اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں

ترسیل وابلاغ کی زبان

کمال احمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں

ترسیل وابلاغ کی زبان

مصنف

کمال احمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1998
دوسری طباعت	:	2011
تعداد	:	550
قیمت	:	-/152 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	795

Urdu Radio Aur Television Men
Tasrel-o-Iblagh Ki Zaban
by **Kamal Ahmad Siddiqi**

ISBN :978-81-7587-568-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159

ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں (Top)70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھر پور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

1۔ دیباچہ	7
2۔ پہلا باب: ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ	13
3۔ دوسرا باب: اردو کا ارتقا، ترسیل کی زبان کی حیثیت سے	56
4۔ تیسرا باب: زبان — تقریر سے تحریر تک	232
5۔ چوتھا باب: اردو نشریات کی زبان کا تجزیہ	313
6۔ پانچواں باب: اردو خبروں کی زبان کا تجزیہ	340
7۔ چھٹا باب: ریڈیو اور دوردرشن کے پروگراموں میں اردو کا حصہ	369
8۔ ساتواں باب: اہم اردو پروگراموں کے مسودے اور ریکارڈ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن میں	404
9۔ آٹھواں باب: اختتامیہ	431
10۔ کتابیات	544

ڈاکٹر محمد احمد صدیقی (ابا مرحوم)

اور

حضور جہاں بیگم (اماں مرحومہ)

کے نام

دیباچہ

اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہے ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ترسیلی زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت، اور یہ کس حد تک موثر ثابت ہوئی ہے۔ اس ایجاد کے بعد کہ برقی مقناطیسی لہریں تار کے وسیلے کے بغیر بھی، فضا میں بھیجی جا سکتی ہیں، اور دوسری جگہ نہ صرف موصول ہو سکتی ہیں، بلکہ صوت و صدا کو برقی مقناطیسی لہروں میں تبدیل کر کے فضا میں بھیجا جا سکتا ہے، اور جب سیکڑوں ہزاروں میل دور انھیں موصول کیا جائے، تو انھیں پھر، ہو بہو اسی صوت و صدا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ـــــــ اس سے عالمی سطح پر رسل و رسائل میں ایک انقلاب آیا۔ شروع میں اسے پیغام رسانی کے لئے ایک وسیلہ سمجھا گیا، پھر جب اس بات کا احساس ہوا کہ تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کے لئے بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، تو یہ ایجاد رسل و رسائل کے دائرے سے براڈکاسٹنگ کے دائرے میں بھی آئی۔

اس صدی کی تیسری دہائی کا ہندوستان پسماندہ ملکوں میں سے تھا۔ سائنس کی ایجادیں پس ماندہ ملکوں میں، بہت دیر میں پہنچتی ہیں۔ ان کی برکتیں ترقی یافتہ ملکوں ہی کا حصہ ہوتی ہیں۔ لیکن مارکونی کی ایجاد کو ہندوستان پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ براڈکاسٹنگ کب اور کس طرح برصغیر میں پہنچی، اور کس طرح عہد بہ عہد اس کا ارتقا ہوا۔ ترسیل کی زبان کی حیثیت سے، ریڈیو کے قیام کے وقت، دو زبانیں اس ملک میں زیادہ اہم تھیں۔ ایک، انگریزی اور دو، اردو کا وہ روپ کم سے کم حکمرانوں، اور ان کے انتظامیہ کے لئے۔ جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ یہ ہندوستانی بہ یک وقت اردو اور ہندی، دونوں کا ترسیلی روپ تھی۔

ادب میں ترسیل کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ زبان کا ادبی روپ

اس کا ترسیلی روپ بھی ہو۔ آدرش صورت تو یہی ہے کہ ترسیلی زبان ہی ادبی زبان بھی ہو، لیکن اس آدرش صورت کے نمونے گنتی میں بہت ہی کم ہیں۔ نثر میں پریم چند اور اُس سے پہلے کے عہد میں نظم میں نظیر اکبر آبادی ہیں۔

خود ادبی زبان کا ایک روپ یا ایک اسلوب کسی عہد میں نہیں رہا۔ ہر عہد کا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ ہر صاحب طرز ادیب کا بھی ایک اسلوب ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اسلوب کوئی جامد تصور نہیں، اس لئے ایک ہی ادیب کے یہاں ایک سے زیادہ اسالیب بھی ملتے ہیں۔ اور ایک ہی عہد میں کئی اسالیب رائج اور مقبول نہ بھی ہوں، تو بھی کسی نہ کسی سطح پر اپنا وجود رکھتے ہیں۔ میر امّن کی نثر کے بعد رجب علی بیگ سرورؔ، دو مختلف ہی نہیں، دو متضاد اسالیب ہیں۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید جس زبان میں لکھی، اور جس کو سنوارنے، یعنی زیادہ مسجع اور مقفّیٰ بنانے کے لئے شیخ امام بخش صہبائی سے فرمائش کی تھی، وہ سر سید کی اس ترسیلی نثر سے یکسر مختلف ہے، جو اردو کو ان کی دین ہے۔ ترسیلی زبان کی حیثیت سے اردو نثر کے ارتقا کا جائزہ بھی اس مقالے میں لیا گیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ چھاپہ خانے نے اردو کو کاروباری، یعنی ترسیلی نثر دی۔ اور یہی نثر، میڈیم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے، ریڈیو کے لئے ذریعہ اظہار بنی۔

ترسیلی زبان کو ادب سے، اور ادب کو ترسیلی زبان سے الگ رکھنا ممکن نہیں۔ ادب خصوصاً شاعری کے لئے استعاراتی زبان نہ ہو، تو اسے سوقیانہ بھی بتایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر نامانوس لفظ استعمال ہو، یا ایسا لفظ استعمال ہو جسے متروکات کی فہرست میں رکھا گیا ہو تو اسے ٹکسال باہر کہا گیا۔ زبان کو اس طرح خانوں میں بانٹنا پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ گفتگو کی زبان ہی تحریری زبان کی بنیاد ہوتی ہے۔ عمارت میں دیواریں اور در و بام، مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتے ہوئے بھی، طرز اور آرایش میں بنیاد سے مختلف ہوتے ہیں۔ تحریری زبان میں ایسا ہو تو کچھ اتنا بڑا مسئلہ نہیں، کیونکہ لکھا ہوا لفظ، فقرہ، جملہ دوبارہ پڑھا جا سکتا ہے۔ لغت کی مدد لی جا سکتی ہے۔ فقرہ اور جملہ ہی نہیں، عبارتیں کئی کئی بار پڑھی جا سکتی ہیں۔ الجھی ہوئی، لمبے لمبے جملوں والی پیچیدہ نثر فارسی سے اردو نے لی تھی۔ اردو کی اپنی نثر، ترجموں سے نہیں، داستانوں سے اُبھری، اور داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ بعد میں انھیں "ضبطِ تحریر" میں لایا گیا۔ تحریر کی عبارت ایک سے زیادہ بار، اس وقت تک پڑھی جا سکتی ہے، جب تک پڑھنے والے پر مفہوم واضح نہ ہو۔ لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے سلسلے میں یہ ممکن نہیں۔ اگر فوری ترسیل نہ ہو، ایک لفظ پر بھی ذہن ایک لمحے

کے لئے آٹکا، اور کئی جملے نکل گئے۔ ایک سو بیس الفاظ فی منٹ کی رفتار سے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن فوری ترسیل کے میڈیم ہیں، اس لئے ترسیلی زبان پہلی اور لازمی شرط ہے۔

لکھنے میں سب سے زیادہ آسانی بول چال کی زبان استعمال کرنے میں ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بول چال کی زبان عام طور سے صرف ڈراموں میں یا بغیر لکھے ہوئے پروگراموں میں ہی ہوتی ہے۔ اس تحقیق میں اس ذیلی موضوع کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ ریڈیو کے قیام کے وقت کلاسیکی ادب اور عصری ادب کے خزانوں کے علاوہ، اسٹیج اور خاص طور سے پارسی اسٹیج کے ڈرامے موجود تھے۔ کچھ کو جوں کا توں براڈکاسٹ کیا جا سکتا تھا، باقی میں، نئی میڈیم کی ضرورتوں کے مطابق کانٹ چھانٹ ضروری تھی۔ چنانچہ ایسا کیا گیا، اور ریڈیو روپ تیار کئے گئے۔ اس تحقیق میں ایک نظر ریڈیو کی اصناف، اور ان کے ارتقا پر بھی ڈالی گئی ہے۔ پہلے دور کے اہم نشریوں کے کچھ نمونے حاصل کر کے، پیش کیا گیا ہے، اور کچھ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ریڈیو اور دور درشن کے پروگراموں میں اُردو کا کیا حصّہ ہے، یہ بات بھی اس تحقیق کے دائرے میں ہے۔ یہ خاصا الجھا ہوا معاملہ ہے، خصوصاً اردو ہندی کے تنازعہ کے تناظر میں۔ اہمیت رسم خط کو نہیں دی گئی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے سلسلے میں اس کوئی بامعنی عنصر نہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ ٹی وی اسکرین پر عنوانات کی پٹی سے قطع نظر، اہمیت اس زبان کی ہے، جس میں پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ اعداد و شمار حقیقت کا اظہار بھی کرتے ہیں، اگر اعداد و شمار پیش کرنے والوں کا مقصد حقیقت کا اظہار کرنا ہو، ورنہ اعداد و شمار ہی سے حقیقت پر پردہ ڈالنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسی تحقیقی مقالے میں جدول سے مفر نہیں۔ سرکاری طور پر ریڈیو میں جن پروگراموں کو اردو پروگرام تسلیم کیا گیا ہے، اُن کی فہرست دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ کچھ اور اہم اور مقبول پروگرام بھی ترسیلی اردو ہی کے پروگرام ہیں۔

اردو خبروں، خبرناموں اور پروگراموں کی زبان کا تجزیہ بھی اس تحقیق کا ایک اہم مقصد ہے۔ چنانچہ دو اہم باب اس کے لئے وقف ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن سے بہت اہم پروگرام پیش کئے گئے، جن کی ادبی اہمیت ہے، مختلف اسٹیشنوں اور سنٹروں کی لائبریریوں اور آرکائوز میں اہم پروگرام ٹیپ اور ویڈیو ٹیپ پر موجود ہیں۔ بہت سے اہم پروگراموں کے مسوّدے بھی موجود ہیں۔ پروگراموں کا رسالہ آواز،

جواب بند ہو چکا ہے، اہم پروگراموں کے مسوّدے بھی شائع کرتا تھا۔ براڈکاسٹنگ پر چھ دہوں سے زیادہ وقت گذر چکا ہے۔ شروع شروع میں پری سٹو ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ زیادہ تر پروگرام براہ راست اسٹوڈیو سے نشر ہوتے تھے۔ ریکارڈ کئے ہوئے پروگرام، عام طور سے ڈرامے یا اعلیٰ پایہ کے موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے، یا پھر شخصیتوں کی بات چیت۔ یہ پروگرام باری باری ہر اسٹیشن سے ہوتے تھے، اور کئی بار بجنے کے بعد یہ خراب ہو جاتے تھے۔ ٹیپ ریکارڈنگ کی زندگی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن سارے اچھے پروگرام محفوظ رکھنا بھی ممکن نہیں۔ بہت سے مسوّدے بھی ضائع ہو گئے، کیونکہ انھیں رکھنے کے لئے جگہ کا مسئلہ تھا، اور ہے۔ پھر بھی کچھ بہت اہم مسوّدے اور ریکارڈ اور ویڈیو ٹیپ موجود ہیں۔ ان کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں، اور اس مقالے کے ایک باب میں شامل ہیں۔

ایک اہم گوشہ، جو اس تحقیقی مقالے کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ مختلف سطحوں پر یہ کوشش کی گئی کہ ریڈیو کی زبان، لغت اور ادب کی طرف سے ہٹا کر، روزمرّہ کی طرف، ترسیلی زبان تک لایا جائے۔ حکومت کی لسانی پالیسی کی طرف سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۱۹۴۹ء میں وزیر مملکت آر آر دیواکر کو دھیان دلایا۔ اس سال ہندوستانی خبروں کی جگہ ہندی میں خبریں نشر ہونا شروع ہوئی تھیں، اور بول چال کی زبان اور محاورے سے دور جانے لگی تھیں۔ اس اہم خط کی نقل حاصل کر کے اس مقالے میں شامل کی گئی ہے۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی نے اسی سلسلے میں دوسری کوشش کی۔ اس سلسلے میں دو اہم دستاویزوں کے فوٹو اسٹیٹ اس مقالے میں پہلی بار پیش کئے جا رہے ہیں۔ اندر کمار گجرال نے ایک بار پھر کوشش کی کہ براڈکاسٹ کی زبان، عام بول چال کی زبان کے مطابق ہو۔ انھوں نے یہ خوبصورت جملہ تراشا کہ 'آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی نہیں، ترسیل کی پالیسی ہے'۔ پی سی چٹرجی نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ ان کی کتاب سے متعلقہ حصے لے کر اس بحث کو سمیٹا گیا ہے، کیونکہ اس مقالے کے موضوع سے اس کا گہرا اور براہ راست تعلق ہے۔ گجرال کے بعد، ایمرجنسی کے زمانے میں ودیا چرن شکلا ریڈیو اور اطلاعات کے وزیر ہوئے۔ محسوس کیا گیا کہ پروگراموں کی ترسیل نہیں ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وزارت اور ڈائرکٹوریٹ جنرل میں کچھ اقدامات کئے گئے۔ وزارت کے میمورینڈم کی ایک فوٹو کاپی حاصل کی گئی، جو مقالے میں شامل کی جا رہی ہے۔ اس میں اس میٹنگ کی روداد ہے، جو شکلا کی صدارت میں ہوئی تھی اور اس میں حکومت کے منشا کا بھی ذکر ہے۔ اردو میں زیادہ پروگرام کرنے کی بھی بات ہے۔

براڈکاسٹنگ پر لائنل فیلڈن، سید ذوالفقار علی بخاری، پی سی چٹرجی، ایچ آر لوتھرا،

، ہریش چندر کھنہ اور جی سی اوستھی کی کتابوں کے علاوہ آکاش بھارتی کی رپورٹ اور آکاش وانی کے گولڈن جوبلی نمبروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کتابوں اور مضامین کے مصنفوں کا، شکریے کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن ۱۹۷۵ تک آل انڈیا ریڈیو کا حصہ تھا۔ بہت دنوں تک ریڈیو کے اثرات دوردرشن پر رہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ عملہ ریڈیو کا تھا، اور ریڈیو کے ڈھرے پر پروگرام سوچتا تھا۔ پرانی عادتیں چھوٹنے میں وقت لگتا ہے۔ دوسری اہم وجہ آلات اور تکنیکی جانکاری کی کمی تھی۔ یہ کمی بھی دور ہوئی اور عملے نے پوری طرح تربیت پائی۔ اب دوردرشن پیشہ ورانہ ہے، اور میڈیم کی خوبیوں اور نزاکتوں کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پھر بمبئی، دلّی، کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں میں ٹی وی کے لیے اچھے اسٹوڈیو کھل گئے ہیں، جو ٹی وی کے لئے ہر طرح کے پروگرام بنا رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے پروگرام لئے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن بصری میڈیم ہے، اور اس ایک جہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کا گہرا اثر ذہنوں پر ہوا ہے۔ لیکن ادب پر ابھی تک اس کے اثرات نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔ فلم بھی بڑا طاقتور میڈیم ہے۔ اس کے لئے جو کچھ لکھا گیا، وہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا، اس لئے ادب کا حصہ نہیں بنا۔ یہی کچھ ٹی وی کے سلسلے میں بھی درست ہے اس اضافے کے ساتھ کہ دوردرشن کے لئے جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کے شائع ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ایک سیریل بھی شائع ہو چکا ہے۔ امکانات بہت روشن ہیں، نتیجہ ظاہر ہونے میں البتہ کچھ وقت لگے گا۔

یہ مقالہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں، پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ جو رہنمائی انھوں نے کی اس کے لئے شکر گذار ہوں۔

کمال احمد صدیقی

۵۵۷۱، لاجپت نگر
صاحب آباد (یوپی)
۲۰۱۰۰۵

پہلا باب

ہندوستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ

ہندوستان میں براڈ کاسٹنگ کا آغاز نومبر ۱۹۲۳ء میں ہوا، جب کلکتہ میں ریڈیو کلب بنا۔ اگلے برس جون میں، بمبئی اور مدراس میں بھی ریڈیو کلب بنے، اور انھوں نے روزانہ پروگرام نشر کرنا شروع کئے[1] یہ پیشہ وارانہ نہیں، شوقیہ براڈ کاسٹنگ تھی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں مدراس کلب بند ہو گیا۔ لیکن اسی سال ۲۳ جولائی کو بمبئی سے پہلا براڈ کاسٹ شروع ہوا۔ ۲۶ اگست کو کلکتہ اسٹیشن سے بھی باقاعدہ براڈ کاسٹ شروع ہوئے۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات کے ابتدائی دور کی تفصیلات کچھ بکھری ہوئی ہیں۔ منظر بہت واضح نہیں ہے اور ڈور اُلجھی ہوئی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ایچ آر لوتھرا نے اپنے ایک مضمون Fifty, Not out, میں، جو براڈ کاسٹنگ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں لکھا تھا[2] کہ ہندوستان میں پہلا ریڈیو کلب ۱۶ مئی ۱۹۲۴ء کو مدراس میں قائم ہوا، اور ۳۱ جولائی سے پروگرام نشر کرنا شروع کئے۔ اُسی برس اکتوبر میں یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں مدراس کارپوریشن نے براڈ کاسٹنگ سروس شروع کی جو ۱۶ جون ۱۹۳۸ء تک جاری رہی۔ اور پھر اسی روز وہاں آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن کھلا۔ دہرہ دون میں بھی مقامی کوششوں سے ۱۶ راپریل ۱۹۳۶ء کو ایک ریڈیو اسٹیشن سے نشریات شروع

---

1. Broadcasting In India : P.C. Chatterji

2. A.I.R, Programme Journal (English)

: 24-30 May, 1977 : Pp.39

ہوئیں، جن کا سلسلہ ۱۰ مئی ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ ایڈیشن بھی بند کرنا پڑا[1]

براڈ کاسٹنگ کا پہلا تجربہ ہندوستان میں ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ بمبئی کے گورنر سر جارج لائیڈ کی فرمائش پر، ڈاک اور تار کے محکمے کے اشتراک سے، ٹائمز آف انڈیا نے بمبئی سے موسیقی کے ایک پروگرام کے براڈ کاسٹ کا بندوبست کیا۔ بمبئی سے پونے دو سو کیلو میٹر کے فاصلے پر، پونہ میں سر جارج لائیڈ نے یہ پروگرام سُنا[2] سرکاری دستاویزوں کی بنیاد پر ایچ آر لوتھرا نے اپنی کتاب[3] میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن تاریخ انہوں نے بھی نہیں لکھی ہے۔

ہندوستان، برطانوی سلطنت کی ایک نوآبادی تھا اس کا شمار پسماندہ ملکوں میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود، جہاں تک براڈ کاسٹنگ کا تعلق ہے، ہمارا ملک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے پیچھے نہیں رہا۔ خود وائرس کی ایجاد کے سلسلے میں ہندوستان کی علمی پیش رفت قابل ذکر ہے۔ اگرچہ مارکونی نے پیٹنٹ نمبر ۱۲۰۳۹ کے تحت وائرس (بلا تار برقی) مواصلات کی ایجاد، دولت مشترکہ میں جون ۱۸۹۶ء میں رجسٹر کرائی تھی، لیکن ہندوستان کے سائنسی حلقے اس دوڑ میں پیچھے نہیں تھے۔ جگدیش چندر بوس، مارکونی کے ہم عصر تھے، اور ریڈیائی لہروں کی دریافت انھوں نے بھی کر لی تھی، لیکن پیٹنٹ پہلے مارکونی کا رجسٹر ہوا۔ یہ مسئلہ اس تحقیق کا مسئلہ نہیں ہے، لیکن اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ دنیا میں پہلی بار ریڈیو ٹرانسمشن

---

1. Landmarks in Indian Broadcasting (Akashvani 24-30 May, 1977) P 56

2. Report on the working group on Autonomy for Akashvani and Doordarshan (akash bharati national broadcast trust) report; Volume II: Appendix A: P 271

3. Publication Division (Government of India) Indian Broadcasting

4. ,, ,, ,,

سے پروگرام ۱۹۲۰ء میں Pittsburg(U.S.A) سے شروع ہوئے۔ مارکونی کمپنی نے ۲۲ فروری ۱۹۲۰ء کو برطانیہ میں چیمس فورڈ سے نشریات شروع کیں۔ برٹش براڈکاسٹنگ کمپنی نومبر ۱۹۲۲ء میں وجود میں آئی۔ اور جان ریتھ اس کے منیجنگ ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ لوتھرا کی یہ اطلاع درست نہیں ہے۔ برٹش براڈکاسٹنگ کمپنی ایک پرائیویٹ کمپنی تھی، اور جے سی ڈبلو ریتھ اس کے جنرل منیجر تھے۔ پہلی جنوری کو جب یہ پبلک کارپوریشن میں تبدیل ہوئی، تو اس کا نا برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن ہوا، اور ریتھ اس کے پہلے ڈائرکٹر جنرل ہوئے[1] ہندوستان کی اہمیت تاج برطانیہ میں جڑے ہوئے کوہِ نور سے زیادہ تھی۔ اسی نوآبادکی وجہ سے ملکہ وکٹوریہ نے قیصرِ ہند کا لقب اختیار کیا تھا، اور اسی کی وجہ سے شاہ برطانیہ، King Emperor شہنشاہ کہلاتا تھا۔ برطانیہ کی معیشت اور خوشحالی کا دارومدار ہندوستان پر تھا، کیونکہ یہاں سے نہ صرف سستا خام ملتا تھا، بلکہ برطانوی مصنوعات کے لئے یہ بڑی آبادی والا ملک ایک اہم منڈی بھی تھا۔ ہندوستان اور برطانوی جزائر کے درمیان فاصلے کے پیشِ نظر مواصلات بہتر بنانے کے لئے ریڈیو کے بڑے امکانات تھے۔ صرف مواصلات کے لئے نہیں، بلکہ ترسیل اور ابلاغ کے لیے بھی۔ ریتھ کو ان سب امکانات، اور تاج برطانیہ کے مفادات کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ بی بی سی کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے، وہ ہندوستان کو بھی اپنے دائرہ عمل میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ہندوستان میں براڈکاسٹنگ کے مرکز قائم کرنا ضروری تھے چنانچہ انھوں نے مارکونی کمپنی کے کرنل سمپسن سے نومبر ۱۹۲۳ء میں گفتگو کی[2] لیکن حکومت ہند نے ریتھ کے خیال کا خیرمقدم نہیں کیا۔ سرد مہری کے اس رویتے سے انھیں خاصی مایوسی ہوئی، جس کا ذکر انھوں نے اپنی یادداشتوں میں کیا ہے[3] لندن

---

[1] Broadcasting in India: G.C. Awasthy

[2] The Birth of Broadcasting (Oxford University Press): ASA Briggs

[3] Into the Wind : J.C.W. Reith ۱۹۴۹ ایڈیشن لندن صفحہ ۱۱۳

میں انڈیا آفس نے سنجیدگی سے ان کی تجویز پر غور کیا، اور نہ دلّی میں وائسرائے نے کوئی دلچسپی یا سرگرمی دکھائی۔ وائسرائے نے ریڈیو کی اہمیت اور اس کے امکانات کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ ریتھ لکھتے ہیں کہ بعد میں لارڈ ولنگڈن نے پچھلی بے حسی کی تلافی کرنا چاہی، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، اور ریتھ کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

شروع کے دنوں میں شوقیہ کلبوں نے اہم رول ادا کیا، اور باقاعدہ براڈ کاسٹنگ سرگرمیاں شروع ہو جانے کے بعد بھی ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہ تجرباتی دور تھا، اس لئے شاید حکومت فراخ دلی کے ساتھ اجازت نامے جاری کرتی رہی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ٹرانسمیٹر کم تھے، اور زیادہ طاقتور نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے علاقے ریڈیو بیم سے محروم تھے۔ جہاں جہاں متعلقہ اتھارٹی براڈ کاسٹنگ مہیا نہیں کر سکتی تھی، وہاں شوقیہ کلبوں کو خوشی سے اجازت دے دی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں لاہور کی ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن کو ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی منظوری مل گئی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ براڈ کاسٹنگ کے تعلیمی پہلو کو سب سے پہلے پنجاب کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے تسلیم کیا۔ اگرچہ یہ اسٹیشن صرف تفریحی پروگرام نشر کرتا تھا، لیکن کمیٹی نے اسے ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ دی۔ باقی اخراجات کی کفالت پنجاب کی حکومت کرتی تھی۔

پہلی ستمبر ۱۹۳۷ء تک ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن یہ اسٹیشن چلاتی رہی۔ اسی سال ۱۶ر دسمبر کو آل انڈیا ریڈیو نے پانچ کیلو واٹ کے ٹرانسمیٹر سے میڈیم ویو پر نشریات شروع کیں۔[1]

ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ گرانٹ تو پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی دیتی تھی، حکومت پنجاب، باقی اخراجات کے لئے کیا دیتی تھی، اس کا کوئی ریکارڈ کہیں نہیں ہے، اور نہ کوئی ایسا ہے جو بتا سکے۔ اس کے بارے میں دریافت کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن کوئی یقینی رقم کسی کے ذہن میں نہیں تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ میچنگ گرانٹ دیتی ہوگی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار روپے۔ گویا سارے سال کا بجٹ تین ہزار روپے تھا۔ مہینے کا خرچ ڈھائی سو روپے۔ اس

---

[1] براڈ کاسٹنگ ان انڈیا، ص ۳۔

رقم سے گراموفون ریکارڈ خریدے جاتے تھے، اور معمولی سی رقم ٹرانسمیٹر کی مرمت کے لئے رکھی جاتی تھی، جس کا اوسط تیس روپے مہینے تھا۔ اخبار وغیرہ خود شوقیہ براڈکاسٹ کرنے والے خریدتے تھے۔ اس اسٹیشن کے بارے میں ایچ، آر، لوتھرانے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں: [1]

I recall with great pleasure the small station set up by the Y.M.C.A. at Lahore in 1926. Some five years later, learning that the man running it had been at college with me, I asked him if I could watch how it worked. When in the next evening, he reached the place on the first floor, up steep brick stairs, I was waiting for him at the landing. He opened a small room, dusted the table and switched on the gear stacked on it. After a few minutes, when the valves had warmed up, he started making announcements, reading excerpts from local newspapers and playing some gramophone records. After an hour or so, he switched the transmitter off, locked the door and walked away. In later years, when AIR staff had begun to proliferate vastly, and not always for the best reasons, I remembered with regret that one-man broadcasting station, and wished for the return of the days when specialisation had not set in, and each AIR station had only a few

---

[1] براڈکاسٹنگ ان انڈیا ص ۳۔

programme men who were expected to be versatile and able to turn their hand to all kinds of assignments.

ہنس راج لوتھرانے جو بات کہی ہے، اس میں ایک نکتہ ہے۔ پہلے براڈکاسٹنگ شوق تھی۔ پھر پیشہ بنی، اور پھر ملازمت۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلے پچھتر سے اسّی فیصدی تک وقت موسیقی کے لئے تھا۔ آرٹسٹ اسٹوڈیوز سے نشر کرے، یا کمرشل ریکارڈ۔ ڈرامہ کی بڑی اہمیت تھی۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اتنی زیادہ نوعیتوں کے پروگرام نہیں ہوتے تھے۔ پھر، جیسا کہ خود لوتھرانے لکھا ہے، وائی ایم سی اے شام کو ایک گھنٹہ کا پروگرام کرتا تھا۔ ایک آدمی کافی تھا۔ لیکن یہ بحث دوسری ہے۔ پروگرام اردو اور انگریزی میں ہوتا تھا۔ غالب حصہ اردو کا تھا۔ ایک امریکی مسٹر پیرسن شروع میں اس کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ سرخ اینٹوں کی عمارت کی چھت پر ایریل تھا۔ اسٹوڈیو پہلی منزل پر تھا، اور کنٹرول روم سیڑھیوں کے نیچے۔ فزکس کے ایک طالب علم، چمن لال اور بعد میں بی جے گلائی اسے چلاتے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے دو گھنٹے تک پروگرام نشر ہوتے تھے گراموفون ریکارڈوں کے علاوہ مقامی آرٹسٹ بھی گانے نشر کرتے ہیں، اور انھیں معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ حکومت ہند نے آٹھ سو روپے اور حکومت پنجاب نے چھ سو روپے کی گرانٹ دی۔[1]

تجارتی مفاد کس طرح کام کرتے ہیں، اس کی مثال پشاور کے پہلے ریڈیو اسٹیشن کے قائم کئے جانے میں ملتی ہے۔ اس اسٹیشن نے ۱۹۳۵ء میں کام کرنا شروع کیا۔ وہاں کوئی شوقیہ کلب بھی سامنے نہیں آیا۔ مارکونی کمپنی نے ایک ٹرانسمیٹر، اور کچھ ریڈیو سٹ صوبائی حکومت کو عاریتاً دیئے، کہ ریڈیو سٹ مختلف علاقوں میں کمیونٹی سننگ کے لئے لگائے جائیں۔ اگر براڈکاسٹنگ کا تجربہ کامیاب ہو، تو حکومت ٹرانسمیٹر اور ریڈیو سٹ خرید لے۔ شمالی مغربی صوبے کی حکومت نے یہی ٹرانسمیٹر پہلی اپریل ۱۹۳۷ء کو حکومت ہند

---

[1] انڈین براڈکاسٹنگ، ص ۷۱۔

کے حوالے کیا[1]

کس اسٹیشن سے کیا کیا پروگرام نشر ہوتے تھے، خاص طور سے انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس اور آل انڈیا ریڈیو کے قیام سے پہلے، اس کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ البتہ کہیں کہیں برسبیل تذکرہ کچھ اطلاعات مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ شروع کے برسوں میں، آل انڈیا ریڈیو کے قیام سے پہلے، پشاور اور الہ آباد کے اسٹیشن بنیادی طور سے دیہاتی پروگرام نشر کرنے کے لئے تھے۔ مقامی سنگیت، زیادہ تر لوک سنگیت اور فصلوں کے بارے میں جانکاری فراہم کرنا ان کا بنیادی مقصد تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے سابق ڈائرکٹر جنرل، جو ایشیا پیسفک براڈکاسٹنگ یونین کے صدر بھی رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں:

In the early years other events occurred which have significance in the development of All India Radio. First, in 1935 private stations were set up in Peshwa in the North-West Frontier Province and in Allahabad in the United Provincewhich started broadcasting programmes for rural audiences. These stations, later incorporated into the AIR network, mark the beginning of the rural programmes, which are now an important component in its output.

الہ آباد میں بھی تجربے کے طور پر تیس کے دہے میں براڈکاسٹنگ شروع ہوئی۔ زراعتی انسٹی ٹیوٹ، الہ آباد نے ۱۹۳۵ء میں لائسنس حاصل کیا۔ اور انسٹی ٹیوٹ نے روزانہ ایک گھنٹے کے پروگرام نشر کئے۔ اسٹیشن پہلی فروری ۱۹۴۹ء تک کام کرتا رہا، اور اس

---

[1] براڈکاسٹنگ ان انڈیا، ص: ۸ (جی سی اوستھی)۔

تاریخ کو آل انڈیا ریڈیو کا الٰہ آباد اسٹیشن قائم ہوا[1]

الٰہ آباد اسٹیشن کے سلسلے میں اہمیت اس بات کی ہے کہ یہ پرائیویٹ اسٹیشن، اس کے بہت عرصے بعد تک کام کرتا رہا، جب مرکزی سرکار نے براڈ کاسٹنگ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

الٰہ آباد کے زراعتی انسٹی ٹیوٹ کی طرح کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں فزکس کے شعبے نے بھی نشریات شروع کیں۔ تفصیل ہیرین باسو کے الفاظ میں[2]

... in 1925 there was broadcasting in India operated from the Department of Physics of the Science Colleges of Calcutta University, and they maintained this operation for only a year... Dr. Sisirkumar Mitra was appointed Professor of Physics in Science College in 1923... Dr. Mitra began his research and experiment in wireless... He set up a transmitter in a small room in the Department of Physics, and with the help of one of his colleagues he used to transmit through the wireless, talks, music, recitation, etc., and those who would receive them used to send them reports regularly.......... Dr. Mitra continued his efforts for nearly a year, and these drew the attention of the British Broadcasting Corporation of England. At the beginning of 1926 the BBC sent its

---

[1] BROADCASTING IN INDIA (Saga Publications : P.C. Chatterji

[2] Broadcasting in India (Allied Publishers) : G.C. Awasthy

Memoirs of a Versatile Artiste : Hiren Basu

Akashvani : July 24-30, 1977

representative, Mr. C.C. Wallick, to explore the commercial possibilities of this Broadcasting Corporation in India.

برطانوی ہند میں چار مہانگر تھے۔ کلکتہ، بمبئی، اور مدراس، جو پریسی ڈنسیوں کی راج دھانیاں تھیں، اور دلی، جو سارے ملک کی راج دھانی تھی۔ قاعدے سے پہلا ریڈیو اسٹیشن دلی میں قائم ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بنگال کے ریڈیو کلب کو، عارضی طور سے ایک چھوٹے مارکونی ٹرانسمیٹر سے نشریات کی اجازت دی گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۳ء میں کلکتہ کے ریڈیو اسٹیشن نے کام کرنا شروع کیا۔ جون ۱۹۲۴ء میں بمبئی کے ریڈیو کلب نے ایسے ہی ایک ٹرانسمیٹر سے براڈکاسٹ شروع کیے۔ ۱۶ مئی ۱۹۲۴ء کو مدراس کا ریڈیو کلب وجود میں آیا[1] اور ۳۱ جولائی سے نشریات شروع ہوئیں۔

تاریخیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی، لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ایچ آر لوتھرا کا ماخذ وزارتِ اطلاعات و نشریات، آل انڈیا ریڈیو اور وزارت کے دوسرے ماتحت دفتروں کی فائلیں تھیں۔ انھیں بھی تاریخیں اور ساری تفصیلات نہیں ملیں۔ بلکہ ان کی مشکلات کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مختلف ماخذوں، جو سرکاری یا نیم سرکاری سمجھے جا سکتے ہیں، ان میں نادرست اطلاعات بھی ہیں۔ مثال کے طور پر جی سی اوستھی نے لکھا ہے:[2]

> Strictly speaking, broadcasting in India had started much before 1927 and was conducted by amateur clubs. The first of such clubs was the Madras Presidency which was formed on May 16, 1924...

آل انڈیا ریڈیو کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر، اس کے پروگرام جرنل سے Landmarks in Indian Broadcasting میں پہلا اندراج یہ کیا ہے:[3]

---

[1] ایچ آر لوتھرا، انڈین براڈکاسٹنگ، ص ۶، ۷۔ [2] جی سی اوستھی، براڈکاسٹنگ ان انڈیا، ص ۳
[3] آکاش وانی (جولائی ۲۴-۳۰، ۱۹۷۷ء) ص ۵۵۔

1924 ' May 16: First Radio Club in India Formed at Madras.

لوگوں میں براڈکاسٹنگ سے کتنی دلچسپی تھی، اس بات کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب کرشنا سوامی شیٹی اپنی تعلیم ختم کرکے ولایت سے مدراس واپس آئے، تو وہ اپنے ساتھ چالیس واٹ کے ایک ٹرانسمیٹر کے سارے پرزے لائے تھے۔ ان پرزوں کو جوڑکر ٹرانسمیٹر تیار کیا گیا، اور مدراس ریڈیو کلب کے افتتاح کے بعد نشریات اسی سے ہونے لگیں۔ ظاہر ہے یہ تجرباتی نشریات تھیں، اور ان کا دائرہ آٹھ کلو میٹر میں محدود تھا۔ رسمی براڈکاسٹنگ سروس ۳۱ جولائی ۱۹۲۴ء سے شروع ہوئی، جب پانچ گنا زیادہ طاقتور، یعنی دو سو واٹ کا ٹرانسمیٹر لگایا گیا۔ مدراس پریسی ڈنسی ایڈ کلب کا اسٹیشن، مالی مشکلات کی وجہ سے، اکتوبر ۱۹۲۷ء سے آگے نہ چل سکا۔ کلب نے اپنا ٹرانسمیٹر مدراس کارپوریشن کو پیش کردیا جس نے براڈکاسٹنگ کے لئے لائسنس حاصل کیا، اور پہلی اپریل ۱۹۳۰ء سے نشریات شروع کیں۔

ملک کے مختلف شہروں میں ریڈیو اسٹیشن قائم تو ہو گئے تھے، لیکن جسے باقاعدہ براڈکاسٹنگ کہا جا سکتا، وہ صورت نہیں تھی، لوگوں میں شوق تھا، لیکن ان کے پاس ضروری وسائل نہ تھے، باقاعدہ تربیت یافتہ عملہ نہیں تھا۔ صرف ایک کم طاقت کا ٹرانسمیٹر ہونا کافی نہیں ہوتا۔ پروگراموں کی ترتیب، ان کی افادیت، ان کا فنی معیار، یہ سب بھی ضروری باتیں ہیں، اور ان کے تیار کرنے کے لئے ایک باقاعدہ پلان ہونا ضروری ہے چنانچہ حکومت ہند نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر سوچنا شروع کیا، اور مرکزی سرکار کے سکریٹری، اے ایچ لے کی صدارت میں ۷ اور ۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک میٹنگ ہوئی، جس میں انگریزی روزناموں اسٹیٹس مین اور ٹائمز آف انڈیا کے نمائندوں کے علاوہ مرکزی سرکار کے مختلف شعبوں کے افسروں نے بھی شرکت کی۔ ساڑھے چار صفحوں کا ایک خط ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء کو، صوبائی حکومتوں کو بھیجا گیا، جس میں حکومت ہند کی پالیسی کی وضاحت کرنے کے ساتھ، مقامی حکومتوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی رائے، اپنا ردعمل اور اپنے مشورے بھی بھیجیں۔ ہند سرکار کی تجویزوں کے اہم نکتے یہ تھے۔

۱۔ ریڈیو ریسیور رکھنے کی لائسنس فیس سالانہ دس روپے ہوگی۔ اس کا اسّی فیصدی حصہ براڈکاسٹنگ کرنے والے ادارے (براڈکاسٹنگ لائسنس) کو ملے گا۔ یہ لائسنس

مطالبہ پر، ڈاکخانے جاری کریں گے، اور درخواست دہندہ کی عمر، جنس یا قومیت کے بارے میں کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۲۔ خبریں براڈکاسٹ کرنے کے اوقات کا تعین، خبر رساں ایجنسیوں، اخباروں اور سائنسی اداروں کے مشورے سے ہوگا۔

۳۔ خاص حالات میں، اگر علاقے کے اخباروں اور خبر رساں ایجنسی کی رضامندی حاصل کرلی گئی ہو، تو اس میں تبدیلی بھی ممکن ہے۔

۴۔ (براڈکاسٹنگ) لائسنسی کو براڈکاسٹ کے لئے معاوضہ کے طور پر رقم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ ڈائرکٹر جنرل، ڈاک اور تار کے، وقت وقت پر، مقرر کئے گئے معیار کی پابندی کی گئی ہو۔

۵۔ مرکزی سرکار کی تجویز، یہ حق اپنے پاس رکھنے کی ہے، کہ کسی وقت بھی لائسنسی کو نوٹس دے کروہ براڈکاسٹ ہونے والے پروگراموں کی روپ ریکھا حکومت کو بھیجے، اور حکومت اس سلسلے میں جو ہدایات دے ان پر عمل کرے۔ مرکزی حکومت پری سنسرشپ نافذ کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

۶۔ ہر لائسنس پانچ سال کی مدّت کے لئے ہوگا۔ اور اس کی نوعیت اجارہ داری کی ہوگی، بشرطیکہ خدمات تسلّی بخش ہوں۔

۷۔ لائسنسی کو کمپنیوں کے قانون کے تحت، لائسنس کی منظوری کے تین مہینے کے اندر، لمٹیڈ کمپنی بنانا ہوگی، اور منافع، سرمایہ کے دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوگا پبلک کو حصے خریدنے کا حق ہوگا۔

اس خط میں مرکزی سرکار نے صوبائی حکومتوں سے یہ بھی کہا تھا کہ ان معاملوں پہ رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے نکتوں کی تشہیر کی جائے، لیکن پری سنسرشپ کی بات کی تشہیر نہ کی جائے۔

ایچ آر لوتھرا نے سارے ریکارڈ دیکھے ہیں اور انھوں نے اپنی کتاب کے دوسرے باب میں جو تفصیل دی ہے، وہ نہایت دلچسپ ہے۔

دلّی کے چیف کمشنر نے ۹ مئی کے خط کا جواب ۲۶ جولائی ۴۴ء ہی کو دے دیا۔ اور جواب یہ تھا کہ انھیں دلّی میں کوئی ایسا غیر سرکاری شخص نہیں ملا جسے براڈکاسٹنگ میں

دلچسپی ہو، یا اس موضوع پر کوئی مفید اطلاع فراہم کر سکے۔

حکومت آسام کا جواب ۲۱ اگست کا ہے۔ اسے کسی اور بات سے زیادہ چائے کے باغوں کی فکر تھی، اور وہ پریشان تھی کہ اگر نشر کرنے کی اجارہ داری براڈ کاسٹنگ کمپنی کو مل جائے گی، تو چائے کے باغات، جو ایک دوسرے سے کم طاقت کے وائرس سٹوں سے رابطہ رکھتے ہیں، ان کا کیا ہوگا۔

بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ نے، جو چیف کمشنر بھی تھا، ۲۱ جولائی کو لکھا کہ اس کا علاقہ اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے کہ کمرشل براڈ کاسٹنگ کے بارے میں سوچا جاتے، اس لئے کسی ردِ عمل کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

برما اس وقت برطانوی راج میں شامل تھا، اور ہندوستان کی مرکزی سرکار کی عملداری میں تھا۔ چیف سکریٹری نے ۲۹ اگست کے خط میں لکھا کہ مطلوبہ تشہیر کی گئی تھی، لیکن پبلک نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا . . . . . رنگون کارپوریشن نے لکھا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے . . . . برمی چیمبر آف کامرس کو کچھ نہیں کہنا تھا . . . چینی چیمبر آف کامرس نے حکومتِ ہند کے خیال سے اتفاق کیا۔[1]

کچھ افراد، اداروں اور صوبائی حکومتوں کے ردِ عمل اور بھی آئے، لیکن وہ کچھ بہت زیادہ اہم نہیں۔ براڈ کاسٹنگ کے معاملات صنعت اور محنت کا محکمہ دیکھتا تھا۔ ۹ مئی ۱۹۲۴ء کے گشتی خط کے جواب میں جو ردِ عمل اکٹھا ہوئے ان پر غور کرنے کے لئے ۲۰ مئی ۱۹۲۵ء کو شملہ میں ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی۔ مسٹر این ایم جوشی (ایم ایل اے) کی دو تجویزیں تھیں۔ ایک یہ کہ براڈ کاسٹنگ حکومت کی اجارہ داری ہو۔ دوسری یہ کہ صرف ہندوستانیوں ہی کو اس شعبے میں ملازمت دی جائے۔ ان کی دونوں تجویزوں سے اتفاق نہیں کیا گیا، حالانکہ بعد میں ریڈیو پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اور جب بعد میں ٹیلی ویژن آیا تو یہ بھی سرکاری محکمہ بنا۔ ان دونوں کو کارپوریشن بنانے، یا زیادہ سے زیادہ مختاری دینے کے لئے کئی بار کوششیں ہوئیں، جن میں چندا کمیٹی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، لیکن حکومت نے اپنے اختیارات سے دستبردار ہونا گوارا

---

[1] ایچ آر لوتھرا: انڈین براڈکاسٹنگ ص ۸ ــ ۱۱۔

نہیں کیا۔ لیکن بعد کی بات ہے۔ سر دیواپرساد سربھادھیکاری اس کے حق میں تھے کہ ایک ہی کمپنی کو براڈ کاسٹنگ سونپی جائے، لیکن ہر ممکن احتیاط برتی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پانچ برسوں کے لئے اجارہ داری دی جائے۔ کمیٹی نے اعلامیے کا مسودہ بھی منظور کیا، چنانچہ ۲۷، مارچ ۱۹۲۵ء کو Broadcasting کے عنوان سے کمیونکے جاری کیا گیا۔ اس کی اہم باتیں یہ تھیں کہ حکومتِ ہند، برطانوی ہند کے علاقوں میں، اسٹیشن قائم کرکے براڈ کاسٹنگ کی اجازت پرائیویٹ تنظیم کو دینے کے لئے لائسنس جاری کرے گی۔ شرائط کم و بیش وہی تھیں، جن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ یعنی خاص حالات میں حکومت کو پری سنسرشپ اختیار ہوگا۔ کچھ اہم شرطیں اور بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کی اکثریت، برطانوی ہند کے باشندوں پر مشتمل ہو۔ کمپنی اس بات کی پابند ہوگی کہ سارے ملک میں براڈ کاسٹنگ کی خدمات فراہم کرے گی، اور ان مقامات پر ریڈیو اسٹیشن قائم کرے گی، جو اس کے اور حکومت کے درمیان طے ہوں گے۔ لائسنس دس برس کے لئے ہوگا، اور یہ دس برس کی مدت اس روز سے شمار ہوگی جس روز پہلا اسٹیشن براڈ کاسٹ شروع کرے گا۔ پہلے پانچ برسوں میں، اگر حکومت کمپنی کی کارکردگی سے مطمئن ہوئی، تو کسی اور فریق کو براڈ کاسٹنگ کا لائسنس نہیں دے گی۔ کمپنی اس امر میں آزاد ہوگی کہ ریڈیو سٹ بھی بنائے، اور ان کے پرزے بھی، لیکن اس پر اس کا اجارہ نہیں ہوگا۔ پہلے پانچ برسوں میں کمپنی کے منافعوں میں کوئی حد نہیں لگائی جائے گی، لیکن پانچ برس کے بعد حکومت کو اختیار رہوگا کہ کمپنی کو ریڈیو سٹوں کی لائسنس فیسوں کا جو حصّہ ملتا ہے، اس شرح میں کمی کی جاسکتی ہے۔ لائسنس کتنے ریڈیو اسٹیشن بناتا ہے اور وہ کتنے بڑے ہوتے ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں ہوگی، لیکن ان کے وقوع کے بارے میں حکومت کی منظوری لازمی ہوگی۔ حکومت، کمپنی سے مشورے کے بعد ویولنتھ الاٹ کریگی۔ پروگرام کتنے گھنٹے ہو اور اوقات کیا ہوں، یہ فیصلہ کرنے کی آزادی عام طور سے کمپنی کو ہوگی۔

یہ اطلاعات لوتھرا نے اپنی کتاب میں دینے کے بعد لکھا ہے [1]

---

[1] Indian Broadcasting : H.R. Luthra

The government reserved the right to inspect broadcasting stations, TAKE OVER or operate these or impose a complete censorship or close these down in times of emergency, impose complete or partial prohibition or pre-censorship either generally or specifically at any time, issue any special or general restrictions as regards matter which may or may not be broadcasted or as to the persons who may or may not broadcasted or as to the persons who may not broadcast, specify sources from news and information in the nature of news may be obtained and the time of broadcasting the same, terminate the licence at any time in the event of improper or inefficient use of broadcasting station, require a broadcasting station to broadcast free of cost to government weather reports, forecasts, government notices and communiques and educational propaganda or other government matter provided the time taken out of the ordinary programme did not exceed 10%.

جو اختیارات، مندرجہ بالا عبارت میں جلی حروف، یعنی کیپٹل حروف میں ہیں، وہ صوبائی حکومتیں بھی استعمال کر سکتی ہیں، جن میں ریڈیو اسٹیشن ہو۔ ریڈیو ریسیور کی فیس دس سے بڑھا کر بارہ روپے سالانہ کر دی گئی، اور اس میں سے دس روپے براڈکاسٹنگ کمپنی کا حصہ ہوگا۔

۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو یہ کمیونکے جاری ہوا، اور اسی روز انڈین اسٹیٹس اینڈ ایسٹرن ایجنسیز کے ایف ای روشر F.E. Rosher نے صنعت اور محنت کے محکمے کو لکھا کہ اعلیٰ درجے کی براڈکاسٹنگ کا معیار قائم رکھنے کے لئے صرف ریڈیو ریسیور سے حاصل ہونے والی

لائسنس فیس کی آمدنی، کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوگی، اور شروع کے تین چار برسوں میں کچھ اور مالی وسائل کی ضرورت ہوگی۔ کارگذار ڈائرکٹر وائرس، آر پی رٹیان نے کلکتہ اسٹیشن کے سالانہ اخراجات کا جو تخمینہ لگایا، وہ خاصا دلچسپ ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈیو پروگراموں کی ثقافتی اور فنی اہمیت یا قدر و قیمت کا کوئی اندازہ حکومت کو نہیں تھا، جس نے براڈکاسٹنگ محکمۂ صنعت و محنت کے سپرد رکھا تھا، اور چونکہ ریڈیو سیٹوں کی لائسنس فیس محکمۂ تار و ڈاک کے ڈاکخانوں کو وصول کرنا تھی، اور ٹرانسمیٹروں کا تعلق وائرس مواصلات سے تھا، اس لئے ڈائرکٹر وائرس کا شمار "ماہرین" میں ہونا تھا، جس نے کلکتہ اسٹیشن کے سالانہ اخراجات کا یہ تخمینہ لگایا:

۱۔ ڈیڑھ کیلو واٹ کے اسٹیشن، جس کی قیمت ایک لاکھ روپے، اور دائرہ ۳۲ کیلومیٹر ہو، سرمایہ پر ساڑھے سات فیصدی سود	۷,۵۰۰ روپے
۲۔ مندرجہ بالا پر ڈپری سی ایشن پانچ فیصدی سالانہ	۵,۰۰۰ " "
۳۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کی سالانہ تنخواہ	۱۲,۰۰۰ " "
۴۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر اور اناؤنسر کی سالانہ تنخواہ	۶,۰۰۰ " "
۵۔ انجنیئر کی سالانہ تنخواہ	۹,۰۰۰ " "
۶۔ اسسٹنٹ انجینیئر کی سالانہ تنخواہ	۱,۲۰۰ " "
۷۔ اکاؤنٹنٹ کی سالانہ تنخواہ	۱,۵۰۰ " "
۸۔ دفتر کے عملے کی سالانہ تنخواہ	۲,۴۰۰ " "
۹۔ عمارت کا کرایہ (سالانہ)	۱,۲۰۰ " "
۱۰۔ بجلی اور دیکھ ریکھ کے سالانہ اخراجات	۴,۶۰۰ " "
۱۱۔ سو روپے روز کے حساب سے، پروگراموں کی تیاری پر سالانہ اخراجات	۳۶,۵۰۰ " "
میزان	۸۶,۹۰۰ روپے

گویا سو روپے کے اضافہ کرنے کے بعد اسٹیشن کا کل خرچ ستاسی ہزار روپے سالانہ ٹھہرا۔ تخمینہ میں پروگراموں کی تیاری کے لئے ساڑھے اکتالیس فیصدی سے بھی کم رقم رکھی گئی۔ سو روپے روز میں میوزک آرٹسٹوں کی فیس، سازندوں کی فیس، ڈرامہ نگار

اور ڈرامہ آرٹسٹوں کی فیسیں، مقرروں کی فیسیں، شہر کے باہر سے آنے والے آرٹسٹوں کی فیسیں، پارٹیوں کی فیسیں سب شامل ہیں۔ پروگرام افسروں کی کوئی مد نہیں ہے۔ کسی افسر کے کہیں آنے جانے کے لئے بھی کوئی مد نہیں ہے۔ سرکاری تخمینوں میں ایک مد کمیشن جنسی کی ضرور رکھی جاتی ہے۔ ڈائرکٹر وائرس نے وہ بھی نہیں رکھی۔ آمدنی کی مدوں میں دس روپے ہر ریڈیو سیٹ کی لائسنس فیس سے کمپنی کو ملنا تھے، اور اس وقت کلکتہ اسٹیشن کے دائرۂ عمل میں کل آٹھ سو پچاس ریڈیو لائسنس والے سٹ تھے۔ یعنی آٹھ ہزار پانچ سو روپے براڈکاسٹنگ لائسنسی کا حصہ بنا۔ آمدنی کے تخمینے میں اشتہارات سے پچاس روپے روز کی آمدنی رکھی گئی، اور امید کی گئی کہ جب کمپنی براڈکاسٹ شروع کرے گی تو براڈکاسٹ ریسیور لائسنسوں کی تعداد آٹھ گنا کو بڑھے گی ہی، یعنی چھ ہزار آٹھ سو ہو جائے گی۔ گویا کمپنی کو چھیاسی ہزار لائسنس سے اور سوا اٹھارہ ہزار اشتہارات سے ملیں گے، گویا آمدنی ہوگی ایک لاکھ چار ہزار دو سو پچاس۔ اس میں سے سالانہ خرچ اڑسٹھ ہزار نو سو وضع کرنے کے بعد منافع ہوتا ہے سترہ ہزار تین سو پچاس روپے۔ ٹرانسمیٹر کی قیمت چونکہ ایک لاکھ روپے طے کی گئی، اس لئے سترہ عشاریہ تین پانچ فیصدی سالانہ منافع کمپنی کو ہوگا۔ یہ تجزیہ لوتھرا کی کتاب انڈین براڈکاسٹنگ کے تیسرے باب میں دی گئی سرکاری اطلاعات اور اعداد و شمار کی بنیاد پر ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ کارگذار ڈائرکٹر آف وائرس کے تخمینے کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں تھا، ورنہ انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی اتنی جلد دیوالیہ اور ناکام نہ ہوتی ابھی انڈین براڈکاسٹنگ کے قیام تک اور مرحلے بھی ہیں۔

۲۲ اپریل کو حکومت نے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی درخواستوں کی آخری تاریخ ۳۱ اگست ۱۹۲۵ء تک بڑھا دی۔ کتنی درخواستیں اس تاریخ تک آئیں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ کچھ زیادہ حوصلہ افزا جواب نہیں آئے ہوں گے، کیونکہ ۵ نومبر کو ایک اور کمیونکے جاری کیا گیا، اور درخواستوں کے وصول کرنے کی آخری تاریخ ۷ دسمبر تک بڑھا دی گئی۔ سرکاری ریکارڈ سے لوتھرا کو یہ معلوم ہوا کہ ۹ نومبر کو ایف ای روشر نے درخواست بھیجی لیکن پہلی دسمبر کو انھوں نے صنعت اور محنت کے محکمے کو لکھا کہ ان کی درخواست کو منسوخ سمجھا جائے کیونکہ وہ انڈین ریڈیو ٹیلی گراف کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں، اور کمپنی نے اسٹیشن چلانے کے لئے درخواست دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کمپنی کی واحد قابل غور درخواست تھی،

جو اس نے ۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو دی تھی. لیکن صنعت اور محنت کے محکمے کا ناطق فیصلہ تھا کہ انڈین ریڈیو ٹیلی گراف لمیٹڈ، بمبئی کو براڈ کاسٹنگ کا لائسنس نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس کی سرگرمیاں براڈ کاسٹنگ تک محدود نہیں رہیں گی. براڈ کاسٹنگ کے لئے اُسے ایک الگ کمپنی بنانا پڑے گی. یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ریڈیو ریسیور سٹ کی سالانہ لائسنس فیس ۱۲ روپے طے ہوئی تھی، جس میں سے ۱۰ روپے براڈ کاسٹنگ کمپنی کو ملنا تھے. انڈین ریڈیو ٹیلی گراف کمپنی نے تجویز پیش کی کہ لائسنس فیس ۱۲ روپے سے گھٹا کر ۱۰ روپے کر دی جائے، جس میں ۸ روپے کمپنی کو ملیں. حکومت نے یہ تجویز منظور کر لی. لوتھرا کو تمام سرکاری ریکارڈ مہیا تھے، اور وہ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے لئے کتاب لکھ رہے تھے، لیکن انھوں نے انڈین کمپنیز ایکٹ کے تحت انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے رجسٹر ہونے کی تاریخ نہیں لکھی ہے. ۳۱ مارچ سے[1] پہلے کمپنی رجسٹر ہوئی. ڈائرکٹر جنرل، ڈاک و تار میں ڈائرکٹر آف وائرس، بلحاظِ عہدہ، اس کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا رکن ہوا. ۱۳ ستمبر ۱۹۲۶ء کو ایک روپے کے اسٹامپ پیپر پر انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی اور حکومت کے درمیان معاہدے پر دستخط ہوئے. صنعت اور محنت کے سکریٹری، اے سی میک وائرس، سی آئی ای، آئی سی ایس نے گورنر جنرل ان کونسل کی جانب سے نہیں، بلکہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے "منجانب" دستخط کئے.[2]

انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے تحت پہلے بمبئی اور اس کے بعد کلکتہ کے ریڈیو اسٹیشن سے نشریات شروع ہوئیں. بمبئی کا اسٹیشن پہلی بار ۲۳ر جولائی ۱۹۲۷ء کو وائسرائے لارڈ اروِن کی افتتاحی تقریر پر چھ بجے شام کو ہوا کی لہروں پر لایا. افتتاحی پیغام میں وائسرائے اروِن نے جو کچھ کہا تھا، اس کا تعلق ریڈیو کے رول سے ہے، اور وہ یہ ہے:[3]

---

[1] ۱۹۲۶ء.

[2] انڈین براڈ کاسٹنگ میں ایچ آر لوتھرا نے صرف سکریٹری فار اسٹیٹ لکھا ہے (ص ۲۸)

[3] ایضاً، ص ۳۲-۳۳.

India offers special opportunities for the development of broadcasting. Its distances and wide spaces alone make it a promising field. In India's remote villages there are many who after the day's work is done, find time hang heavily enough upon their hands, and there must be many officials and others whose duties carry them into out of the way places, where they crave for the company of their friends and the solace of human companionship. These are of course, too, in many households, those whose social custom debars from taking part in recreation outside their own homes. To all these and many more, broadcasting will be a blessing and boon of real value. Both for entertainment and for education, its possibilities are great, and yet we perhaps scarcely realise how great they are. Broadcasting in India is today in its infancy, but I have little doubt that, before many years are past, the number of its audience will have increased tenfold, and that this new application of science will have its devotees in every part of India.

آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشہور (وظیفہ یاب) اسٹیشن ڈائرکٹر کے ڈی دکشت نے اپنے ایک مضمون[له] میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لوکھڑا کی طرح دکشت بھی آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر رہ چکے تھے۔

[له] Akashvani July 24-30, 1977 (Article Bombay Calling)

It was a simple but impressive ceremony, held in the Radio House, Apollo Bunder, which marked the inauguration of the Station of the Indian Broadcasting Company Limited, a private enterprise. One of the sponsors of this enterprise, Sir Ibrahim Rahimtoola, had very rightly prophesied in his speech on the occasion that the Bombay Station "is the first in the chain of stations" which he hoped would one day cover the whole of India.

سر ابراہیم، انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں رسمی باتوں کے علاوہ ایک بہت اہم بات زبان کے سلسلے میں کہی تھی[1]

One of the greatest difficulties in our way is that of language. We have to cater for population speaking various languages and having multitude of tastes and we realise that our task will need imagination, first-hand knowledge and hard work.

ہندوستان کثیر اللسانی ملک ہے، اور زبانوں کے علاقے ایسے متعین نہیں ہیں کہ ایک علاقے میں صرف ایک ہی زبان بولنے والے ہوں۔ سر ابراہیم نے جس مسئلے کا ذکر کیا ہے، اس کا احساس ڈائرکٹر آف وائرس، آر، ایل نکلسن کو ۱۹۲۳ء میں تھا، حالانکہ سول سرونٹ کی حیثیت سے اس کا تعلق صرف انتظامی اور کاغذی کارروائی سے تھا۔ براڈ کاسٹنگ سے اس کا صرف یہ تعلق تھا کہ ٹرانسمیٹر بے تار برقی، یعنی وائرس استعمال کرتے ہیں۔ ایک فائل جب ان کی میز پر پہنچی تو انھوں نے اس پر لکھا کہ کوئی ایک بڑی کمپنی براڈ کاسٹنگ کی ذمہ داری لینے کو تیار ہو، اس کے امکانات کم ہیں۔ مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی کمپنیاں یہ کام سنبھالیں، اس کے امکانات زیادہ ہیں۔ اور پھر انھوں نے ایک ایسی بات لکھی جو

---

[1] انڈین براڈ کاسٹنگ، ص ۴۳-۴۴۔

ان کے فرائض میں یقیناً شامل نہیں تھی۔[1]

The Language Question is very Troublesome

لوتھرا نے اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ بمبئی سے کن کن زبانوں میں پروگرام ہوتے تھے۔ انگریزی اور مغربی موسیقی کے علاوہ ہندوستانی، مراٹھی اور گجراتی میں پروگرام ہوتے تھے۔ کے ڈی دکشت نے اپنے مضمون "بامبے کالنگ"[2] میں فروری ۱۹۳۵ء کے بعد شارٹ ویو ٹرانسمیٹر کے بعد مراٹھی، گجراتی، ہندی، اردو، اور انگریزی زبانوں کے پروگراموں کا ذکر کیا ہے، جن میں کنٹر اور کونکنی کے پروگراموں کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۹ء تک ہندوستانی "سکشن اسٹیشنوں پر تھے، اور خبریں بھی ہندوستانی میں ہوتی تھیں، ہندی یا اردو میں نہیں۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کا دوسرا اسٹیشن کلکتہ میں شروع ہوا۔ بنگال کے گورنر، سر اسٹینلے جیکسن نے اس کا افتتاح ۲۶ اگست کو کیا۔

انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی بمبئی اور کلکتہ کے دو اسٹیشن پورے تین برس بھی نہ چلا کی اگرچہ اس کو ہر براڈکاسٹ ریسور کی دس روپے لائسنس فیس میں سے آٹھ روپے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مالی مدد اس طرح ملتی تھی کہ باہر سے آنے والے وائرس ریسیونگ آلات کی جو قیمت انوائس پر ہوتی تھی، اس کا دس فیصدی انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کو ملتا تھا۔[3] لیکن کمپنی پورے تین برس بھی یہ دو اسٹیشن نہ چلا سکی۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں اس نے سرکار سے مالی امداد کی درخواست کی تھی حکومت نے اسے منظور نہیں کیا، اور پہلی مارچ کو کمپنی نے خود کو دیوالیہ قرار دیا۔[4]

عام طور سے انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کی سرگرمیوں کا خاکہ بھی پیش کیا جاتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کمپنی میں دو لاکھ چونسٹھ ہزار روپے کے حصے راجہ صاحب

---

[1] انڈین براڈکاسٹنگ، ص ۶۔

[2] آکاش وانی (جولائی ۲۴-۳۰، ۱۹۷۷)، ص: ۲۵۔

[3] جی سی اوستھی، براڈکاسٹنگ ان انڈیا، ص: ۵۔

[4] آکاش وانی (انگریزی) ۲۴-۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء، ص ۵۵، ۵۶ ایضاً۔

دھن راج گرجی نرسنگھیر جی کے تھے، اور دو لاکھ تر سٹھ ہزار روپے کے حصے انڈین ٹیلی گراف کمپنی کے تھے، اور اس کمپنی میں دو تہائی سرمایہ مارکونی کمپنی کا تھا۔ اور مارکونی کمپنی ہی سے ٹرانسمیٹر خریدے گئے تھے۔

ہندوستان میں ریڈیو کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں ایچ آر لوتھرا کی کتاب انڈین براڈ کاسٹنگ ہی کو آفیشل تاریخ کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے نہ صرف پہلے کی مطبوعات کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا، بلکہ انھیں سرکاری ریکارڈ بھی دکھائے گئے۔ ایک بات ایسی ہے، کہ اگرچہ اس کا تعلق برطانوی دورِ حکومت سے ہے، لیکن اس کے نتائج سے حکومتِ وقت کو پریشانی ہو سکتی تھی، اس لیے انھوں نے براہِ راست Quotes دینے کے بجائے ذرا مبہم انداز میں بات بیان کی ہے۔ لیکن جو سرکاری نوٹنگز کے طریقے سے واقف ہو، وہ اس بات تک پہنچ سکتا ہے، جو ایسی زبان میں چھپائی جاتی ہے جسے Offic Lalese کہتے ہیں۔ لوتھرا نے بھی یہ اسلوب اور پیرایۂ بیان کہیں کہیں استعمال کیا ہے، حقیقت سات پردوں میں چھپائی جائے، کہیں بیان میں تضادات سے جھانکتی ہے، اور کہیں بین السطور میں صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو کی تاریخ کا یہ ایک بہت اہم پہلو ہے، اس لیے اس پر توجہ دینا ضروری ہے۔

حقیقت کو سمجھنے کے لیے، چند برس پہلے کے کچھ ورق الٹنا پڑیں گے۔ ۱۹۲۴ء میں بی بی سی کے ڈائرکٹر جنرل جے سی ڈبلو ریتھ نے لندن میں انڈیا آفس کو براڈ کاسٹنگ کے امکانات، اور اس کے ایک نہایت موثر ابلاغِ عامہ کا ذریعہ ہونے کی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن بات انڈیا آفس کے پلے نہیں پڑی۔ اگلے برس انھوں نے وائسرائے کو لکھا، اور یہی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ اس خط پر ضابطے کی کارروائی ڈائرکٹر وائرس، اور محکمہ صنعت و محنت نے کی، کہ وائرس کے معاملات یہ محکمہ دیکھتا تھا۔ براڈ کاسٹنگ کے Soft-ware اور اس کی نزاکتوں کو سمجھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ یہ صرف براڈ کاسٹنگ کے Hard-ware پہلو والے لوگ تھے۔ پروگراموں کے جھنجھٹوں میں پڑنا انھیں خواہ مخواہ کا بکھیڑا نظر آیا۔ ریڈیو پروگراموں سے مواصلات کے نظام میں کوئی بہتری ممکن نہ تھی، اور نہ ان سے ان صنعتوں کو فروغ مل سکتا تھا، جن سے برطانوی صنعت کاروں کو فائدہ ہوتا۔ چنانچہ اس محدود نظریے کی وجہ سے ڈائرکٹر جنرل برٹش براڈ کاسٹنگ کے خط کا گرم جوشی سے سواگت نہیں ہوا۔

رہتے، لندن ہی ہندوستان میں براڈکاسٹنگ کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ حکومت ہند کی سرد مہری کے رویے سے وہ بددل ہو گئے، اور انھوں نے ہندوستان میں براڈکاسٹنگ کے قیام میں کسی رول کا خیال اپنے دماغ سے نکال دیا[1] بعد میں وائسرائے لارڈ ولنگڈن کو اس میڈیم کی اہمیت کا احساس ہوا، اور ہند سرکار کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ ریڈیو پروگرام صرف وقت، بے وقت کی راگنی نہیں۔ تقریروں ہی سے نہیں، گیتوں سے بھی "پیغام" سننے والوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی، اعلیٰ عہدوں کے لیے افسر بی بی سی لائی تھی، بمبئی کے اسٹیشن ڈائرکٹر L.B. Page تھے، اور کلکتہ کے C.C. Wallick۔ ٹکنکل اور انتظامی امور کے لیے بھی عملہ بی بی سی آیا تھا۔ لیکن انھوں نے ۱۹۲۸ء میں تنخواہوں اور الاؤنسوں میں اضافے کے لیے نوٹس دیا، اور وہ سب لندن واپس بھجوا دیئے گئے۔ ظاہر ہے باہر کا سنیئر یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایتھر کی لہروں پر جو کچھ جا رہا ہے، وہ کیا ہے، اور اس سے کیا ترسیل ہو رہی ہے۔ پھر دیسی ریاستوں میں بھی ریڈیو اسٹیشن قائم ہونے کے امکانات تھے، اور وہاں کے ریڈیو پر گورنر جنرل کی حکومت کا کوئی کنٹرول ممکن نہیں تھا۔ درپردہ، بہت سے دیسی حکمرانوں کی ہمدردیاں مہاتما گاندھی اور ان کی سیاسی جماعت سے تھیں۔ ساہتیہ پریشد اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسوں میں، جن میں گاندھی جی نے اندور میں شرکت کی، ان کی صدارت مہاراجہ اودے پور راج نے بھی کی۔ پھر ریڈیائی لہروں کو سرحدوں میں محدود نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دیسی ریاست کے اسٹیشن سے نشر ہونے والے پروگرام پڑوس کے برطانوی ہند کے علاقوں میں بھی سنے جا سکتے تھے۔ یہ اندیشہ ہائے دور و دراز نہیں تھے۔ فوری پریشانی کی وجہ ملک کی سیاسی صورت حال تھی۔ ایک بے چینی عیاں بھی تھی، اور اس سے زیادہ نہاں تھی۔ بنگال کی راجدھانی کلکتہ میں ریڈیو اسٹیشن تھا۔ اور بنگال دہشت پسندوں کی تحریک کا مرکز تھا۔ سوشلزم اور مارکسزم کی آوازیں بھی وہاں سے اٹھ رہی تھیں۔ مزدوروں کی ٹریڈ یونین تنظیمیں بن چکی تھیں۔

---

[1] لوتھرا: انڈین براڈکاسٹنگ، ص ۳، اور اوستھی: براڈکاسٹنگ ان انڈیا، ص ۲۔

جواہرلال نہرو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں؛ له

I was by no means a pioneer in the socialist field in India. Indeed I was rather backward and I had advanced painfully, step by step, where many others had gone ahead blazing a trail. The worker's trade union movement was, ideologically, definitely socialist, and so were the majority of the Youth Leagues. A vague confused socialism was already part of the atmosphere of India when I returned from Europe in December 1927, and even earlier than that there were many individual socialists. Mostly they thought along utopian lines, but Marxian was influencing them increasingly, and a few considered themselves as hundred percent Marxists. ... Such importance as I possessed as a socialist worker lay in the fact that I happened to be a prominent Congressman holding important Congress offices. There were many other well-known Congressmen who were beginning to think likewise. This was most marked in the U.P. Provinical Committee, and in this Committee we even tried, as early as 1926, to draw up a mild socialist programme. We are a zamindari and taluqadari province,

---

له 1988 : An Autobiography : Jawaharlal Nehru ص ۱۸۲–۱۸۳

and the first question we had to face was that of the land. We declared that the existing land system must go and that there should be no intermediaries between the State and the cultivator. We had to proceed cautiously, as we were moving in an atmosphere which was, till then, unused to such idea.

سب لوگ اگر جواہرلال نہرو کی طرح ہوتے، جو پھونک پھونک کر قدم رکھتے، تو شاید مرکزی سرکار کو پریشانی نہیں ہوتی۔ نئے خیالات کی وجہ سے لوگوں نے نئے نظام کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے، اور ظاہر ہے انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹوں سے حکومت کو ان سب باتوں کی اطلاع تھی، اور وہ حالات کی نزاکت سے واقف تھے۔ ان نزاکتوں کا احساس اس وقت نہیں تھا، جب انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کو لائسنس دیا گیا، لیکن جیسے جیسے اسٹیشنوں کے افتتاح کی تاریخیں قریب آنے لگیں، ڈاک اور تار کے ڈائرکٹر جنرل کو مستقبل کے مسائل کا شدید احساس ہونے لگا۔

لوتھرا، انڈین براڈ کاسٹنگ میں ص ۴۶ پر لکھتے ہیں کہ انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کو لائسنس دے دینے کے بعد بھی حکومت اس طرف سے فکرمند رہی کہ اقتصادی طور سے یہ پروجکٹ ناکام تو نہیں ہو جائے گا۔ ڈائرکٹر جنرل ڈاک و تار کے ذہن میں یہ خیال تھا، اور شاید محنت و صنعت کے محکمے کا بھی ایسا خیال ہو کہ حکومت خود براڈ کاسٹنگ کی ذمہ داری سنبھال لے۔ لوتھرا نے سرکاری فائلیں دیکھی ہیں، لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کوئی عبارت نقل نہیں کی ہے۔ براڈ کاسٹنگ کمپنی کے بارے میں سرکار اتنی فکرمند ہو، یہ بات قرینِ قیاس نہیں۔ ایسا ہوتا تو کئی طریقے سبسڈی دینے کے تھے۔ اور نہیں، تو سرکاری نوٹس براڈ کاسٹ کرنے کی اجرت کے طور پر معاوضہ کی رقم دی جا سکتی تھی۔ بنیادی بات یہ تھی کہ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ اس میڈیم کے ذریعے سے "غلط خیالات" رعایا کے دماغوں میں پرورش پائیں۔ انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے بمبئی اور کلکتہ اسٹیشنوں سے براڈ کاسٹ ۲۳ جولائی اور ۲۶ اگست ۱۹۲۷ء کو (بالترتیب) شروع ہوئے، اور حکومت کی نیت کا اندازہ ۱۳ مئی ۱۹۲۷ء کے اس نوٹ سے ہوتا ہے،

جو ڈاک اور تار کے ڈائرکٹر جنرل نے تیار کیا تھا، اور جس میں اس بات پر زور رکھا کہ "اس وقت اگر حکومت براڈکاسٹنگ اپنے ہاتھوں میں لے لے، تو کمپنی سے سودا آسانی سے، اور کم خرچ میں طے ہو سکتا ہے، کیونکہ مستقبل میں براڈکاسٹنگ مالی طور پر منفعت بخش ہوگی، پر ابھی مسئلے کے مرحلے میں ہے۔ آئندہ برسوں میں براڈکاسٹنگ کامیاب بھی ہو سکتی ہے، اور معاہدے کے تحت چند برسوں میں زیادہ منافع ہونے لگا۔[لہ] تضاد تو یہیں واضح ہے کہ ایک طرف حکومت کو براڈکاسٹنگ کمپنی کے مالی بحران کی فکر ہے، دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ چند برسوں بعد، جب منافع زیادہ ہونے لگے گا، تو "سودا" مہنگا ہو جائے گا۔ ۱۳ مئی کے نوٹ کا ذکر کرنے کے بعد لوتھرا لکھتے ہیں:

In a despatch of April 28, 1927 on Radio Broadcasting in India, he added that it had been stated that it would probably be necessary for the government to take an active part in the development of broadcasting and he would submit that the matter should be investigated at a very early date.

لوتھرا کو یہ خیال نہیں رہا کہ پہلا نوٹ ۱۳ مئی کا تھا۔ ۲۸ اپریل کا نوٹ اس میں اضافہ نہیں کر سکتا! ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ۸ اگست کو شملہ میں ہونا قرار پائی، جس میں محکمۂ داخلہ، تجارت اور مالیات، قانون سازی کے محکمے، محکمۂ خارجہ اور سیاسی محکمہ کے نمائندوں کو بلایا گیا۔ ڈائرکٹر آف وائرس نے دس صفحوں کا ایک نوٹ پس منظر کے طور پر سب محکموں کو بھیجا۔ اس میں اور کیا باتیں تھیں، اس کے بارے میں لوتھرا نے خاموشی اختیار کی ہے، البتہ یہ حصہ نقل کیا ہے:

If broadcasting fails to take hold of the country now, the possibility of utilizing it for government purposes will be lost or at any rate

---

[لہ] لوتھرا، انڈین براڈکاسٹنگ ص ۴۶-۴۷۔

deferred indefinitely.

اسی نوٹ میں یہ معنی خیز جملے بھی ہیں:

Broadcasting is a very sensitive thing and it is doubtful if it would ever obtain the confidence of the people of India if entirely worked by government. The government could allow the present broadcasting scheme to carry on, and erect special stations of their own for educational and other government purposes, but apart from the expenditure involved the public will not listen to programmes entirely composed of instructional matter. It is essential to provide them with entertainment as well and that is hardly a matter for government to undertake.

جن لوگوں کی تربیت آلات کی فراہمی اور ان کو نصب کرنے کے لیے ہو، وہ پروگراموں کے بارے میں اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتے تھے؟ براڈکاسٹنگ اور سرکاری مقاصد کی بات پہلی بار کی گئی، اور یہ مقاصد صرف تعلیم تک محدود نہیں تھے۔ واضح طور سے ریچھ کا یا کسی اور کا خط ہوگا، جس سے یہ خیال پیدا ہوا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ کاغذات ڈائرکٹر آف وائرس کو دکھائے گئے ہوں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اسے خلاصہ بنا کر، بریف کیا گیا ہو۔

۸ راگست کو شملہ میں میٹنگ ہوئی تو اس میں کیا طے ہوا، اس کے کاغذات شاید لوتھرا کو نہیں دکھائے گئے۔ جن لوگوں کو نازک معاملات میں حکومت کے طریقۂ کار کا اندازہ ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو بی بی سی سے آئے ہوئے عملے کا زیادہ تنخواہوں کا مطالبہ کرنا، اور استعفیٰ دے کر واپس چلا جانا علت سے خالی نہیں کلکتہ

اسٹیشن کے پروگرام مشاورتی بورڈ کے شریک صدروں، مسٹر جسٹس کوسٹیلو اور سر اونکار مل جاٹیہ کا پہلی اکتوبر کو مستعفی ہونا کچھ غیر متعلق باتیں نہیں۔ بی بی سی کے عملے کا جانا اور ان دو حضرات کا علاحدہ ہو جانا، مرکزی سرکار کے اشارے کے بغیر ہوا ہو، یہ باور کرنا مشکل ہے۔

صنعت اور محنت کے محکمے نے ان حقائق اور حالات پر غور کیا[1] اور وائسرائے کے علم میں بھی یہ باتیں لائی گئیں۔ انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کو خط لکھا گیا، جس میں یہ دریافت کیا گیا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن چلا سکتی ہے؟ ۲۷ دسمبر کو سر ابراہیم رحمت اللہ (کمپنی کے چیئرمین) نے صنعت اور محنت کے ممبر سر بھوپندر ناتھ متر کو لکھا کہ سرکار کی مالی امداد کے بغیر براڈکاسٹنگ جاری رکھنا کمپنی کے لئے ممکن نہیں[1]

۱۲ مارچ ۱۹۲۹ء کو بالآخر کمپنی نے ڈائرکٹر آف وائرس کو لکھ دیا کہ کمپنی میں اب زیادہ گھاٹا اٹھانے کی سکت نہیں ہے، اس لئے اگر حکومت چاہے، تو لاگت کے داموں پر کمپنی کا اثاثہ لے لے، اور براڈکاسٹنگ کی ذمہ داری جلد سے جلد سنبھال لے۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ براڈکاسٹنگ کمپنی ہی کرے، تو نقصان کی کفالت، گرانٹ کی صورت میں کرے۔ سالانہ گھاٹا دو لاکھ روپے ہے۔ کمپنی نے ریڈیو سٹوں کی سالانہ لائسنس فیس دس روپے کی جگہ، بارہ روپے کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

مختلف سطحوں پر میٹنگیں ہوتیں، لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا، یہاں تک کہ کمپنی کو اور زیادہ نقصان اٹھانے کا بوتا نہ رہا، اور اس نے پہلی مارچ ۱۹۳۰ء کو رضاکارانہ طور سے دیوالیہ ہونے کا اظہار کر لیا۔ فیڈرل اسمبلی میں خاص سیاسی پارٹیوں نے صنعت و محنت کے ممبر پر زور ڈالا کہ براڈکاسٹنگ سروس کا سلسلہ ٹوٹے بغیر جاری رہنا چاہیے، اور اگر ضروری ہو تو حکومت براڈکاسٹنگ کی ذمہ داری سنبھال لے۔ طے یہ ہوا کہ حکومت تین لاکھ روپے میں سارا اثاثہ خرید لے گی، اور یہ کہ کمپنی مارچ کے مہینے میں سروس جاری رکھے گی، جس کے لئے اسے تیس ہزار روپے اور دیئے جائیں گے۔ پہلی اپریل ۱۹۳۰ء سے حکومت نے دونوں اسٹیشنوں کا اثاثہ اپنی تحویل میں لے لیا۔

---

[1] ایضاً: ص ۱۵۔

عملے کو بھی انھیں شرائط کے ساتھ لے لیا اور بمبئی اسٹیشن کا چارج پوسٹ ماسٹر جنرل، بمبئی نے اور کلکتہ اسٹیشن کا چارج، پوسٹ ماسٹر جنرل بنگال نے سنبھالا۔ اب یہ دو اسٹیشن انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کے تھے۔ سرکار کے لئے دو برس تک یہ تجرباتی سروس تھی۔ ۱۹۳۲ء میں فیصلہ کیا گیا کہ سرکار کے انتظام میں سروس باقی رہے گی[1] اس طرح نہ صرف تجرباتی اور عبوری دور ختم ہوا، بلکہ چونکہ مستقل طور سے اسے چلانا تھا، اس لئے اس کے بارے میں گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کیا گیا۔ پہلی جنوری ۱۹۳۴ء سے انڈین وائرلیس ٹیلی گرافک ایکٹ نافذ ہوا۔ اس وقت قانون یہ تھا کہ لائسنس کے بغیر کوئی ریڈیو نہیں سن سکتا۔ ریڈیو سٹ لائسنس کے بغیر رکھنا جرم نہیں تھا، سننا جرم تھا لیکن نئے ایکٹ کے تحت لائسنس کے بغیر ریڈیو سٹ رکھنا بھی جرم قرار پایا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ ہوا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ریڈیو لائسنس ۱۰،۸۷۲ تھے، لیکن ۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ان کی تعداد ۱۶،۱۷۹ تھی[2] دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۱۲۹ کے تحت براڈ کاسٹنگ کی آئینی پوزیشن یہ ہوئی:

(1) The Federal government shall not unreasonably refuse to entrust to the Government of any Province of the Ruler of any Federated State such functions with respect to broadcasting as may be necessary to enable that Government or Ruler

(a) to construct or use transmitters in the Province or State

(b) to regulate, and impose fees in respect of the construction and use of transmitters and use of

---

[1] آکاش بھارتی رپورٹ، حصہ دو، ۶۷۱۔

[2] آکاش وانی (انگریزی)، جولائی ۲۴-۳۰، ۱۹۷۷ء، ص ۵۵۔

receiving apparatus in the Province of State:

Provided that nothing in this sub-section shall be construed as requiring the Federal Government to entrust to any such Government or Ruler any control over the use of transmitters constructed or maintained by the Federal Government or by persons authorised by the Federal Government, or over the use of receiving apparatus by persons so authorised.

(2) Any functions so entrusted to a Government or Ruler shall be excercised subject to such conditions as may be imposed by the Federal Government, including, notwithstanding any thing in this act, any conditions with respect to finance, but it shall not be lawful for the Federal Government so to impose any conditions regulating the matter broadcast by, or by authority of, the Government or Ruler.

(3) Nothing in this section shall be construed as restricting the powers conferred on the Governor-General by this Act for the prevention of any grave menace to the peace and tranquility of India, or as prohibiting the imposition on Governments or Rulers of such conditions regulating matter broadcast as appear to be necessary to enable the Governor-General to discharge his functions in so far as he is by or under this Act required in the

exercise thereof to act in his discretion or to exercise his individual judgement.

۱۹۳۵ء کے اس ایکٹ سے نہ صرف براڈ کاسٹنگ کی آئینی حیثیت طے ہوگئی، بلکہ یہ بات بھی یقینی ہوگئی کہ اس ملک میں براڈ کاسٹنگ ایک مستقل میڈیم کے طور پر آگئی ہے۔ صوبائی حکومتوں اور دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی اپنے علاقوں میں براڈ کاسٹنگ اسٹیشن قائم کرنے کا حق ملا۔ مختلف صوبوں میں اسٹیشن قائم تھے، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ دیسی ریاستوں میں، سب سے پہلے اسٹیشن نظام نے حیدرآباد میں قائم کیا، جس سے ۳ فروری ۱۹۳۵ء سے براڈ کاسٹ شروع کی گئی اسے کچھ عرصہ بعد ایک اور اسٹیشن اورنگ آباد میں قائم کیا گیا۔ ۱۰ ستمبر کو اسی سال میسور میں ریڈیو اسٹیشن نے براڈ کاسٹ شروع کیے۔ اس کا نام "آکاش وانی" رکھا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں رابندر ناتھ ٹیگور نے آل انڈیا ریڈیو کے لئے جو خاص نظم لکھی، اس کا عنوان بھی "آکاش وانی" تھا۔ پہلی اپریل ۱۹۵۰ء کو جب آل انڈیا ریڈیو نے حیدرآباد، اورنگ آباد، میسور، اور ٹریونکور کے اسٹیشن اپنے نٹ ورک میں شامل کرلئے تو "آکاش وانی" نام بھی اس کے حصے میں آیا۔ آل انڈیا ریڈیو کا تار کا پتہ Air Voice تھا۔ یہ Akashvani. کیا گیا۔ بعد میں ہوم سروس کا متبادل نام ہندی میں آکاش وانی کر دیا گیا۔ پہلی مئی کو بڑودہ اسٹیشن کی نیو رکھی گئی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۴۸ء کو یہ بھی آل انڈیا ریڈیو میں شامل کیا گیا۔ گوا پرتگال کی نوآبادی تھا۔ ۱۹۴۶ء میں پرتگالیوں نے پنجم میں پانچ کیلوواٹ کا میڈیم ویو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۶۲ء سے یہ آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہوا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا شاید ضروری ہے کہ انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے بند ہونے کے بعد انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس وجود میں آئی تھی۔ فیلڈن کو یہ نام پسند نہیں تھا۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو نام رکھنا چاہا۔ انھوں نے ہندوستان کے نقشے پر اے آئی آر کا مونوگرام بھی بنایا تھا۔ اور اسے آئی آر کے مخفف نام کو وہ کسی بھی صورت میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن اوپر کی افسر شاہی کو یہ تجویز پسند نہیں تھی یہ کہانی

۱؎ آکاش وانی بھارتی رپورٹ، حصہ دو، ص ۷۱۔۷۰ (A-6)

خود فیلڈن کی زبانی ' ان کی خود نوشت سے ملہ

I had managed to change the name of the organisation, and this trivial event pleased me. I had never liked the title ISBS (Indian State Broadcasting Service) which to me seemed not only unwieldy but also tainted with officialdom. After a good deal of cogitation-which may seem ridiculous now, but these apparently simple and obvious things do not always appear easily- I had concluded that All India Radio would give me not only protection from the clauses which I most feared in the 1935 Act, but would also have suitable initialsAIR. I worked out a monogram which placed these letters over the map of India, and it is now about the only thing which remains of me in India. But when I mooted this point, I found that there was immense opposition in the Secretariat to any such change. They wanted ISBS and they thought it fine. I realized that I must employ a little unnatural tact. I cornered Lord Linlithgow after a Viceregal banquet, and said plaintively that I was in a great difficulty and needed his advice. (He usually responded well to such an opening). I said I was sure that he agreed with me that ISBS was a clumsy title. After a slight pause,

---

ملہ The Natural Bent : Lionel Fielden — P.192-93

he nodded his long head wisely. Yes, it was rather a mouthful. I said that perhaps it was pity to use the word broadcasting at all, since all Indians had to say 'broadcasting'- Broad was for them an unpronounceable word. But I could*NOT*.I said, think of another title; could he help me? 'Indian State; I said, was a term which, as he well knew, hardly fitted into the 1935 Act. It should be something general. He rose beautifully to the bait. 'All India?' I expressed my astonishment and admiration. The very thing. But surely not 'broadcasting'? After some thought he suggested, 'radio?' Splendid, I said and what beautiful initials.

چنانچہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کا دن ایک تاریخی دن ہے اس تاریخ سے انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس کا نام آل انڈیا ریڈیو ہوگیا[1] لیکن دلی اسٹیشن نے پورے پانچ مہینے پہلے، یعنی ۱۹۳۶ء کے پہلے دن ایتھر کی لہروں پر پروگرام نشر کرنا شروع کئے۔ یہ بیس کیلو واٹ کا میڈیم ویو ٹرانسمیٹر تھا[2] اور اسی روز پروگرام جرنل "آواز" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ یہ ذولسانی تھا، اردو اور ہندی میں[3]۔ ۶ اپریل کو دہرہ دون اسٹیشن نے براڈکاسٹ شروع کئے[4]۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ پہلی اپریل کو پشاور اسٹیشن کی ذمہ داری آل انڈیا ریڈیو نے سنبھال لی۔ لاہور کے شوقیہ اسٹیشن کے بارے میں کچھ تفصیل دی جا چکی ہے۔ پہلی ستمبر کو وائی ایم سی اے کے اسٹیشن نے پروگرام

---

[1] آکاش وانی: جولائی ۲۴-۳۰ ۱۹۷۷ء؛ ص: ۵۶۔
[2] ایضاً، ص ۵۵۔
[3] ایضاً (انگریزی)۔
[4] ایضاً۔

نشر کرنا بند کئے، اور ۱۶ دسمبر کو آل انڈیا ریڈیو کے پانچ کیلو واٹ کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر نے نشریات شروع کیں۔ اور اسی تاریخ کو پہلا شارٹ ویو ٹرانسمیٹر، جس کی طاقت دس کیلو واٹ تھی، دلّی کی نشریات کے لئے مہیا ہوا۔ ۱۹۳۸ء بھی آل انڈیا ریڈیو کی توسیع کے سلسلے میں اہم سال ہے۔ ۴ فروری کو بمبئی سے بھی دس کیلو واٹ کے شارٹ ویو ٹرانسمیٹر سے براڈ کاسٹ شروع ہوئے۔ ۲ راپریل کو لکھنؤ سے پانچ کیلو واٹ کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر پر براڈ کاسٹ کا آغاز ہوا۔ (دس مئی کو دہرہ دون براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن کا اسٹیشن مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔) پہلی جون کو دوسرا شارٹ ویو ٹرانسمیٹر دلّی کو ملا۔ اس کی طاقت پانچ کیلو واٹ تھی۔ ۱۶ رجون کو مدراس میں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن کا افتتاح ہوا، دو ٹرانسمیٹروں سے۔ چوتھائی کیلو واٹ کا میڈیم ویو اور دس کیلو واٹ کا شارٹ ویو[1] اور اسی کے ساتھ مدراس کارپوریشن کی براڈ کاسٹنگ سروس کا اختتام ہوا۔

پروگرام جرنل "آواز" ہندی اور اردو میں، ذولسانی تھا۔ پہلی جولائی کو دونوں زبانوں کے جریدے الگ الگ ہو گئے۔ اردو کے جریدے کا نام "آواز" ہی رہا، لیکن ہندی کے جریدے کا نام "سارنگ" رکھا گیا۔

بارہواں دس کیلو واٹ کا شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ۱۶ راگست کو کلکتہ اسٹیشن کو ملا، اور نشریات کا دائرہ وسیع ہوا۔

۱۶ رجنوری ۱۹۳۹ء کو ایک نئی جہت براڈ کاسٹنگ کو ملی۔ یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹروں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ بعد کو دلّی اسٹیشن بمبئی کے پروگرام ریلے کرتا تھا اور سیچر کو دلّی کے پروگرام بمبئی ریلے کرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے تیاری تھی، آنے والے جنگ کے زمانے میں۔ بی بی سی کے ریلے کے لئے۔ فیلڈن نے باقاعدہ براڈ کاسٹنگ کی بڑی مستحکم بنیاد ہندوستان میں رکھی تھی۔ دفتر شاہی اور افسر شاہی براڈ کاسٹنگ اور اس کی ضروریات اور اس کی اہمیت کے سلسلے میں ناخواندہ تھی، لیکن قدم قدم پر فیلڈن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں۔ لیکن وہ اس ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر جاتے تھے۔

---

[1] ایضاً: ص ۵۶۔

حیرت تو یہ ہے کہ لندن میں انڈیا آفس ہی نہیں، بی بی سی بھی اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکے۔ اگست رستمبر میں فیلڈن علاج کے لئے ولایت میں تھے۔ واپس آنے سے پہلے اُن کے خیالات کیا تھے؎

> I started a grand quarrel with the BBC and India Office. I was convinced that the Germans would start a short-wave service to India, and that, since my own medium-wave transmitters could not compete with it, a similar service must be started by the BBC. This was complicated engineering matter, which arose chiefly from the fact that, in the absence of any manufacture of cheap medium-wave sets in India, all sets were geared to short as well as medium wave... But neither the BBC nor the India Office would have any thing to do with it... I was summoned to the India Office, and stated my views to an assembly of old gentlemen who had never listened to any radio. They said, with some spleen that they would cable to the Government of India. I retorted that the Government of India was illiterate about broadcasting: and in due course that Government sent a cable to say that Fielden was, as usual, being an alarmist.

فیلڈن کا اندازہ درست تھا۔ ہم پھر براڈکاسٹنگ کی توسیع کی طرف واپس آتے ہیں۔

؎ لائنل فیلڈن: دی نیچرل بنٹ، ص: ۲۰۸، ۲۰۹۔

۱۹۳۹ء ہی میں پہلی مارچ کو پشاور اسٹیشن، ریلے سینٹر بن گیا۔ ۱۶ مئی کو ترچناپلی سے پانچ کیلو واٹ کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر پر براڈکاسٹ شروع ہوئے۔ اسی روز ٹروچی اسٹیشن بھی شروع ہوا۔ ستمبر میں دلّی سے مختلف زبانوں میں خبروں کے بلیٹن شروع ہوئے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پہلی اکتوبر سے معمول کے انگریزی، ہندستانی اور بنگالی خبروں کے بلیٹنوں کے علاوہ تامل، تلگو، گجراتی، مراٹھی اور پشتو میں بھی (کل ۲۷) بلیٹن روزانہ نشر ہونے لگے۔ ۴ دسمبر کو دلّی سے فارسی میں خبریں بھی ہونے لگیں۔ ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔

۲۴ دسمبر بھی براڈکاسٹنگ کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے۔ ابھی تک آل انڈیا ریڈیو کے معاملات صنعت اور محنت کا محکمہ دیکھتا تھا۔ اس روز انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ کا محکمہ وجود میں آیا۔

پہلی دسمبر ۱۹۴۷ء جموں میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ آئینی طور سے یہ ریاست جموں وکشمیر کی وزارتِ اطلاعات ونشریات کے تحت تھی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو پٹنہ اسٹیشن سے براڈکاسٹ شروع ہوئے۔ اس کے دو روز بعد ۲۸ جنوری کو کٹک اسٹیشن قائم ہوا۔ پہلی جولائی کو گوہاٹی اور ۱۶ جولائی کو ناگپور اسٹیشن پروگرام لے کر ہوا کے دوش پر آئے۔ ۱۲ اکتوبر کو وجے واڑہ اسٹیشن سے پروگرام نشر ہونا شروع ہوئے۔ ۲۱ اکتوبر کو ریڈیو کشمیر کا سرینگر اسٹیشن میڈیم ویو پر شروع ہوا۔ ۱۶ دسمبر کو آل انڈیا ریڈیو نے بڑودہ اسٹیشن کو اپنی تحویل میں لیا۔ ۱۹۴۹ء میں بھی کئی اسٹیشن کھلے۔ پہلی فروری کو الہ آباد اسٹیشن (میڈیم ویو) ۴ مارچ کو حیدرآباد اسٹیشن (میڈیم ویو) ۱۶ مئی کو جالندھر اسٹیشن (میڈیم ویو) ۱۹۵۰ء میں ۸ جنوری کو دھارواڑ اسٹیشن (میڈیم ویو) کھلا۔ پہلی اپریل کو آل انڈیا ریڈیو نے چار ریاستی اسٹیشنوں کو اپنی تحویل میں لیا۔ ٹری وینڈرم (میڈیم ویو) میسور (میڈیم اور شارٹ ویو) حیدرآباد دکن (میڈیم ویو) اور اورنگ آباد (میڈیم ویو)۔ ۱۴ مئی کو کوزھی کوڈ (میڈیم ویو) اسٹیشن شروع ہوا۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو پونہ (میڈیم ویو) اسٹیشن کھلا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو آل انڈیا ریڈیو نے ریڈیو کشمیر سرینگر اور ۱۶ دسمبر کو ریڈیو کشمیر جموّں کو اپنی تحویل میں لے لیا، لیکن ان کے نام ریڈیو کشمیر ہی رہے۔ ۱۹۵۵ء میں نٹ ورک میں جو اضافے ہوئے

وہ یہ ہیں: ۴ جنوری کو راج کوٹ (میڈیم ویو) اسٹیشن۔ ۹ اپریل کو جے پور (میڈیم ویو) ۲۲ مئی کو اندور (میڈیم ویو) ۱۶ جون کو شملہ (شارٹ) ۲ نومبر کو بنگلور (میڈیم ویو) اسٹیشن کھلا، اور اس نے میسور کے اسٹیشن کی جگہ لی۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بھوپال (شارٹ ویو) اسٹیشن ہوا پر آیا۔ ۹ اپریل ۱۹۵۷ء کو چندی گڑھ میں اسٹوڈیو قائم ہوا جہاں پروگرام ریکارڈ کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ ۷ جولائی کو رانچی (شارٹ ویو) اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔ ۳ اکتوبر، آل انڈیا ریڈیو کی تاریخ میں ایک بہت ہی اہم دن ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت براڈ کاسٹنگ کو "خواص" کے لئے محدود کیا جا رہا تھا، اور مقبول سنگیت اور دوسرے پروگراموں کو "عامیانہ" بتا کر، ریڈیو سے رفتہ رفتہ خارج کیا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ ریڈیو سیلون کے وہ پروگرام سارے ملک میں مقبول ہو گئے جو بمبئی ہی میں تیار کئے جاتے تھے۔ سامعین کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے متبادل پروگرام کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور آل انڈیا ریڈیو کا پنج رنگی پروگرام "وودھ بھارتی" شروع کیا گیا۔ پہلے یہ پروگرام بمبئی اور مدراس سے شارٹ ویو پر ہوتا تھا۔ اب ریکارڈ کئے ہوئے پروگرام ان اسٹیشنوں کو بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں وودھ بھارتی کے مرکز ہیں، اور یہ تقریباً ہر اسٹیشن کے ساتھ ہیں۔ کمرشل سروس بھی وودھ بھارتی پر ہی شروع ہوئی، اور ریڈیو سیلون ہی کی وضع پر۔

۳۱ جنوری ۱۹۶۰ء کو دلی اسٹیشن کو طاقتور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر، سو کیلو واٹ کا، پروگراموں کے لئے ملا۔ ۲۲ فروری کو ایک پروگرام "اردو مجلس" شروع ہوا۔ جو سارے ملک کے لئے ایک طرح سے قومی پروگرام تھا۔ سارے ملک میں لوگ اردو پروگرام کے لئے ترستے تھے، اس کے باوجود پست معیار اور غیر دلچسپ ہونے کی وجہ سے یہ سنا نہیں گیا نتیجہ یہ ہوا کہ طاقتور ٹرانسمٹر سے ہٹا کر، اسے کمزور ٹرانسمیٹر پر پھینک دیا گیا، اور شارٹ ویو سے بھی ہٹا لیا گیا۔ یہ پروگرام اس نیت سے شروع کیا گیا تھا کہ ملک کے مختلف علاقائی اسٹیشنوں سے اردو پروگراموں کا مطالبہ کرنے والوں کا منہ بند کیا جا سکے۔ تفصیل بعد میں آئے گی۔

۱۹۶۳ء میں تین نئے اسٹیشن کھلے۔ جنوری میں کوہما میں، جون میں پورٹ بلیر میں، اور اگست میں امپھال میں۔

''اردو مجلس'' کا تجربہ ناکام ہونے کے بعد، ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو اکسٹرنل سروسز سے روزانہ آدھے گھنٹے کی اردو سروس شروع کی گئی۔ بعد میں یہی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس بنی۔

نومبر میں دلّی کو اکسٹرنل سروسز کے لئے دو طاقتور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر اور ملے۔ کالی کٹ، جودھپور اور احمدآباد اسٹیشنوں کو وودھ بھارتی پروگراموں کے لئے ٹرانسمیٹر ملے۔ کالی کٹ اور جودھپور کو (۱۵ اگست) کو اور احمدآباد کو ۲ اکتوبر کو۔

۱۹۶۶ء میں نیٹ ورک میں یہ اضافے ہوئے۔ ۶ مارچ کو پاسی گھاٹ اسٹیشن کھلا۔ شیلانگ میں آگزیلری مرکز کھلا۔ ٹریونڈرم کو ایک میڈیم ویو ٹرانسمیٹر، وودھ بھارتی سروس کے لئے ملا۔

اکسٹرنل سروسز سے پچھلے سال ۲۴ اکتوبر کو جو آدھے گھنٹے کی اردو سروس پاکستان کے لئے شروع ہوئی تھی، وہ مئی میں نو گھنٹے روزانہ کی سروس کر دی گئی، اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کہلائی۔

اسی سال متھرا اور اےجل (ایجوال) مزورم میں اسٹیشن کھلے۔

۱۹۶۷ء کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے کمرشل سروس شروع کی۔ اسی سال پونڈی چیری میں بھی اسٹیشن کھلا۔

۱۹۶۸ء: ۱۰ فروری کو پربھنی میں آگزیلری مرکز کے لئے ٹرانسمیٹر لگا۔

۱۹۶۹ء کی سب سے اہم بات یہ ہے دلّی کو یووانی کے لئے ایک الگ چینل ملی۔ اپنی جگہ یہ نوجوانوں کا اسٹیشن ہے۔ عام طور سے نوجوانوں کے لئے ریڈیو پروگراموں میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ننھے منّے بچوں کے لئے، اور چودہ سال کے بچوں کے لئے بھی پروگرام تھے۔ سب سے پہلے تجربے کے طور پر سرینگر اسٹیشن نے ۱۹۵۵ء نوجوانوں کے لئے پروگرام شروع کئے تھے۔ دلّی کی یووانی سروس کے بعد نوجوانوں کے پروگراموں کے لئے راستہ کھل گیا۔

۲۲ ستمبر کو سپر پاور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کلکتہ میں لگا۔ جس سے پڑوسی ملکوں میں سامعین کے لئے اکسٹرنل سروسز ڈویژن کے پروگرام ریلے ہونے لگے۔

۱۹۷۰ء اگست میں کلکتہ سے یووانی سروس شروع ہوئی۔ ۲۰ دسمبر کو حیدرآباد

سے بھی یہ سروس شروع ہوئی۔

۱۹۷۱ء: لیہہ لداخ میں (۲۱ جون کو) ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ اسی سال زیادہ طاقت کا میڈیم ویو ٹرانسمیٹر شملہ کو ملا۔ جودھ پور، الپی اور امپھال کو بھی ایسے ہی طاقتور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر ملے۔

ایکسٹرنل سروسز کے پروگراموں کے لئے ایک سپر پاور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر راج کوٹ کو، اور دو زیادہ طاقتور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر علیگڈھ میں نصب ہوئے۔

پناجی (گوا) کو ودودھ بھارتی مرکز کے لئے ایک اور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر ملا۔

۱۹۷۲ء: سلچر میں ۱۱ راگست کو ریڈیو اسٹیشن نے براڈکاسٹ شروع کئے۔

۲ راکتوبر کو گورکھپور اسٹیشن کے ہائی پاور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر سے پروگرام نشر ہونا شروع ہوئے۔ ۱۴ راکتوبر کو کوہیما میں ہائی پاور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر لگا۔ دہلی، تروننلویلی اور اودے پور کے پانچ کیلوواٹ والے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر، دس کیلو والے ٹرانسمیٹروں سے بدلے گئے۔

۱۹۷۴ء: ستمبر میں توانگ اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔

نومبر میں میسور میں ٹرانسمیٹر، اس کے اپنے پروگراموں کے لئے لگا۔

سرینگر سے الگ الگ ٹرانسمیٹر پر یووانی سروس شروع ہوئی۔

۱۹۷۶ء: ۲ فروری کو دربھنگہ میں ریڈیو اسٹیشن نے کام کرنا شروع کیا۔

۸ مئی کو روہتک اسٹیشن سے نشریات شروع ہوئیں۔

پہلی اگست چھترپور میں اسٹیشن نے براڈکاسٹ شروع کئے۔

۱۹ ستمبر کو اورنگ آباد اسٹیشن ہوا پر آیا۔

۱۱ ردسمبر کو منگلور اسٹیشن سے پروگرام شروع ہوئے۔

۲۶ ردسمبر کو اجیکاپور اسٹیشن کھلا۔

۲۱ رجنوری ۱۹۷۷ء کو جگدلپور اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔

جولائی ۱۹۷۷ء Frequency Modulation یعنی FM براڈکاسٹنگ تجربے کے طور پر مدراس اسٹیشن سے شروع کی گئی۔

۲ راکتوبر ۱۹۷۷ء کو ریوا میں آکاش وانی کا اسٹیشن شروع ہوا۔

۷ر اپریل ۱۹۷۹ء کو ایف ایم ٹرانسمشن، آکاش وانی کلکتہ سے تجربے کے طور پر شروع ہوا۔

۲۱ر ستمبر ۱۹۷۹ء کو بمبئی اسٹیشن سے ایف ایم ٹرانسمشن تجربے کے طور پر شروع ہوا۔

۲ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو گنٹاک میں ریڈیو اسٹیشن کھلا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۸۲ء کو میگھالیہ میں آکاش وانی تورا نے ایک کیلو واٹ کے ٹرانسمیٹر سے پروگرام براڈکاسٹ کرنا شروع کئے۔

Poona
Dec 11, 1987

My dear Kamal

I have your letter of 4/12. I remember you clearly and have a soft-corner for you! You can write Truth as you see it and use my name if a context demands such a reference:-

You have undertaken an interesting problem and with your rich background of knowledge and experience you will achieve your objective.

I will try to recollect some points you need but my note would be short. I am not in a good shape healthwise, but I will attempt it. I will need some time.

Blessings, Sincerely
K. P. Bhatt

دوردرشن

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ اس روز تجربے کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کے ٹیلی ویژن مرکز کا افتتاح صدر جمہوریہ نے کیا۔ ٹرانسمیٹر اور آلات عطیے کے طور پر فلپس انڈیا لمٹیڈ نے دیئے تھے[۱] یہ وہی آلات تھے، جو اس کمپنی نے دلّی کی صنعتی نمائش میں کلوز ڈسٹرکٹ ٹیلی ویژن کے ڈمانسٹریشن کے لیے اپنے اسٹال میں لگائے تھے۔

تجارتی مفادات کس طرح براہ راست یا بالواسطہ تعلیم اور کلچر میں دلچسپی لیتے ہیں، یہ ریڈیو کے قیام کے سلسلے میں مارکونی کمپنی کی سرگرمیوں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ پشاور اسٹیشن کے لیے اس نے ٹرانسیٹر دیا تھا، اور انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی میں بھی اس کے حصے تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دلّی کے تجرباتی ٹیلی ویژن مرکز کے لیے فلپس کمپنی نے ٹرانسیٹر تحفے کے طور پر دیا۔ شروع ہی سے صنعت اور تجارت کے حلقوں کے مفادات ٹیلی ویژن کے قیام میں تھے، اور آج جب رنگین ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں بہت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے، اور اس کا اثر اتنا بڑھ گیا ہے کہ ریڈیو گہنا گیا ہے، اور فلم کی صنعت بھی بڑی حد تک ٹیلی ویژن کے تناور برگد کے سایے میں اپنی نشو ونما میں پہلی سی توانائی نہیں پاتی، تو ہم دیکھتے ہیں کہ سارے قابلِ ذکر پروگرام کسی نہ کسی صنعتی گھرانے کی اسپانسرشپ کی وجہ سے ممکن ہیں۔ پروگراموں اور ان کے وقت

---

[۱] جی سی چٹرجی۔ براڈکاسٹنگ ان انڈیا ص ۱۵۔

پر ان صنعتی گھرانوں کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے۔ صرف خبروں اور سیاسی پروگراموں پر حکومت کی سیاسی اجارہ داری ہے۔

۱۹۵۹ء میں جب دلّی میں پہلا تجرباتی ٹیلی ویژن سینٹر قائم ہوا، تو اس کے تین بنیادی مقصد تھے۔ ۱۔ تجربہ ۲۔ تربیت، اور ۳۔ جائزہ۔ ہفتے میں ایک ایک گھنٹے کے صرف دو دو پروگرام ہوتے تھے۔ منگل اور جمعہ کو۔ لے ٹیلی ویژن وقت کی مانگ تھی، اور اس سے صنعت اور تجارت کے طاقتور حلقوں کے مفادات بھی جڑے ہوئے تھے۔ خود حکومت اور حکمراں جماعت اس میڈیم کے ذریعے سے عوام تک اپنی شبیہ بہتر بنانے کے امکانات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اتاولی تھی۔ چنانچہ مالی وسائل فراہم کرنے کے لیے پہلے تو نومبر ۱۹۶۷ء میں آل انڈیا ریڈیو کی کمرشل سروس شروع کی گئی، پھر مئی ۱۹۷۰ء میں اسپانسرڈ پروگرام بھی شروع کر دیئے گئے۔

۲ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی آل انڈیا ریڈیو کا ٹیلی ویژن سینٹر شروع ہوا۔

۲۶ر جنوری ۱۹۷۳ء کو سرینگر (کشمیر) میں ٹی وی سینٹر کھلا۔

۲۹ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو امرتسر ٹی وی سینٹر سے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ یہ پروگرام دلّی میں تیار ہوتے تھے، اور ان کی فلمیں یا ویڈیو ٹیپ ریکارڈنگ امرتسر بھیجی جاتی تھیں۔

۲ر اکتوبر ۱۹۷۳ء پونہ میں ٹی وی ریلے سینٹر نے کام کرنا شروع کیا۔

پہلی اگست ۱۹۷۵ء، ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے۔ اس دن SITE یعنی Satellite, Instructional Television, Experiment کا افتتاح ہوا، اور اس کی وجہ سے ٹی وی ریلے کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ٹی وی سینٹر بھی کھلنے لگے، اور ٹیلی ویژن نٹ ورک پھیلنے کے ساتھ اسے ریڈیو سے الگ، آزاد حیثیت دینے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

۸ر ۱۹۷۵ء کو کلکتہ میں ٹی وی اسٹیشن کھلا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو مدراس میں ٹی وی اسٹیشن کھلا۔

لے جی سی چٹرجی۔ براڈ کاسٹنگ ان انڈیا ص۱۵۱

۲۷ ر نومبر ۱۹۷۵ء کو لکھنؤ میں ٹی ڈی اسٹیشن کھلا۔

۱۹۷۶ء ہندوستان میں ٹیلی ویژن کے لیے ایک اہم سال ہے۔ نئے سال کے پہلے دن ٹی وی کمرشل سروس شروع ہوئی، اور آج وہ اتنی پھیل گئی ہے کہ اس نے ٹیلی ویژن کا کردار بدل دیا ہے۔ اسی سال پہلی اپریل سے، یعنی نئے مالی سال کے پہلے دن آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن، دو الگ ڈائرکٹوریٹ جنرل میں تقسیم ہو گئے۔ پہلے ٹی وی کا ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کا ماتحت افسر ہوتا تھا، اور اس کا دفتر آکاش وانی بھون میں ہوتا تھا۔ اب ڈائرکٹر جنرل دوردرشن کا دفتر منڈی ہاؤس منتقل ہو گیا۔

۱۲ ر اگست ۱۹۷۷ء کو مسوری میں ٹی وی پروگرام ریلے کرنے کے لیے ٹرانسمیٹر نے کام کرنا شروع کیا۔

۱۲ ر جنوری ۱۹۷۹ء کو کانپور میں ٹی وی پروگرام ریلے کرنے کے لیے ٹرانسمیٹر کی سہولت مہیا ہوئی۔

۱۳ ر اپریل ۱۹۷۹ء کو جالندھر سینٹر سے ٹیلی کاسٹ شروع ہوئے۔

۱۷ ر نومبر ۱۹۸۱ء کی ایک اور اہم تاریخ ہے۔ پرگتی میدان، دلّی کے اسٹوڈیو سے، جو نمائش کا ایک حصہ تھا، تجربے کے طور پر رنگین پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوئے۔[لے]

۵ ر اگست ۱۹۸۲ء سے باقاعدہ رنگین پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔ اسی تاریخ سے INSAT-I A نیشنل نٹ ورک پروگراموں کے ریلے کے لیے استعمال ہونے لگا، اور اسی تاریخ سے ناگپور سے بھی سروس شروع ہوئی۔

۵ ر اگست کو ان سیٹ ون اے کی، جو سہولت فراہم ہوئی تھی، انٹ ورک کو اس سے محروم ہونا پڑا، کیونکہ ان سیٹ ون اے لائق استعمال نہ رہا۔

۶ ر جولائی ۱۹۸۳ء کو حکومتِ ہند نے ٹیلی ویژن کی ترقی اور توسیع کے لیے ۶۸ کروڑ روپے کا ایک منصوبہ منظور کیا۔ یہ مالی سال ۸۵-۱۹۸۴ کے لیے تھا۔

۱۵ ر اگست ۱۹۸۳ء کو الہ آباد ٹی وی سینٹر کے ایک کیلو واٹ کا ٹرانسمیٹر کا

لے ایچ آر لوتھرا، انڈین براڈکاسٹنگ، ص ۴۹۹ تا ۵۰۵۔

افتتاح ہوا۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں INSAT-I B نے کام کرنا شروع کیا، اور اس کی چینلیں دور درشن کو پروگرام ریلے کرنے کے لیے فراہم ہوئیں۔

شروع میں جب ٹی وی تجرباتی دور میں تھا، تو اس کے پروگرام تعلیمی نوعیت کے تھے۔ لیکن بعد میں یہ مقصد پسِ پشت چلا گیا۔ ۵/اگست ۱۹۸۴ء سے ٹی وی ٹکنالوجی تعلیمی مقاصد کے لیے باقاعدگی سے کام میں لائی جانے لگی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے روزانہ، ایک ایک گھنٹے کے دو پروگرام اسپانسر کرنا شروع کیے۔

۱۷/دسمبر ۱۹۸۴ء کو ایک اور ٹرانسمیٹر دلّی دور درشن کو ملا، جس سے چینل بی کے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔

پہلی مئی ۱۹۸۵ء کو ایک اور چینل بمبئی دور درشن کو ملی۔

دوسرا باب

اردو کا ارتقا ترسیل کی زبان کی حیثیت سے

اشوک، چندر گپت موریا، ہرش اور کنشک کے علاوہ ایسی شخصیتیں قدیم تاریخ اور زمانۂ ماقبلِ تاریخ میں نہیں، جن کا اقتدار سارے جزیرہ نما پر ہو، وہ جزیرہ نما جو اپنی وسعت کی وجہ سے برِ عظیم اور برِ صغیر جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ رامائن اور مہابھارت سے پرتھی راج راسا[1] تک، یہ سرزمین چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ ہے۔ ایک ملک کا باقاعدہ تصور سب سے پہلے امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے۔ سندھ کی نسبت سے ملک کو عربوں نے ہند کہا، اور ہند کی نسبت سے ہندو، ہندوی اور ہندی لفظ بنے۔ ہندو سے مراد ہند کا باشندہ تھا۔ مذہب کے معنوں میں یہ بعد میں استعمال ہوا۔ جس وقت پہلے یہ لفظ استعمال ہوا، اس وقت ہندو مذہب نہیں تھا۔ دھرم تھا۔ اور دھرم کے معنی ہیں فرض۔ ایک غلط فہمی کچھ عالموں میں پائی جاتی ہے کہ ہندوی اور ہندی ہم معنی ہیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر امرت رائے کا بھی ہے[2] ہندوستان کی ہر زبان ہندوی تھی، چاہے وہ ہند آریائی ہو، پشاچی ہو، یا دراوڑی۔ بقول امیر خسرو[3]:

---

[1] حافظ محمود خاں شیرانی نے "پرتھی راج راسا" کو اندرونی شہادتوں کی بنا پر اکبر و جہانگیر کے عہد کی تصنیف بتایا ہے (انجمن ترقی اردو ایڈیشن)۔ اس میں اچار اور بندوق (آگ اُگلنے والی ایکھ) کے ذکر کے علاوہ بعد کے عہدوں کا بھی ذکر ہے۔

[2] امرت رائے: A house Divided

[3] امیر خسرو: نہ سپہر (مثنوی) (بمبئی ایڈیشن)

سندی و لاہوری و کشمیری وکبر　　دھوری سمندری، تلنگی و گجر
معبری وگوری و بنگالی وادد　　دہلی و پیرانش اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندویست زایام کہن　　عام بکارست بہ ہرگونہ سخن

امیر خسرو نے ہند آریائی بولیوں کی ماں، یعنی سنسکرت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسے دری سے مٹھاس میں بہتر لیکن عربی سے کم تر بتایا ہے؛

اَنست زبانے بصفت در دری[1]
از عربی کمتر و برتر ز دری
گرچہ شیرینست دریں و شکریں
ذوق عبارت کم ازاں نیست دریں

امیر خسرو نے "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں نہ صرف اپنے ہندوی کلام کا ذکر کیا ہے، بلکہ یہ ذکر بھی کیا ہے کہ انھوں نے مسعود سعد سلمان کے تین دیوان دیکھے تھے[2] ایک عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندوی کا لباب الالباب میں بھی اس کا ذکر ہے[3]۔ مسعود سعد سلمان کی ولادت ۱۰۴۶ء اور وفات ۱۱۲۱ء کی ہے۔ خسرو کا زمانہ ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء کا ہے۔ درمیان میں بابا فرید گنج شکر کا عہد ہے، ۱۱۷۳ء سے ۱۲۶۵ء کا۔ ان کا بھی ہندوی کلام ہے۔ شاید اس زمانے میں لاہوری اور ملتانی (سرائیکی) میں لائقِ امتیاز فرق نہیں تھا۔ سعد سلمان کا صرف فارسی دیوان باقی رہا، جو تہران سے بھی چھپا ہے۔ اس میں ایک مصرع بھی ہندوی کا نہیں ہے۔ ان کا ہندوی کلام امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ بابا فرید گنج شکر کا کلام جو سینہ بہ سینہ اس عہد تک پہنچا ہے، وہ کس حد تک الحاقی الفاظ سے محفوظ رہا، نہیں کہا جاسکتا۔

---

[1] سنسکرت زبان کی طرف اشارہ ہے؛ "نہ سپہر" ص ۱۸۱ (بمبئی ایڈیشن)

[2] امیر خسرو، غرۃ الکمال (مطبع قیصریہ، دلی ایڈیشن) ص ۶۶ "..... مسعود سعد سلمان را اگر ہست اما آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است ....."

[3] محمد عوفی، لباب الالباب، جلد دوم (مطبوعہ ۱۹۰۲، کیمبرج ایڈیشن) ص ۲۴۶ "..... او را سہ دیوان ست۔ یکے بتازی، ویکے بپارسی ویکے ہندوی ..."

یہی بات امیر خسرو کے ہندوی کلام کے لیے بھی درست ہے۔ یہاں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ خسرو نے سنسکرت کی تعریف تو کی ہے، لیکن اس کا شمار ہندوی میں نہیں کیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے مسعود سعد سلمان کے لاہوری (یعنی پنجابی یا سرائیکی) کے کلام کو ہندوی بتایا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ان تمام زبانوں کو ہندوی کے تحت رکھا ہے، جو گھروں، کوچوں اور بازاروں میں بولی جاتی تھیں۔

تغیر کی خاصیت وقت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ سماج کے ہر مادی اور غیر مادی شعبے میں بتدریج تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اور اکثر آنکھوں کے سامنے ہونے والی تبدیلیاں محسوس نہیں ہوتیں۔ یہ معمول کی اور معمولی تبدیلیاں، اور غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں مکانوں کی تعمیر کے طرز سے لیکر، لباس کی تراش خراش تک، نئی فصلوں سے لے کر نئے پکوانوں تک، نئی مصنوعات سے لے کر نئے معاشی رشتوں تک، حکومت کے نئے طریقوں سے لے کر زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت تک۔ سب باتیں شامل ہیں۔ یہ ارتقائی اور معمول کی تبدیلیاں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں کہ یہ بعد کی انقلابی تبدیلیوں کی وجہ ہوتی ہیں۔ امیر خسرو کا عہد (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) ہندوستان کے لسانیاتی منظر نامے میں اگر نوعی نہیں، تو بہت اہم تبدیلیوں کے عہد کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس منظر نامے کے منظر اور پیش منظر کو سمجھنے کے لیے پس منظر کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ آریا جب اس ملک میں آئے تھے، تو یہاں ایک بہت ترقی یافتہ مدنی تہذیب بہت عروج پر تھی۔ یہ سندھ وادی کی تہذیب ہے۔ موہنجو داڑو اور ہڑپا اسی کے باقیات اور آثار ہیں۔ آریاؤں نے اس تہذیب کو تہس نہس کر دیا، اور اگرچہ اس کے عناصر جذب کر لیے، لیکن وہ اپنی صورت میں دراوڑ تہذیب میں بھی باقی نہیں ہے۔ آریا حملہ آور سے زیادہ مہاجر تھے۔ وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، قرائن یہ ہیں کہ سولہ سو اور پندرہ سو برس قبلِ مسیح کے درمیان آریاؤں کے پہلے قافلے ہندوستان آئے۔ آریا اپنی زبان اور رگ وید کے ابتدائی حصے کے ساتھ ادبی روایات لے کر آئے تھے۔ سندھ وادی، دراوڑوں کی تہذیب تھی۔ جو دراوڑ آریاؤں میں ضم نہیں ہوئے،

وہ جنوب کی طرف ڈھکلتے ڈھکلتے اتھرو ندھیاچل کے جنوب میں چلے گئے۔ قدیم اور جدید ہندوستانی زبانوں کے بارے میں ٹی برو .T.Burrow نے ایک اہم مضمون لکھا تھا، جو مشہور تاریخ داں اے ایل باشم Basham کی کتاب کا ایک حصّہ ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور اس کا موضوع ہندوستان کی ثقافتی تاریخ ہے۔ برو کا مضمون پہلی جلد کا تیرھواں باب ہے۔ آریاؤں کی ادبی روایات کے بارے میں برو [1]

The literary tradition of India goes back more than 3,000 years, and during the greater part of this time it was dominated by Sanskrit, first in its Vedic, and later in its classical forms. The early Aryan invaders of India brought with them, along with other elements a developed culture, a language of great richness and precision, and a highly cultivated poetic tradition. (P 162)

آریا اپنے ساتھ رگ وید کی شروع کا حصہ لے کر آئے تھے۔ سام وید اور یجروید یہیں لکھے گئے۔ اتھروید بھی یہیں لکھا گیا۔ اگرچہ ویدکی حیثیت سے اسے ذرا بعد میں تسلیم کیا گیا۔ لیکن یہ دوسرا موضوع ہے۔ ویدوں کی تکمیل کے زمانے کے بارے میں برو کا خیال ہے [2]

...The compilation of later Vedas followed after no great interval, and the corpus of Vedic poetry, whose beginnings may be fixed

---

[1] A cultural History of India; Edited by A.L. Basham; (Clarendon Press, Oxford; 1975) Chapter XIII: Ancient and Modern Languages : T. Burrow.

[2] ایضاً (ٹی برو)

some where round 1300 BC, was probably complete in the main by about 1000 BC. (p.162)

ویدوں کی زبان، آریاؤں کے مذہبی فرائض ادا کرنے کی نہیں، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی زبان تھی۔ لیکن وہ زبان جو آریا تخت جمشید (ایران) کے علاقے سے لے کر آئے تھے، اس میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں ہوئیں۔ اس ملک میں آکر ان کا سابقہ شیو کی پرستش کرنے والوں اور گنگا کو پوتر سمجھنے والوں سے پڑا۔ ان میں بہت سے لوگ آریاؤں کے سماج میں شامل ہو گئے۔ ان کی زبان کے الفاظ بھی ویدی زبان میں شامل ہوئے۔ نئی آوازیں بھی آئیں۔ آریا اپنے ساتھ لائی ہوئی کچھ اصوات کو بھی بھولنے لگے۔ اسی کے ساتھ غیر آریاؤں کے ساتھ میل جول ہی نہیں، ازدواجی رشتوں کی وجہ سے بھی زبان پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ زبان پر ہی نہیں مذہبی عقائد پر بھی اثر پڑنا ضروری تھا۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر سیر حاصل کام نہیں ہوا ہے، خاص طور سے ہماری زبان میں، حالانکہ یہ موضوع ہماری زبان کے ارتقا سے جڑا ہوا ہے، کیونکہ اردو کا براہ راست رشتہ پالی اور شورسینی سے ہے، جو ویدی اور سنسکرت ہی کی پراکرتیں اور اپبھرنش ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں بعد میں۔ اس مقام پر مشہور تاریخ داں اے ایل باشم کے خیالات پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگی۔[1]

The great development in culture, religion and language which is evident in the later Vedic literature shows that a long period must have elasped between the time of the composition of the last hymns of the Rg Veda and the days of the Buddha-perhaps as

---

[1] The wonder that was India by A.L. Basham (Pre-history)

much as 500 years. It is therefoeprobable that the most of the Rg Veda was composed between 1500 and 1000 BC, though the composition of some of the most recent hymns and the collation of the whole collection may have taken place a century or two later.

When the hymns were written, the focus of Aryan culture was the region between the Yamuna and Satlaj (Sutudri), south of the modern Ambala and along the upper course of river Sarswati. The later river is now an insignificant stream, loosing itself in the desert of Rajasthan, but it then flowed broad and strong, and probably joined the Indus below the confluence of the Satlaj. The Vedic poets knew the Himalayas but not the land south of the Yamuna, and they did not mention the Vindhyas. (P.32)

To the east the Aryans had not expanded far beyond the yamuna and the Ganga is mentioned only in one late hymn (P.33)

آریاؤں کے لیے سب سے اہم علاقہ پنجاب کا تھا، اور اس کی سرحد وہ جگہ ہے، جہاں آج انبالہ ہے۔ اس علاقے کی زبان کو وہ سب سے زیادہ پاکیزہ سمجھتے تھے۔ شمال مغربی علاقے کی یہ زبان اودیچہ کہلائی۔[1]
موجودہ انبالہ سے لے کر موجودہ الٰہ آباد تک کا علاقہ مدھیہ دیش کہلایا۔[2]

---

[1] ایضاً اے ایل باشم
[2] ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۸۔

یہاں کی زبان بھی معیاری سمجھی گئی، لیکن اعلیٰ ترین معیار پنجاب میں انبالہ تک کی زبان ہی کا سمجھا گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مدھیہ دیشہ کے وسط میں متھرا کا علاقہ زبان کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ یہی سنسکرت پالی اور شورسینی کا علاقہ ہے۔

آریا اس ملک میں نہ صرف آگئے تھے، بلکہ انھوں نے نظم و نسق بھی قائم کرلیا تھا، لیکن پوری طرح سارا ملک ان کے بندوبست کے دائرے میں نہیں تھا۔ باشم نے اس کے بارے میں لکھا ہے ؎اله

At this time the Aryans had not wholly subjugated the indigenous *inhabitants*. Though many hymns refer to the battles between one Aryan tribe and another, there is, underlying this *inter-tribal rivalry*, a sense of solidarity against the Dasas and Dasyus, who evidently represent the survivors of the Harappa culture, and kindered peoples of the Punjab and the North-West. The Dasas are described as dark and ill-favoured, bull tipped, snub nosed, worshippers of phallus, and of hostile speech. They were rich in cattle, dwelt in fortified places, called PUR, of which the Aryan War-god Indiar a had destroyed hundreds. .....The Aryans were not uninfluenced by the earlier inhabitants. In classical Sanskrit the word Dasa regularly means 'Slave' or 'bonded man' and in later hymns of the Rg Veda, it was already acquiring that meaning, while the feminine form Dasi is used in the sense of 'slave-girl' through out the book;— but, though many of the

---

اله The wonder that was India by A.L. Basham (Pre-history)

vanquished Dasas must have been enslaved, some seem to have come to terms with the conquerors, and one Dasa chief as following Aryan ways and patronizing brahmans. One result of this contact of Aryan and non-Aryan is evident even in the earliest stratum of the Rg Veda, the language of which is appreciably effected by non-Indo-European influences. All Indian languages, from Vedic to the modern vernaculars, contain a series of sounds, the Retroflex or Cerebral Consonants, which can not be traced in any other Indo-European tongues, not even in old Iranian, which is closely akin to Sanskrit. These sounds must have developed quickly, from the efforts of non-Aryans to master the language of their conquerors. No doubt, the invaders often married indigenous women, whose children were bi-lingual, and after a few generations, the Aryan's original language showed the effect of the admixture of aboriginal blood. Numerous words in the R g Veda are not connected with any known Indo-European roots, and were evidently borrowed form the natives. (P. 33 & 34)

آریا اپنی زبان کی پاکیزگی کے معاملے میں بہت حسّاس تھے۔ ایران میں کم از کم اُن کی دو ٹکڑیاں آکر آباد ہوئی تھیں۔ ایک بے ستون اور تخت جمشید کے علاقے میں، اور دوسری باختر (شروان) کے علاقے میں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے وطن مالوف سے براہ راست آئے تھے۔ لیکن اس صدی کے شروع میں ایشیائے کوچک کے علاقے بمقام ہٹائٹ میں جو کھدائی ہوئی، اس سے یہ بات سامنے آئی کہ انھوں نے ایک عرصہ ہٹائٹ میں قیام کیا تھا، اور وہیں سے ایران آئے تھے۔ ہٹائٹ میں آریاؤں نے ایک بند سماج میں، خود کو ماحول کے لسانی اثرات سے محفوظ رکھا، اور ان کی زبان میں ارتقاء کا عمل اگر ہوا تو نہیں کے برابر۔ لیکن ایران میں آس پاس، یعنی ماحول کے لسانی اثرات انھوں نے قبول کیے۔

اس ملک میں، افغانستان ہوتے ہوئے آریا قافلے کئی لہروں میں آئے۔ گریرسن اور ہرنلے نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی آریاؤں کی زبانیں بنیادی طور پر ایک ہوتے ہوئے بھی قدرے مختلف ہیں۔ باختر کے علاقے سے آنے والے آریاؤں کی بولیوں کو پشاچی کہا گیا۔ گویا ویدک زبان، وقت اور مقام کے اعتبار سے تین گروہوں میں بٹی۔ کشمیری، پشتو اور مغربی پنجاب میں پشاچی بولیاں پھلی پھولیں۔ ان کے بنیادی الفاظ کا ذخیرہ وہی ہے۔ ایسٹرک اور دراوڑی اثرات سے ہند آریائی اور پشاچی بولیاں، مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے، اور مختلف صورتوں میں ارتقاء پزیر ہوئیں۔ مقامی لوگوں سے ازدواجی رشتے قائم ہوئے معکوسی آوازیں بھی دوسری پیڑھی میں، ذولسانی ہونے کی وجہ سے آئیں، اور ساتھ ساتھ غیر آریائی الفاظ بھی، جیسا کہ باشم کے پچھلے اقتباس میں بتایا گیا ہے۔ زبان کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے، چوتھی صدی قبلِ مسیح میں پانینی نے قواعد لکھی۔ ٹی برو کے الفاظ میں ؎۱

The next milestone in the history of Sanskrit is the Grammar of Panini, which describes in complete detail a form of the language

---

؎۱ Ancient and Modern Languages : T. Burrow (P.162)

younger that of Brahmanas, and based on the spoken usage of the educated Brahmans of the time. Panini's exact date is unknown, but the forth century BC may be given as a rough estimate.

قواعد سے بندھ جانے کے بعد سنسکرت ایک حالت میں منجمد ہوگئی۔ بولیوں میں ارتقاء کا عمل جاری رہا، اس لیے سنسکرت اور پراکرت بولیوں کے درمیان، وقت کے ساتھ ساتھ، فرق بڑھتا گیا۔[1]

The reason why Sanskrit as a language evolved no further after

Although the gap between Sanskrit and the ordinary spoken language grew progressively, this did not have an adverse effect on the use of Sanskrit, but rather its importance grew with time. For instance the language of administration in Mauryan times, as attested by the inscriptions of Ashoka,was Prakrit, and this continued for some centuries, but gradually Prakrit was replaced

Panini was not only his authority, but also the fact that by this time the Aryan Language had become divided into two, on the one hand Sanskrit, the language of learning, and in particular the language of Brahman caste and of its religion, and on the other hand Prakrit, the language of masses. (P.162)

---

[1] ایضاً۔

by Sanskrit untillfinally Sanskrit was almost exclusively used for this purpose. (p.163)

درمیانی ہند آریائی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ پانچ سو سال قبلِ مسیح سے ایک ہزار عیسوی تک کا ہے، اور اس کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا عہد شروع ہوتا ہے۔ زبان کے سلسلے میں دو ادوار کے درمیان کوئی واضح حدِ فاصل نہیں ہوتی۔ ارتقاء کا طریقہ ہی یہی ہے۔ کچھ خصوصیات بتدریج معدوم ہونے لگتی ہیں، اور نئی خصوصیات بتدریج اُبھرنے لگتی ہیں۔ ریڈیو کی اصطلاح میں اسے کراس فیڈ کہتے ہیں۔[1]

Middle Indo-Aryan is divided into three stages, and it covers a period ranging from 500 BC to AD 1000. The first stage is represented by Pali and the inscriptions of Ashoke and later rulers, and comprises the period shortly after Christian era. The term Prakrit, when used in the narrow sense, applies to the second stage. (p.165)

سنسکرت اور پراکرتوں (اور اپ بھرنشوں) کا مشترکہ ذخیرہ الفاظ تھا۔ تلفظ کے فرق کی وجہ سے مختلف صورتیں بکھری تھیں۔ سنسکرت میں لفظ اپنے اصلی یا قریب اصلی اچارن کے تھے۔ تت سم نے اپنا تلفظ برقرار رکھا جبکہ پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں تسہیل کے قدرتی عمل سے تلفظ نکھرتے رہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی یا ناقابلِ فہم نہیں تھے۔ پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں کچھ لفظ تت سم تلفظ والے بھی تھے۔ ادبی تخلیقات میں تت سم اور تدبھو کا مشرن بھی ہوتا تھا۔ خاص طور سے جہاں مکالمے ہوں۔

---

[1] ایضاً۔

مکالمے ڈرامے کی ساخت کے لیے بنیادی ہیں۔ ٹی بروتے ڈرامے کی اس اہم روایت کے بارے میں لکھا ہے:[1]

The drama is governed by an interesting convention, according to which kings, ministers and learned men speak Sanskrit, while men of lower status and women speak Prakrit, a practice reflecting, no doubt, the current usage of the time. Various Prakrit dialects are used in drama, according to the prescriptions of the grammarians. The language of the ordinary dialogue is Saurauseni, which would strictly be the dialect of the Mathura region, but which no doubt represents the language of wider area now known as Uttar Pradesh. The Maharashtri dialect, based on what now is the Maratha territory, is used for the lyrics that occur from time to time, in the drama, and outside the drama it was recognized medium for the composition of Prakrit poetry. The Magadhi dialect, by a partly artificial convention, is used for the speech of the lower characters in drama, and other minor dialects are supposed to be used for specific purposes....... The third and final stage of Middle Indo-Aryan is represented by what is known as Apabhramsa. This represents a stage of linguistic development roughly half way

---

[1] ایضاً۔

between Prakrit and the Modern Ind-Aryan languages, and its period is roughly AD 600-1000. The earliest specimen would be the Apabhramsa verses appearing in the fourth act of Kalidasa's Vikramorvasiya, but there is doubt as to their authencity. (p.165)

اپ بھرنش، جیسے جیسے پس منظر میں جاتے ہیں، پیش منظر میں جدید ہندوستانی زبانوں کے روپ ابھرتے ہیں۔ جانے والے اور آنے والے سنہ ایک ہزار عیسوی میں گلے ملتے ہیں۔ یہ تاریخ کا اتفاق ہے کہ اسی موڑ پر محمود غزنوی کا (۱۰۰۱ء میں) حملہ ہوتا ہے۔ ملتان، سندھ، پنجاب، دلی کے نواح اور میرٹھ تک اس کی حکومت پھیل جاتی ہے۔ لسانی تبدیلیاں اگر صرف ان علاقوں میں ہوتیں، تو فارسی (عربی اور ترکی) الفاظ کو ان کا سبب سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسا نہیں ہے، کیونکہ اپ بھرنشوں کا جدید ہند آریائی زبانوں کے مرحلے میں داخل ہونا، ایک ایسا عمل ہے، جو ہر علاقے میں کم و بیش ایک ہی رفتار سے ہوا۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے شاید ترک فارسی اثرات کی وجہ سے یہ عمل کچھ تیز ہو گیا ہو۔ پراکرتوں کی طرح اپ بھرنشوں کے بنیادی ذخیرے کے الفاظ کی جڑیں ایک ہی تھیں۔ لیکن تلفظ کے اختلاف کے باوجود ایک لسانی علاقے کے لوگ دوسرے علاقوں کے لوگوں کی بول چال سمجھتے تھے۔ تبدیلیوں کی رفتار زیادہ تیز ہونے سے زبانوں کی حد بندیاں بھی واضح ہوئیں۔ اس مرحلے کے بارے میں ٹی برو کا مشاہدہ، اور ان کے تاثرات خاصے دلچسپ ہیں۔[1]

---

[1] :

Ancient and Modern Languages by T. Burrow

(Chapter XIII in A Cultural History of India : Part I edited by A.L. Basham; Clarendon Press, Oxford : 1975.

The emergence of the modern Indo-Aryan languages dates from the period after AD 1000, when already the division of the regional languages was assuming the shape that is familiar today. (p. 166)

....The modern languages of the main block of Indo-Aryan developed very much on parallel lines, since there was no major geographical obstacles inhibiting mutual contact. Naturally the following languages emerged :

South-west	:	Gujrati and Marathi
West	:	Sindhi and Punjabi
Northwest	:	Kashmiri
North-east	:	Nepali
East	:	Assamese, Bengali and Oriya
Central	:	Hindi; Western and Eastern, with which we may enumerate Rajasthani to the west, and Behari to the east.

....Apart from the Muslim influence the development of the modern Indo-Aryan languages followed the same lines.

The early literature was predominantly religious and almost exclusively poetic. In form and subject matter it was based on Sanskrit models. An important new feature in the modern languages, as opposed to the earlier Middle Indo-Aryan, was the introduction on an exclusive scale, of Sanskrit loan words. In

Prakrit, even at the Apabhramsa stage, words might in fact be derived from Sanskrit, but they always appeared disguised as Prakrit by the operation of phonetic rules. At the stage of Modern Indo-Aryan this practice was no longer feasible and the Sanskrit words had to be introduced as such. Another consideration was the poverty of the vernacular languages, due to the continued use of Sanskrit at the expense of spoken languages down to a late date. (p. 166)

ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو کے وجود میں آنے، اور اس کے ارتقاء کے
بارے میں لکھا ہے کہ ؎

Formation and Development. The socio-political history of India during the last 1000 years has played a great role in the formation and development of Urdu. After 1206, drastic changes took place in the social, cultural and linguistic structures of the country. These changes served to develop a composite culture and gave birth to a new language. Since this language was given patronage by the ruling elites, it soon began to be used by a large number of the people and gradually became the lingua franca of the regions. In course of time, it travelled from the North, the nucleus of Muslim power, to the west from where it moved to the Deccan,

---

؎

Comparative Indian Literature : Vol. I
Edited by K.M. George (Kerala Sahitya Academy)
Paper on URDU by Dr. Naseer Ahmad Khan

embracing eventually the eastern regions as well. Indeed, the numerous Khanqahs monasteries of Muslim saints) could come in close contact with the indigenous people through the same language. Its patronization by the political magnates and the Sufis contributed immensely to the formation and configuration of the language. The first Urdu poet, perhaps, was Mas'ud Sa'd Salman (1046-1121), a Sufi, followed by yet a number of other Sufis, Khwaja Moinuddin Chisti (1140-1268), Baba Farid Ganj Shakar (1173-1265), NizamuddinAulia (1238-1325), Amir Khusrau (1253-1325) and Khwaja Banda Nawaz Gesu Daraz (1321-1422) of Gulbarga, etc.

During the reign of Allauddin Khilji (1296-1316) and Mohammad Bin Tughlaq (1325-51) the language spread over large parts of Gujarat and southern states of India. The states like Golcanda and Bijapur which enjoyed an autonomous status during the early 14th century, became the centres of Urdu language and valuable literary works were produced by its patron. The language of poetry between the 16th and 17th centuries had a mixture of eastern Punjabi, vernacular of western U.P., Dravidian dialects and Perso-Arabic structural characteristics. The main contributors of Dakkhani Urdu literature are Miranji (1595-1663), Bahauddin Bhan (1388-1506). Khwaja Banda Nawaz Gesu

Daraz, Mulla Wajhi (?-1635), Quli Qutub Shah (1565-1611), etc. In North India along with Amir Khusrau the name of Kabir (1440-1518), Guru Nanak (1419-1538), Afzal (?-1625), Abdul Wasey Hansvi and Khan Aarzu (1687-1755) also played an important role in forming and developing the language. Under the influence of Dakkhani writing, perhaps after 17th century, North Indian writers and scholars also started writing in Urdu. Vali Dakkhani's (1649-1707) literary tradition became popular in the north which was followed by eminent writers of Delhi, Lucknow, Patna and Rampur.

ہندوستان کثیر الالسنہ ملک ہے۔ غالب امکان اس بات کا ہے کہ فیلڈن نے یہاں آنے سے پہلے لسانی نقشہ سمجھا ہوگا۔ لسانیات کے طالب علم کی حیثیت سے نہیں، ہندوستان کے ہونے والے کنٹرولر براڈکاسٹنگ کی حیثیت سے۔ ریڈیو میڈیم آواز ہے، اور آواز سے زبان جڑی ہوئی ہے۔ فیلڈن نے ہندستانی گرامر اور اردو رسم خط پر دسترس پانے کی کوشش کی۔ سوال یہ ہے کہ اردو ہی کیوں؟ یہ قیاس کچھ ایسا نادرست نہ ہوگا کہ انھوں نے گریرسن کے کام سے بھی خود کو باخبر رکھا ہوگا۔ اگر انیس فولیو کی جلدیں نہیں تو نویں جلد پر ایک نظر ضرور ڈالی ہوگی۔ ان کا پورا نام جارج ابراہم گریرسن تھا۔ ڈبلن کی کاونٹی میں گلینا گیٹری کے مقام پر ۷ جنوری ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے سنسکرت میں دستگاہ حاصل کی۔ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں کلکتہ آئے محکمۂ مالیات کے افسر ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے، اور ۱۹۲۸ء تک ہندوستان کی ۳۶۴ زبانوں اور بولیوں کے بارے معلومات جمع کیں، جو انیس ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیں[1] ان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا۔

---

[1] Encyclopaedia Britannica (1969 edition) Vol. X (p.923)

اس پیمانے کا کام نہ اس سے پہلے ہوا ، اور نہ بعد میں ۔ ہندستانی زبان کے بارے میں
گریرسن نے یہ لکھا ہے (ص ۴۲) ؎۱

As a dialect of Western Hindi, Hindostani presents itself under several forms. These may first of all be considered under two heads, viz. Vernacular Hindostani, and the literary Hindostani founded there on. Vernacular Hindostani is the language of the Upper Gangetic Doab and of western Rohilkhand. Literary Hindostani is the polite speech of India generally, and may be taken a the vernacular of educated Musamans through out northern India, and all musamans south of Narbada. Being derived from, and still having its roots, in vernacular Hindostani, it would be more logical to treat the later first, but considerations of convenience lead so to reverse the process. Literary Hindostani is so widely known and of such importance, to that it must necessarily be taken as the standard dialect of western Hindi. Its grammer and its various standards of literary style are fixed, and present a suitable form with it based, of to which it is related. I therefore commence by describing Literary Hindostani.

(Linguistic Survey of India) Vol. IX, Part I: Indo-Aryan Family : ؎۱
Central Group : Editor : G.A. Grierson : 1916

گریرسن نے ایک ہی سانس میں دو باتیں کی ہیں، اور ان دونوں باتوں میں جو واضح تضاد ہے، اس کی طرف شاید ان کا دھیان نہیں گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ادبی ہندوستانی عام طور سے ہندوستان کی مہذب زبان ہے، اور اسے شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی روزمرہ گفتگو کی زبان سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر یہ ملک کی مہذب زبان ہے، تو صرف مسلمانوں تک محدود کیوں؟ اور وہ بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں تک۔ ایک ہی کنبے یا خاندان میں کچھ تعلیم یافتہ مسلمان ہوں اور کچھ غیر تعلیم یافتہ، تو کیا ان کی زبان میں بھی فرق ہوگا۔ زبان کا تعلق نہ فرقے سے ہوتا ہے، نہ طبقے سے اور نہ نسل سے۔ اگر ایسا ہوتا تو زبان ترسیل اور ابلاغ کی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتی۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پہلے باب کے شروع ہی میں توجہ دلائی ہے:

> "ہمیں میکس مولر کا یہ قول نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبانوں کے ہند یورپی خاندان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کے بولنے والے بھی ایک ہی نسل سے ہیں۔ . . . "[1]

اس موضوع پر حجت کے لئے دلیلیں لانے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اس عہد میں اردو میں لکھنے والے غیر مسلموں کا توڑا نہیں ہے۔ گریرسن نے ص ۴۳ پر اسی ہندوستانی کو سارے ہندوستان کی لنگوا فرینکا بھی بتایا ہے، اور اس سے اس خیال کا بطلان ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی کا ادبی روپ مسلمانوں تک محدود ہے۔[2]

The word 'Hindostani' was coined under European influence, and means the language of Hindostan. It thus connotes much more than it literally signifies, for, besides Hindostani, three other languages, Bihari,

---

[1] ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو (تیسرا ایڈیشن) ص ۱۷۔

[2] گریرسن: لنگوئسٹک سروے آف انڈیا۔

Eastern Hindi and Rajasthani are spoken in Hindustani, a tract inhabited by about ninety millions of people, and as large as Germany, France and Spain combined. Even in the tract in which Western Hindi is vernacular, and of which Hindostani may be considered as the standard literary dialect, it is only spoken as a general vernacular in a comparatively small area in the north-western corner. .... It appears to be Gilchrist, who about 1767 first coined the word 'Hindostani' or, as he spelt it, 'Hindoostanee' (Foot Note : Ferguason in 1773 published A Dictionary of The Hindostani Language)

Literary Hindostani, as distinct from vernacular Hindostani, is current, in various forms, as the language of polite society, and as a ligua franca over the whole of India proper. It is also a language of literature, both poëtical and prose. (P.43)

جیسا کہ بہت پھیلے ہوئے سروے کے کاموں میں ہوتا ہے، جس میں ملک کے ہر گوشے سے اعداد و شمار جمع کئے جائیں، انھیں ترتیب دیا جائے، بلکہ ترتیب کے طریقے اعداد و شمار اور دوسری معلومات جمع ہونے کے بعد طے کئے جائیں — پہلا حصہ، جو ایک طرح سے تمام گوشواروں کا نچوڑ ہوتا ہے، سب سے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ گریرسن کے لنگوسٹک سروے آف انڈیا کی پہلی جلد اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں، کیونکہ اس میں باقی اٹھارہ فولیوز کا نچوڑ ہے۔ مغربی ہندی اور ہندستانی کے بارے میں نویں جلد میں اس کے مشاہدات، تاثرات اور اس کے اخذ کئے ہوئے نتائج پر ایک سرسری نظر ڈالی جا چکی ہے مختصر، لیکن زیادہ واضح اور جامع طریقے سے اس موضوع پر گریرسن نے پہلی جلد کے پندرہویں باب میں لکھا ہے جو اظہار اس نے کیا ہے، اسے ہم اس کی بہت ہی سوچی سمجھی ہوئی رائے کہہ سکتے ہیں۔

مغربی ہندی کے بارے میں ص ۶۲ا پر لہ

Western Hindi covers the country between Sarhin (Sirhind) in the Punjab and Allahabad in the United Provinces. This almost exactly corresponds to the Madhya Desa or the 'mid-land' ...... It has several recognized dialects, of which the principal are Hindostani, Braj Bhaka, Kanauji and Bundeli, to which we may add the Bangaru of the southeastern Punjab. Of these, Hindostani is now the recognized literary form of Hindi. - - - - -

اس بیان میں چند باتیں نوٹ کرنے کی یہ ہیں۔ یونائٹڈ پراونسز اب اُتر پردیش ہے۔ وہ علاقہ جسے جنوب مشرقی پنجاب بتایا گیا ہے، اب ہریانہ کہلاتا ہے، اور ہریانوی ہی کا ایک نام بانگڑو بھی ہے (اسی کا ایک اور نام جاٹو بھی ہے)۔ گریرسن نے کھڑی بولی کا نام نہیں لیا ہے، جو مغربی ہندی کی سب سے اہم بولی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے نزدیک ہندستانی ہی کھڑی بولی ہے۔

صفحہ ۱۶۴ پر ہندستانی کے بارے میں گریرسن نے اپنے انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے، جس کا اظہار اس نے سروے کی نویں جلد کے پہلے حصّے میں کیا ہے۔ لیکن موضوع سے اس کے گہرے تعلق، اور اس کی اہمیت کی وجہ سے اُس پر پھر ایک نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا؛ ۲ہ

As a vernacular, Hindostani is the dialect of western Hindi which exhibits the language in the act of shading off into

---

لہ G.A. Grierson: Linguistic Survey of India; Vol. I; Chapter XV

۲ہ ایضاً۔

Punjab.....Hindostani must be considered under two aspects, (I) as a vernacular dialect of Western Hindi and (II) as the well known literary language of Hindostan and the lingua franca current over nearly the whole of India.

گریرسن کو اس بات پر اصرار ہے کہ ہندوستانی ادبی زبان بھی ہے، اور بول چال کی، عوامی ترسیل اور ابلاغ کی زبان بھی، جس کے دائرے میں لگ بھگ سارا ہندوستان آجاتا ہے۔ یہ صرف شمالی ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اردو اور پنجابی کی قواعد میں مماثلتیں بیان کیں اور تاریخ کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی، کہ ایک ہی زبان پنجاب سے چل کر دلّی اور دلّی سے دکن پہنچتی ہے۔ پروفیسر محی الدین قادری زورؔ نے، جو ماہر لسانیات تھے، اس بات کے قائل تھے کہ پنجاب کی زبان اور دکنی میں مشترک خصوصیات یقیناً ہیں۔ "ہندستانی لسانیات" میں انھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ شوکت سبزواری اردو کو براہِ راست شورسینی اور پالی کے رشتے کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح ملک کے مختلف علاقوں میں بولیاں اپ بھرنش کے مرحلے سے گذر کر جدید ہندوستانی زبانوں کی سرحد میں داخل ہوئیں، اسی طرح اردو بھی اپنے اپ بھرنش کی ارتقا پزیر شکل ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے، اور ان کے ساتھ فارسی عربی اور ترکی کے الفاظ آنے نہ آنے کا اردو کے ارتقا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علمی حیثیت سے، اور علم السنہ کے اعتبار سے ان کی بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی اس کے بارے میں تفصیل سے بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت اردو کے بارے میں گریرسن کے خیالات کو سمجھنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے، (ص ۱۶۴) پر وہ اردو کو اسی ہندوستانی کا فارسی آمیز اسلوب بتاتے ہیں، جو سارے ملک کی لنگوا فرانکا ہے[1]

---

[1] ایضاً۔

Urdu is that form of Hindostani which is written in the Persian character, and which makes a free use of Persian (including Arabic) words in its vocabulary. The name is said to be derived from the Urdu-e-Mu'alla or royal military bazaar out-side the Delhi Palace. It is spoken chiefly in the towns of western Hindostan, by Musalmans and by Hindus who have come under the influence of Persian culture.

زبان اور قومیت کسی مذہبی فرقے یا نسل سے نہیں ہوتی۔ یہ مسلمات میں سے ہیں، اس کے باوجود برصغیر میں ان دونوں کو مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ اور ایسا غیر ملکی حکمرانوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت نہیں کیا، بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سربرآوردہ عالموں نے اس نظریے کو فروغ دیا۔ ہو سکتا ہے ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی ہو، جو کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تھا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ ہندوستانی شعبے کے پروفیسر تھے، اور انھیں کی نگرانی میں اردو اور دیوناگری رسم خط میں ان انگریز افسروں کے لئے کتابیں لکھی اور چھاپی گئیں، جو انگلستان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر ہو کر آتے تھے۔ خود گل کرسٹ نے کئی اہم کتابیں لکھیں، جن میں دو جلدوں میں انگریزی ہندوستانی لغت، ہندوستانی زبان کی قواعد، اور نصاب کے طور پر کالج کی نگرانی میں تیار کی گئی اہم ناگری اور اردو رسم خط کی کتابوں کے حصّوں پر مشتمل گلدستہ تھا۔ گل کرسٹ نے عام بول چال کی زبان میں قرآن مجید کے تیسوں پاروں کا ترجمہ بھی کرایا تھا، اور اس کا کچھ حصہ چھپ بھی چکا تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ گل کرسٹ بہت تیزی سے کام کرا رہا تھا، لیکن کالج کی کونسل کے قاعدوں کی وجہ سے ان میں بادھا پڑ رہی تھی۔ گل کرسٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود کتابوں کی طباعت کا خرچہ برداشت کرے گا۔ کالج کتاب کی سو جلدیں خرید لیا کرے۔ اس طرح کام چل رہا تھا۔ لیکن قرآن مجید کے ترجمے سے کالج کی کونسل اور روز بیٹر یعنی گورنر جنرل نے ضروری نہیں سمجھا۔ جو حصہ چھپ چکا تھا،

اس کے اخراجات گل کرسٹ کو دے دیئے گئے۔ کول بروک نے انجیل مقدس کے فارسی اور ہندوستانی میں ترجمے بھی کرائے تھے۔ فارسی ترجمہ شاید اس نے خود کیا تھا، لیکن ہندوستانی ترجمہ ایک منشی سے کرایا تھا، اور وہ اس سے مطمئن نہیں تھا۔ ترجمے اس نے نظرِ ثانی کے لئے گل کرسٹ کو بھیجے۔ بہت ممکن ہے اسی سے گل کرسٹ کو خیال آیا ہو کہ کالج کے سالانہ مباحثہ کے لئے موضوع یہ ہو کہ مقامی مقررین اپنے صحیفوں کی تعلیمات کا انجیل کی تعلیمات سے موازنہ کریں۔ گل کرسٹ کا خیال تھا، اس کی وجہ سے لوگ مسیحی مذہب اختیار کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ افواہ اڑ گئی کہ فورٹ ولیم کالج کے مسلم عملے کو، اس مباحثے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس لے جایا جائے گا، اور وہاں انھیں عیسائی بنایا جائے گا۔ اس معاملے نے ایسی نازک صورت اختیار کرلی کہ جب بات وزیٹر، یعنی گورنر جنرل کے سامنے پیش ہوئی، تو انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ موضوع قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن اس کی وجہ سے جو اندیشے پیدا ہوگئے ہیں، اس کی وجہ سے مباحثے کا موضوع بدل دیا جائے[1]۔ گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے آیا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، تو اسے ہندوستانی شعبے کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اس واقعے کے بعد ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کو اُس نے استعفےٰ دے دیا، اور کلکتہ نام کے جہاز سے ولایت واپس چلا گیا۔ چار برسوں میں اُس نے اُردو اور ہندی نثر کو ایک نیا اسلوب دیا۔ اس نے بول چال کی زبان کو تحریری زبان بنایا۔ درجن سے زیادہ اہم کتابیں اس کی نگرانی میں لکھی گئیں۔ صرف ایک باغ و بہار ہی لکھی جاتی تو یہ کارنامہ بھی کم نہیں تھا۔ اردو نثر میں میرامّن کی اس کتاب کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے[2]۔ قصّہ چہار درویش ہی کو عطا حسین خاں تحسین نے نوطرزِ مرصّع میں لکھا تھا[3]۔ دونوں کے اسلوب میں زمین آسمان کا نہیں، تو وہ فرق ضرور ہے جو ریختہ اور ہندوستانی کے درمیان ہے۔ میرامّن کے

---

[1] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد۔

[2] میرامّن، باغ و بہار۔

[3] میر عطا حسین خاں تحسین، نوطرزِ مرصّع۔

علاوہ للّولال کوی، میر شیر علی افسوس، پنڈت سدل مسر، مظہر علی خاں ولا، نہال چند، غلام شاہ بیگ وغیرہ اور منشی بھی تھے۔ شکنتلا اور بیتال پچیسی کاظم علی جوان[1] نے للّولال جی کے ساتھ مل کر لکھیں۔ انھیں کے اشتراک سے مظہر علی ولا نے سنگھاسن بتیسی اور مادھونل لکھیں۔ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی اردو اور دیوناگری دونوں لپیوں میں چھپیں۔ آگرہ کے للّولال جی کا تاریخی کارنامہ "پریم ساگر"[2] ہے، اپنی زبان کی وجہ سے۔ تاریخی کارنامہ اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں تصنیف اور تالیف کا جو کام ہو رہا تھا، اس میں زور اس بات پر تھا کہ کتابیں بول چال کی زبان میں لکھی جائیں، تاکہ ولایت سے آنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر، انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں اپنے فرائض منصبی سنبھالیں تو "رعایا" کی گذارشیں سننے اور پڑھنے میں انھیں مشکل پیش نہ آئے۔ للّولال نے کیا یہ کہ اردو عبارتوں میں سے فارسی (عربی اور ترکی) کے الفاظ ہی نہیں، تدبھو، یعنی روزمرّہ کے الفاظ بھی نکال دیئے، اور ان کی جگہ تت سم شبد رکھ دیئے۔

اب ظاہر ہے یہ بامحاورہ، اور فوراً سمجھ میں آنے والی، ترسیل اور ابلاغ کی زبان تو ہو نہیں سکتی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ للّولال کوی نے ایسا گل کرسٹ کی ہدایت پر کیا، یا خود ایسا کیا۔ اگر ہندی کو اردو سے دور لے جانے کی کوئی لمبے عرصے کی پالیسی سرکار کی ہوتی، تو فورٹ ولیم کالج کو اتنی جلد تہہ کر کے نہ رکھ دیا جاتا، اور جان گل کرسٹ کو، استعفے کے باوجود سبکدوش نہ کیا جاتا۔ قرائن کا جھکاؤ اس طرف ہے کہ "پریم ساگر" کی زبان کے اسلوب کا فیصلہ للّولال کوی نے ہدایت پر نہیں، خود کیا ہو گا۔ انھوں نے ایک نمونہ پیش کر دیا کہ کھڑی بولی کا جو روپ صدیوں میں نکھرا ہے، اور جس کی مشاطہ فارسی، عربی اور ترکی جیسی زبانوں کی روایات رہی ہیں، اس کے ڈھانچے کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ صرف دخیل الفاظ اور تدبھو الفاظ کو تت سم سے بدل دیا جائے۔

---

[1] کاظم علی جوان اور للّولال: سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی۔

[2] للّولال: پریم ساگر۔

"باغ و بہار" تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۱۷ کے اعداد حاصل ہوتے ہیں، جو سنہ ہجری ہے۔ کتاب پر اشاعت کا سال ۱۲۱۸ھ درج ہے۔ یعنی یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں چھپی تھی۔ یہ اعتراف بھی شروع ہی میں ہے[1]

"ماخذ اس کا نوطرز مرصع وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین کا ہے۔"

"فارسی قصۂ چہار درویش سے۔"

اور یہ بات بھی میر امّن دلّی والے نے دیباچے کے طور پر لکھی ہے:[2]

"۔۔۔ صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اردو زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں، اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں، اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمائش تالیف ہوئیں۔"

میر امّن نے یہ بھی لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ خداوند نعمت، صاحب مروّت، نجیبوں کے قدر دان، جان گلکرسٹ صاحب نے، کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے، لطف سے فرمایا کہ اس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرے۔"

"باغ و بہار" کی زبان، شعوری طور سے اپنے عہد کی دلّی کے گھروں، بازاروں اور گلی کوچوں میں بولی جانے والی زبان کے مطابق ہے۔ اس میں عبارت آرائی نہیں کی گئی ہے، بلکہ عام لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام جو زبان بلا تکلف بولتے تھے، ساری توجہ دہی زبان لکھنے پر دی گئی ہے۔ نمونہ یہ ہے:

سیر دوسرے درویش کی[3]

---

[1] میر امّن: باغ و بہار

[2] ایضاً۔ [3] میر امّن۔ باغ و بہار۔

"جب دوسرے درویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وہ چہار زانو ہو بیٹھا، اور بولا۔

اے یارو! اس فقیر کا ٹک ماجرا سنو | میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم | ہے گا ہمارا درد نپٹ لا دوا، سنو

اے دلق پوشو۔ یہ عاجز بادشاہ زادہ، فارس کے ملک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصفہان نصف جہان مشہور ہے۔ ہفت اقلیم میں اُس کے برابر کوئی ولایت نہیں، کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے، اور وہ ساتوں کواکب میں بڑا اعظم ہے۔ اب و ہوا وہاں کی خوش، اور لوگ روشن طبع، اور صاحب سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے، جو بادشاہ اس ملک کے تھے، لڑکپن سے قاعدے اور قانون سلطنت کے تربیت کرنے کے واسطے بڑے بڑے دانا استاد، ہر ایک علم کے اور کسب کے چُن کر، میری اتالیقی کے لئے مقرر کیئے، تو تعلیم کامل ہر نوع کی پاکر، قابل ہوں۔ خدا کے فضل سے، چودہ برس کے سن و سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول، نشست و برخاست پسندیدہ، اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے، سب حاصل کیا۔ اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں، قصے ہر ایک ملک کے، اور احوال اولوالعزم بادشاہوں اور نام آوروں کا سُنا کروں۔ . . . . ."

ایک اردو انیسویں صدی کے شروع کی یہ تھی، جسے میر امن دلّی والا ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو کہتے ہیں۔ اور ایک پُر تکلف اُردو چالیس برس پہلے کی ہے، جس میں تحسین نے نو طرزِ مرصع لکھی۔ اس کی تصنیف کا سال ۱۷۶۰ء ہے[۱] ہندی اور اردوئے معلّیٰ کو تحسین ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں ان کا جو اسلوب ہے، وہ خود کو اس کا موجد بھی سمجھتے ہیں۔

". . . . ایک روز بلبلِ ہزار داستان، اس حکایتِ دل فریب

---

[۱] ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد اوّل: ص ۶۶۰۔

کے تئیں بھی بیچ گلزارِ گفتگو سے کہانی کے مترنم کیا، جو ہر ایک صدائے ترنم اس کی بے اختیار دل کو لبھاتی تھی کہ سننے سے تعلق ہے، طاؤسِ نگارین خیال کا بیچ دماغ خاطر کے یوں جلوہ گر ہوا، کہ اگرچہ پیشتر دو تین نسخے انشائے تحسین، ضوابط انگریزی، وہ تواریخ قاسمی وغیرہ کے بقدر حوصلہ اپنے بیچ عبارت فارسی کے تصنیف کئے ہیں، لیکن مضمون اس داستان بہارستان کے تئیں، عبارتِ رنگین، زبانِ ہندی کے لکھنا چاہیئے، کیونکہ آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجادِ تازہ کا نہیں ہوا۔ اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبانِ اردوئے معلّیٰ کا رکھتا ہو، مطالعہ اس گلدستۂ بہار بن کے سے ہوش و شعور بجوائے کلام کا حاصل کرے، کہ واسطے علمِ مجلس کے لسانی زبانِ ہندوستان کے بیچ حق آدمی بیروں جہات کے ترا دکنندہ ناتراش کے تئیں ہے . . . . .''[2]

تحسین کی زبانِ ہندی اور اردوئے معلّیٰ کے نمونے کے طور پر، چہار درویش (نوطرزِ مرصع) سے قصۂ درویشِ دوم؛

"تب درویشِ دوم نے، عندلیبِ خوش لہجۂ زباں تئیں بیچ گلزارِ بیان کے، یوں داستاں سرا اس معنی رنگیں کا کیا:

کہ یہ بندہ، پسر فرمانروائے ملکِ فارس کا ہے، جو اکتسابِ کمالاتِ ہر فن کا جوہرا بنائے ملوک کا ہے۔ والد بزرگوار، یعنی والی اُس دیار کے، نے میرے تئیں عہدِ طفولیت سے واسطے تکمیلِ فنونِ جہانداری، اور تحصیل شیوۂ شہریاری کے بیچ خدمت معلّمانِ دانشور وادیبانِ خرد پرور کے نصب کیا، اور اتالیقانِ صاحب ذکا کے تئیں جہتِ اصلاحِ طبعِ نوآموز کے تعین فرمایا، کہ آدابِ خلافت و فرمانروائی و قوانینِ انتظام سلطنت و کشورکشائی کے سے بیچ تربیت میری کے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

---

1. یہ اضافت بھی نثر میں لائقِ توجہ ہے۔
2. میر عطا حسین تحسین، نوطرزِ مرصع۔

چنانچہ بہ فضلِ الٰہی بیچ سن چہاردہ سالگی کے فیضِ تربیت ان کی سے شائستگی حال و آراستگیِ مقال بہ ہمہ وجوہ حاصل کی، جو بیچ تہذیبِ اخلاق و حسنِ معاش کے بہرور رکھتا تھا۔ شبانہ روز اوقاتِ عزیز کے تئیں بیچ صحبت اربابِ فضل و کمال کے سننے حکایاتِ رنگین و افسانہ ہائے شیریں کے سے تمتع کافی حاصل کرتا۔ اتفاقاً ایک روز اصحابِ فطنت سے ایک شخص نے کہ بیچ مطالعۂ کتبِ تواریخ کے مہارتِ تمام رکھتا تھا۔ ذکراً بلبلِ زباں کے تئیں بیچ سبزہ زارِ محفل سرمست کے بترنم تعریف حاتم طائی کی اس طور سے، کہ صلائے سخاوت و مروّت اُس کے بیچ گلشنِ دہر کے قیامت تک مترنم رہے گی، نغمہ سرا کیا۔ . . . ."

مشکل ہی سے تحسین کی زبان کو ہندی، یا اردوئے معلیٰ یا بول چال کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ جملوں میں فعل، اسم اور صفت وغیرہ کی وہ ترتیب نہیں ہے، جو بول چال کی زبان میں ہوتی ہے۔ یہ عبارت پڑھ کر کسی دوسری زبان سے لفظی ترجمے کا احساس ہوتا ہے۔

ایسے لوگ بھی تھے، جو عام بول چال کی زبان کو سوقیانہ، اور ادبی تخلیق میں استعمال کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ اردو نثر میں ان کے نمائندہ رجب علی بیگ سرورؔ ہیں، جنھیں "باغ و بہار" کی زبان سے طیش آیا۔ اور انھوں نے زبان کی پاکیزگی کا نمونہ پیش کرنے کے لیے "فسانۂ عجائب" لکھا[1]۔ اس کی زبان تحسین کی زبان کے کنبے کی ہے:

"جس وقت زاغِ شب نے، بیضہ ہائے انجم، آشیانۂ مغرب میں چھپائے اور صیادانِ سحر خیز، دام بردوش آئے، اور سیمرغِ زریں جناح مطلاّ بالِ غیرتِ لال، قفسِ مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گذری، روز ہوا"[2]

"ہندی ساہتیہ کا برہت اتہاس" سولہ بھاگوں میں ہے۔ اشٹ یعنی آٹھویں بھاگ میں ایک باب ہے "ٹمندھ"، ص ۲۶۰ پر ہندی کی اردو شیلی کے ادھارن کے طور پر یہ جملے ہیں:

---

[1] رجب علی بیگ سرورؔ، "سرورِ سلطانی"، "شرارِ عشق"، "شگوفۂ محبت"، "گلزارِ سرور"، "شبستانِ سرور" اور "انشائے سرور" کے بھی مصنف ہیں، لیکن عام طور سے "فسانۂ عجائب" ہی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ [2] رجب علی بیگ سرور: فسانۂ عجائب۔

"چونکہ مناسب معلوم ہوا کہ ایک قانون ایسا اجرا کیا جاوے، جس سے بعد شادی زوجہ
اپنے شوہروں پر بخوبی حکومت کر سکے، اور اس سبب سے ان دونوں میں نفاق
نہ پیدا ہو۔ لہذا قانون حسب ذیل مروّج کیا گیا" [1]

اس کتاب کے ایڈیٹروں میں ڈاکٹر نگندر اور رام دھاری سنگھ دنکر وغیرہ کے نام ہیں، اور پیش لفظ ڈاکٹر راجندر پرساد کا لکھا ہوا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی عبارت کو اسی مناسبت سے اردو کی فارسی شیلی کہیں تو شاید ایسا غلط نہ ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب، باغ و بہار کے کئی برس بعد لکھا۔ زبان کے تئیں ان کا جو رویہ ہے، اسے رجعت قہقری ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ مرصع کاری نہیں، سراسر تصنع ہے۔ زندہ زبان کے لفظ زندہ ہوتے ہیں۔ ان کو پنجروں میں قید کرنا، یا انہیں مار کر، ممیوں کے روپ میں مردہ عجائب گھر میں رکھنا، کوئی صفت نہیں۔ رجب علی بیگ سرورؔ کا اسلوب ہی یہی ہے۔ یہ ہے "گلزار سرورؔ" سے ایک جملہ:

"یہاں سے نقاش ثانی، معترف نادانی، گردش دیدہ، بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرورؔ، اپنی گذشتہ داستانِ حیات بیان کرتا ہے..." [2]

اور یہ ہے "سرورِ سلطانی" میں ان کا اسلوب:

"دوسرے دن جس وقت تہمتنِ مشرق، آشفتہ بخوں، سمند نیلگوں پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دوچار ہوا۔ آخر کار تہمتن نے نعرہ کیا، کوہ دماموں کا جگر پارہ کیا......" [3]

کچھ واقعات ایک سے، ایک ہی زمانے میں، لیکن مختلف جگہوں پر ہوتے ہیں تو انہیں اتفاق سمجھ کر، حیرت بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب فکری، علمی یا ادبی شعبوں میں ایسا ہو، تو حیرت کے بعد ہم مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اگر تلاش کریں تو ان میں ایک تعلق بھی نظر آئے گا۔ انشاء اللہ خاں انشا فورٹ ولیم سے وابستہ نہیں تھے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بول چال کی نثر کو تحریر

---

[1] ہندی ساہتیہ کا برت اتہاس، آٹھویں جلد ص: ۲۶۰۔
[2] رجب علی بیگ سرور؛ گلزارِ سرور۔
[3] رجب علی بیگ سرور؛ سرورِ سلطانی۔

میں منتقل کیا جارہا ہے، اور اس کی وجہ سے اردو نثر کو ایک ادبی روپ ملنے والا ہے۔ شاعری میں تو سراج الدین خان آرزو محاورۂ گوالیار (برج بھاشا) کو سند ماننے پر اصرار کرتے تھے میر تقی میر جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان کو سند مانتے تھے۔ لیکن اردو نثر پر "ریختہ" کی حکمرانی تھی، اگرچہ نثر اردو میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی بے وقعتی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خان آرزو نے "نوادرالالفاظ" فارسی نثر میں لکھی۔ میر تقی میر نے نہ صرف اپنی خود نوشت "سوانح" فارسی میں لکھی، بلکہ اردو شاعروں کا تذکرہ "نکات الشعرا" فارسی میں لکھا۔ شاعر کے حالات اور اس کی شاعری کی خصوصیات پر اظہارِ خیال فارسی میں، اور مثالیں اردو میں۔ مصحفی نے بھی "ریاض الفصحا" اور دوسرے تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ میر امن قصۂ چہار درویش، تحسین کی نوطرز مرصع کو سامنے رکھ کر ۱۸۰۱ء میں دلّی کی عام بول چال میں لکھتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ ایک گلدستے با مجموعہ "ہندی مینول" میں ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوتا ہے۔ پھر وہ شاید اس پر نظرِ ثانی کرتے ہیں، اور ۱۸۰۲ء میں "باغ و بہار" نوک پلک سے درست ہو کر "باغ و بہار" ہو جاتی ہے (کہ یہ ہجری سن ۱۲۱۷ ہے، اور "باغ و بہار" سے بھی یہی عدد نکلتے ہیں، "باغ و بہار" کلکتہ میں ۱۸۰۳ء میں چھپتی ہے۔ انشا کی نظروں سے یہ کتاب نہیں گذرتی، اور وہ اس کے وجود سے بھی لاعلم ہیں، اور اسی سن میں وہ "کہانی رانی کیتکی کی" لکھتے ہیں۔ بے نقط عبارتیں وہ پہلے بھی لکھ چکے تھے۔ ان سے پہلے بھی اوروں نے لکھیں، اور ان کے بعد بھی۔ لیکن رانی کیتکی کی کہانی میں انھوں نے ایک ایسا کمال کر دکھایا کہ اس نے اُردو کے آغاز سے لے کر اس کی ہیئت اور ترکیب تک کے سارے نظریات کے کوزوں کو نہ صرف اوندھا دیا، بلکہ توڑ پھوڑ دیا۔ اس کہانی میں انشا نے ایک بھی فارسی، عربی اور ترکی کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے نامانوس لفظ ہی استعمال کئے ہیں۔ لالٹین کا لفظ Lantern کی مہنّد شکل ہے۔ یہ لفظ کئی جگہ انھوں نے استعمال کیا ہے۔ شوکت سبزواری کو چھوڑ کر علم زبان اور لسانیات کے ماہروں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ کو اردو کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے ساتھ کسی نہ کسی صورت سے ضرور جوڑا ہے۔ اردو کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں نے اسی وجہ سے اُردو کو نہ صرف مسلمانوں کی زبان، بلکہ مسلمانوں کی پہچان کی زبان بتایا

ہے[1] اردو اپنے فارسی عربی اور ترکی کے دخیل الفاظ کی وجہ سے ہندوستان میں اپنے جمہوری حقوق سے محروم رکھی گئی۔ انشاؔ کی 'رانی کیتکی کی کہانی' میں چونکہ ایک بھی فارسی ترکی یا عربی کا لفظ نہیں ہے، اور چونکہ ان زبانوں کا ہندوستان میں آنا مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے[2] اس لیے اگر ان زبانوں کے لفظوں کے بغیر اگر ایک ادبی تصنیف اردو میں ہے، تو یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اردو کا مسلمانوں اور مسلمانوں کے ساتھ آئی ہوئی زبانوں سے کوئی بنیادی رشتہ نہیں۔ ہندی والوں نے انشاؔ کی اس تصنیف کو ہندی تسلیم کر لیا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن اطمینان کی بات اس وقت ہوتی جب وہ اس زبان کو فرقہ وارانہ سیاست کا نشانہ نہ بناتے، جو انشاؔ کی شاعری کی زبان ہے[3] نتائج اور سوال اور بھی اس سے جڑے ہوئے ہیں، لیکن وہ اس تحقیق کے دائرے سے باہر ہیں۔ یہاں جو بات زیادہ بامعنی ہے، اور جس پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ ایک چیز روح عصر ہوتی ہے۔ یہ کوئی غیر مادّی تصوّر نہیں ہے۔ معروضی حالات، مشکل آسان کرنے کے لیے خود راستہ دکھاتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد ایک دم سے ٹوٹ رہا تھا۔ انٹر پرسنل کمیونی کیشن کی جگہ ابلاغ عامہ ـــ اور براہ راست ترسیل ایک ضرورت تھی۔ شاعری، خاص طور سے غزل کی شاعری سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ سادہ نثر کی ضرورت تھی۔ اور یہ بول چال ہی کی نثر ہو سکتی تھی۔ آداب، القاب اور تصنع سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بول چال کی سادہ زبان پر اپنے انگریز افسروں کا دسترس ہونا، حکمرانی کی ضرورت کے لیے لازمی محسوس ہوا۔ پہلے انھوں نے سنسکرت اور فارسی

---

[1] ڈاکٹر نامور سنگھ، باسی بھات میں خدا کا ساجھا؛ مطبوعہ ہنس لکھنؤ، مارچ ۱۹۸۷ء۔

[2] یہ تاریخی اعتبار سے اس لیے درست نہیں ہے کہ مصالحوں کی تجارت کے سلسلے میں عرب تاجروں کی بستیاں بہت پہلے سے مالابار کے ساحلی علاقوں میں تھیں، اور وہ موپلا کہلاتے تھے، اور کہلاتے ہیں۔

[3] اُردو کے حق میں بھی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہرکشن سنگھ سرجیت کا مضمون "اُردو کے جمہوری حقوق" (قومی آواز ۲۳ نومبر ۸۸ء)

کی طرف توجہ دی تھی۔ ۱۷۸۳ء میں ولیم جونز سپریم کورٹ آف جوڈیکیچر کے مجسٹریٹ کی حیثیت سے کلکتہ آئے تھے[1]۔ یونانی، لاطینی، فرانسیسی زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی انھیں عبور تھا۔ یہاں آکر انھوں نے سنسکرت پڑھی، اور وہ دستگاہ بہم پہنچائی کہ نہ صرف شکنتلا کا ترجمہ کیا، اور کالیداس کو یورپ سے متعارف کرایا، بلکہ منوسمرتی کا بھی ترجمہ کیا۔ لندن کی رائل سوسائٹی کی وضع پر کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنائی۔ صدارت گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کو پیش کی گئی تھی، لیکن انھوں نے جونز کے صدر ہونے پر اصرار کیا۔ جونز کے بڑے علمی کارنامے ہیں، اور ان کا نام پہلے ماہر لسانیات، یعنی اس علم کے بانی کی حیثیت سے لیا جاتا ہے، حالانکہ سراج الدین خان آرزو (۱۶۸۹ء-۱۷۵۶ء) نے سب سے پہلے سنسکرت اور فارسی کی مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا تھا، اور اس امکان کی طرف ان کا رجحان تھا کہ دونوں کی مصدر زبان ماضی میں ایک رہی ہوگی۔

رانی کیتکی کی کہانی کی وجہ تصنیف، خود انشا کے الفاظ میں ہے[2]

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی، کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ کسی اور بولی کا پٹ نہ ملے تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے، باہر کی بولی، اور گنوار ی کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔"

لالٹین کا لفظ کئی جگہ کہانی میں آیا ہے۔ خیال تو یہی ہے کہ یہ Lantern کا ہندی روپ ہے۔ غالب نے "دستنبو" میں ایسی فارسی لکھنے کی کوشش کی تھی جس میں ایک بھی عربی لفظ نہ ہو۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کیونکہ ان کے کئی خطوں میں "ہیبت" کے لفظ کو کاپی سے نکال دینے اور رجا تو سے چھیل دینے کی ہدایتیں ہیں۔[3] انشا پر جن لوگوں نے کام کیا ہے، ان میں سے کسی نے بھی انشا کی اس کہانی میں "باہر کی بولی" کے لفظوں کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ البتہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ۱۹۸۶ء

---

[1] The works of Sir William Jones : Edited by Lord Teignmooth, Published by John Hatchard (London) : 1806

[2] کہانی رانی کیتکی۔

[3] خطوطِ غالب۔

میں، کراچی یونیورسٹی میں ایک گفتگو میں بتایا تھا کہ انشا کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ چھ لفظ انہیں ایسے اس کہانی میں ملے، جو فارسی کے ہیں۔ ان چھ لفظوں کی نشاندہی انہوں نے نہیں کی۔ بنیادی ذخیرے کے الفاظ میں یقیناً بہت سے ایسے ہوں گے جو فارسی (قدیمی فارسی) اور سنسکرت (ویدی زبان) کے ایک ہونے کی وجہ سے تت سم صورتوں میں موجود ہوں گے، اور ان کے تدبھو روپ بھی ہونگے صرف چند مثالیں، اور ان مثالوں سے یہ بھی واضح ہوگا کہ ہند۔ یورپی، ہند۔ ایرانی، اور ہند آریائی کے مرحلوں سے پہلے جب پروٹو انڈو۔ یورپین، یعنی قبل ہند۔ یورپی زمانے میں الفاظ کا جو ذخیرہ تھا، وہی لے کر وہ۔ یورال، الطائی اور تھین شان پہاڑوں کے علاقوں سے، ہجرت کے لئے نکلے۔ پہلی تقسیم عام طور سے س اور ک کے تلفظ والے قبائل کی تقسیم کہی جاتی ہے۔ ایک ہی آواز دو طرح سے ادا ہوتی ہے، اور اس کے باقیات آج بھی۔ یورپ کی ہر زبان کی لغت میں اس طرح سے ہیں کہ سی C سے لکھے جانے والے کچھ لفظوں میں س کی آواز سے جیسے Centre اور کچھ میں ک کی جیسے Can۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہوتے ہیں۔ بولیوں Dialects کا خلط بھی تھا۔ وہ لفظ جو انگریزی میں سینما C سے ہے، جرمن کینما K سے ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ تفصیل اس تحقیق اصل موضوع کے بکھر جانے کے سبب بن سکتی ہے، اس لئے صرف چند مثالیں ہیں:

ا۔ ا۔ انگریزی میں سنچوری Century، ۲۔ فارسی میں صدی ۳۔ سنسکرت میں شتابدی۔ ان تینوں کا پروٹو انڈو۔ یورپین مادہ یقیناً ایک ہے۔

ب۔ ا۔ انگریزی میں ہارس Horst ۲۔ فارسی میں اسب / اسپ ۳۔ سنسکرت میں اشو۔ ان تینوں کا مادّہ بھی ایک ہے۔

ج۔ ا۔ انگریزی کاؤ Cow ۲۔ فارسی گاو ۳۔ سنسکرت گو ۴۔ ہندی / اردو گائے / گئو ان چاروں کے مادّے ایک ہیں۔

د۔ ا۔ انگریزی فادر Father ۲۔ فارسی پدر ۳۔ سنسکرت پتا

ہ۔ ۱۔ انگریزی مدر Mother ۲۔ مادر ۳۔ ہندی ماتا

اسی طرح گنتی میں مماثلتیں واضح ہیں [1]

---

[1] Linguistics as an instrument of Pre History By Morris Swadesh included in Dell Hyme's Language in Culture and Society

and

Indo-European Languages and Archaeology by Hugh Hencken.

فارسی اور سنسکرت ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں۔ ہندی اور اردو سنسکرت کی جڑواں بیٹیاں ہیں۔ اس لئے اُردو میں کوئی ایسی عبارت لکھنا جس میں فارسی کے لفظ اپنی اصلی یا بدلی ہوئی شکل میں نہ ہوں، کوئی بڑی با معنی بات آج نہیں، لیکن انشا کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے تھی۔ ہو سکتا ہے اس زمانے میں کسرہ کے ساتھ سِر اور فتحہ کے ساتھ سَر کو الگ الگ سمجھا جاتا ہو۔ لیکن عربی اور ترکی کے الفاظ کے بغیر عبارت لکھنا واقعی کارنامہ تھا۔ فردوسی نے بھی شاہنامہ میں عربی الفاظ کے بغیر ایران کی تاریخ/اساطیر نظم کرنے کی کوشش کی تھی، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عرب کے فصحانے جس قوم اور ملک کو عجم یعنی گونگا کہا تھا، ان کا کلچر کتنا عظیم ہے کتنا وسیع ہے اس کی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ۔ ایک جگہ فردوسی کو مشکل پیش آئی۔ وہ افسرِ قلعہ یا قلعہ دار کیسے کہتا۔ آخر اس نے لفظ (کوٹ والا سے) کوتوال (کوتوالِ حصار) بنایا۔ انشا نے جو زبان کہانی رانی کیتکی میں استعمال کی ہے، وہ یہ ہے؛

"ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے اپنے اسی اٹھکھیل پنے اور الٹرپن کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے آئی تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے، سب کو چھوڑ چھاڑ گھوڑا پھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا،"[1]

انشا بڑے بانکے اور ترچھے انسان تھے۔ ایک طرف یہ زبان لکھی ہے۔ دوسری طرف نثر میں خالص ریختہ قسم کی فارسی آمیز زبان کا نمونہ ان کی "دریائے لطافت" میں موجود ہے۔ یہ کتاب دو حصّوں میں ہے، اور فارسی میں ہے۔ پہلا حصّہ انشا کی تصنیف ہے، اور دوسرا اُن کے عہد کے ایک اور عالم مرزا قتیل نے۔ قتیل ان کے دوست بھی تھے، ہم چشم بھی، لیکن ایسے ہم چشم، شاید واحد ہم چشم جس سے معرکہ آرائی نہیں ہوئی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انشا نے ان کو کسی فن میں بند نہیں پایا۔ انشا کا لکھا ہوا حصّہ، جو فصاحت و بلاغت کے بارے میں ہے، اردو ترجمہ میں الگ بھی چھپ گیا ہے۔ انشا نے رانی کیتکی کی کہانی ۱۸۰۳ء میں لکھی تھی۔ دریائے لطافت اس کے چار برس بعد کی، یعنی ۱۸۰۷ء کی تصنیف ہے۔ تیرہ برس پہلے جب وہ دلی گئے تھے، جو مشہور صوفی شاعر میرزا مظہر جانِ جاناں سے ملے تھے۔ انشا کو میرزا مظہر سے ملنے کا اشتیاق

---

[1] انشا اللہ خاں انشا، کہانی رانی کیتکی کی۔

تھا، وہ بیان کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں:[1]

" . . . . . میں نے خط بنوایا، ڈھاکے ململ کا جامہ پہنا۔ سرخ دستار سر پر رکھی۔ باقی لباس بھی اسی قبیل سے تھا۔ اور از قسم سلاح جو کچھ میں ساتھ لے گیا تھا، اس میں ایک بہت خوبصورت کٹار بھی تھی، جو میں نے کمر میں اُڑس لی تھی۔ اس ہیئت سے ہاتھی پر سوار ہو کر ان کی خدمت میں روانہ ہوا۔ جب اس مکان کی چھت پر پہنچا، جو جامع مسجد کے متصل کیول رام بانیئے نے بنوا کر ان کو نذر کر دیا تھا، تو میں نے دیکھا کہ میرزا موصوف پیرہن اور کلاہ سفید پہنے، اور ناشپاتی رنگ کے ڈوپٹے کا سموسہ کندھے پر ڈالے بیٹھے تھے۔ میں نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ نہایت اوراخلاق سے، جو بزرگوں کا شیوہ ہے، سلام کا جواب دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر، مجھ بے لیاقت کے سر کو اپنے کنادیں بھینچ لیا، اور پہلو میں جگہ دی، اور میں نے عرض کیا:"

اب مکالمہ کی زبان توجہ کے لائق ہے، جو کسی طرح اس بیان کی عبارت کی زبان سے میل نہیں کھاتی۔ یہ عبارت یقیناً انشاؔ کے زمانے کے "شرفا اور فصحا" کی زبان ہوگی، حالانکہ زبان نہ شرفا اور فصحا کی جاگیر ہے، اور نہ ان کی سند کی محتاج ہے۔ آج بھی جو زبان لکھی جاتی ہے، وہ انشاؔ کی اس زبان سے بہت مختلف نہیں ہے، اور یہ اس بات پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری ادبی زبان انجماد کی لپیٹ میں آگئی ہے، بالکل اس زبان کی طرح، جو انشاؔ کے عہد میں میرزا مظہر جان جاناں سے اُن کے مکالمے کی زبان ہے:

"ابتدائے سنِ صبا سے تا اوایلِ ریعان، اور اوایلِ ریعان سے ولی الآن، اشتیاقِ مالا یطاق تقبیلِ عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا، کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منظم ہو سکے۔ لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔"

امرت رائے نے بھی اپنی کتاب[2] میں انشاؔ کے یہ جملے نقل کئے ہیں یہ ریختہ نثر ہے، حالانکہ ریختہ کا تعلق صرف موسیقی اور شاعری ہے۔ یہ بحث اپنے

---

[1] انشاء اللہ خاں انشاؔ، دریائے لطافت

[2] A house Divided by Amrit Rai. (P 259)

مقام پر آئے گی۔ غالب نے کہا تھا[1]

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اور مقطع سے پہلے کا شعر ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

غالب کی ایک اور غزل کا مقطع ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

میر کے جس ریختے کا عقیدت سے غالب نے ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا!

اور یا

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میر اور سودا، انشا سے ایک پیڑھی پہلے کے ہیں، حالانکہ انشا نے بھی ان کا زمانہ پایا تھا۔ سودا کی وفات کا سن ۱۱۹۵ ہجری ہے[2] اور انشا کی پیدائش کا سال ۱۱۶۶ ہجری ہے[3]۔ میر تقی میر کا انتقال سودا کے بعد میں ہوا[4] اس لئے انشا نہ صرف میر و میرزا کی شعری روایت سے واقف تھے، بلکہ شاعری میں ان سے الگ رنگ ہونے کے باوجود انھوں نے ٹکسالی زبان ہی میں شاعری کی۔ اس ریختہ میں نہیں، جو ان کے بعد کی پیڑھی میں غالب نے اپنے ابتدائی

---

[1] میرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوانِ غالب۔

[2] ڈاکٹر محمد حسن: سودا کے حالاتِ زندگی (کلیاتِ سودا، نسخہ رچرڈ جانسن: ۱۹۸۵ ایڈیشن ص۵۰)۔

[3] مالک رام: سہ ماہی "تحریر" اپریل تا جون ۱۹۷۳ء۔

[4] میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا، اور انشا کا ۱۸۱۷ء میں۔

زمانۂ شاعری میں اپنایا تھا، اور جس کا نمونہ یہ شعر ہے:

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

میرزا مظہر جانِ جاں کی خدمت میں. بڑی عقیدت سے، جس زبان میں انشا نے گذارش کی تھی، اور جو عبارت دریائے لطافت سے نقل کی گئی ہے. وہ کچھ غالب کے اس مطلع کے خاندان کی ریختہ ہے۔ اردو زبان وہ ہرگز نہیں، اور یقیناً انشا کے زمانے میں بھی وہ عام بول چال کی زبان نہیں تھی۔ عام بول چال کی زبان تو وہ ہے، جو میرامّن کی کتاب "باغ و بہار" کی زبان ہے۔

سنہ ۱۸۰۴ء کے شروع میں گل کرسٹ فورٹ ولیم کالج سے استعفیٰ دے کر ولایت چلے گئے۔ ان کے جانے کے چھ برس بعد سنہ ۱۸۱۰ء میں للولال کوی کی کتاب "پریم ساگر" دیوناگری لپی میں چھپی[1] ظاہر ہے اس کا مسودہ گل کرسٹ کی نظروں سے نہیں گذرا ہوگا۔ لیکن یہ بات وثوق سے اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں ۶۰ کتابوں کی جو فہرست ص ۱۷۱ سے ص ۱۷۵ تک دی گئی ہے، اس کو ص ۱۷۲ کے فٹ نوٹ میں دو متضاد معنی کا حامل بنا دیا ہے۔ نمبر شمار ۱۷ کتاب "کائنات جو" کا ہے، جس کے آگے [?] سوالیہ نشان بریکٹ میں ہے۔ فٹ نوٹ کی عبارت ہے: "گل کرسٹ کی فہرست میں کائنات کے آگے 'JOU' لکھا ہے۔ ممکن ہے نقل کرنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو۔ اس فہرست میں للولال کب (کوی) کی دیوناگری میں کتاب "پریم ساگر" کا نمبر شمار ۳۲ ہے، اور زیرِ طبع کتابوں میں یہ چوتھی کتاب ہے۔ فروری ۱۹۰۴ء کے آخر میں گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج سے استعفیٰ دیا تھا۔ للولال کی یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں، یعنی چھ برس بعد چھپی۔ ۹ اگست ۱۸۰۳ء کو گل کرسٹ نے انعام کے لئے ہندوستانی مصنّفین کی جو فہرست پیش کی تھی، اُس میں ۲۵۰ صفحوں کی کتاب "پریم ساگر" کا بھی اندراج ہے، اور یہ بھی کہ یہ "ہندی کی بے حد مفید کتاب ہے"۔[2] "پریم ساگر" کی زبان سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی اور باغ و بہار سے کتنی مختلف

---

[1] عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد: چارٹ ص ۱۷۴۔
[2] گل کرسٹ اور اس کا عہد: ص ۱۴۹۔

ہے، اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے :

"جس کال اوشا بارہ ورش کی ہوئی، تو اس کے مکھ چندر کی جیوتی دیکھ کر پورن ماسی کا چندرما چھپ ہین ہوا۔ اُس کی چوٹی سٹکائی لکھ ناگن اپنی کینچلی چھوڑ سٹک گئی۔ مدہ کی بنکائی نرکھ دھنش دھک دھکانے لگا۔ آنکھوں کی بڑائی چنچلائی پیکھ نیند کھنجن کھائے رہے۔"[1]

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام سے مختلف تھا۔ فورٹ ولیم کالج ایک تدریسی ادارہ تھا، جہاں ولایت سے آنے والے انگریز افسروں کو ہندوستان کی لنگوافرینکا (ہندستانی — دونوں پیبوں ہیں) سکھانے کے علاوہ عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی، تاکہ وہ نظم و نسق چلا سکیں، یہاں کے قوانین سمجھ سکیں۔ مالیات کے ریکارڈ پڑھ سکیں، مقامی لوگوں سے بات چیت کر سکیں، اور عدالتوں میں اُن کے بیان ترجمان کی خدمات کے بغیر سمجھ سکیں۔ یہ مقاصد فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی فہرست سے ظاہر ہے۔ اس میں کلیاتِ سودا، کلیاتِ ولی، بحری وطبّی لغت، ہندوستانی کہاوتیں، ہندی میں مستعمل عربی و فارسی محاورات، تواریخ بنگالہ، ہدایت الاسلام، جامع القوانین، تواریخ تیموری، تواریخ عالمگیری، تواریخ السلاطین، سیف الملوک، الف لیلیٰ، اخلاق النبی، پندنامہ فریدالدین عطّار، مادھونل، حاتم طائی، اخلاقِ ہندی، گُل بکاولی، راج نیت، چندراوتی، توتا کہانی، امیر حمزہ، قصہ دل و حسن، دہ مجلس، سری بھاگوت گیتا بھی شامل تھیں۔

خود گل کرسٹ نے یہ کتابیں لکھی تھیں، جو چھپی بھی تھیں:[2]

1. The Anti-Jargonist
2. The Oriental Linguist
3. A new Theory of Prospectus of Persian Verbs
4. نوا یجاد، یعنی نقشہ افعالِ فارسی مع مصدرات آں در فارسی و انگریزی۔
5. The Hidee Arabic Mirror
6. Guide to Hindoostanee

---

[1] للّو لال: پریم ساگر (ہندی، دیوناگری پلی)۔

[2] گل کرسٹ اور اس کا عہد، ۱۵۹۔

9. Hindee Story Teller

۷ و ۸۔ رومن، ناگری اور فارسی رسم خط کے مختلف نمونے

10. Moral Preceptor

(انگریزی، عربی، فارسی، ہندوستانی، برج بھاشا اور بنگلہ میں)

11. The Oriental Fabulist

۱۲۔ ہندستانی گلستان

13. A Dictionary, English and Hindoostanee

14. The Appendix

15. Hindee Exercises

16. The Stranger's East India Guide to the Hindoostanee, or Grand Popular Language of India.

17. The Hindoostanee Directory, or Student's IntroducLor

18. The Hindee Principles

19. The Hindoostanee Manual, or Casket of India.

آخری کتاب کوئی تصنیف نہیں، بلکہ فورٹ ولیم کالج سے، جو کتابیں چھپی تھیں، یہ ان کا انتخاب تھا، درسی اور نصابی ضرورت کے لئے، اور اسے رومن، ناگری اور اردو، تینوں رسم الخطوں میں چھاپا گیا تھا، تاکہ آسانی سے ہندی اور اردو پڑھنے کی مشق ہوسکے۔

گل کرسٹ نے انگریزی ہندوستانی لغت (۱۳) ہندستانی زبان کی قواعد، جو لغت کے حصے کے طور پر اس میں شامل کی گئی، ضمیمہ لغت (۱۴) اور The oriental Fabulist (۱۱) ۱۷۸۶ء اور ۱۷۹۸ء کے درمیان، اپنے طور پر، فرائضِ منصبی کے طور پر نہیں، لکھی تھیں۔ ان کتابوں کی افادیت، چھپنے سے پہلے ہی گورنر جنرل ویلزلی

پر واضح ہوگئی، اور ولایت سے آنے والے کمپنی بہادر کے جونیئر افسروں کی تربیت کے لیے "ویلزی
ایما سے گل کرسٹ نے جنوری ۱۷۹۹ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔[1] اس مدرسہ کا نام Oriental
Seminary تھا۔ نوایجاد یعنی نقشۂ افصالِ فارسی۔ ۔ ۔ ۔" (۴) اسی زمانے میں تدریسی ضرورتوں
کے پیش نظر لکھی گئی۔ گل کرسٹ کے مدرسے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے،
کہ گورنر جنرل نے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۰۰ء میں یہ کالج قائم ہوا، اور گل
کرسٹ کو ہندوستانی شعبے کا صدر مدرس یا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج ایک تعلیمی ادارہ تھا، اور اس کا مقصد کھلا ہوا یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے
جو منصوبے اس ملک پر حکومت کرنے کے لیے بنائے تھے، اس کے لیے اس کو ہندوستانی
جاننے والا عملہ فراہم ہو۔ گل کرسٹ کی لغت کی تین سو کاپیاں کمپنی نے خرید کر ولایت بھیجی تھیں۔
ان میں سے زیادہ تر ان لوگوں کی تربیت کے لیے استعمال ہوئی ہوں گی، جنھیں بھرتی کر کے
ہندوستان بھیجا جاتا تھا۔ بنگال پر کمپنی بہادر کی حکومت تھی۔ بہار اور بنارس پر بھی
"دیوانی" کی وجہ سے اس کا اقتدار تھا۔ علمی کاموں کے لیے رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور
اس کی سرگرمیاں تھیں۔ گل کرسٹ بھی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا ممبر تھا۔ اس کا وہ اسسٹنٹ
سکریٹری بھی رہا تھا۔ وہ سوسائٹی کے جرنل Asiatic Researches
کی ادارتی کمیٹی کا ممبر تھا۔ اس کے باوجود فورٹ ولیم کالج میں اس کے کام کو سوسائٹی کی خدمات
سے خلط نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ دونوں اداروں کے حلقہ ہائے کار مختلف تھے۔[2]

ہندوستانی قواعد میں شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے حصّوں کا ترجمہ بھی گل کرسٹ نے
کر کے شامل کیا تھا۔ لیکن اس کا مقصد بھی نصابی ضرورت تھا۔ ایک نمونہ:

To be, or not to be, that is the question.

جینا، خواہ نہ جینا (م) سوال یہی ہے کہ

Whether tis? nobler in the mind to suffer.

بہتر ہے دل میں برداشت کرنا

۱؎ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۳۲۔

۲؎ " " " " " ، ص ۸۲۔

The sling and arrows of outrageous fortune.

قہرآلود قسمت کے فلاخن اور خیر باراں کو

Or to take arms against a sea of troubles,

یا سن مکھ دست بہ شمشیر ہونا دریا مصیبتوں کے

And by opposing them..To die? to sleep, _

،تمام کرنا ان کو۔ مرنا کیا ہے؟ سونا ہے،

No more; and by a sleep to say we end

کچھ اور نہیں۔ یہ کہنا کہ ایک نیند سے ہم مل میٹ کرتے ہیں

The heart-ache and the thousand natural shocks

دردِ دل اور ہزار صدماتِ فلکی

That flesh is heir to,.its a consumption

جن کا متحمل ہر ایک متنفس ہے۔ یہ مراد ایک ہے۔

Davoutly to be wish'd. To die,.to sleep:-

جس کو بہ آرزو چاہا چاہیئے۔ مرنا، درست، سونا ہے

To sleep; perchance to dream: aye, there is the rub:

ہاں سونا ہے، شاید سپنا دیکھنا۔ فی الواقعہ سترِ راہ در یہی ہے کہ

For in that sleep of death what dreams may come,

کہ جب ہم نے اس کش مکش دینوی سے نجات پائی تب اس نیند میں کیسے خواب نظر آویں گے

When we have shuffled off this mortal coil,

یہی تشویش ہم کو خوف و رجا میں رکھتی ہے۔ امتیاز یہی ہے

Must give us pause: there's the respect

جو اذیت کی اینہاں تک عمر دراز کرتی ہے۔

That makes calamity of so long life;

والا کون سہتا زمانے کی کوتک و اہانت

For who would bear the whips and scoms of time,

ظالم کے ظلم . . . . . لے

The oppressor's wrongs......

ترجمے کے لیئے پہلی شرط ہے کہ دونوں زبانوں پر، اگر برابر کا نہیں، تو مکمل عبور حاصل ہو۔ گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں ولایت سے بمبئی آیا تھا۔ بیس برسوں میں اتنی زبان اگر اس نے سیکھ لی کہ ترجمہ کرسکے، تو یہ کام، کارنامے سے کم نہیں۔ ترجمے کی خامیوں کا اسے بھی احساس تھا، لیکن یہ صرف زبان سیکھنے والے غیر ملکیوں کے لیئے تھا۔ کیونکہ شیکسپیئر اُن کا شاعر تھا۔ گل کرسٹ نے لکھا ہے :

"یہ امر طالبِ علم کو غالباً گراں نہ گذرے گا کہ اس کی زبان کے ایک ٹکڑے کا ہندوستانی نثر میں ترجمہ بطور نمونے کے پیش کیا جائے، تاکہ اس کو اندازہ ہوسکے کہ دونوں زبانوں کے محاورات اِن حسین مکالمات کی ادائیگی میں کس حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جن کو لافانی شیکس پی یر نے کارڈی نل وُلزے (Cardinal Wolsey) اور شہزادہ ہیملٹ (Hamlet) کی زبان سے، عالمِ خیال میں ادا کرائے ہیں۔ ان دونوں مکالمات کا بول چال کی مہذب زبان میں زیادہ سے زیادہ لغوی ترجمہ کرنے کی میں نے کوشش کی ہے، تاکہ سلاست کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کا وہ اندازِ بیان بھی قائم رہے، جو ایسے مسائل کے بیان میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ . . . . . اس ترجمے کے گھٹیا پن اور اس کی بے علمی سے ناظرین کو اس کا بھی اندازہ ہوسکے گا کہ ترجمے میں اصل کی روح اور اس کے حسن کو برقرار رکھنا بسا اوقات کس درجہ دشوار ہوجاتا ہے۔" ٢ے

فورٹ ولیم کالج ایک ادارہ تھا۔ اس سے پہلے گل کرسٹ کی سعی انفرادی تھی۔ اپنا مدرسہ قائم کرنے سے پہلے، انفرادی طور پر، اپنی ذاتی حیثیت میں گل کرسٹ نے لغت کا کام کیا تھا۔ گل کرسٹ کی اہمیت، اردو نثر کے ارتقا میں اپنی جگہ، لیکن وہ پہلا غیر ملکی نہیں

لے گل کرسٹ اور اس کا عہد : ص ۲۵۷، ۲۵۸۔

٢ے ایضاً ص ۷۴، ۷۵۔

تھا، جس نے لغت کی طرف اور ہندوستان کی زبان میں تصنیف کا سلسلہ شروع کیا۔

زبان سیکولر ہوتی ہے۔ کاروبار، انسانی تعلقات، جذبات، سیاست، انتظامی امور روحانی اور فکری موضوعات اور مختلف مذاہب کے لیئے اظہارِ خیال کے لیئے، اور مناظروں اور زبانی یا تحریروں میں مذہبی خیالات سے مخالفت کے لیئے بھی وہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ جب درباری اور عدالتی زبان فارسی تھی، تو صوفیا اور سنتوں کی زبان عام بول چال کی زبان ہندوستانی تھی۔ ہندوی کہیں، ہندی کہیں، اردو کہیں، کچھ کہیں۔ صوفیوں اور سنتوں کی بانیوں سے عام طور سے واقفیت ہے، اور کتابیں موجود ہیں۔ لیکن غیر ملکیوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیئے، نہ صرف ہندوستان آکر زبانیں سیکھیں، بلکہ اہلِ ہند کی روحانی نجات کے لیئے اپنے مذہبی نظریات ہندوستانی اور دوسری زبانوں میں لکھے۔ بنجمن شلزے نے بھی ایک ہندوستانی گرامر لکھی تھی، حالانکہ ان سے پہلے جوشوا کیٹلر نے ڈچ زبان میں سب سے پہلی اردو قواعد لکھی تھی۔ شلزے کی گرامر کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے، جو تعلیقات کے ساتھ چھپ گیا ہے[1]۔ اس کے مقدمے میں ڈاکٹر ابواللیث نے قواعد نویسی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ کچھ اہم حقائق جو انھوں نے بیان کیئے ہیں، یہ ہیں[2]:

۱۔ ”اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے اکثر کی مادری زبان فارسی یا ترکی تھی، اور فارسی ہی اس عہد میں درباری، دفتری، عدالتی، تہذیبی اور شعر و ادب کی زبان تھی۔ ان بزرگوں نے اپنی تدریس و تبلیغ کے لیئے یہاں کی زبانوں کو سیکھا، اور اپنی محفلوں میں گفتگو، اور تالیف و تصنیف کے لیئے ان کو اختیار کیا۔“

ظاہر ہے یہ وہی زبان ہے جسے سنت اپنا اپدیش دینے کے لیئے استعمال کرتے تھے۔ صوفیوں اور سنتوں کے مخاطب ایک ہی تھے۔

۲۔ ”جب مغربی مشنری یہاں آنا شروع ہوئے، تو انھوں نے بھی اپنی تبلیغی

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: ہندوستانی گرامر از بنجمن شلزے: مجلسِ ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۷ء

[2] ایضاً ص ۲۔

ضرورت کے پیش نظر یہاں کے مختلف علاقوں کی زبانیں سیکھیں۔ ان کے قواعد اور لغت مرتب اور مدوّن کیئے، انجیل اور مقدس کتابوں کے ان زبانوں میں ترجمے کیئے . . . . . . بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ اکبری میں ہی ان مبلغوں نے اردو کو، جسے وہ ہندوستانی، زبانِ ہندوستان، ہندوی اور ہندی کے ناموں سے یاد کرتے تھے، استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ سولھویں صدی کے ان مصنفین میں ایک نام جیرونیموزاویر (Jerionimo Xavier) کا ہے، جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں Companions of Jesus کی تنظیم سے متعلق تھا، اور جہانگیر کے دربار میں پیش بھی ہوا تھا۔ اس کا قیام آگرہ میں تھا، جہاں وہ سنہ ۱۵۸۶ء اور سنہ ۱۶۱۵ء کے درمیان موجود تھا۔ اس نے ہندوستانی فارسی لغت کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ یہ ان کتابوں میں شامل ہے، جو سنہ ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف ہیں۔ اس کا پورا نام :

Vocabularium Portugalico Hindustano-Persicum

تھا . . . . ایک مشنری مصنف انتونیو (Antonio de Saldhana) دی سلدانھا (کذا) تھا۔ اس کی وفات سنہ ۱۶۶۳ء میں ہوئی۔ اس نے دعاؤں کا ایک مجموعہ Rosas کے نام سے ہندوستانی زبان میں لکھا . . . . اسی دور کا ایک دوسرا مصنف اگناسیو آرکامونے Ignacio Arcamone تھا . . . . اس کی وفات ۳۰ / اپریل سنہ ۱۶۸۳ء کو ہوئی۔ اس نے کونکنی اور دکھنی (یعنی اردوئے قدیم) کا ایک لغت لکھا، جس میں لاطینی مترادفات بھی درج کیئے۔ اس کے رسالے میں قواعد بھی ہے، اور لاطینی کو نکنی لغت کے علاوہ ایک پوری فصل دکھنی اور کونکنی بولیوں کی خصوصیات پر لکھی گئی ہے۔ تیسرا مصنف جہان دی پیڈروزا (Joao de Pedroza) تھا۔ اس کا عہد سنہ ۱۶۴۰ء اور سنہ ۱۶۷۲ء کے درمیان ہے۔ اس نے اعتراف کے لیئے ہدایات۔

Instrucsan para confissao sacramental em lingua Indostania

کے عنوان سے لکھیں۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں گیساپے ماریا ڈی برنینی دا گاگنا نو

(Maria de Bernini) (کذا) نے ہندی/ہندوستانی میں کئی کتابیں لکھیں . . . . لغت میں اس کی دو کتابیں ہیں؛ ہندی/لاطینی اطالوی لغت، اور اطالوی ہندی لغت۔ اس کی تین دیگر تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

1. Catechiomus cum orationilus cotida nis im ligua Hinde
2. Leber devotions pere neophytis im ligua Hinde.
3. Dialago fra un cristiano un gentile im lingua Indostana.

ان میں پہلی دو کتابوں میں مذہبی دعائیں ہیں، اور تیسری کتاب میں ایک عیسائی اور ایک غیر عیسائی کے درمیان مکالمہ ہے۔ آخری کتاب کے متعلق مصنف نے واضح طور سے بتایا ہے کہ اسے زبانِ ہندوستان میں لکھا ہے۔[1]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب دکھن میں ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء میں "سب رس" لکھی تو جہاں قصۂ حسن و دل شروع کیا ہے، وہاں ذیلی سرخی ہے: "آغازِ داستان" زبانِ ہندوستان۔ مغربی مصنفوں نے، جو اس بات سے واقف نہیں تھے، اپنی زبانوں میں زبانِ ہندوستان ہی بتایا۔

۳۔ "اٹھارویں صدی کی ایک اور مشنری شخصیت فادر کاسیانو دی ماسیراتا (Fr. Cassiano de Macerata) کی ہے . . . . . انھوں نے ہندوستانی زبان کی ایک قواعد Grammatica Hindustana کے نام سے لکھی۔ اس کا سنہ تالیف، بعض حوالوں سے ۱۷۵۶ء ہے، اور اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔"[2]

۴۔ اسی دور کے ایک اور مصنف فرانس ماری دا تورس (Francois Marie - de Tours) مترادفاتِ زبانِ ہندوستان (Thesarus Linguae - Indianae Hindostaníae) مرتب کی . . . . . ایک اور مصنف یوجین تری گوترس (Eugino Trigueiros) تھے . . . وکا سنہ

---

[1] ایضاً؛ ص ۲،۳۔

[2] ایضاً؛ ص ۴۔

۱۷۱۵ء میں بنگال میں تھے، اور سنہ ۱۷۴۰ء میں گوا میں اُن کے قیام کا حوالہ ملتا ہے۔ اُن کی دو تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ہندوستانی فارسی لغت ؛

1. Nomes de Consas a Mezin has emportuguese Indostan oer, Presico.

اور دوسری :

2. Fragments de unvocabulario de lingua Indostana.

اسطی فانس پٹیرو (Stephamus, a. ss. Petro) (کذا) جن کا انتقال سنہ ۱۷۶۶ء میں ہوا، اور جو مالابار کے مشن سے منسلک تھے، دو اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں ایک میں ہندوستان کے حروفِ تہجی، اُس کے قواعد، لغت اور عیسائی مذہب کے بارے میں کچھ تحریریں شامل ہیں۔ اس کا نام

Alphabetum Indostannum, cui acced it Grammatica. Dictionariolum et doctrina christiana.

ہے۔ اُن کی دوسری کتاب اطالوی ۔ ہندوستانی، ہندوستانی ۔ اطالوی لُغت ہے . . . . . . مارتینو دا میلو کاسترو (Martino de Meloe Castro) نے غالباً سنہ ۱۷۸۱ء میں ہندوستان کے مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام Alphabeta Indica تھا، اور اس میں دیگر زبانوں کے علاوہ ہندوستانی زبان بھی شامل تھی۔ اٹھارویں صدی میں لکھی جانے والی اس قبیل کی بعض اور تصانیف و تالیفات حسبِ ذیل ہیں۔

1. Introductio ad linguam Indostana, anctore quodam missiourio capucino.
2. Compendium catechesis chritiquae im lingua Indostana.
3. Compendium vitae salvatoris Jesus Chrisi im lingua Indostana.

4. Dialogus inter magistrum et discipulm de Christiana religione im Lingua Indostana.

5. Catechesmius im lingua Indostana.

اس کا قلمی نسخہ لاہور میں، مسیحیوں کے کتب خانے میں محفوظ ہے

6. Catechesnio im Lingua Indostana-Marodella Tomba (D. Bhagapur 1830 palua 1744).

7. Grammatica Indostana.

ہندوستان میں مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لئے مبلغوں نے نہ صرف قواعد کی کتابیں اور لغات لکھیں، بلکہ انھیں چھاپنے کے لیئے، اور مذہبی لٹریچر چھاپنے کے لئے چھاپے خانے قائم کیئے۔ کلکتہ تو خیر مرکزی شہر، شہر البلاد ہونے کی وجہ سے تھا، لیکن اسی کے ساتھ آگرہ، سردھنا، بیٹھیا، لاہور، دیناپور، اور دوسرے شہروں میں چھاپہ خانے قائم کیئے۔ آگرہ سے آرک بشپ کی نگرانی میں ایک پندرہ روزہ اخبار پیام خوشخبری بھی نکلا[1]۔ ایک پریس پٹنہ میں بھی قائم ہوا[2]۔ بمبئی اور مدراس تو تجارتی حیثیت سے اہم شہر تھے ہی۔ پریس یہاں بھی قائم ہوئے۔ اگر مسیحی مبلغوں نے اپنا مذہب پھیلانے کے لیئے کوشش نہ کی ہوتیں، تو شاید اتنی جلد اردو کے حروف ڈھالے نہ جاتے، اور اردو کی چھپائی عام ہونے میں وقت لگ جاتا۔

تبلیغی مقاصد کے علاوہ نظم و نسق اور سیاسی امور کے پیش نظر بھی کام ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا مختصر ذکر ہو چکا ہے۔ تجارتی، سیاسی اور علمی مقاصد سے قواعد اور لغت نویسی کا جو کام غیر ملکیوں نے کیا، اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ اس جائزے کی بنیاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مقدمہ ہے، جو بنجمن شلزے کی ہندوستانی پر لکھا گیا ہے:-

۱۔ ۱۵ ۱۷ء میں جوشا کیٹلر کی لکھی ہوئی قواعد۔ قواعد اردو (ص ۱۹) میں مولوی عبدالحق نے اسے لاطینی زبان میں لکھی ہوئی قواعد بتایا ہے۔ لیکن شلزے نے یہ

---

[1] ایضاً ص ۴، ۵۔ [2] ایضاً ص ۵۔

قواعد لکھی تھی، اور اس نے اسے ڈچ زبان میں تصنیف بتایا ہے۔

۲۔ ۱۷۴۱ء میں بنجمن شلزے نے لاطینی میں قواعد لکھی تھی، جو ۱۷۴۵ء میں چھپی۔ یہ ہندوستانی کی قواعد ہے، اور اس میں سنسکرت، دیوناگری، بنگلہ اور گورمکھی کے حروفِ تہجی بھی دیئے گئے ہیں۔ سنسکرت کے حروف شاید اس لئے دیئے گئے ہیں کہ "شاستری یعنی ہندوؤں کی انجیل" کو پڑھا جاسکے[۵۱]

۳۔ ۱۷۷۸ء میں ایک پرتگالی نے Portuguese Grammatica Indostana لکھی تھی، جو لسبن سے ۱۷۷۸ء میں چھپی تھی۔

۴۔ "انگریزی زبان میں اردو کے قواعد نویسوں میں ایک قدیم مصنف گلکسن ہے، جو گورنر ونسی ٹارٹ کا سکریٹری تھا۔ اس کا ذکر جان گل کرسٹ نے کیا ہے[۵۲]

۵۔ ۱۷۷۲ء، میں مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کے مطابق، ہیڈلے کی گرامر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ ابواللیث صدیقی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں[۵۳]

> ہیڈلے سنہ ۱۷۶۳ء میں بنگال آرمی میں داخل ہوا۔ اور اس سلسلے میں اسے ہندوستانیوں کی ایک کمپنی کی سربراہی سپرد ہوئی (بحوالہ رسالہ گل کرسٹ، ص ۲) چنانچہ اپنے منصب سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے اُسے اس زبان کی تحصیل کی طرف توجہ کرنی پڑی، اور اس نے ۱۷۶۵ء بقول خود، اپنے سپاہیوں کے لئے اس زبان کے قواعد مرتب کئے، جسے لندن کے ایک تاجر نے ۱۷۷۱ء میں شائع کیا۔ یہ گویا ہیڈلے کی قواعد کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اور کم و بیش اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب شلزے کی قواعد کے اصل لاطینی متن کا انگریزی ترجمہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ہیڈلے نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ مولوی عبدالحق نے غالباً اسی دوسرے ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے۔ . . . . . میرے پیشِ نظر اس

---

۵۱ A Grammar of Hindoostani Language by Benjamin Schulzino, (English Traslation) P.7(Section I-Division the 2nd)

۵۲ ابواللیث صدیقی (بنجمن شلزے کی ہندوستانی قواعد) ص: ۸۔

۵۳ ایضاً۔

قواعد کا چھٹا ایڈیشن ہے، جو ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان یہ ہے

A compendious grammar of the current corrupt dialect of the jargon of Hindoostan-VI Edition 1804, London.,

۶۔ ۱۷۷۳ء میں جے فرگیوسن نے لندن میں ہندوستانی لغت دو جلدوں میں لکھا جو شائع بھی ہوا۔ بقولِ گل کرسٹ اس میں ایک مقالہ ہندستانی قواعد پر بھی شامل ہے۔

۷۔ بیلی ڈوف (بقولِ عبدالحق) یا بے بی ڈف (بقولِ گل کرسٹ[۱]) جو ۱۷۸۷ء میں کلکتہ میں تھا، اور بقولِ خود مغل دربار میں ناٹک کا منتظم ہوگیا تھا، بیس برس بعد جب انگلستان واپس گیا تو اس نے اردو کی ایک قواعد لکھی۔ گریرسن نے اس کی ہندوستانی زبان کی واقفیت کو ناقص بتایا ہے[۲]

۸۔ گل کرسٹ کے ہم عصر کرک پیٹرک نے، جو کمانڈر ان چیف کا سکریٹری تھا ایک لغت کی تدوین شروع کی تھی۔ لیکن یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔

۹۔ "باغ و بہار کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، جن میں سے اکثر میں اُردو انگریزی لغت بطور ضمیمہ شامل ہے۔ ان میں سے بعض، مثلاً ڈنکن فوربس والا نسخہ رومن رسم الخط میں چھاپا گیا ہے، تاکہ وہ وقت جو انگریزوں کو ایک نیا رسم الخط سیکھنے میں صرف کرنا پڑے، اس کی جگہ اس زبان کی تحصیل پر صرف ہو، تو زبان بہت جلد سیکھی جا سکتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان اس دور کی دوسری پسندیدہ کتاب تھی جس کے اقتباسات رومن میں انگریزی ترجموں کے ساتھ شائع ہوتے"[۳]

---

[۱] ایضاً۔ ص ۹۔
[۲] ایضاً۔ ص ۱۰۔
[۳] ایضاً۔ ص ۱۳۔

قواعد لکھی تھی، اور اس نے اسے ڈچ زبان میں تصنیف بتایا ہے۔

۲۔ ۱۷۴۱ء میں بنجمن شلزے نے لاطینی میں قواعد لکھی تھی، جو ۱۷۴۵ء میں چھپی۔ یہ ہندوستانی کی قواعد ہے، اور اس میں سنسکرت، دیوناگری، بنگلہ اور گورمکھی کے حروفِ تہجی بھی دیئے گئے ہیں۔ سنسکرت کے حروف شاید اس لئے دیئے گئے ہیں کہ "شاستری یعنی ہندوؤں کی انجیل" کو پڑھا جاسکے[1]

۳۔ ۱۷۷۸ء میں ایک پرتگالی نے ؛ Portuguese Grammatica Indostana لکھی تھی، جو لسبن سے ۱۷۷۸ء میں چھپی تھی۔

۴۔ "انگریزی زبان میں اردو کے قواعد نویسوں میں ایک قدیم مصنف گلکسن ہے، جو گورنر وسی ٹارٹ کا سکریٹری تھا۔ اس کا ذکر جان گل کرسٹ نے کیا ہے[2]

۵۔ ۱۷۷۲ء، میں مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کے مطابق، ہیڈلے کی گرامر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ ابواللیث صدیقی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں[3]

> ہیڈلے سنہ ۱۷۶۳ء میں بنگال آرمی میں داخل ہوا۔ اور اس سلسلے میں اسے ہندوستانیوں کی ایک کمپنی کی سربراہی سپرد ہوئی (بحوالہ رسالہ گل کرسٹ، ص۲) چنانچہ اپنے منصب سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے اُسے اس زبان کی تحصیل کی طرف توجہ کرنی پڑی، اور اس نے ۱۷۶۵ء بقول خود، اپنے سپاہیوں کے لئے اس زبان کے قواعد مرتب کئے جسے لندن کے ایک تاجر نے ۱۷۷۰ء میں شائع کیا۔ یہ گویا ہیڈلے کی قواعد کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اور کم و بیش اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب شلزے کی قواعد کے اصل لاطینی متن کا انگریزی ترجمہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ہیڈلے نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۷۲ء میں شائع کیا۔ مولوی عبدالحق نے غالباً اسی دوسرے ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے۔ . . . . . میرے پیشِ نظر اس

۱؎ A Grammar of Hindoostani Language by Benjamin Schulzino, (English Traslation) P.7(Section I-Division the 2nd)

۲؎ ابواللیث صدیقی (بنجمن شلزے کی ہندوستانی قواعد) ص: ۸۔

۳؎ ایضاً۔

قواعد کا چھٹا ایڈیشن ہے، جو ۱۸۰۴ء مطابق ۱۲۱۹ھ میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان یہ ہے

A compendious grammar of the current corrupt dialect of the jargon of Hindoostan-VI Edition 1804, London.,

۶۔ ۱۷۷۳ء میں جے فرگوسن نے لندن میں ہندوستانی لغت دو جلدوں میں لکھا، جو شائع بھی ہوا۔ بقولِ گل کرسٹ اس میں ایک مقالہ ہندوستانی قواعد پر بھی شامل ہے۔

۷۔ بیلی ڈف (بقولِ عبدالحق) یا بے بی ڈف (بقولِ گل کرسٹ[۱]) جو ۱۷۸۷ء میں کلکتہ میں تھا، اور بقولِ خود مغل دربار میں ناٹک کا منتظم ہو گیا تھا، بیس برس بعد جب انگلستان واپس گیا تو اس نے اردو کی ایک قواعد لکھی۔ گریرسن نے اس کی ہندوستانی زبان کی واقفیت کو ناقص بتایا ہے[۲]

۸۔ گل کرسٹ کے ہم عصر کرک پیٹرک نے، جو کمانڈر ان چیف کا سکریٹری تھا، ایک لغت کی تدوین شروع کی تھی۔ لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

۹۔ "باغ و بہار" کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، جن میں سے اکثر میں اردو انگریزی لغت بطور ضمیمہ شامل ہے۔ ان میں سے بعض، مثلاً ڈنکن فوربس والا نسخہ رومن رسم الخط میں چھاپا گیا ہے، تاکہ وہ وقت جو انگریزوں کو ایک نیا رسم الخط سیکھنے میں صرف کرنا پڑے، اس کی جگہ اس زبان کی تحصیل پر صرف ہو، تو زبان بہت جلد سیکھی جا سکتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان اس دور کی دوسری پسندیدہ کتاب تھی جس کے اقتباسات رومن میں انگریزی ترجموں کے ساتھ شائع ہوتے۔"[۳]

۱۔ ایضاً۔ ص ۹۔
۲۔ ایضاً۔ ص ۱۰۔
۳۔ ایضاً۔ ص ۱۳۔

ابواللیث صدیقی کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ رومن رسم خط میں کتابیں اس لئے شائع کی گئیں کہ انگریز رسم خط سیکھنے پر وقت صرف کرنے کے بجائے زبان کی تحصیل پر توجہ مرکوز کریں۔ ولایت سے آنے والے جونیئر افسروں کو ہندوستانی زبان اس لئے لکھائی جاتی تھی کہ عدالتوں اور دفتروں میں وہ دیسی لوگوں کی گفتگو سمجھ سکیں، اور دستاویزیں پڑھ سکیں۔ رومن میں کتابیں اس لئے چھاپی گئی تھیں کہ استاد کی غیر موجودگی میں بھی وہ عبارتیں، صحیح تلفظ سے پڑھ سکیں۔ اردو رسم خط میں اعراب پریشان کن ہیں۔ رومن سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ لیکن صرف بولی ہوئی زبان کو سمجھنا کافی نہیں تھا۔ پڑھنا بھی اتنا ہی، بلکہ اس سے زیادہ اہم تھا۔ رومن رسم خط، اردو رسم خط سیکھنے میں مدد دیتا تھا۔

ہندوستانی زبان میں انگریزوں کی دلچسپی کا اندازہ صرف فورٹ ولیم کالج کے قیام سے کرنا، گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اس کالج نے کمپنی بہادر کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا تھا، جو تجارت سے ملک گیری اور جہاں داری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انگریز حاکموں کو اردو میں سپاس نامے پیش کئے جاتے، اور وہ بھی جوابی تقریر اُردو میں کرتے تھے۔ بات ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے، جب برطانوی ہند پر تاجِ برطانیہ کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔ مولوی عبدالحق نے ۲۸ راپریل کو علیگڑھ میں اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے خطباتِ گارساں دتاسی کے حوالے سے کہا:[1]

"فروری ۱۸۶۲ء میں جب سر ہنری منٹگمری، لفٹنٹ گورنر پنجاب، ریاست کپورتھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر صاحب موصوف نے مشن اسکول کے طلبہ کے سامنے ہندوستانی میں تقریر کی۔ جنوری سنہ ۱۸۶۴ء پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا، جس میں مختلف ہندوستانی راجا، امرا اور سرکاری عہدے دار شریک تھے۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں اُردو میں جلسے کو خطاب کیا۔

جب سر جانس لارنس وائسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے، تو انھوں نے ایک بڑا شاندار دربار آگرے میں منعقد کیا۔ جب وائسرائے تخت پر بیٹھنے کیلئے

---

[1] خطبات عبدالحق (انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۹ء) ص ۱۰، ۱۰۱۔

تشریف فرما ہوئے، تو توپوں کی سلامی دی گئی، اور سر ولیم میسور نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا، اور خود وائسرائے نے حاضرین کے روبرو ہندوستانی میں تقریر کی۔ نیز مدرسہ مراد آباد کے افتتاح کے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اردو ہی میں جلسے سے خطاب کیا۔ مہاراجہ بنارس نے سنہ ۱۸۶۸ء میں چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے اردو ترجمے کے لئے دس ہزار روپے منظور کئے، بشرطیکہ حکومت بھی دس ہزار روپے دے۔"

یہ تو ۱۸۶۸ء کی بات ہوئی۔ اس سے نصف صدی قبل، اتنا بڑا کام تو نہیں ہوا، لیکن قواعد پر، کسی ذاتی فائدے کے لئے نہیں، بلکہ کچھ علمی شوق کی وجہ سے، اور کچھ ہندوستان میں کمپنی بہادر کو ہندوستانی جاننے والا عملہ فراہم کرکے، اس کو تقویت دینے کے لئے، بہت سے انگریزوں نے قواعد کی کتابیں لکھیں۔

۱۔ اردو گرامر، تالیف جان شیکسپئر۔ . . . . پہلا ایڈیشن ۱۸۱۳ء

۲۔ مقدمہ زبانِ ہندوستانی، تالیف ولیم ٹیٹ۔ طبع اول ۱۸۰۷ء

۳۔ گارساں دتاسی، مقالہ قواعد اردو ۱۸۳۸ء [1]

۴۔ رسالہ قواعدِ ہندوستانی۔ ڈبلیو ہری ٹن ۱۸۳۰ء

۵۔ جدید خود آموز قواعدِ زبانِ اردو، تالیف اسٹیفورڈ اناٹڈ طبع اول ۱۸۳۱ء

۶۔ رسالہ قواعدِ اردو، تالیف اسٹیفورڈ ڈارناٹ، تشریح و اضافہ ڈنکن فوربس ۱۸۵۵ء

۷۔ ہندستانی زبان کی قواعد مشرقی اور رومن رسم الخط میں، مع حواشی . . .
تالیف جولائی ۱۸۵۵ء (طباعت ۱۸۵۹ء)

۸۔ ہندوستانی قواعد، تالیف جیمس آر بیا ئن ٹائن، سنہ ۱۸۴۴ء/۱۸۶۸ء

۹۔ قواعدِ ہندوستانی۔ ایورنڈ جی اسمال، سنہ ۱۸۴۷ء، سنہ ۱۸۵۸ء

۱۰۔ قواعدِ ہندوستانی۔ جے دت لو پراخنو، سنہ ۱۸۵۲ء

۱۱۔ قواعدِ ہندوستانی۔ تالیف کاٹن ماتھر، مرتبہ سر مونیرہ لیہس

۱۲۔ ہندوستانی قواعد، تالیف جان ڈاسن، سنہ ۱۸۷۲ء

---

[1] گارساں دتاسی فرانسیسی نژاد مستشرق تھے۔

۱۳۔ قواعدِ اردو، جان پلیٹس سنہ ۱۸۷۴ء

۱۴۔ ہندوستانی، فارسی و عربی قواعد۔ پامر سنہ ۱۸۸۲ء

۱۵۔ قواعدِ ہندوستانی۔ ڈبلیو کیگر۔ سنہ ۱۸۸۳ء

۱۶۔ قواعدِ ہندوستانی۔ فان کیو۔ سنہ ۸۳ ۱۸ء

۱۷۔ اردو قواعد۔ جے ولسن سنہ ۱۸۸۲ء

۱۸۔ ہندوستانی قواعد۔ تالیف اے سی ڈل سنہ ۱۸۹۳ء

۱۹۔ ہندوستانی قواعد تالیف شلسر، سنہ ۱۸۹۴ء [1]

یہ بات واضح ہے کہ ولایت سے آنے والے انگریز افسروں کو حاضر حقیقتوں، رواں روائتوں اور بول چال کی زبان سے واقف کرانا مقصود تھا۔ اردو میں نثر کی کتابوں کا توڑا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو درس کے لئے بول چال کی زبان میں کتابیں لکھوانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ آخر فارسی اور عربی کے لئے کتابیں نہیں لکھوائی گئیں، اور نہ سنسکرت میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ جھکاؤ مسلمانوں کے علوم کی طرف معلوف ہوتا ہے، اور یہ آج کا احساس ہے، کیونکہ اُردو کو مسلمانوں کی طرف اور ہندی کو ہندوؤں کی طرف ہانک دیا گیا ہے۔ اس وقت ایسا نہیں تھا۔ اُردو میں گُل بکاؤلی نہال چند لاہوری سے لکھوائی گئی۔ اور" مذہب عشق" کے ساتھ خود نوشت حالات کی زبان یہ ہے:

"اس مستمند، نہال چند لاہوری کو، کہ مولد اس نحیف کا شاہ جہاں آباد ہے، اب دَور کھینچ کر بیچ اس شہر اشرف البلاد کلکتے کے، جو اس وقت میں دارالسلطنت ہندوستان کا ہے، لا ڈالا۔"

یہ ایک واہمہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں رجحان مسلمانوں کے حق میں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے تجارتی اور سیاسی مفادات عزیز تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مغل خاندان اور اس کے صوبے داروں سے اقتدار چھین رہی تھی۔ مصحفی جیسے حساس شاعر کم تھے:

ہندوستاں کی دولت و حشمت، جو کچھ کہ تھی [2]
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی ــــ!

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ہندوستانی گرامر از بنجمن شلزے، ص ۱۲، ۱۴۔ [2] شیخ غلام ہمدانی مصحفی: ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو زبان، ادب یا کلچر کو فروغ دینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا مقصد محدود اور مرکوز تھا۔ اس لئے کسی ایسی زبان میں تصنیف، جو اس ملک میں رائج نہ ہو، اور نہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہو، فورٹ ولیم کالج کے اسکوپ سے باہر تھی اگرچہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے، لیکن یہ بات بعید از امکان نہیں کہ گل کرسٹ کے چلے جانے کے بعد پنڈت للّولال نے پریم ساگر کے مسوّدے پر "نظرثانی" کی ہو، اور نہ صرف عربی فارسی اور ترکی لفظ ہی نہیں، بلکہ رائج تدبھو بھی تت سم سے بدل ڈالے۔ آج بھی، جب اسلوب کے لحاظ سے ہندی اور اردو ادبی نثر میں بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے، جملوں کی نحوی ترتیب ایک سی ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر پنڈت للّولال کوی نے جملہ یوں لکھا ہو:

"جس وقت اوشا بارہ برس کی ہوئی تو اس کے چاند سے چہرے کی چمک دیکھ کر چودھویں کا چاند ماند پڑ گیا۔"

اب وقت کو ہٹا کر کال کر دیجئے۔ حالانکہ کال ان معنوں میں نہ للّولال جی کے زمانے میں بولا جاتا تھا، اور نہ اب بولا جاتا ہے۔ ورش زبانوں پر گھس گھس کر نکھر کے برس ہوا تھا۔ برس کو ورش تک الٹے قدموں لے جائیں۔ اسی طرح چاند کو چندر، اور چہرے کو کہ فارسی ہے، منہہ نہیں، مکھ کر دیں۔ چودھویں کے چاند کو پورن ماشی کا چاند بنا دیتے تو بھی بول چال کی، روز مرّہ کی زبان ہوتی۔ پورن ماشی کا چندرما بھی بولتے ہوں گے، لیکن برج اور کھڑی کے علاقے میں نہیں۔ قنوجی کے علاقے میں نہیں۔ یہ ماگدھی اور اردھ ماگدھی کے علاقے کی بولی ہے، جہاں ش، س ہو جاتا ہے۔ اور للّو لال جی تو آگرہ کے گجراتی پنڈت تھے، ان کی زبان کے بارے میں تو قدرتی بات یہ ہوتی کہ اس پر برج کا رنگ چھایا ہوتا، نہ کہ ماگدھی / اردھ ماگدھی کا۔ چاند ماند پڑ گیا، پھیکا پڑ گیا، رنگ پھیکا پڑ گیا، چھب ہین ہونا کون بولتا ہے۔ اب اوپر کی عبارت کا مقابلہ للّولال کی عبارت سے کریں تو یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ پہلے بول چال کی زبان میں "پریم ساگر" لکھی گئی ہوگی، بعد میں اس کی زبان کا حلیہ درست کیا گیا ہوگا:

"جس کال اوشا بارہ ورش کی ہوئی تو اس کے مکھ چندر کی جیوتی دیکھ پورن ماسی کا چندرما چھب ہین ہوا۔"

اگرچہ یہ قیاس ہے، اور کوئی شہادت مہیا نہیں ہے، لیکن شاید یہ حقیقت سے بہت دور نہ ہو۔

للولال کی "پریم ساگر" کی زبان، ہندی کے ایک اسلوب کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ ہندی کی سنسکرت شیلی کا جنم داتا، انھیں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندی ادب کی سب سے اہم تاریخ، جو سولہ بھاگوں میں لکھی گئی ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر راجندر پرساد کا دستخطی ہے، اور جس کی مجلسِ ادارت میں رام دھاری سنگھ دنکر، ڈاکٹر نگیندر، کرواپتی ترپاٹھی، ڈاکٹر وجے پال سنگھ، ڈاکٹر نگیندر ناتھ اُپادھیائے، ڈاکٹر واسو دیو سنگھ اور سدھاکر پانڈے جیسے ہندی دنیا کے مہان نام ہیں، اس میں سنسکرت شیل संस्कृत हिन्दी शैली کی یہ مثال دی گئی ہے[1]

पदादि उपचार करके होम के समय
यौवन पुरोहित उपासका के प्राण सामि चोमे
मोहमेद लगाकर सर्वनाश तंत्र से मन्त्रों से
आहुति दें। मानखंड के लिए "निद्रा स्वाहा:..

"پداد اُپچار کر کے ہوم کے سمے، یودن پروہت اُپاسک کے پران سمبدھوں میں موہ گنتِ لگا کر سرو ناش تنتر سے منتروں سے آہوتِ دیں۔ مان کھنڈ کے لیئے نڈرا سواہا۔ . . . . . "

اس پر تبصرہ ہے[2]

"للولال سے راجہ لکشمن سنگھ تک چلی آرہی اس سنسکرت ہندی شیلی میں تت سم شبد گرہن کے لیئے سنسکرت کی منجوشا کا اُپ یوگ بھارتیندو نے کیا۔ اس پنڈتا دپن لنبے واکیوں کی کتھا واچک شیلی کے کریا پد تھا کرے اور سماس سندھ کا ادھک پریوگ یتھا وسترالنکار ادِ شبدوں کا پریوگ ہے۔"

---

[1] हिन्दी साहित्य का बृहत् इतिहास: अष्ट भाग:
निबन्ध पृ: 260

[2] ایضاً

پنڈت للّولال کی کتاب "پریم ساگر" کا ذکر ہندی ادب کی ہر تاریخ میں ہوتا ہے، لیکن یہ کتاب چھاپی جاتی ہے دھارمک کتابوں کے ساتھ۔ آگے ایک اشتہار کی فوٹو کاپی پیش کی جائے گی۔ اردو رسم خط میں بھی "پریم ساگر" چھپی ہے، لیکن یہ جس فہرست میں ہے اُس میں ترتیب سے یہ کتابیں (یا گرنتھ) ہیں۔

۱۔ تلسی رامائن ۲۔ سکھ ساگر (باتصویر شریمد بھاگوت مہاپران) ۳۔ موشیو مہاپران ۴۔ بالمیکی رامائن ۵۔ مہابھارت ۶۔ درگا سپت شتی (چنڈی پاٹھ) ۷۔ پریم ساگر (شری للّولال جی کرت کرشن لیلا کا چتروں سہت انمول رتن) ۸۔ بچوں کا بھاگوت...

"پریم ساگر" کی بھاشا کے کچھ اور نمونے[1]

श्री शुकदेव मुनि बोले- महाराज- ! ग्रीष्म की अनीति देख, नृप पावस प्रचंड पशु पक्षी, जीव जन्तुओं की दशा विचार चारों ओर से दल बादल ले लड़ने को चढ़ आया। तिस समय घन जो गरजता था सोई तो धौंसा बजता था और वर्ण-वर्ण की घटा जो घिर आयी थी सोई सूर रावत थे तिनके बीच बिजली की दमक शस्त्र की सी चमक थी बगपाँत ठौर-ठौर ध्वजा सी फहराय रही थी, दादुर, मोर लड़ खैतों की सी भाँति यश बखानते थे और बड़ी-बड़ी बूँदों की सी झड़ी बाणों की सी झड़ी लगी थी।

इतना कह महादेव जी गिरिजा को साथ ले गंगा तीर पर जाय नीर में न्हाय न्हिलाय, अति लाड़ प्यार से लगे पार्वती जी को वस्त्र आभूषण पहिराने। निदान अति आनन्द में मग्न हो डमरू बजाय तांडव नाच-नाच, संगीत

---

[1] للّولال: پریم ساگر

शास्त्र की रीति से गाय-गाय लगे रिझाने ।

जिस काल ऊषा बारह वर्ष की हुई तो उसके मुख चन्द्र की ज्योति देख पूर्णमासी का चन्द्रमा छवि क्षीण हुआ, बालों की श्यामता के आगे अमावस्या की अन्धेरी फीकी लगने लगी । उसकी चोटी सटकाई लख नागिन अपनी केंचुली छोड़ सटक गई । भौंह की बंकाई निरखि धनुष धकधकाने लगा, आँखों की बड़ाई चंचलाई देख मृग मीन खंजन खिसियाय रहे ।

للّول لال کے بارے میں ہندی ساہتیہ کا اتہاس میں رام چندر شکل لکھتے ہیں:[1]

"...... آگرے کے رہنے والے، گجراتی برہمن تھے۔ ان کا جنم ۱۸۲۰ سموت میں اور مرتیو ۱۸۸۲ سموت میں ہوئی۔ سنسکرت کے وشیش جانکار تو یہ نہیں جان پڑتے، پر بھاشا کویتا کا ابھیاس انھیں تھا۔ اردو بھی کچھ جانتے تھے۔ ۱۸۶۰ سموت میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے ادھیاپک جان گل کرسٹ کے آدیش سے انھوں نے کھڑی بولی گدھ میں "پریم ساگر" لکھا، جس میں بھاگوت دشم سکند کی کتھا ورنن کی گئی ہے۔ انشا کے سمان انھوں نے کیول ٹھیٹھ ہندی لکھنے کا سنکلپ تو نہیں کیا تھا، پر ودیشی شبدوں کے نہ آنے دینے کی پرتگیا اوشیہ لکچھت ہوتی ہے۔ یدی یہ اردو نہ جانتے ہوتے تو عربی فارسی

---

[1] رام چندر شُکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس (پہلا بھاگ): ناگری پرچارنی سبھا۔ کاشی سموت ۲۰۴۱ ص ۲۸۶۔

کے شبد بچانے میں اتنے (کر تکار) کبھی نہ ہوتے، جتنے ہوئے۔ بہتیرے عربی فارسی کے شبد بول چال کی بھاشا میں اتنے مل گئے تھے کہ انھیں کیول سنسکرت ہندی جاننے والے کے لئے پہچاننا بھی کٹھن تھا۔ . . . . للّولال جی انجان میں کہیں کہیں ایسے شبد لکھ گئے، جو فارسی یا ترکی کے ہیں۔ جیسے बैरख (بیرکھ) شبد ترکی کا بیرک بیرک) ہے، جس کا ارتھ جھنڈا ہے۔ پریم ساگر میں یہی شبد آیا ہے، دیکھئے:

शिवा जी ने एक ध्वज बाणसुर को दे के
कहा इस बैरव को ले जायँ

پر ایسے شبد دو ہی چار جگہ آئے ہیں۔ . . . . للّولال کی بھاشا کرشن پاسک دیاسوں کی سی برج رنجت کھڑی بولی ہے۔"

لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو ایک ہیں۔ ہندی سے مراد کھڑی بولی ہندی لیکن ایک نازک فرق پھر بھی دونوں میں ہے، اور اس کی طرف رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری اکثر توجہ دلاتے تھے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اردو میں مرکب افعال ہیں۔ ہندی میں ایسا نہیں ہے۔ "پریم ساگر" میں افعال کا کردار کہیں اردو کا ہے، اور کہیں اس زبان کا جسے فراقؔ گورکھپوری گنوارو کہتے تھے، اور رام چندر شکل "برج رنجت کھڑی بولی" کہتے ہیں۔ ان کی تحریر کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں، ان میں یہ ناہمواری موجود ہے:

"گریشم ابنتی دیکھ ترپ پاوس پرچنڈ پشو پکش، جیو جنتوؤں کی دشا بچاروں اور سے دل بادل لڑنے کو چڑھ آیا۔"

"اتنا کہہ، مہادیو جی گرجا کو ساتھ لے، گنگا تیر پر جائے، نیر میں نہائے، نہلائے، اتی لاڈ پیار سے لگے پاروتی جی کو، وستر آبھوشن پہرانے۔"

". . . . اس مکھ چندر کی جیوت دیکھ پورن ماشی کا چندر ما چھب ہین ہوا۔"

پہلی اور تیسری مثال میں دیکھ کر یا دیکھ کے کسی جگہ صرف دیکھ ہے

دوسرے جملے میں کہہ اور لے، کہ کے یا کر کے بغیر ہے، لیکن رام چندر شکل نے للّولال کا ذکر کرتے ہوئے جو مثال دی ہے، اس میں دے کے ہے، صرف دے نہیں:

شیوا جی نے ایک دھوج باڈن سر کو دے کے کہا اس بیرکھ کو لے جاہے۔

اس ناہمواری کی وجہ بھی بہت ممکن ہے یہ ہو کہ للّولال نے "پریم ساگر" کہانی اردو میں لکھی ہو، پھر اصلاح سے اسے غیر ملکی لفظوں سے پاک کیا، اور کھڑی بولی میں برج کا مشرن کیا۔ کچھ غیر ملکی لفظ اور اردو کا طرز باقی رہ جانا بھول چوک ہے

رانی کیتکی کی کہانی میں بھی انشاؔ کا دعویٰ کہ کسی اور بولی کا پُٹ نہ ملے، سو فیصدی پورا نہیں ہو۔ لالٹین کے لفظ کی نشاندہی کی جاچکی ہے۔ کہ بیانیہ اردو / ہندی میں رچ بس گیا ہے۔ اسے انشاؔ نے فارسی الاصل نہیں سمجھا۔ منہ سیقی کے ایک ساز کے لئے منہ چنگؔ کا ذکر بھی انشاؔ کی کہانی میں ہے۔ چنگؔ فارسی لفظ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے رنگؔ اور چنگؔ بھی آریا اپنے ساتھ تختِ جمشید اور بہستون کے علاقے سے لائے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید "پریم ساگر" میں رنگ برنگؔ کے بجائے درن درنؔ نہ لکھا جاتا۔ شاید آریا یہاں آنے کے بعد یہ دو لفظ بھول گئے۔ ژالؔہ (مختفی سے) آریا یالہ لائے تھے۔ جس طرح یمناؔ کا تلفظ جمناؔ اور ایودھیا کا اجودھیاؔ ہو گیا، اسی طرح ژالؔہ جلؔ ہو گیا، لیکن درمیان کی کڑی یلؔ کا ہونا ممکن ہے۔ یہ پروٹو انڈو یوروپین ذخیرے کا لفظ ہے، جو پانی کے معنون میں تلفظ کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ مختلف یورپی زبانوں میں موجود ہے۔ انگریزی میں Jelly اسی سے مشتق ہے۔

انشاؔ کے اسی زمانے میں رانی کیتکی کی کہانی لکھنا، جب کلکتہ میں میرامنؔ نے "باغ و بہار" لکھی، ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے، اور اتفاق سے کچھ زیادہ بھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ للّولال نے جس زمانے میں عربی، ترکی اور فارسی لفظوں کو "پریم ساگر" سے نکالا، اسی زمانے میں انشاؔ نے بھی رانی کیتکی کی کہانی میں ایسا کیا۔ ایسے اتفاقات ایک ساتھ ہوں، تو لامحالہ دھیان اس طرف جاتا ہے کہ یہ اتفاق سے کچھ زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ انشاؔ نے صرف تدبھو یا رائج تت سم رانی کیتکی کی کہانی میں رکھے۔ جہاں مجبور ہو گئے وہاں غیر مانوس الفاظ کا سہارا انھیں بھی لینا پڑا۔ لیکن پنڈت للّولال نے تدبھو چاندؔ کو بھی چندرؔ اور چندرماؔ کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ صرف زبان اس تحقیق کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ایک پہلو، جو اتفاق سے کچھ زیادہ ہے، اور جس کی طرف کسی محقق نے توجہ نہیں کی، زبان کے تناظر میں خود بخود ابھر رہا ہے۔ شبہ ہے کہ انشاؔ بھی فورٹ ولیم کالج جانے کی خواہش اپنے دل کے کسی گوشے میں رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے "حسب الحکم گورنر

جنرل بہادر دام ملکہ "فورٹ ولیم کالج کے لیئے میرزا کاظم علی اور مظہر علی خاں ولاّ کا تقرر کیا تھا۔ میر تقی میرؔ نے بھی شاید درخواست دی تھی۔ کرنل اسکاٹ کے روبروان کی پیشی ہوئی، لیکن وہ عمر زیادہ ہونے کی وجہ منتخب نہیں کئے گئے[1]۔ انشا کا رانی کیتکی کی کہانی لکھنا حسن طلب بھی ہو سکتا ہے۔ قتیلؔ نے دریائے لطافت کا دوسرا حصّہ لکھا تھا۔ قواعد کا انشاؔ نے لکھا تھا۔ اور قتیلؔ مرشدآباد میں تھے۔ اور نہیں تو یہ اتفاق عجیب ہے!

زیادہ تفصیل میں جانا، موضوع تحقیق سے دور لے جائے گا۔ لیکن یہ پہلو تحقیق اور سنجیدہ توجہ چاہتا ہے۔

دکن میں ادب اور شاعری کی نہج وہی تھی، جو شمالی ہندوستان میں تھی، کیونکہ ہندوی کی قلم دلّی ہی لے جاکر لگائی گئی تھی، اور جب محمد تغلق نے دلّی سے دارالسلطنت، دولت آباد منتقل کیا، تو اس قلم کی آبیاری ہوئی، اور یہ تناور درخت ہی نہیں بنا، بلکہ اس کی نسل بھی بڑھی، اور گلزار کے گلزار کھل گئے۔ شمالی ہندوستان کی زبان میں ارتقائی تبدیلیاں ہوئیں، جو ذولسانیات کا لازمی نتیجہ تھیں۔ لیکن جو مثالیں ہم نے دیکھیں، ان میں شعوری طور پر فارسی (عربی، ترکی) الفاظ نہیں لائے گئے تھے۔ ۱۶۴۵ء میں صنعتی کے "قصہ بینظیر" میں یہ شعر ملتا ہے:

دکھیا کم سہنسکرت کے اِس میں بول
ادک بولنے تے رکھیا ہوں امول

اس بیت میں دو باتیں نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ آہنگ کسی فارسی بحر کا نہیں، بلکہ خالص ہندوستانی رائج آہنگ ہے۔ دوسرے یہ کہ ادِق کو رائج صوتیات کے مطابق اَدک رکھا گیا ہے۔ جمیل جالبی نے صنعتی کے اس شعر کے رجحان کا تجزیہ یوں کیا ہے[2]

"یہ وہی رجحان تھا، جو شمال میں ایک ڈیڑھ صدی پہلے شروع ہو چکا تھا، اور جس کی وجہ سے وہاں اردو زبان، دکنی سے بہت پہلے، جدید اسلوب سے قریب آگئی تھی اس فرق کا اندازہ اس وقت آسانی سے ہو سکتا ہے، جب افضل پانی پتی کی

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد؛ ص ۱۳۹۔
[2] جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) ص: ۱۹۳۔

"بکٹ کہانی" (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء) اور مقیمی کی 'چندر بدن و مہیار' کو ایک ساتھ پڑھا جائے۔ دونوں تقریباً ایک ہی زمانے کی تصانیف ہیں۔ دونوں کی زبان پر ہندوی اثرات موجود ہیں۔ لیکن سنسکرتی اثرات نے مقیمی کی مثنوی کی زبان کو مشکل بنا دیا ہے، اور برخلاف اس کے فارسی زبان کے اثرات نے افضل کی 'بکٹ کہانی' کو موثر اور شگفتہ بنا دیا ہے جیسے ہی دکن میں اس بات کو محسوس کیا گیا، دکنی اردو بھی، سنسکرت کے اثرات سے آزاد ہو کر، فارسی کی طرف جھکنے لگی۔"

زبان کوئی کیمیاوی مرکب نہیں، جس میں تیزابی اور کھاری اجزا کی مقدار مقرر ہو۔ یہ کوئی مکسچر بھی نہیں، جس میں اجزا مرضی کے مطابق رکھے جائیں۔ زبان ایک طرح سے نامیاتی ہوتی ہے۔ انسانی چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی، انسانی چہرے ہوتے ہیں اسی طرح زبان کی پہچان بھی واضح ہوتی ہے، لیکن مختلف علاقوں کی زبان میں اختلاف ہوتا ہے۔ ہر ادیب کا اسلوب اپنا ہوتا ہے، اور یہ اسلوب زبان سے متعین ہوتا ہے۔ خود ایک ہی ادیب، ہمیشہ ایک سی زبان نہیں لکھتا۔ اس لیے جمیل جالبی نے جو تجزیہ کیا ہے کہ دکنی اردو بھی سنسکرتی اثرات سے آزاد ہو کر فارسی کی طرف جھکنے لگی، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ سنسکرت کے تت سم الفاظ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ پراکرت اور روپ بھرنش کے دور میں سنسکرت الفاظ کی جو صورت نکھر آئی تھی، وہ تو ٹھیٹھ ہندوی ہندی/ریختہ/اردو کے الفاظ ہوتے۔ اور جو سنسکرت کے لفظ اپنی اصلی صورت میں باقی رہے، وہ جدید زبان کے مطابق تھے۔ چنانچہ فرہنگ آصفیہ[1] میں سنسکرت الفاظ کی تعداد ۵۵۴ ہے۔ ہندی (مع پنجابی) الفاظ ۲۱۶۴۲ اور عربی، فارسی، ترکی الفاظ کی مجموعی تعداد ۱۳۶۹۴ ہے۔ یہ لغت آدرش لغت نہیں ہے، لیکن تناسب لگ بھگ یہی ہوگا۔ مگر اسی تناسب سے الفاظ نہ تقریر میں اور نہ تحریر میں استعمال ہوتے ہیں۔ صنعتی نے ایک بات لکھ دی، اس کی بنیاد پر ایسا کلیہ بنانا مناسب نہیں۔ سوداؔ، میرؔ اور غالبؔ، بہت بعد کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی ہر جگہ "سنسکرتی اثرات سے آزادی" ہر جگہ نظر

---

[1] فرہنگ آصفیہ (ترقی اردو بیورو: دوسرا ایڈیشن: ۱۹۸۷ء) جلد سوم: ص ۲۵۵۔

نہیں آتی۔ سودا کے یہ دو شعر ہیں [1]

پان کھا کھا کے آرسی کے بیچ
اپنے ہونٹوں کو دیکھتا ہے لال
میوہ نخلِ اُمید سے سودا
جتنا چاہے تو کھا پہ توڑ نہ ڈال

پہلے شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جو اردو کے دیسی ذخیرے کا نہ ہو۔ رنگ کے معنوں میں لال کے فارسی ہونے پر کچھ لوگوں کو لغات کی بنا پر اصرار ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی اور سنسکرت، دونوں ہند آریائی زبانیں ہیں، اور لال کو رنگ کے معنوں میں بھی دیسی لفظ ہی سمجھنا چاہیئے۔ اگر اسے دخیل لفظ ماننے پر اصرار کیا جائے، تب بھی تیرہ میں سے صرف ایک فارسی لفظ ہے۔ مقطع کے پہلے مصرع میں، پانچ میں سے چار فارسی/عربی/ترکی ذخیرے کے ہیں اور ایک دیسی۔ لیکن ان چار میں سے ایک تخلص ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کے آٹھوں لفظ دیسی ذخیرے کے ہیں۔

غالب کے یہاں ایسے شعر بھی ہیں کہ مصرعوں میں ایک آدھ ار دو لفظ نہ ہو تو فارسی کا شعر ہو جائے [2]

گریہ سرشاریِ شوقے بہ بیاباں زدہ ہے
قطرۂ خونِ جگر چشمکِ طوفاں زدہ ہے
فرصت آئینہ و پروازِ عدم تا ہستی،
یک شرر بالِ دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے
بیتابیِ یادِ دوست، ہمرنگ تسلّی ہے
موجِ تپشِ مجنوں، مملکشِ لیلیٰ ہے
نقدِ زخمِ تابہ کے ما کیسۂ ہیروں ریختن
یعنی اے پیرِ فلک، شامِ جوانی مفت ہے

---

[1] کلیاتِ سودا (ایضاً ؛ ۱۹۸۵) جلد اول ص ۲۳۹، ۲۴۰۔

[2] دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) ص ۲۲۲، ۲۲۹، ۲۳۹ اور ۲۵۵۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی۔
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

فارسی زدگی سے عبارت زیادہ موثر ہوجاتی ہے، اور شگفتہ بھی، اگر جمیل جالبی کا یہ خیال درست ہوتا تو غالب کو اپنے ابتدائی کلام کا بڑا حصہ نظری نہ کرنا پڑتا۔ تھوڑے سے اشعار جو متداول دیوان میں رکھے گئے، وہ صرف نمونے کے لیے۔

ذولسانیت کی وجہ سے فارسی، ترکی اور عربی الفاظ کا اردو میں، یا کسی بھی جدید ہندوستانی زبان میں آنا لازمی تھا۔ نئی اشیا آئی تھیں۔ نئے نام لئے تھے، نئے عمل آئے تھے نئے لباس تھے، نئے ظروف تھے، نئے آلے اور نئے ہتھیار تھے، نیا نظام تھا۔ عمارتوں کا طرزِ تعمیر بدلا تھا باغوں کا بھی طریقہ بدلا تھا۔ طبقے اور فوارے اور نہریں۔ ان سب کی تفصیل اس تحقیق سے اپنے ان اثرات کی وجہ سے بامعنی ہے، جو زبان پر پڑے۔ نئے تہوار، نئے تصورات، نئے آداب، نئے علوم۔ ان سب کے لئے نئے لفظوں کی بھی ضرورت تھی، اور وہ ہر علاقے کی ہندوی نے مستعار لیئے۔ اکبر کے عہد میں، جب راجہ ٹوڈرمل نے مالیات کا ریکارڈ فارسی میں رکھنے کا حکم صادر کیا، اور عدالتوں میں پرانی اصطلاحات کی جگہ نئی قانونی اصطلاحات رائج ہوئیں، تو ایسا صرف اردو میں ہوا۔ سارے ملک میں، مقامی زبانوں میں بھی یہ اثرات آئے۔ لیکن اُردو میں کچھ زیادہ۔ اس کی اور بھی وجوہ ہوں گی۔ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ادب کا طبقاتی کردار ہوتا ہے۔ جو طبقہ شرفا کا سمجھا جاتا تھا، اس میں فارسی نثر اور فارسی شاعروں کا رواج تھا تفننِ طبع کے لئے یہی ریختہ کہتے تھے۔ سنجیدگی سے ریختہ میں شاعری نہیں ہوتی۔ عوامی سطح پر ایک زبان تھی۔ لیکن خواص کی سطح پر دوسری زبان۔ تقریباً وہی صورت تھی، جو کالیداس کے عہد میں سنسکرت اور پراکرت کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ فارسی سننے پر کسی غیر مستحق کے کانوں میں پگھلا ہوا شیشہ ڈالنے کا حکم نہیں تھا۔ صوفیہ کے ملفوظات تک فارسی میں ہیں، بیچ بیچ میں ہندوی / ہندی جملے اور فقرے ہیں۔ بعد میں جب اردو نثر نے رواج بھی پالیا (فضل علی فضلی کی کربل کتھا، جو روضۃ الشہدا کا ترجمہ تھا ۱۷۳۲ء، شاہ رفیع الدین کا کلام مجید کا ترجمہ ۱۷۸۶ء، شاہ عبدالقادر کا کلام مجید کا ترجمہ ۱۷۹۰/۹۱ء اور طبع زاد قصہ مہر افروز و دلبر ۱۷۳۲-۵۹، قصہ ملک محمد گیتی افروز از مہر چند کھتری ۱۷۸۸-۸۹، شاہ حسین کا جذبِ عشق ۱۷۵۹-۹۴.....) تب بھی فارسی کو شرافت کی نشانی سمجھا جاتا رہا

خود غالب نے ۱۸۵۲ء میں اردو میں خط لکھنے کی ہمت کی۔ وہ بھی شاید مجبوراً کیونکہ فارسی نثر میں عبارت آرائی کے لئے "مہرِ نیم روز" کا کام مل گیا تھا۔ میر تقی میر نے پہلا تذکرہ نکات الشعرا لکھا۔ فارسی میں، اگرچہ یہ اردو شاعروں کا تذکرہ تھا۔ میر حسن کا "تذکرہ شعرائے اردو" بھی فارسی میں ہے۔ مصحفی کے تذکرے، جن میں "ریاض الفصحا" بھی شامل ہے، فارسی میں ہے۔ آج بڑا عجیب سا لگتا ہے، جب "تذکرہ شعرائے اردو" میں پڑھتے ہیں:[1]

"احمد گجراتی دیگر، در زبانِ سنسکرت و بھاکامی گویند، د تصانیف بسیار دارد، چوں معاصرِ شاہ ولی اللہ، ولی بود، دوسہ ریختہ نیز گفتہ ......"

اور اس کے بعد نمونۂ کلام :

شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے، در تلک گئے
پوچھی تھی کل بُتاں سے کہیں دل کی میں خبر
سو آج لا کے سر سے وہ میرے پٹک گئے
احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں
سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پانو تھک گئے

ایسا لگتا ہے کہ فارسی اور اردو عبارتیں ساتھ ساتھ لکھنے سے بھی ان دو زبانوں کا ادبی رشتہ مستحکم ہوتا گیا۔ یہ سلسلہ تذکروں سے شروع ہوا، اور ابوالکلام آزاد کے غبارِ خاطر تک، بہ اندازِ دگر، یوں چلتا رہا کہ اردو نثر کی عبارت کے ساتھ فارسی کے اشعار، ترجمہ کئے بغیر ٹانکے جاتے رہے۔ فارسی کے بہت سے محاورے اردو میں ترجمہ ہو گئے۔ مثلاً گردن زدن کو گردن مار کہا جانے لگا۔ لیکن پھر بھی سوختنی گردن زدنی آج تک لکھنے اور بولنے میں رائج ہے۔ پھر کچھ یوں بھی ہوا کہ جو لوگ فارسی کے شاعر تھے جب وہ ریختہ کہنے لگے، تو لازمی طور پر پیکر اور تصوّرات، اور ان کے ساتھ الفاظ، اور اُن کے تلازمے، ریختہ میں در آئے۔ اس فہرست میں میرزا مظہر جانِ جاناں، میرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، انشا اور اسداللہ خاں

---

[1] میر حسن : تذکرہ شعرائے اردو (اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵) ص : ۱۲۔

غالبؔ سبھی شامل ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر محمد حسن[1]

"یوں تو ولی کے یہاں بھی متأخرین شعرائے فارسی کے اثرات ملتے ہیں لیکن
شمالی ہند میں طبقۂ اولیٰ کے شعرا نے واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔
چنانچہ حاتمؔ لکھتے ہیں:

'در شعر اے فارسی بطرز مرزا صائب و ریختہ بطور ولیؔ . . . .
اوقات خود بسر می برد و ہر دو استاداں می داند'

(دیوان زادہ حاتم مخطوطہ رام پور)

سوداؔ نے جن فارسی شاعروں کا ذکر اپنے اشعار میں مختلف انداز سے کیا ہے،
اُن میں محتشم کاشی، وحشیؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، جامیؔ، فیضیؔ، ہلالیؔ، خسروؔ، حافظ
جمالیؔ، انوریؔ، مولانا رومؔ، صائبؔ، بیدلؔ اور شیخ علی حزیںؔ قابلِ ذکر ہیں۔
خود صائبؔ کا مصرعہ:

'گرفتہ ایم اجازت ز باغباں تنہا'

کی تضمین کی ہے فاخرؔ مکیں کی ہجو میں۔ فارسی شعراء اور فضلاء میں سب سے
پہلے صائبؔ ہی کا ذکر کیا ہے:

صائبؔ کے ہے اشعار کا ہر ایک ثنا خواں — کہتے ہیں فصیحی کر نہیں بیہودہ زباں داں
فیضی و ابوالفضل کو طوطی کہیں ناداں — از ہوش ربودند کہیں ہرزہ سرایاں
غیر است چرا ایں ہمہ بے ہوش نشستی"

فارسی کلام کی اکثر تضمین اردو میں ہوتی ہیں۔ فارسی شعر اور مصرعے اقبالؔ تک نے اس
بے تکلفی سے استعمال کئے ہیں جیسے کالیداس کے ڈراموں میں اعلیٰ طبقوں کے کردار
سنسکرت بولتے ہیں۔ خواتین اور نچلے طبقوں کے کردار پراکرت بولتے ہیں۔ جو رشتہ
سنسکرت اور پراکرت میں تھا، وہ رشتہ لسانی اعتبار سے فارسی اور اردو میں نہیں ہے،
لیکن ادبی رشتہ اسی طرح کا بن گیا۔ زمینیں تک اردو شاعروں نے فارسی
شاعروں سے لیں۔ مثلاً سوداؔ کی ایک غزل، بارہ اشعار کی ہے۔ آخری

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن: دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر؛ پہلا ایڈیشن ۱۹۶۴ء، ۲۳۲-۲۳۳۔

دو شعر ہیں:[1]

سوداے کہا میں کر ترے شہرے کو شن کر
دیکھا جو تجھے اُکے تو اے بے سرو پا ہیچ
بولا کر تجھے یاد ہے وہ مصرع بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

غالب نے سودا کی کئی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ بیدل کی یہ زمین سودا ہی کے یہاں سے ان کو ملی۔ غالب کی ایک غزل، سات شعروں کی، غیر متداول کلام میں ہے، مقطع ہے:[2]

اُہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

فارسی مصرعے استعمال کرنے کی روش سے بھی اردو شاعری کی زبان پر گہرا اثر پڑا، اور اس نے اس اسلوب کو بدل دیا، جو بھاکھا کے متوازی اُبھر رہا تھا، یا ارتقا پذیر ہو رہا تھا۔ فارسی الفاظ ضرور زبانوں پر چڑھ گئے تھے، لیکن شعروں میں خوشبو یہیں کی مٹی کی تھی۔

میخانے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

سراج الدین خان آرزو کا یہ شعر کم و بیش ہر تذکرے میں (جس میں ان کا ترجمہ ہو) ملتا ہے۔ میخانہ خالص ایرانی ادارہ ہے۔ لیکن اس شعر میں ایرانی فضا نہیں ہے۔

ایک طرف ایرانی روایات کی پروردہ شاعری ہو رہی تھی، اور دوسری طرف وہ شاعری تھی، جس کا خمیر یہاں کی مٹی سے اُبھرا تھا۔ شاہ مبارک آبرو کے شعر ہیں:[3]

لٹک چلنا سجن کا بھولتا اب تک نہیں مجھ کو
طرح وہ پاؤں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

---

[1] کلیاتِ سودا، جلد اوّل (ترقی اردو بورڈ ایڈیشن) ص ۲۲۰۔
[2] نسخۂ حمیدیہ: ص ۶۴۔
[3] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو: ص ۱۴۔

نہ چھوڑے گا پیا رے جی کسی کا
تمہارا ہنس کے یہ کہنا اجی کا
کہتا ہوں میں پکار سنو کان دھر سجن
جو اور سے ملوگے تو دیکھو گے ہم نہیں

اور یہ شعر ہے ایک درویش شاہ ولی اللہ اشتیاق کا، جو مجدّد الف ثانی کے خانوادے سے تھے[1]

چھوڑ کر تم کو ہمیں اور سے جو لاگ لگی
نہیں یہ منہدی ترے تلوے سے ہے آگ لگی

یہ دو شعر میر شبیر علی افسوس کے ہیں[1]

اُس کے اُٹھتے ہی جی پہ اُن پڑی
دیکھیے آگے آگے کیا ہو گا
بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں، نہ رو سکتے ہیں
چپکے بیٹھے ہوئے ایک ایک کا منہ تکتے ہیں

مغل سلطنت جب ہچکیاں لے رہی تھی، اور ہر ہچکی آخری معلوم ہوتی تھی، ایک "شہنشاہ"، شاہ عالم بھی تھے، جن کی تاریخی اہمیت غلام قادر روہیلہ کی وجہ سے ہے۔ غلام قادر کو بچپن میں یرغمال کے طور پر رکھا گیا تھا۔ پھر شاہ عالم نے اس کو اختہ کرا کے، اپنا منظورِ نظر بنا لیا، اور قدسیہ باغ میں اسے زنانہ کپڑوں میں ملبوس رکھا جاتا تھا۔ کسی صورت سے وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، اور پھر عذاب بن کر لال قلعہ اور اس کے مکینوں پر نازل ہوا۔ اس نے شہزادیوں اور شہزادوں کو بے عزت کیا، شاہ عالم کو نابینا کیا اور شاہی خاندان کے افراد کو اذیتیں دیں۔ شاہ عالم نے حرماں نصیبی سے پہلے حورانِ ارضی اور غلمانِ ارضی سے اسی دنیا کو جنت بنا لیا تھا وہ شاعر بھی تھا۔ فارسی، ریختہ اور بھاکھا، تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اپنے پہلے دور میں آگرے سے دلی جاتے ہوئے، مادھو راؤ پٹیل کے لیئے یہ کبت کہا تھا[3]

---

[1] ایضاً ص ١٦۔ [2] ایضاً ص ٣٠۔

[3] امتیاز علی خاں عرشی، نادراتِ شاہی، ص ٣٧۔

ملک و مال سب کھوے کر پڑے تمہارے بس

مادھو ایسی کیجیو اُوسے تم کو جس

زبان کے دو دھارے، گنگا جمنا کی طرح تھے۔ ایک عوام کی زبان، جس کے کچھ نمونے پیش کئے گئے۔ یہ شعر ان شاعروں کے نمائندہ، یا ان کی زبان اور پیکر تراشی کی حقیقت کو پوری طرح پیش نہیں کرتے۔ ناہمواری فکر اور بیان کے سلسلے میں اس دور کے ہر شاعر کے یہاں ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ فارسی کی جکڑ ان کے ذہنوں پر مکمل اور مطلق کے درجے میں نہیں تھی۔ اردو شاعری میں ایک ایسا موڑ آیا کہ دو روایتوں کے جو دو دھارے قریب آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ پھر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ منظر نامہ بہت الجھا ہوا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کئی ابعاد ہیں۔ محمد حسن لکھتے ہیں:[1]

"اتفاق سے ہندی شاعری میں صنعت گری کا زمانہ، جو ریتی کال کے نام سے موسوم ہے، مغلیہ دورِ حکومت کا آخری زمانہ ہے۔ یوں تو ریتی کال کی مدت لگ بھگ دو صدی قرار دی جاتی ہے۔ اس کی ابتدا سترہویں صدی عیسوی کے وسط ہی سے مانی جاتی ہے، اور شاہ جہاں کے دور کی شان و شوکت، نشاط اور آراستگی، رومان اور حسن کاری، ریتی کال میں صنعت گری اور عشق و نشاط کے غلبے کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس دور کی دو خصوصیات اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اس دور کی شاعری نے بھگتی کال کی مذہبیت کے بجائے، عشق و نشاط کے اس میلان کی، اور مضمون آفرینی، اور نازک خیالی کے اسلوب میں دونوں اعتبار سے، وہ فارسی شاعری سے، اور جہانگیر دارانہ فضا سے متاثر ہوئی جس طرح ولی نے اس بات کی کوشش کی کہ ریختہ میں فارسی اسلوب کو ڈھال لیا جائے، اور مضمون آفرینی، لطافت اور مٹھاس کو اپنا لیا جائے۔ اس طرح کی کوشش ریتی کال کے دورِ متوسط کے شعرا نے بھی اپنے طور پر کی، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب اور ایرانی کرداروں اور تلمیحوں کو اختیار نہیں کیا، جس سے اُن کی شاعری کا بنیادی آہنگ۔ برج بھاشا ہی کا رہا، لیکن

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن: دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر: ص ۲۷۸۔

انکی شاعری کے آہنگ پر فارسی اثر کا انکار ممکن نہیں۔ پنڈت رام چندر شکل لکھتے ہیں:

> "الفاظ کے ساتھ ساتھ کچھ تھوڑے سے شاعروں نے عشق کی شاعری کی پوری صنائی کا ذخیرہ تک اٹھا کر رکھ لیا ہے، اور اُن کے جذبات بھی باندھ گئے ہیں۔ اس ندھی کی لکھی ہوئی رتن ہزار میں یہ بات بد مذاقی کی حد تک پائی جاتی ہے۔ بہاری ایسے پختہ کار شاعر بھی اگرچہ فارسی جذبات کے اثر سے نہیں بچے ہیں، مگر انھوں نے ان جذبات کو اپنے ملک کے سانچے میں ڈھال لیا ہے، جس سے وہ کھٹکتے کیا، اکثر ظاہر بھی نہیں ہوتے۔ ان کی درد ہجر کی کیفیات میں دُور کی سوجھ اور نازک خیالی بہت کچھ فارسی اسلوب ہی کی ہے"

ایسی کتابیں کم ہی ہوتی ہیں، جو رائج زبان کو یکسر بدل کر رکھ دیں۔ پنڈت للّولال "پریم ساگر" یقیناً ایسی کتاب ہے، جو اپنے اسلوب کے اعتبار سے تو نہیں، لیکن اپنی زبان کے اعتبار سے ہندی کی رس شیلی کا نقطۂ آغاز ہے جسے بھارتیندو ایسے ادیب نے ہندی کی سنسکرت شیلی کہا۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ انشاؔ اور للّولال دونوں نے "بدیسی" لفظوں کے بغیر کہانی لکھنے کے نمونے پیش کیئے۔ للّولال نے بدیسی لفظوں ہی کو نہیں، لفظوں کے زبانوں پر چڑھے ہوئے اس روپ کو بھی مسترد کر دیا، جو صدیوں میں جبڑا توڑ مصتوں کو، مصوتوں کی آمیزش سے خوش آواز اور خوش آہنگ بنانے سے نکھرا تھا۔ پراکرت اور اپ بھرنش کے مرحلوں سے گذر کر راتر، رات بنی تھی۔ للّولال جی نے رات سے راتر کی طرف مراجعت کرائی۔ "پریم ساگر" کی زبان لسانی احیاء پرستی کی علامت بن گئی۔ زبانیں دو طرح کی ہوتی ہیں، رائج زبانیں۔ یہ زندہ زبانیں ہیں۔ دوسری وہ زبانیں، جو پرکھے اپنے ساتھ لے گئے۔ نہ پرکھے زندہ کئے جا سکتے ہیں، اور نہ پرکھوں کی زبانیں۔ ہم ان زبانوں کو علمی حیثیت سے پڑھ کر، اپنے ماضی کے خزانوں تک تو پہنچ سکتے ہیں، لیکن ہم ان زبانوں کو زندہ زبانوں کی طرح رائج نہیں کر سکتے۔

"پریم ساگر" کی زبان کی پشت پر جو جذبہ تھا، تجزیہ کریں، تو وہ کوئی نیک

جذبہ نہیں تھا۔ زبان ترسیل کا ذریعہ ہے۔ ماضی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی ترسیل کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے براہِ راست، جو اُس زبان پر دسترس رکھتے ہیں، اور باقیوں کے لیے ترجموں کے ذریعے سے۔ جس تک بات پہنچانا ہوتی ہے، اس کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔ مخاطب کی زبان نہ جاننے والوں کو ترجمان کی خدمات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر ماضی کی زبان، جو رائج نہ ہو، وہ لکھی جائے تو ترسیل صرف اُن سے ممکن ہے جو زندگی کی سرحد کے پار جا چکے ہیں۔ ان کے لئے صرف دعائے مغفرت، یا ان کی آتما کے لئے شانتی کی دعا کی جا سکتی ہے، وہ بھی اگر روح / آتما میں یقین ہو۔ للولال جی کے لیے بدیسی الفاظ اُن کے قائم مقام ہو گئے، جن کے ساتھ یہ الفاظ آئے تھے۔ اور یہیں سے زبان میں فرقہ واریت کا عنصر پیدا ہوا۔ للولال جی کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ دیوناگری لپی کی پیش رو لپی براہمی کس طرح وجود میں آئی تھی؟ شاید آج بھی بہت سے احیاء پرستوں کو اس بات کا علم نہ ہو کہ A.A. Macdonell نے India's Past میں A.L. Basham نے The wonder that India was میں اور Romila Thapar نے Story of India میں اس موضوع پر کیا کچھ لکھا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے:

"رگ وید کے عہد میں قبائلی زندگی سادہ تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں پیچیدگی آ گئی۔ ویدوں کے آخری زمانے میں دستکاریاں زیادہ واضح اور زیادہ مہارت والی تھیں، اور تجارتی لین دین نے بھی زیادہ منظم صورت اختیار کی۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اُبھرنے کے ساتھ ساتھ ہوا، کیونکہ اب قبائلی زندگی کی جگہ جاگیرداری نے لے لی تھی۔ رگ وید میں جن دستکاریوں کا ذکر ہے، ان کے علاوہ اب جوہری، سنار، دھاتوں سے اوزار اور برتن بنانے والے، رسی بٹنے والے، ٹوکریاں بنانے والے، رنگریز، بڑھئی، کمہار اور دوسرے پیشہ ور الگ الگ ہو گئے اور پھر ان کی انجمنیں (گلڈز) بنیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور پیشے بھی تھے۔ ان میں قسمت کا حال بتانے والے، مداری اور نٹ، بانسری بجانے والے، ناچنے اور گانے والے بھی شامل تھے۔ ہاں ایک گروہ اور تھا، اور یہ سود خواروں

کا۔ گویا ساہوکاری اور تجارت نے ساتھ جنم لیا۔ حساب کتاب کیسے رکھا جاتا تھا، اس کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں ہے۔ موریہ عہد سے پہلے سکّے اور تحریر کا کوئی طریقہ رہا ضرور ہوگا، چاہے کتنا ہی ابتدائی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کا ذکر نہیں ملتا۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ چھٹی صدی ق م کے آخر تک ایرانی اثر سے سکّے کا رواج ہوا ہوگا، اور مال کے بدلے مال کے لین دین کے بجائے، یا اس کے ساتھ ساتھ سکّوں میں بھی حساب کتاب ہوتا ہوگا۔ ویدک عہد کے آخری حصّے میں ایک بہت بڑے سیلاب کی داستان ابھرتی ہے۔ بابل سے اس داستان کے خدّ و خال ملتے جلتے ہیں، اور ماہروں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں میسوپوٹامیہ (بابل، نینوا) سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات تھے۔ ہندوستان کے مغربی حصّے سے، خیال ہے کہ دراوڑ نسل سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی تاجر میسوپوٹامیہ سے حروف کا نظام لے کر آئے جو انھوں نے ہندوستانی آوازوں کے لئے پہلے تو جوں کا توں استعمال کیا، پھر اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کیں۔ ایک زمانے کے تجربوں کے بعد وہ رسم خط نکھرا جسے براہمی رسم خط کے نام سے آج موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی تاجر ۲۲ حروف شام کے ساحلی علاقوں سے لائے، جہاں فونیشیا کی ریاست تھی، اور یہ فونیشی رسم خط تھا۔ میسوپوٹامیہ کی طرح یہاں کی زبان بھی سامی نسل کی ایک شاخ، اسیریائی تھی ظاہر ہے شروع میں یہ بھی داہنے سے بائیں لکھی گئی ہوگی۔ اور ۲۲ حروف میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرکے ۴۲ آوازوں کے لئے اسے نئی صورت دی گئی تو کچھ عرصے تک تو خط کی سمت وہی داہنے سے بائیں رہی ہوگی، لیکن بعد میں بائیں سے داہنے کردی گئی۔ یہ محض قیاس نہیں ہے۔ . . . . . . برصغیر میں اشوک کے جتنے کتبے ہیں، شہباز گڑھی اور منسہرا کو چھوڑ کر، سب مقامات میں براہمی ہیں۔ یہ براہمی رسم خط موجودہ دیوناگری اور دوسری ہند آریائی زبانوں (مثلاً بنگلہ گجراتی وغیرہ) کا پیش رو ہے۔

براہمی کے سارے کتبے، ایک چھوڑکر، بائیں سے دائیں ہیں۔ لیکن یراگڈی
(آندھرا پردیش) کے کتبے میں سطریں بالترتیب بائیں سے دائیں اور
دائیں سے بائیں ہیں۔ چونکہ کھالوں یا بھوج پتر وغیرہ پر لکھی ہوئی
دستاویزیں باقی نہیں رہیں، اس لئے یہ اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل
نہیں کہ خط کا رُخ پہلے دائیں سے بائیں تھا۔ اس خیال کی تصدیق ایک
سکّے سے بھی ہوتی ہے، جو مدھیہ پردیش کے مقام ایرن میں ملا[1]
دیوناگری لپی، جن کے رسم خط سے مستعار ہے، ان کے لفظوں کو "پستک نکالا"
دینا، اور پھر دہی تحریر اپنانا، کچھ متضاد سی بات معلوم ہوتی ہے۔ زبان سے اگر
تدبھو خارج کرنا تھے، اور ماضی ہی کی طرف جانا تھا، تو جدید رسم خط میں کیوں؟
براہمی رسم خط کے وجود میں آنے سے بھی پہلے کے تت سم شبدوں کو استعمال کرنا
ایسا ہی ضروری تھا، تو رسم خط کے سلسلے میں کم از کم براہمی تک تو واپسی کا سفر
کیا ہوتا۔ اُردو رسم خط بھی اسی نسل سے ہے، جس نسل سے دیوناگری کا تعلق ہے۔
لیکن شاید یہ بات للّولال کو نہیں معلوم تھی، ورنہ شاید انھوں نے نیا رسم خط بھی
ایجاد کیا ہوتا۔

لسانی احیاء پرستی کا لسانی فرقہ پرستی میں بدلنا ایک المناک سانحہ ہے۔ عربی،
فارسی اور ترکی کے لفظوں کی طرح اُردو رسم خط کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ انیسویں
صدی میں مغلوں کی حکومت برائے نام تھی۔ لیکن ہندی ادب کی تاریخوں میں اس
کو مغل سامراج کہا جاتا ہے۔ "ہندی ساہتیہ کا برہت اتہاس" میں "جس پر ڈاکٹر
راجندر پرساد کا پیش لفظ ہے۔ اور جس کے مرتبین میں رام دھاری سنگھ دنکر
اور ڈاکٹر نگیندر وغیرہ کے نام ہیں، ایسا لکھا گیا ہے۔ فرقہ پرستی کا زہر میٹھا بھی ہوتا
ہے، اور اس کا سرور، نشیلی دواؤں کی طرح حقیقتوں کے احساس سے دور
کر دیتا ہے، اور اس کا شکار ایک ایسا ماضی اپنے تصوّر میں پیدا کر لیتا ہے،
جو کبھی ماضی تھا ہی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد اردو پر یلغار شروع ہوگئی۔ اس

---

[1] رسم خط۔ ایک جائزہ: مضمون مشمولہ "اردو ادب" ۱۹۸۶ شمارہ (۱ و ۲) ص: ۷۹ - ۸۱۔

کے بارے میں حالی جیسے سنجیدہ ادیب نے سرسید کی سوانح عمری میں کچھ تفصیل دی ہے[1]:

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں (کذا) کوشش کی جائے، اور بجائے اس کے بھاشا زبان (کذا) جاری ہو، جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا، اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ان کا یہ بیان ہے کہ:

انھیں دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیر سے، جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا، اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے"

یہ زبان کا مسئلہ تھا کہ جس نے سرسید کے دل میں شبہات پیدا کیئے۔ اگرچہ وہ فرقہ پرست نہیں ہوئے، لیکن انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو صرف مسلمانوں کی بھلائی تک محدود کر لیا۔ فلاحی کاموں میں ان کے مخلص ہندو دوست بھی اُن کے ساتھ تھے، لیکن یہ دوسرا موضوع ہے۔ ہم حالی کے بیان پر واپس آتے ہیں[2]:

"غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں، جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لئے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی: حیات جاوید: دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ (ترقی اردو بیورو، نئی دلی) ص ۱۳۸۔

[2] ایضاً: ص ۱۳۹۔

مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں، اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی، جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔

یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ انھیں دنوں میں لفٹنٹ گورنر بنگال، بھاگلپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے، اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو ایڈریس ایسی اُردو میں دیا گیا، جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کیئے گئے تھے، اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو، جو ہمیشہ بنگال میں رہا ہو، آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے، کہ جس طرح بنگالہ میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہوگیا ہے، اُسی طرح صوبہ بہار میں بھی بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کیئے جائیں۔ چونکہ ہزآنر ایڈریس کے بہت ہی کم الفاظ سمجھے تھے، انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہے، یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے۔ اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انھوں نے چند روز بعد حکم دے دیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حرف، اور جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے، جاری ہو۔ مسلمانوں نے، اور بہت سے قدیم وضع ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں۔ الہ آباد کے صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلے کی تحریک کے لئے منعقد ہوئے، اور آخر کار مجلس کے سکریٹری، بابو سرودا پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسیدؔ سے خط وکتابت شروع کی۔''

۲۷ر نومبر ۱۸۶۸ء کے "سائنٹفک سوسائٹی (ص ۷۵۴) میں سنڈیال کے خط کے جواب میں سرسیدؔ کا خط چھپا تھا۔ سرسید کے جواب سے واضح ہے کہ ان کو کیا لکھا گیا ہوگا۔ اس خط کا اہم حصّہ یہ ہے،[۱۷] جو ۲۷ نومبر ۱۸۶۸ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا تھا۔

۱۷؎ عتیق صدیقی: سرسید احمد خاں - ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۸۱، ۱۸۲۔

"اخبار پائنیر مطبوعہ ۲۳ ستمبر میں اخبار انگلش مین کے حوالے سے ایک اشتہار مندرج ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"ہوم گورنمنٹ ملک کی تمام عدالتوں میں اردو یا کسی خاص دیسی زبان کا رائج ہونا نہیں چاہتی۔ بلکہ اس کی رائے کے موافق ہر عدالت میں وہ زبان رائج ہونی چاہیئے جو اس ضلع کی زبان ہو"

یہ اشتہار الہ آباد انسٹی ٹیوٹ میں لوگوں کی نظروں سے گذرا، اور اس کے ممبروں نے پچھلے اجلاس میں اس کی نسبت بہت کچھ گفتگو کی۔ مگر چونکہ اکثر لوگ یہ بات جانتے تھے کہ علی العموم جمیع معاملات میں اور خصوصاً ملک کی بہبودی کے معاملات میں جب آپ سے کسی قسم کی رائے طلب کی جاتی ہے، تو آپ نہایت مناسب، اور بے رو رعایت رائے دیتے ہیں۔ بایں لحاظ ان لوگوں نے مجھ سے تحریک کی کہ میں آپ سے ہندوستان کے شمالی اضلاع کے دفتروں میں ہندی رائج کرنے کی نسبت دریافت کروں"

اس خط سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ ہندی اور دیوناگری لپی عدالتوں میں رائج کرنے کے لیئے جو لوگ تحریک چلا رہے تھے، انھیں سرسید کی دیانت پر پورا بھروسہ تھا، اور وہ سرسید کو فرقہ پرست نہیں سمجھتے تھے۔

۲۔ عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی رائج کرنے والے خود کیا زبان لکھنے اور بولنے میں ستعمال کرتے تھے۔

نسٹی ٹیوٹ گزٹ مخالف کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں ہچکچاتا نہیں تھا۔ یّد کا قیام اس زمانے میں بنارس میں تھا۔ وہیں سے انھوں نے ۸ نومبر کو ب لکھا ہلے

۵ مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) حصہ دوم ص ۲۶۷-۲۶۹ (اکتوبر ۱۹۶۰ ایڈیشن)
حیات جاوید میں حالی نے نام ستنڈیال لکھا مکاتیب میں نام سرودا پرشاد سنڈل لکھا گیا ہے۔

"میری دانست میں اس طرح بیان کرنا کہ ہندی زبان اضلاعِ شمال و مغرب کی موجودہ مخلوط زبان ہے، جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے، دو مختلف باتوں کو ملا دینا ہے، اس لئے کہ زبان فی نفسہ اور چیز ہے، اور کسی خاص قسم کے حروف میں اس کا لکھا جانا اور بات ہے۔ میرے نزدیک اضلاعِ شمال و مغرب و صوبۂ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان شائع ہونا چاہئیے، جس کو آپ ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں، لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں۔

اس باب میں گفتگو کرنا کہ وہ دیوناگری یا فارسی یا انگریزی حروف میں لکھی جاوے، محض بے فائدہ بات ہے، اس واسطے کہ خود عدالتوں کے کاروبار سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اس کو کس قسم کے حروف میں لکھنا مناسب ہے، اور کون سے حروف ہمارے کام کے انجام کے لائق ہیں۔

اگر کوئی شخص فارسی حروف کو ترک کرنے اور ان کی جگہ اور حروف قائم کرنے کی نسبت مستحکم وجوہ پیش کرے، اور یہ اطمینان کر دے کہ بغیر کسی دقت کے ہندی حرفوں سے ہماری کاربراری ہو سکے گی، تو پھر میں حروفِ مجوّزہ کے جاری ہونے کی نسبت کچھ اعتراض نہ کروں گا۔

سرودا پرشاد نے ۱۲ نومبر کو ایک اور خط سرسید کو لکھا۔ ۱۴ نومبر کو سرسید نے اس کا جواب بھی دیا[1]

"جو کچھ میں نے ہندی زبان کی تعریف کی نسبت آپ کو پہلی چٹھی میں لکھا تھا، اس سے حقیقت میں میری یہی غرض تھی کہ زبان کا پسند کرنا اور بات ہے۔ اور جن حروف میں وہ لکھی جائے، اُن کا پسند کرنا اور

---

[1] ایضاً

بات ہے۔ اور اسی وجہ سے بحث وگفتگو میں وہ دونوں معاملے جدا قرار دینے چاہئیں۔ اِن دونوں کو شامل کر دینے سے آپ کی چٹھی میں وہ بات لکھی گئی ہے، جو ہندی زبان کی تعریف میں ٹھیک ٹھیک شامل نہیں ہو سکتی۔ مگر جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ہندی زبان سے خاص ہندوستان کے باشندوں کی زبان مراد ہے، تو میں آپ سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔

میں آپ کی صرف اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں کہ وہ زبان، اور اُردو زبان ایک نہیں ہے، اس واسطے کہ آپ اپنی پہلی چٹھی میں یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ ہندی زبان سے آپ کی مراد اضلاع شمال مغرب کی موجودہ مخلوط زبان ہے۔ پس یہ مخلوط زبان سوائے اُردو کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور آپ کا یہ فرمانا کہ اُردو زبان میں فارسی کے بہت سے لفظ مخلوط ہیں، بجا نہیں ہے، اس واسطے کہ فارسی کے لفظ اُردو میں وہی لوگ زیادہ ملا دیتے ہیں، جو فارسی زیادہ جانتے ہیں، اور جو فارسی نہیں جانتے، وہ نہایت رواجی اور عام استعمال کے لفظوں میں بولتے ہیں، جیسے قدیمی رومی زبان جاننے والا اپنی اصل انگریزی زبان میں رومی لفظ اور جملے ملانے کا شائق ہوتا ہے۔ یا سنسکرت کا ماہر بھاکا زبان میں سنسکرت کے لفظ ملانے سے باز نہیں رہتا۔

جو لوگ اُردو زبان میں مشہور مصنف ہیں، وہ ہرگز نامناسب طور سے دو زبانوں کو نہیں ملاتے۔ چنانچہ میر دردؔ کے دیوان، اور باغ و بہار کے دیکھنے سے معلوم ہوگا۔

جب آپ کے نزدیک ہندی زبان ان اضلاع کی موجودہ مخلوط زبان ہے، تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں اور اُردو میں کیا فرق ہے۔ پس جب ان دونوں زبانوں میں امتیاز نہیں ہے، تو پھر تبدیلی کے کیا معنی، اور ایک زبان کے بجائے دوسری زبان کیسے رائج ہوگی۔

علاوہ اس کے، آپ کی تحریر سے کہ یہ تبدیلی اصلی زبان کی ترقی کا باعث ہو گی، نہایت تعجب ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ میرے ذہن میں

یہ بات نہیں آئی کہ تمام دنیا میں کوئی اصلی زبان بھی ہو۔ پس ناچار، میں آپ
کی تحریر سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ شاید اصلی زبان سے آپ کی مراد ملک
کی زبان ہو گی، اور ہم لوگوں کی نسبت آپ ہندی زبان یا اُن اضلاع
کی موجودہ مخلوط زبان کو ہمارے ملک کی زبان کہتے ہوں گے، جس کو
میں اُردو کہتا ہوں "

زبان کا مذہب یا فرقے سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی ملک میں ایسا نہیں یہ مسئلہ صرف اس ملک میں ہے، کیونکہ مفادِ خصوصی نے خود کو سات پردوں میں چھپا کر اُس کھڑی بولی اُردو کو اپنی شناخت بنایا، جس میں سے نہ صرف عربی فارسی اور ترکی لفظ نکال دیئے گئے ہوں، بلکہ کھڑی بولی نے جنھیں تراش خراش کر ٹکسالی لفظ بنا دیا تھا۔ اُردو کا وہ روپ، جس سے فارسی اور فارسی کے ساتھ آنے والے لفظ، اور پراکرت کے وہ لفظ، جو اپ بھرنش کے نگار خانے سے سنور کر نکلے ہوں، تت سم سے بدل کر ہندی کا سنسکرت روپ یا شیلی کہا گیا ہے۔ اپنی اس غلط شناخت کو باعث فخر سمجھا گیا۔ سنسکرت میں چونکہ وید، اُپنشد اور شاستر ہیں، اس لئے ہندی کی سنسکرت شیلی کو مذہبی تقدس بھی مل گیا، اور باقاعدہ اس کو مذہبی جنگ بنا دیا گیا۔ ہندی کی سنسکرت شیلی کو رائج کرنے کے لئے جنگ، ہندی کے اخباروں میں نہیں، اُردو کے اخباروں میں لڑی گئی۔ اردو سے مقبول نہیں تھی ہندو مذہبی کتابیں، رامائن، مہابھارت اردو میں چھپ رہی تھیں، اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ گورکھپور کے گیتا پریس کی رامائن، مہابھارت اور شریمد بھاگوت گیتا ہر ہندو گھرانے میں پڑھی جاتی تھیں۔ بیسویں صدی، جنوری ۱۹۸۹ کے شمارے میں ص ۴۳ پر دیہاتی پستک بھنڈار، دلی کا ایک اشتہار پورے صفحے پر۔ اس میں ان دھارمک کتابوں کا اعلان ہے:

تلسی رامائن، سکھ ساگر (شریمد بھاگوت مہاپران)، شیو مہاپران، بالمیکی رامائن، مہابھارت، درگا سپت شتی، پریم ساگر (شری للولال جی کرت کرشن لیلا) بچوں کا بھاگوت، گنگا کبیر، بھجن مالا، کبیر جوگ، برہمانند بھجن مالا، شریمد بھاگوت گیتا، شریمد باگوت مہاپران۔

یہ تو قیمتی کتابیں ہیں۔ کم قیمت کی یہ کتابیں ہیں:

ہنومان چالیسہ، گنگا بھگتی ساگر، درگا چالیسہ، ستیہ نراین کتھا، گنگا ایشور پرار تھنا، کبیر دوباولی تلسی دوباولی، شیو چالیسہ، آرتی سنگرہ وغیرہ!

ہر شہر میں سڑکوں کے کنارے مذہبی یا نیم مذہبی کتابیں اردو ہندی میں اب بھی بکتی ہیں باقاعدہ اس کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کئے جائیں تو حیران کن نتائج سامنے آئیں گے۔

بنارس کے بابو فتح نراین سنگھ کی تحریک، فرقہ وارانہ ڈگر پر آ گئی۔ الہ آباد کی مرکزی کمیٹی کے بابو سرودا پرشاد کی سرسید سے جو خط و کتابت ہوئی، اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نادرست شناخت کی تلاش میں اُردو کو ختم کرنے کے لئے تحریک زور پکڑنے لگی۔ سرسید اس سے دل برداشتہ ہوگئے۔ حالی کے لفظوں میں[1]

"یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا۔ آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی، اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کئے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں، اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے، گورنمنٹ میں بھیجی (کذا) سنا گیا ہے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر، سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی۔ مگر کمیٹی کامیاب نہیں ہوئی، اور غالباً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہوگئی کہ فارسی خط اور اُردو زبان کی اشاعت، بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔"

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے، ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اُردو کی مخالفت کا پھر موقعہ ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ، شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کئے گئے۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایتِ اُردو قائم کی، اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجی (کذا) مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا، بلکہ ایک بہت بڑا

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۱۴۳

پولٹیکل مسئلہ ہے۔۔۔۔۔۔

حالی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں افراط و تفریط سے خود کو بچایا حقیقت پسندی، اور بیان میں توازن ان کی سرشت ہے۔ اُردو ان کی زبان تھی لیکن باوجود اس کے، انھوں نے معروضی حالات کا ہمیشہ خیال رکھا، اور زمین آسمان کے قلابے ملانے سے احتراز کیا۔ لکھتے ہیں[1]

"ہندوستان میں کوئی زبان اُردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصّوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے، مگر ایسا کوئی حصّہ نہیں، جہاں اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے، اور اسی بنا پر ۱۸۲۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامّل بھی ہو، تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کو بھی تامّل نہیں ہو سکتا۔

حالی نے گاساں و تاسی کے ایک خطبے کا اقتباس بھی دیا ہے[2]

"فرانس کے مشہور اورنٹیلسٹ، گاساں وتاسی، جنھوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے، وہ اس متنازع فیہ مسئلے کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں:

"ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلادے۔"

گاساں وتاسی کا بیان تکلیف دہ بھی ہے، اور افسوسناک بھی۔ اُردو اور اس کے رسم خط کے خلاف تحریک کچھ ہندو حضرات نے چلائی تھی، لیکن انھیں سارے ہندو فرقے کی نہ صرف تائید حاصل تھی، بلکہ وہ بہ ظنِّ خود "ہندو مفادات" کے علم بردار بن گئے تھے۔ جس علاقے میں یہ تحریک چلائی گئی، وہاں خواندگی کی شرح سارے

---

[1] ایضاً، ص: ۱۴۱۔
[2] ایضاً، ص ۱۴۱۔

ہندوستان میں سب سے کم تھی۔ پانچ سات فیصدی سے زیادہ خواندگی کا اوسط نہیں تھا۔ اور ہر تعلیم یافتہ اُردو فارسی پڑھے ہوتے تھے۔ تعلیم یافتہ ہندو گھرانوں میں مرد اردو ہی پڑھتے تھے، اور خواتین زیادہ تر دیونا گری میں پڑھتی تھیں۔ بول چال کی زبان ایک ہی تھی۔ شہروں اور گاؤں کی رائج زبان اور بولی میں فرق تھا۔ ہندو حضرات اردو پڑھتے تھے، اور ان کے صحیفے بھی اسی لئے فارسی رسم خط میں تھے، جو ہر سال اسی رسم خط میں بھی، دیونا گری کے علاوہ چھاپے جاتے تھے پنجاب میں تو یہ صورت تقسیم ملک کے بعد بھی رہی۔ پنجابی صوبے کی تحریک کی وجہ سے ہماچل پردیش کے وجود میں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اگر ہماچل کی سرکاری زبان اُردو نہ ہوتی۔ لسانی بنیادوں پر پردیش بنتے وقت اگر ہماچل کی سرکاری زبان ہندی ہوتی، تو علاقہ ہریانہ میں ضم ہوتا، اور اگر پنجابی سرکاری زبان ہوتی تو علاقہ پنجاب کا حصہ بن گیا ہوتا۔ ڈاکٹر پرمار ہماچل کی آزادانہ شخصیت کے قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ ہماچل کی سرکاری زبان اردو ہی رہی۔ یہاں تک کہ لسانی تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد ہماچل پردیش جب وجود میں آگیا، تو وہاں کی سرکاری زبان ہندی اور دوسری سرکاری زبان اردو رکھی گئی۔ چنانچہ ہماچل میں اردو کے خلاف کوئی لسانی یا فرقہ وارانہ تحریک پہلے کبھی تھی اور نہ آج ہے۔ زبان کو کس طرح فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والوں نے استعمال کیا ہے، اور کس طرح مردم شماری کے سلسلے میں کھیلے ہوئے ہیں، اس کے بارے میں پی سی چٹرجی اپنی کتاب سیکولر ویلوز فار سیکولر انڈیا میں لکھتے ہیں[1]

> A critical issue, which has turned the Sikhs to search for their identity on the basis of religion rather than on other criteria, has been that of language. In pre-pOrtion days, the vernacular was Punjabi and the commonly accepted script for secular purposes for Muslims, Hindus and Sikhs was the Persian or Urdu Script. It

---

Secular Values for India By P.C. Chatterji (P.296-297)

can safely be said that most Punjabi Hindu males were familiar with the Urdu script and their competence in Hindi and the Devanagri.

Script was rudimentary at best. It was Hindu women who knew Hindi in the Devanagri script. With the Muslims practically ousted[1] from Punjab and with Hindi in the Devanagri script as the National language, the Urdu script could, with some show of reason, be counted out. But it is nevertheless extraordinary and perhaps unique that Punjab Hindus, as a result of tutoring by the Arya Samaj and the Jana Sangh, repudiated Punjabi as their mother tongue and opted for Hindi. From the 1951 Census onwards the Arya Samaj advised Punjabi Hindus to declare Hindi, not Punjabi, as their mother tongue. As a result of this vigorous, if nor virulent propaganda, the percentage of Punjabi-speaking people fell from 60% to 41% between 1951 and 1961. The impact of this on the Sikhs is graphically brought out in the following :

'He (Hindu) overnight fell in love with Hindi in Devanagri script-of which he was as ignorant as of Gurmukhi-and just to oppose the Sikhs he began to clamor for Hindi to be made the only

court language in East Punjab. The money-minded Hindu, the secularist Hindu, the Muslimized Hindu, who never seriously revolted against Urdu and Persian in the Punjab, who has not even now learnt one word of his classic language, Sanskrit, and pronounces Hindi in the Arabic accent, has pitted his full force against his mother tongue Punjabi,.....The Hindu discovered all the beauties of Devanagri, and his love for it returned to him on the day when it became the official script by an Act of Parliament..... If that position of vantage had been given to Chinese or even Arabic, the Hindu would not have minded much.' [2]

زبان کو فرقے کے ساتھ جوڑکر، اسے فرقہ وارانہ سیاست، یا فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لیے استعمال کرنا ایک طرح سے مفاد خصوصی رکھنے والے عناصر کے لئے ایک کارگر حربہ بن گیا ہے۔ اردو اور ہندی کا علاقہ ایک ہے۔ اس علاقے میں اردو کو اس کے

---

[1] مراد ہے Official language کیونکہ آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں ساری زبانیں جن کا ذکر ہے، National languages ہیں۔

[2] Hindus and the Punjabi State by Kalid, O.P.; Hindi Prachar Sabha, Ambala 1955, quoted in Storm Over Sutlej, Pp 99-100. Diebold

حق سے محروم رکھا گیا۔ پنجاب میں مردم شماری میں دھاندلی کرکے سکھوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے مذہب کو اپنی لسانی اور شناخت بنائیں، کیونکہ جن غیر سکھوں کی مادری زبان پنجابی تھی، اور پنجابی ہے، وہ مردم شماری میں اپنی زبان کچھ یوں لکھاتے ہیں "ساڈی زبان ہندی ہے"۔ فرقہ وارانہ عصبیت کے ساتھ ساتھ لسانی عصبیت ایک رجحان کے طور پر سنجیدہ تحقیق چاہتا ہے۔ لسانی عصبیت اور فرقہ وارانہ عصبیت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، اور اگرچہ یہ سکہ جعلی ہے، لیکن بازارِ سیاست میں رائج ہو گیا ہے۔ کھلی ہوئی فرقہ پرست جماعتیں، کھُل کر بات کرتی ہیں۔ ڈھکی چھپی فرقہ پرست جماعتیں، سیکولرزم کا لبادہ اوڑھے، لسانی عصبیت کا عملی مظاہرہ کرکے فرقہ پرستوں کی آنکھوں کا تارا بنتی ہیں۔ پی سی چٹرجی اور اوپی نے جس رجحان کی نشاندہی کی ہے، اس کا براہ راست سلسلہ ۱۸۶۷ء میں اس سبھا سے جا کر ملتا ہے، جو بنارس میں بابو فتح نراین سنگھ کے گھر پر ہوئی تھی، اور بالواسطہ سلسلہ للولال کی "پریم ساگر" تک پہنچتا ہے، جو ۱۸۱۰ء میں چھپی تھی، کیونکہ اسی نے وہ شیلی دی جسے بھارتیند و ہندی کی سنسکرت شیلی کہتے ہیں۔ ہندی کی اس سنسکرت شیلی کو ہندوؤں کے فرقہ پرست عناصر نے اپنی قومی شناخت بنا لیا، گویا ۱۸۱۰ء سے پہلے ان کی کوئی شناخت ہی نہیں تھی۔

لسانی عصبیت کا رجحان چونکہ اردو پر اثر انداز ہو رہا ہے، اس لیئے خرابی کی اس صورت کو سمجھنا مفید ہو گا۔ ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہم کسی بھی طرح اس ملک کے "اصلی" باشندوں، اور ان کی زبان یا زبانوں تک نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ نگریٹو، آسٹرک، دراوڑ، آریا، عرب، ترک، ایرانی (نسلاً آریا) سبھی آئے۔ اپنے ساتھ وہ اپنی زبانیں اور کلچر لے کر آئے۔ جب دو مختلف زبانیں اور ایک کلچر ایک علاقے میں اکھٹا ہوتے ہیں، تو دونوں میں لین دین ہوتا ہے۔
A.Richard Diebod, J.R. لکھتے ہیں لہ

INCIPIENT BILINGUALISM By A. RICHARD DIEBOLD, JR. included in LANGUAGE AND CULTURE, A Reader edited by DELL HYMES of the University of Pennsylvania. Pp. 459-460.

"It is assumed that when there is contact between two societies whose members speak different languages, there will result certain linguistic and other cultural changes which must be attributed directly to the fact of contact. This will be evident upon examination of the change subsequent to the contact of two groups. Language contact and culture contact universally result in the transfer of elements from one system to the other, by a process which has been variously labeled borrowing or diffusion. This transfer of elements produces systematic change which might be called CONVERGENT, since it involves a degree of merging of two separate systems. ...Convergence in our sense is a concomitant of culture contact as well as language contact. Such merging is excluded from biological systems: speciation produces infinite bifurcation, but mutual infertility of different species prohibits subsequent biological merging. Biological change is totally divergent. Linguistic and cultural change, on the other hand, is rarely if ever free from convergence."

ہندوستان زمانۂ ما قبلِ تاریخ سے زبانوں اور کلچروں کی آمیزش کی آماجگاہ رہا ہے۔ جب آریا، ایران سے یہاں آئے، تو دراوڑوں کی شہری تہذیب (موہنجو داڑو اور ہڑپا) یہاں موجود تھی۔ ظاہر ہے اُس نے اپنے سے پہلے آئی ہوئی اقوام (نگرٹو، آسٹرک) کے اثرات جذب کئے تھے۔ آریاؤں نے پنجاب میں ڈیرے ڈالے تو انھوں نے دراوڑوں کے کلچر سے شیو اور گنگا کے علاوہ زبان میں معکوسی آوازیں لیں۔ دراوڑ، جو آریاؤں میں شامل نہیں ہوئے، اور جنوب کی طرف ہجرت کر گئے، وہ بھی اپنے ساتھ سنسکرت الفاظ کا ذخیرہ لے گئے۔ پھر جب عرب سندھ میں آئے، تو ان کی ایک دین سندھی زبان کا رسمِ خط ابھی تک موجود ہے۔ پنجابی اور اُردو نے فارسی نستعلیق خط لیا، لیکن سندھی نے عربی خط لیا، جو برِّصغیر کی واحد زبان ہے، اس اعتبار سے۔ ترک اور ایرانی جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ ترکی، فارسی اور عربی الفاظ بھی لائے۔ ان کی زبان فارسی تھی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف اپ بھرنش جدید ہندوستانی زبانوں کے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔ انھیں کو امیر خسرو نے ہندوی کہا ہے، اور اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ فارسی بولنے والوں کے الفاظ ہندوی زبانوں میں گئے۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع اردو ہے، یا وہ زبان جو آج اردو کہلاتی ہے۔ ان بیرونی اثرات سے ادب میں نئی اصناف آئیں۔ دخیل الفاظ بھی آئے۔ خود فارسی میں ہمارے دیسی ذخیرے کے الفاظ گئے۔ لین دین صرف لفظوں کا نہیں، بلکہ کلچر کا بھی تھا۔ فارسی نے ہندوستان سے کلچر کے جو عناصر لیئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ہونے والی فارسی شاعری (امیر خسرو، فیضی، غنی کاشمیری کو چھوڑ کر) سبکِ شیراز اور سبکِ اصفہان کے لئے ناقابلِ فہم اور محاورے سے دور جا پڑی۔ اسی لئے اہلِ ایران نے ہندوستان کے فارسی شاعروں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ کلچرل لین دین کا ایک نمونہ یہ ہے کہ "کچھ بھی نہ تھا" کو "خاک نبود" اہلِ ایران نہیں مانتے اور نہ سمجھتے تھے۔ غالب نے ایک خط میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اہلِ ایران ایسے موقع پر "ہیچ نبود" کہتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو ہی کے یہاں نہیں، تقریباً ہر شاعر کے یہاں ہندوستانی الفاظ ہیں۔ الفاظ ہی نہیں تصوّرات بھی۔ باہر سے آئی ہوئی زبان چند نسلوں تک ہی زندہ رہ سکتی تھی لیکن

جو اثرات اس کے ہندی / اردو پر ہوئے وہ باقی ہیں۔ لسانی اثرات ثقافتی اثرات
کے ساتھ لکھتا ہے:[1]

"Contact and convergence between two different languages or cultures results in a sociological situation wherein the same individual learns elements from a linguistic or cultural system other than his native system. Linguists refer to this learning process as Bilingualization. The individuals situation as LANGUAGE CONTACT and to the particular learning process as BILINGUALIZATION. The individuals so involved are called bilingual. Linguistic change resulting from such contact is called Borrowing or Interference. Anthropologists refer to the learning situation as Culture Contact and to the particular learning process as Acculturation.... Bloomfield introduced the term Intimate Borrowing to cover, somewhat unfortunately, both the sociological learning situation and the linguistic results : ...we can usually distinguish between ordinary cultural borrowing and the Intimate Borrowing which occurs when two languages are spoken in what is topographically and politically a single community (1933, p.467) Bloomfield spoke of the upper or dominant language, which many speakers of the lower language learn, although few or no speakers of the lower language learn, although few or no speakers of the dominant conversely

---

[1] ایضاً

learn the lower. `The practical background of this process is evident. The upper language is spoken by the dominant and privileged group; many kinds of pressure drive the speaker of the lower language to use the upper language' (1933 p.426)

Viewed historically, either of two principal sociological results can follow from language contact in a given speech community. First, there may be indefinitely prolonged bilingualism, such that both languages continue to be learned, although perhaps in determinably different contexts and functions. Alternatively, one of the two languages may fall into disuse, such that fewer and fewer and finally no new speakers learn it. In the later case we speak of a language shift, and bilingualism ceases with the death of the last speaker of the language that is no longer learned.'

لسانیات میں زبان وہ ہے جو بولی جائے۔ جو اصول ڈائی بولڈ نے، بلوم فیلڈ کے حوالے سے بیان کئے ہیں، وہ فارسی کے ہندوستان کے آنے کے بعد لسانی منظر نامے کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ غوری اور سلطنت کے زمانے میں آنے والی نسل کی زبان فارسی یقیناً تھی۔ لیکن اگلی پیڑھیوں کی بھی زبان فارسی تھی، ایسا سمجھنا شاید درست نہ ہو۔ ایرانی اور ترکی امرا برابر آتے رہے۔ ان کی ایک پیڑھی کے بعد زبان فارسی نہیں ایک آدھ گھرانے میں اگر ایسا ہوا تو اسے استثنیٰ کے خانے میں رکھا جائے گا۔ بابر کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ ہمایوں کی زبان بھی فارسی مانی جا سکتی ہے۔ اکبر بھی ذولسانی اگر نہیں تھا، تو

اس کے بعد یقیناً ذولسانی تھی۔ لیکن فارسی انتظامی امور میں استعمال ہوتی رہی۔ اگر راجہ ٹوڈرمل نے مالیات کے ریکارڈ فارسی میں رکھنے کے احکامات جاری نہ کیئے ہوتے، تو شاید فارسی کا چلن ختم ہوگیا ہوتا، اور فارسی شاعری کا رواج غالب کے عہد تک باقی نہ رہا ہوتا۔ اُردو کے لیئے سند قلعۂ معلّٰی کی زبان سے لینے کی بات، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قلعہ کی زبان مدّتوں سے دیسی تھی۔ ان حالات میں، غالب زبان کی حیثیت سے فارسی زبان کی عمر ہندوستان میں بہت کم رہی۔ انتظامی معاملات تک، "تاخط و کتابت تک فارسی کا محدود ہو جانا فارسی کے غیر رائج زبان ہونے کی دلیل ہے۔ صرف وہ لوگ فارسی سیکھنے پر "مجبور" تھے جن کا تعلق انتظامیہ سے تھا، یا جو اسے شرافت اور فصاحت کی نشانی سمجھ کر اس میں دستگاہ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ کچھ اس ملک کا مقدر رہے کہ جو زبانیں بولی نہیں جاتیں، وہ علم اور فضیلت کی نشانی بن گئیں۔ یہی سنسکرت کے ساتھ ہوا، اور یہی فارسی کے ساتھ ہوا۔ "اعلیٰ ہندی" لکھنے والے سنسکرت شبدوں کا پریوگ کرنا، اور "اعلیٰ اردو" لکھنے والے فارسی (عربی و ترکی) لفظوں کے "نگینے" عبارتوں میں جڑنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاؤ۔ بولڈ لکھتے ہیں:[1]

"Linguistic interference paralles the sociological situation of bilingualism. Given two languages in contact, it is discovered that the relationship of dominant to lower discussed by Bloomfield with reference to bilingualism obtains also with reference to interference: 'In all cases ... it is the lower language which borrows predominantly from the upper. Accordingly, if the upper language survives, it remains as it was, except for a few cultural loans, such as it might take from any neighbour...if the lower

---

لہ ، ایضاً ص ، ۹۴ ۔

language survives, it bears the marks of the struggle in the shape of copious borrowings (1933, p.464) There is, then, a recurrent imbalance, for two languages in contact at any one point in time. Linguistically this is reflected in the fact that interference in the lower language is marked, while negligible or wholly absent in the dominant language.

بلوم فیلڈ نے جو لسانی کلیہ پیش کیا ہے، اس کی صحت مسلم ہے. لیکن اس کسوٹی پر کسنے کے لیے ہمارے پاس یہ اعداد و شمار نہیں ہیں کہ اُردو کے پاس کل کتنے لفظوں کا سرمایہ ہے۔ اس میں بنیادی ذخیرے کے کتنے لفظ ہیں، تت سم اور تد بھو۔ اور کس زبان کے کتنے دخیل الفاظ ہیں۔ فرہنگ آصفیہ[1] کی بنیاد پر کوئی تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۱۸ء میں لغت کی تدوین (وقتِ نظرِ ثالث) جیسی ہو سکتی تھی، مولف نے بڑی محنت کی۔ لُغت کے آخر میں مولف نے ص ۰۵۵۲ پر جو نقشہ دیا ہے، اس کے مطابق بنیادی ذخیرے اور دخیل الفاظ کی تعداد یوں ہے:

ہندی مع پنجابی	۲۱۶۴۴
اردو	۱۷۵۰۵
عربی مع معرب	۷۵۸۴
فارسی	۶۰۴۱
سنسکرت	۵۵۴
انگریزی	۵۰۰
مختلف	۱۸۱

ان میں ترکی، یونانی، پرتگالی، عبرانی، سریانی، رومی، فرنچ، پالی، برہما، ملاباری اور ہسپانیہ شامل ہیں۔

لہ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (تین جلدوں میں) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

چوّن ہزار" نو لفظوں" میں صرف دو لفظ پالی کے بتائے گئے ہیں۔

سچدانند بھٹاچاریہ کی کتاب[1] میں اشوک کے پہلے کتبے (گرنار — جوناگڑھ، کاٹھیاواڑ) کا جو متن دیا گیا ہے، وہ اردو رسم خط میں یوں ہے (کچھ حصہ):

اِیَم دھمّ دِواِم پریےنَ رہرِنا) پریّے دسِنا راڈنا[2] لیکھا پتا ادھنَ کم پچ
جیوتّم ارھبپ تاپرجّ ہیوتّم ن پچ سماج لَت دیو بہلم ہ دوسم سماج مہ
پسّت دیوانم پریہ پریّے دسنو راڈنو پرمہان سمجھ دیوانم پریس پریے داسنو
راڈنو انوّ دِوَسم بہون پراڈنس تس ہسترہ ن ارھبش سوپا تھیہ سے اَج
یدا ایم دھمّ لپی لِکھِتات اِدِبراڈنا ارھبرے سو پا تھاییے دُو مورا ایکو مگو سوپپ
مگوَن دھو دُ اَیپتے پ تر پراڈنا پچھان ارھبرے۔

رانا، لیکھا (جواب لکھتا ہے) جیوتّم (یعنی جیون) سماج اور پراڈان (روح کے معنوں) میں پہچانے جاسکتے ہیں۔ اتنے لفظ ایک مختصر عبارت میں ہیں۔ پالی ہی ترقی یافتہ شکل اردو ہے اس لیے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی لغت میں پالی کے صرف دو لفظ بتائے گئے ہیں۔

"یاسین" عربی لفظ ٹھیک دکھایا ہے۔ لیکن "یاسین کا وقت آنا"، "یاسین سنانا" اردو "لفظ" کی حیثیت سے شمار ہوئے ہیں۔ "نفاق" ایک لفظ عربی درست لیکن نفاق پڑنا، نفاق رکھنا، نفاقنہ، نفاقتی — چار اردو "لفظ" شمار ہوئے ہیں۔ یہ تو مرکب لفظ بھی نہیں ہیں۔ ناک ایک لفظ اور اس کے بعد یہ چار "لفظ"، ناک میں دم آنا، ناک میں جان آنا، ناک میں دم کرنا کافی نہیں تھے کہ ایک اور لفظ پانچواں "ناک میں دم آنے لگا" بھی ہے۔

اس لغت میں، جس میں "اتفاق" عربی ہے، چار اردو "لفظ" اتفاق بڑھنا،

---

[1] . Select Asokan Epigraphs, by Sachchidananda Bhattacharya,

[2] اور کتبوں میں بنیادی متن یہی ہے، لیکن علاقے کی بولی کے مطابق تلفظ مختلف ہونے کی وجہ سے راجا، لاجا اور رایا بھی ہے۔

اتفاق پڑنا، اتفاق سے اور اتفاق کرنا بھی ہیں۔ "اتفاقِ رائے" اور "اتفاقِ حسنہ" عربی بتائے گئے ہیں، اور دو عربی "لفظ" شمار ہوتے ہیں۔ اضافت عربی میں نہیں ہوتی فارسی میں دخیل لفظ ہونے کی وجہ سے اضافت لگائی گئی ہے، اور اضافت کے بعد یہ ترکیب عربی کی نہیں رہی۔

ایسی بہت سی مثالیں اس لغت میں ہیں، اس لئے کسی تجزیے کو اس کی بنیاد پر پیش کرنا مفید نہ ہو گا۔ حالانکہ ڈاکٹر گیان چند نے[1] "محاوروں" اور "روزمرہ" کو انفرادی لفظ تسلیم کر لیا ہے، اور ہر "لفظ" جسے اردو بتایا گیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اس بنا پر کہ "اردو الفاظ بھی ہندوستان میں بنے ہیں" اُن کو ہندی، سنسکرت، پالی، مالا باری اور براہمی کے ساتھ جوڑ کر اُردو میں ہندوستانی لفظوں کا تناسب ½۳۰ فیصدی، اور فارسی، ترکی و سامی الفاظ کا تناسب ½۵۰ فیصدی نکالا ہے اُردو تو اردو کسی بھی جدید ہندوستانی زبان میں اور اس میں ہندی بھی شامل ہے ۳۰ فیصدی الفاظ بنیادی ذخیرے کے نہیں ہو سکتے۔

انگریزی یا دوسری زبانوں میں نہ صرف لغتیں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد چھپتی ہیں، بلکہ ان میں اُن نئے لفظوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، جو اس تھوڑے سے وقفے میں رائج ہو جاتے ہیں۔ اُردو میں ایسا نہیں ہے۔ ایک تو ہماری لغتیں سائنٹفک طریقے سے مدوّن نہیں ہوئی ہیں، بلکہ پرانی لغات اب بھی چھپ رہی ہیں۔ اردو میں بنیادی ذخیرے کے لفظوں اور دخیل الفاظ کے تناسب کا کوئی سائنٹفک مطالعہ کسی فرد کے لئے ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ نمونوں کو لے کر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ ڈاکٹر گیان چند کا اندازہ ہے کہ "اردو کی کوئی اوسط تحریر لے لیجئے۔ اس کی ایک سطر میں استعمال ہونے والے عربی فارسی الفاظ گنیئے۔ پانچ چھ سے زیادہ نہ ہونگے، جبکہ پوری سطر میں پندرہ سولہ الفاظ ہوتے ہیں۔"[2]

ڈاکٹر گیان چند کے ان چار جملوں میں کل ۳۶ لفظ ہیں، جن میں سے ۱۱ لفظ عربی / فارسی ہیں۔ یعنی ساڑھے تیس فیصدی۔ ڈاکٹر گیان چند کا اندازہ کہ

---

[1] ڈاکٹر گیان چند: لسانی مطالعے (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۸۲۔

[2] ایضاً: ص ۱۸۳ (اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ)

اوسط ۲۵ فیصدی اور ۳۳ فیصدی کے درمیان ہوگا، درست ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد جو بجا اس لفظ انھوں نے عبارت میں لکھے ہیں:

"فرہنگ کی رُو سے دیکھا جائے تو اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلے اُردو ہندی میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالہ 'اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' کے اوراق الٹیے، از ابتدا تا انتہا تمام نمونے خالص ہندی کے معلوم ہوتے ہیں۔"

ان میں ستائیس لفظ عربی، فارسی ترکی کے ہیں۔ یعنی چون فیصدی۔

تحریری زبان، تقریری زبان کی لکھی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود لسانیاتی مطالعے اور تجزیے کے لئے تحریری زبان کو بنیادی نہیں بنایا جاتا۔ لیکن ماضی میں کیا صورت تھی، اس کے لئے تحریر کو ہی بنیاد بنانا پڑتا۔ ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر عبدالحق کی کتاب میں شامل نمونوں کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے، وہ ماضی کے لسانی نقشے کے بارے میں ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ مطالعہ بھی اہم ہے، لیکن زبان چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، اور ہم ماضی کے معیار پر واپس نہیں جا سکتے، اس لئے آج کے تناظر میں اس کا بہت زیادہ فائدہ نہیں۔ ایک ہی عہد میں مختلف ادیبوں کی زبان ان کے اسلوب کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ یہی نہیں، ایک ہی لکھنے والے کی مختلف تحریروں میں، بلکہ ایک ہی تحریر میں دیسی ذخیرے اور دخیل الفاظ کے تناسب کی ایک ہی وضع نہیں ہوتی، اور اس کی مثال خود ڈاکٹر گیان چند کی تحریر ہے، جس کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

رچرڈ ڈائی۔ بولڈ اور بلوم فیلڈ نے "ڈولسانیت" کے بارے میں جو مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے، اُن کا اطلاق ہندوستان (برِّ صغیر) پر کریں تو یہ بڑی حقیقت سامنے آتی ہے کہ باہر سے آنے والی کوئی زبان باقی نہیں رہی۔ نیگرو ٹو نکوبار کی طرف چلے گئے، اور اپنی زبان اپنے ساتھ لے گئے۔ مونڈا بھی پانچ دریاؤں کے زرخیز علاقوں سے بیدخل ہوگئے۔ مدھیہ پردیش اور چھوٹا ناگپور وغیرہ میں وہ اپنی زبان کے ساتھ جنگلوں اور دشوار گذار علاقوں میں ہیں۔ ان کی زبان نے دراوڑوں کو ضرور متاثر کیا ہوگا، اور یہ خود بھی دراوڑی زبان سے متاثر ہوتے ہوں گے، اور

اب ان کی زبان اپنے علاقوں میں جدید ہند آریائی زبانوں سے متاثر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر بلوم فیلڈ نے جو بات غالب اور نچلی زبانوں کے بارے میں کہی ہے، وہ دراوڑی زبان اور ویدی زبان کے بارے میں بالکل درست ہے۔ دراوڑی زبان، ویدی زبان کے مقابلے میں نچلی زبان تھی، اس لئے شمالی ہندوستان میں اس کی وجہ سے ویدی زبان کی آویزش اور آمیزش سے مختلف علاقوں میں مختلف بولیوں نے جنم پایا۔ دراوڑ، جو ہجرت کر کے وندھیاچل کے جنوب میں چلے گئے، وہ ویدی کے دخیل الفاظ اتنی بڑی تعداد میں ساتھ لے گئے، کہ آج خالص دراوڑی علاقوں میں دراوڑی نسل کے لوگوں کے نام ویدی (سنسکرت) ہوتے ہیں۔ اگر دراوڑ جنوب نہ گئے ہوتے تو شمالی ہندوستان کا لسانی نقشہ کچھ اور ہوتا۔ دراوڑی زبان کی صرف ایک بولی براہوی پاکستان میں باقی رہی۔ خود ویدک یا سنسکرت، جو ادبی زبان بنی، باقی نہیں رہی، اگرچہ اس کے لفظ کچھ اپنی اصلی صورت میں اور زیادہ تدبھو صورت میں جدید ہند آریائی زبانوں میں زندہ ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں جو فرق مختلف علاقوں میں ہے، وہ صرف آب و ہوا اور دوسرے جغرافیائی وجوہ کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ ذولسانیت کی وجہ سے ہے۔ سنسکرت کی طرح سے فارسی بھی (عربی اور ترکی الفاظ کے ساتھ) غالب زبان رہی، لیکن نچلی سطح پر اپ بھرنشیں تھیں۔ انھوں نے جس طرح سنسکرت کے دخیل الفاظ لئے تھے، اسی طرح بڑی تعداد میں فارسی سے بھی دخیل الفاظ لئے۔ لیکن سنسکرت کی طرح فارسی بھی "زندہ زبان" کی حیثیت سے باقی نہ رہ سکی۔ نچلی سطح کی زبان، ذولسانی حالتوں میں غالب زبان سے بڑی تعداد میں ذخیرۂ الفاظ لیتی ہیں۔ یہ لسانیاتی حقیقت ہے، اس لئے ہمیں دلیلیں گھڑنے یا جواز تراشنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اچھی زبان وہ ہے جس میں فارسی عربی اور ترکی کے الفاظ کم ہوں یا زیادہ۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، یہ شورسینی اور پالی کی اپنے علاقے میں جانشین ہے۔ شورسینی میں ویدی (سنسکرت) کے الفاظ ماضی میں دخیل الفاظ تھے۔ جب فارسی آئی، اور اپنے ساتھ عربی اور ترکی الفاظ لائی، تو اس وقت تک سنسکرت (ویدی) ذخیرے کے الفاظ، نچلی زبان میں اتنے رائج ہو چکے تھے کہ ہم نے انھیں دخیل الفاظ کے بجائے دیسی ذخیرے کے الفاظ قرار دے دیا۔ یہ الفاظ، غالب زبان کے تھے، اور اس بڑی تعداد میں تھے، کہ ان کی وجہ سے "ذولسانیت" کی اس

حالت کو نہیں سمجھا، اور شمالی ہند کی تمام بولیوں کو ہند آریائی بولی مان لیا، اور آج بھی مانتے ہیں۔ "لسانیات" کے علم کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ شاید اس نظریہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے کہ شمالی ہند کی جدید زبانیں ہند آریائی نسل کی ہیں، اگرچہ گنتی کے نام پرو ٹو انڈو یوروپین نسل کے ہیں۔ انھیں بھی غالب زبان کے دخیل الفاظ سمجھا جا سکتا ہے۔

بلوم فیلڈ کا یہ نظریہ کہ غالب زبان بھی نچلی زبان سے، ذولسانی حالت میں، لفظ مستعار لیتی ہے، لیکن کم، درست ہے۔ اس کی مثالیں محمود شیرانی نے دی ہیں[51]:

" . . . خود فارسی زبان میں ہمیں ایسے لفظ ملتے ہیں، جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں۔ مثلاً بت، جو بودھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یا کوتوال، جو ٹھیٹ ہندی، یعنی کوٹ والا، بمعنی مالکِ قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامۂ فردوسی میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار
بر آویخت بار ستمِ نامدار

صاحب شرف نامہ کہتے ہیں:

"واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراساں وفارس مشہور شدہ"

ہیلاج کی بابت بھی موحب شرف نامہ کی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ایں لفظ ہندی است، کہ مستعمل در فارسی شدہ است"

اور لفظ بیلک کی تشریح میں کہتے ہیں:

"تیر شکاری دو شاخہ، ایں لغت ہندی است کہ مستعمل در فارسی شدہ"

لکھن یعنی لنگھن (روزۂ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے۔ شل یعنی سیل ہندی ہے، اور فرخی کے ہاں ملتا ہے:

بگونہ شل افغانیاں دو پرہ و تیز
چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار

چندن، فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے، جسے آج کل ہم صندل کہتے ہیں۔ برشکال (ورس کال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے۔ مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے:

---

[51] محمود شیرانی، پنجاب میں اردو (اتر پردیش اردو اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۲ء) ص ۲۹۔۳۰۔

بر شکال اے بہارِ ہندوستاں

اے نجات از بلائے تابستاں

زیادہ تفصیل میں جانا موجودہ تحقیق کے لئے ضروری نہیں۔ البتہ ایک بات کی طرف توجہ دلانا شاید ضروری ہے، اور وہ بھی اس وجہ سے کہ لسانیات کی عمر، علم کی حیثیت سے کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اردو میں تو اور بھی کم ہے۔ اُردو زبان کی تاریخیں جب نہیں بھی لکھی گئی تھیں، تو ریختہ کا وجود تسلیم کیا گیا تھا۔ حسن سنجری کی غزل کے کچھ شعر[1]

بسیار گفتم ایں سخن، اے دل بہ کس رغبت مکن

ان کی تباہی ات کٹھن بہو توں کہے سمجھائے کر

ظاہر ہے پہلا مصرع فارسی کا ہے، اور دوسرا مصرع ایک فارسی لفظ "تباہی" کے ساتھ، اپنے زمانے کی دلّی کی روزمرّہ میں ہے۔ مقطع کا کردار بھی یہی ہے:

بس حیلہ کردم اے حسن، بے جاں شدم از دم بدم

کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر

دوسرے مصرع میں کوئی بدیسی لفظ نہیں ہے۔ یہی صورت پانچ شعروں میں ہے۔ مطلع میں ردیف، و قوافیہ کی قید کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا، اس لئے اس شکستہ بحر میں، جو دراصل رجز سالم مثمن میں ہے، مصرع دو برابر کے ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے[2]۔ مطلع میں نصف، مصرعِ اولیٰ فارسی میں، اور باقی نصف ہندوی میں ہے۔ مصرعِ ثانی میں تین چوتھائی مصرع فارسی میں اور آخری مستفعلن ہندوی میں ہے:

ہر لحظہ آید در دلم، دیکھوں اوسے ٹک جائے کر

گویم حکایت ہجرِ خود باآں صنم جیو لائے کر

تاریخِ ادبِ اردو کے ص ۴۴ کے دوسرے فٹ نوٹ کے حساب سے یہ غزل "قدیم بیاض انجمن ترقی اردو، کراچی" (میں ہے)۔ اسی زمین میں ایک غزل امیر خسرو سے بھی منسوب بتائی گئی ہے۔ زبان اردو کی تشکیلِ قدیم کے لئے ہمیں ایسی مشکوک دستاویزوں پر بھروسہ نہیں

---

[1] تاریخِ ادبِ اردو، جلد اوّل (قدیم دور) مرتبہ جمیل جالبی ص ۳۵۔

[2] عروض کے اعتبار سے یہ حقیقی شکستہ بحر نہیں ہے۔

کرنا چاہیئے۔ حسن سجزی اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر تھے۔ بسنگ (ساتھ کے معنوں میں) نون ساکن سے ہے، نون غنہ سے نہیں۔ مقطع میں یہ لفظ غنہ سے نظم ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کلام حسن سجزی کا نہیں ہو سکتا۔ خالق باری جس طرح خسرو کا (امیر خسرو) کا کارنامہ نہیں ہے اور جس طرح سینہ بسینہ چلا آرہا امیر خسرو سے منسوب اکثر کلام اُن کا نہیں ہے، اسی طرح یہ کلام بھی حسن سجزی کا نہیں۔ وہ شاعر جو دوسرے مصرعے ہندوی میں کہہ سکتا تھا، اس نے پورا ایک شعر، دونوں مصرعوں سمیت ہندوی میں نہیں لکھا، کیوں؟ کیا وہ آئندہ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے ریختہ کی مثالیں گھڑ رہا تھا؟۔ امیر خسرو کے زمانے کی بول چال کی مستند زبان، صنعتِ ایہام کی وجہ سے ان کے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں موجود ہے[1]

آئی آئی بماں بیاری آئی
ماری ماری براہ ماری آئی

فارسی کا یہ مطلع ہندوی میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ما کے مطلب ماں، اور براہ کہ مطلب برہ، یعنی فراق ہیں۔ ایک بات، جو اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں سے غور و فکر اور نہایت سنجیدہ توجہ چاہتی ہے، یہ ہے کہ امیر خسرو جیسا قادر الکلام شاعر، جو جذبات سے مغلوب ہو کر، اپنے مرشد کے وصال کے بارے میں کہتے ہیں:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوندیس

کیا وہ اس قسم کا کلام موزوں کرتا:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

---

[1] امیر خسرو: غرۃ الکمال، دیباچہ

زبان بے شک "ریختہ" ہے کہ اس میں وہی پچاس فیصدی فارسی اور پچاس فیصدی ہندوی کا پیٹنٹ نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اتفاق سے زیادہ کچھ ہے کہ حسن سجزی کی غزل کی طرح اس میں بھی شکستہ بحر استعمال کی گئی ہے (فعولُ فعلن آٹھ بار شعر میں۔ نصف مصرع فعولُ فعلن فعولُ فعلن)۔ مطلع میں مصرعوں کے نصف اوّل فارسی، اور نصف دوم ہندوی۔ شعر میں وہی شعر والا نسخہ۔ پہلا مصرع فارسی اور دوسرا مصرع ہندوی۔ دوسرا شعر واضح کرتا ہے کہ فارسی روایت کے بر خلاف، اور ہندوستان کی شعری روایت کے عین مطابق عاشق عورت ہے، جو سکھی سے پیا سے دور ہونے کا دکھڑا بیان کرتی ہے۔ لیکن مطلع میں؟ پیا کی چھاتی نہیں، صیغۂ جمع میں "چھتیاں" ہیں! یہ تو بعد کی ریختی سے بھی زیادہ فحش شعر ہے۔ امیر خسرو جیسے قادر الکلام شاعر سے ایسا شعر منسوب کرنا، مزید تحقیق چاہتا ہے۔ فارسی شاعروں نے، جہاں ضرورت ہوئی، ہندوی لفظ استعمال کئے ہیں۔ "بیڑۂ پان" بعد میں میرزا مظہر جانِ جاناں (جان) نے اُردو میں باندھا۔ اس سے پہلے امیر خسرو نظم کر چکے تھے، اس لئے کہ فارسی یا عربی مترادفات اس کے لئے نہیں تھے۔ البتہ ڑ کی صوت فارسی میں نہیں ہے، اس لیے "بیرۂ پاں" لکھا۔ اور بیرۂ تنبول بھی لکھا ہے۔ اشیا کے ناموں کی وجہ سے دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال شروع ہوتا ہے۔ امیر خسرو سے دو قطعہ بند شعر منسوب ہیں:[1]

زرگر پسرے، چو ماہ پارا
کچھ گھڑیئے، سنوار ئیے، پکارا

نقدِ دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گڑھا، نہ کچھ سنوارا

دونوں شعروں کے دوسرے مصرعے، اتنی صاف زبان میں ہیں کہ اس عہد کے اسلوب میں نہیں معلوم ہوتے۔

ریختے کے قدیم نمونے، جو ادب کی تاریخوں میں ملتے ہیں، اُن کے ماخذ اپنے عصر کے نہیں ہیں، یا وہ سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ زبانی صدیوں کا سفر طے

---

[1] ڈاکٹر وحید مرزا: امیر خسرو

کرنے والے شعروں میں نہ صرف الحاقی عناصر شامل ہو جاتے ہیں، بلکہ عہد بہ عہد اُن میں لفظوں کی صورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء کے سلسلے میں جو دوہا امیر خسرو سے منسوب ہے، اس کی اور قرأتیں بھی ہیں۔ صفدر آہ یہ قرأت درست مانتے ہیں:[1]

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چہوں دیس

پیر ضامن نظامی سید بخاری کے نزدیک صحیح قرأت یہ ہے:[2]

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارد کیس
چل خسرو گھر اپنے سو سانجھ بھئی جو ندکیس

ریختہ نام زبان کے لئے تھا، اور اس وقت بھی جب اسے اردوے معلیٰ اور اردو کہنے لگے تھے، ریختہ کے نام سے بھی موسوم کرتے تھے۔ سوداؔ کا مقطع ہے:

مظہرؔ کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سوداؔ یقین جان کر دوڑا ہے باٹ کا

اور میر تقی میرؔ، کہ خدائے سخن ہیں، ایسی بات کہتے ہیں کہ جس سے ریختہ کا سلسلہ اُن کے معشوق کے توسط سے دکن تک پہنچتا ہے:

خوں گر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے کے
معشوق جو اپنا تھا، باشندہ دکن کا تھا

غالبؔ تک اسے ریختہ کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
شعرِ اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اُسی طرح ریختہ میں دو زبانیں "ملوث" ہوتی ہیں۔ جن کی بنیادی زبان فارسی تھی، انھوں نے فارسی میں ہندوی الفاظ

---

[1] مضمون مشمولہ نیا دور (لکھنؤ) امیر خسرو نمبر دسمبر ۱۹۷۴، ص ۶۶۔
[2] ایضاً ص ۴۲۔

ضرورت کے تحت استعمال کیئے، اور بے تکلف۔ اور جن کی بنیادی زبان ہندوی تھی، انھوں نے ہندوی میں فارسی (بشمول عربی و ترکی) الفاظ استعمال کیئے۔ ریختہ، یعنی ذولسانیات کا مطالعہ ہمارے یہاں اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے۔ یہ عمل نیچے کی زبان ہندوی میں اور اوپر کی زبان فارسی دونوں میں ہوا۔ آدرش صورتِ حال تو یہ ہوتی کہ نیچے سے اوپر آتی ہوئی ہندوی کی ریختہ شکل اور اوپر سے نیچے آتی ہوئی فارسی کی ریختہ شکل، درمیان میں کسی نکتہ پر آکے ایک دوسرے میں گھل مل جاتیں۔ لیکن یہ آدرش صورت اس لیئے ممکن نہیں ہو سکتی تھی کہ ہندوی زندہ زبان تھی، اور فارسی جن کی مادری زبان تھی، ان کی اگلی پیڑھیوں کے لیئے وہ "زندہ" زبان نہیں، بلکہ ادبی اور روایتی زبان ہو گئی۔ اگرچہ انتظامیہ اور خط وغیرہ لکھنے میں اس کا استعمال جاری رہا۔ فارسی کی تجدید کئی بار ہوئی۔ غلام خاندان اور اس کے بعد بھی سلاطین کے زمانے میں اکّا دکّا امرا، جنکی مادری زبان ترکی یا فارسی تھی، آتے رہے۔ بابر کے ساتھ پھر ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اکبر کے زمانے میں بھی، بلکہ بعد کے شہنشاہوں کے زمانے میں بھی کچھ خاندان آئے (ان میں نورجہاں کے والدین بھی تھے) لیکن ان اکّا دکّا خاندانوں کی آمد سے لسانی نقشے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ عرفیؔ، نظیریؔ اور دوسرے شاعروں کے آنے سے بھی، سوائے ان کی انفرادی تخلیقات کے کوئی اثر زبان پر نہیں پڑا۔ فارسی زبان کی روایات نے دیرپا اثر چھوڑا، سنسکرت کی طرح، لیکن سنسکرت ہی کی طرح، وہ کلاسیکی زبان ہو گئی، بھاشا یعنی عام بول چال کی زبان نہیں رہی۔

ذولسانیت (- bi-lingualism) کی فارسی میں پر مثال، جمالی کے ایک ایک ریختے میں ہے:

آں پری رخسار چوں شانہ بر چوٹی می کند
جاں دراز عاشقاں را عمر چھوٹی می کند
چشم را قصّاب ساز و غمزہ را خنجر کند
عشق بازاں را جدا نت. لوٹی. لوٹی می کند
چوں زند خنجر بر جانم خوں ز جانم می کند
ہمچو مرغِ نیم بسمل لوٹ. پوٹی می کند

برد رت اَیم رقیبے گویمت درغازنیست
ایں چنیں بدبخت با بد بات کھوٹی می کند
در رہِ عشقت جمالی گشتہ چوں حیران وزار
عاقبت از مفلسی درکوں لنگوٹی می کند

جمالی (متوفی ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) بابر کے زمانے کے شاعر ہیں، اور ان کا یہ ریختہ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی کی لائبریری کے ایک مخطوطے میں ہے[1]

ایک اور مثال حکیم یوسفی کا "قصیدہ درلغاتِ ہندی" ہے، جس کے تین شعر یہ ہیں:

آں کہ چشم و ناک بینی بول ابرو ہوتہ لب (کذا)
دند دنداں، کارہ گردن، گوتہ زانو مونڈ سر
کھال پوست و پڑ مغز و استخواں گو بند ہاڑ
انگلی انگشت باشد، انگوٹا انگشت نر
دست پیشانی متھ، سینہ چھاتی دست ہاتھ
موہ رو و چل رواں شو، بیٹھ بنشیں دیکھ نگر[2]

یہ شاعری نہیں، مترادفات منظوم کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے نمونے تاریخ ادب میں ملتے ہیں، لیکن حقیقی فارسی شاعری، جس میں "ذولسانیت" کی مثالیں شاذ و نادر رہیں، سوائے اس کے کہ کچھ ہندوی لفظ بلا تکلف آ گئے ہیں، تو ایسے الفاظ سنائی اور فردوسی کے یہاں بھی ہیں، جن کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ فارسی غالب زبان تھی، اس لیے اس پر خراشیں نہیں ملتیں، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ فارسی ہندوستان آتے ہی، "زندہ" زبان نہیں رہی، اگرچہ اس میں شاعری غالب کے بعد تک کچھ شاعروں نے کی۔ کلاسیکی زبان چونکہ حوالے کی زبان کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے، اس لئے اس کی روایات، اس کے پیکر اور تصوّر باقی رہے۔

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل (جمیل جالبی) ص ۵۳۔
[2] خالق باری مرتبہ حافظ محمود شیرانی بحوالہ[1] ص ۵۳

ان کی کارفرمائی اور کارفرمائی سے زیادہ گرفت، اُردو غزل پر ہو گئی، اور اس نے ایک نئے ریختے کو جنم دیا۔ اس رجحان کی تجدید عہد بہ عہد نہیں ہوئی، بلکہ ایک دم سے یہ لاوا ولیؔ کی زبان اور ولیؔ کے اسلوب میں تبدیلی کے بعد اُردو شاعری میں پھوٹا۔

شیخ بہاؤالدین باجنؔ (۱۳۸۸ء — ۱۵۰۶ء) کی زبان یہ تھی:[1]

سب پھل باری تو ہیں بھو نرا بہو بھر لیو باس
راول میرا راج کرے رکی مندر کے پاس
باجن باجن ہا جن تیرا تجھ یا بھین نا جیون میرا

(۲)

جب لگ جیب چلے ہے میری بیری کہوے شارہ پوراؤں
منہ لہو بھر لیوں تیرا ناوں کریم و رحیم تیرا ناؤں
باجن جیوے جیوے تجھ ناؤں بھر پور رو ہیا توں سبھ کے ٹھاؤں
تجھ ناوں کی میں ہوئی واری جاؤں

گرو ناؔنک کی زبان یہ تھی:

ہوئی حلال، لگے حق جائی، نانک در دیدار سمائی

ریداؔس کی زبان اس مصرع سے واضح ہے:

ریداس کی اردا س سن، کچھ حق حلال پہچان لے

سندرؔ شاعر کی زبان:

ظلم کوں کرتا ہے دمنی سوں، نڈر نا ہے دوزخ کوں بھرتا ہے خزانہ بلائی کا
ہووے گا حساب جب آوے گا نا جواب تب سندرؔ کہت گنہگار ہے خدائی کا

اکبر کے زمانے میں محل اور دربار، دونوں کی فضا میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی۔ محل میں جودھا بائی کی وجہ سے عید بقرعید کی طرح ہولی اور دیوالی کے تہوار بھی منائے جانے لگے، جس میں شہنشاہ بھی شرکت کرتا تھا۔ دربار میں فیضی، ابوالفضل ایسے فارسی کے عالم بھی تھے، اور رحمان خاناں (عبدالرحیم) جیسے فارسی،

---

[1] تاریخ ادب اُردو (جالبی) ص ۱۰۸۔

سنسکرت اور ہندی کے شاعر بھی۔ دربارِ اکبری کے ایک ہندی شاعر نرہری بھی تھے۔
اُن کی زبان یہ ہے [1]

بابر، ہمایوں، غازی صفت دوؤ من ورچ کرم اٹل سوامی تکبر
ایکن اٹھایی ایکے تھا پت جگت ہت انکھ جکھ پھرے، چھنو چکبر
گنی نرگنی ہندو ترک سکل بیبوسے رتن پتی نرہری اب ایک ٹکبر
بیرم پرو ستن خان خاناں، سے وزیر جاکے نیلاٹے ہنی سنت بلت شاہ اکبر

ایک اور نمونہ: [2]

ہیں ابو بل گج ورا ہی بھوت سانگا دل دگھ اگا وَں
بھوری گنج گجرات بہادر اتی قابل اُت گدر لو۔ لو دل
نرہری گجرت پٹھان دل جہاں لگو جونج سو رائے کہاوں
ام دھاؤں جم سنگھن گنی پراس چنپت من مانجھ ہمایوں

ہمایوں کے شہنشاہی کے دو دور تھے۔ ان دو کے درمیان شیر شاہ سوری کی حکمرانی کا دور ہے، اور اس کے بعد اس کے بیٹے سلیم شاہ کا۔ ملک محمد جائسی نے "پدماوت" شیر شاہ کے عہد میں لکھی، جس کا شمار ہندی کے ادبِ عالیہ میں ہوتا ہے۔ جائسی نے ہمایوں کا پہلا دور، اور بابر کا دور بھی دیکھا تھا۔

بابر سا چھترپتی راجا   راج پاٹ ان کہنہ دھی سا جا [3]

عہد اکبری میں ایک اہم شاعر گنگ بھی تھا [4]

کھل ملت سیس کوی گنگ من اِمت تیج روی رتھ کھسیو
خانخاناں بیرم سون جیہہ کرودھ کری تنگ کسیو

عبدالرحیم خانِ خاناں، بیرم خاں، خانِ خاناں کا بیٹا تھا، جسے اکبر نے بیرم خاں

---

[1] ڈاکٹر سریو پرشاد اگروال، اکبری دربار کے ہندی کوی ص ۳۲۱ (لکھنؤ یونیورسٹی ایڈیشن)
[2] ایضاً: ص ۳۱۹۔
[3] رام چندر شکل۔ جائسی گرنتھاولی (ناگری پرچارنی سبھا) ص ۳۴۱
[4] اکبری دربار کے ہندی کوی (اگروال) ص ۱۱۹۔

کی وفات کے بعد اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا، اور اسے اپنے باپ کا عہدہ دیا۔ روایت ہے کہ رحیم نے گنگ کو انعام میں چھتیس لاکھ روپے دیئے تھے۔

گوسوامی تلسی داس اور عبدالرحیم خانخاناں نہ صرف ہم عصر تھے، بلکہ رحیم اور تلسی داس میں گہرے مراسم تھے۔ "رام چرت مانس" کو آج مذہبی تقدس حاصل ہے، اور نہ صرف ان کی زبان، بلکہ ان کا اسلوب اس مذہبی عقیدت کی وجہ سے ناخواندہ سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ تک، سب میں مانوس ہے۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ تلسی داس کو جہاں ضرورت محسوس ہوئی، انھوں نے فارسی اور عربی کے رائج الفاظ بلا تکلف اور بلا جھجک استعمال کیئے:[1]

صاحب سبھاے کپ صاحب سنبھارتیے
رام کے غلامن کو کام ترُ رام دوت
موسے دین دو برے کو تکیہ تہارے

....

تیرے نوازے غریب نواز براجت کے ارسالے

....

توغریب کو نوازو، ہوں غریب تیرو

اور میرا بائی کا ایک بھجن جو عقیدت سے گایا اور سنا جاتا ہے، اس میں ایک مصرع ہے:[2]

رام غریب نواز، میرے رام، سری رام غریب نواز

اور

ہے ری میں تو پریم دوانی، مرا درد نہ جانے کوے
گھائل کی گت گھائل جانے، جو کوئی گھائل ہوے
درد کی ماری بن بن ڈولوں وید ملیو نہیں کوے[3]

1۔ رام چندر شکل (مرتب) تلسی گرنتھاولی (حصہ اوّل و دوم) پبلشر بھگوان دین برج رتن داس۔
2۔ میرا کے پد (سستا ساہتیہ منڈل پرکاشن)۔ 3۔ ایضاً۔ ص ۱۱۔

میرا کا یہ کرشن بھجن بھی سبھی نے سُنا ہوگا:[1]

کبھی ہماری گلی آؤ رے جیا کی تپن بجھا دے
پیارے موہن پیارے
گھائل پھر دل ترپتی پیڑا، درد جانے نہیں کوئی

اور

تلپھٹ تلپھٹ کل نہ پرت ہے درہ بان ارلاگی ری
درہ بھجنگ میرو ڈسو ہے، کلیجو لہری اہلال جاگی ری

اور یہ ہیں دادو دیال:[2]

دادو اسک اُداز سوں ایسیں کہے نہ کوئی (اسک: عشق)
درد محبت پائے صاحب حاصل ہوئی

اور

اُسک ماسوک ہوئے گیا اُسک کہاوے سوئے (ماسوک: معشوق)
دادو اس ماسوک کا اللہ اُسک ہوئے[3]

ملوک داس کی زبان میں دخیل الفاظ کچھ زیادہ ہیں، کیونکہ لفظ، خیالات اور تصورات سے جڑے ہوتے ہیں، اور ان کے اظہار کے لئے صرف وہی لفظ بے تکلفی سے استعمال کئے جا سکتے ہیں:[4]

کہتا ملوک جب توبہ کر صاحب سے،
چھانڈ دے گمراہ جن جا رسے پر چلتا ہے
قول سے بے قول ہوا کسی کی نہ لیت دعا
دوزخ کے لئے دل کون کون مارا ہے

---

[1] ایضاً ص ۱۷، ۱۸۔

[2] دادو دیال کی بانی، حصہ اوّل، پبلشر ویلویڈ بیئر پرنٹنگ ورکس الہ آباد: ۱۹۶۳ ایڈیشن ص ۲۳۔

[3] ایضاً ص ۴۰۔

[4] ملوک داس جی کی بانی (ویلویڈ پریس، پریاگ: ۱۹۶۴ء تیسرا ایڈیشن ص ۱۵۱۳۔

نرک کا لفظ موجود تھا، لیکن دوزخ کے ساتھ جو تصوّرات وابستہ ہیں۔ شاید وہ نرک سے ادا نہیں ہوتے۔ آج نرک، دوزخ اور جہنّم ہم معنی الفاظ ہیں، لیکن شاید اس وقت ایسا نہیں تھا۔ اسی طرح شیطان اور نفس کے لفظ بھی خاص مفہوم اور تصوّرات سے جڑے ہوئے ہیں۔ گناہ اور گنہ، گناہگار اور گنہگار کے لئے پاپ اور پاپی کے لفظ موجود تھے، لیکن دادو دیال نے شاید زبان کی ہمواری کے لئے دخیل الفاظ ہی کو ترجیح دی ہے[1]

نفس شیطان کو قید کر اپنے کیا دُنی میں پھرے کھا غوطا
ہے گنہگار بھی گنہ ہی کرتے ہیں کھائے گا مار بھرتے تب روتا

زبان کے ارتقا کے عمل میں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ قافیے صوتی ہوتے ہیں غوطہ اور روتا قافیے ہیں۔

ملوک داس اور دادو دیال کے یہاں تو اسلامی تصوّرات تھے۔ لیکن سور داس کے یہاں ایسا نہیں ہے، پھر بھی دخیل الفاظ بے تکلف، اور ہموار اسلوب میں استعمال ہوئے ہیں:

جائی سے کنس گھرا ہو
دوھی ماکھن گھرت لیت چھڑائے، آج حضور بلاؤ ہو

اور یہ بھی سور داس کا، کرشن بھجن کا انداز ہے:

ذات پات کوئی پوچھت ناہیں شری پت کے دربار

زبان کا تفصیل سے عہد بہ عہد ارتقا اس تحقیق سے متعلق تو ضرور ہے، لیکن پوری تفصیل مقصد نہیں۔ آہنگ کا اسلوب اور ڈکشن سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ فارسی کے نئے آہنگوں میں ہندی / ہندوی شاعروں کو تنوّع کا احساس ہوا، اور اس تنوّع کی کشش نے فارسی کے رائج آہنگ ہندی میں بھی مقبول کیے۔ ہزج سالم مثمن (مفاعیلن شعر میں آٹھ بار) کبیر کے یہاں ہے:

---

[1] دادو دیال کی بانی (بھاگ ایک) ص ۱۲۸۔

[2] سور ساگر (مرتبہ: ڈاکٹر نند دلارے واجپئی)، ناگری پرچارنی سبھا، چوتھا ایڈیشن ص ۱۵۱۳۔

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ سے، ہمن دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن سر بوجھ بھاری کیا

نہ صرف نئے آہنگ آئے، بلکہ نئی ہیئتیں بھی آئیں۔ نئے آہنگوں کے ساتھ دخیل الفاظ کی تعداد اور تناسب میں بھی اضافہ ہوا۔ تبدیلی کئی جہتوں کی وجہ سے اور کئی جہتوں میں ہوئی۔ نئی چیزیں آئیں، جن کے نام نئے تھے۔ اُن کے متعلقات کی وجہ سے اور بھی اضافے ہوے۔ جذبہ اور خیال کے لئے استعارے کی زبان بھی استعمال کرنا پڑتی ہے، ورماحول میں بتدریج یا ایک دم سے تبدیلی ہو تو تشبیہ اور استعارے بدلنا قدرتی بات ہے۔ جب گردن کا لفظ رائج ہو جائے، تو تلسی داس کا یہ لفظ رام چرت مانس میں استعمال کرنا معمول کی بات ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آج گردن باہر کا لفظ نہیں محسوس ہوتا، اور شاید کم ہی لوگوں کا اس کے دخیل لفظ ہونے کی طرف دھیان جاتا ہو۔ رام چرت مانس میں گوسوامی تلسی داس نے کہا ہے:

سو جانئی جنو گردن ماری

ایک بڑی عجیب سی بات اُبھر کر آتی ہے۔ نئے لفظوں کے استعمال کا شوق بھی کچھ لوگوں میں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب رائج زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ گھل مل جاتے ہیں، تو الگ الگ زبانوں کے الفاظ سب نہیں پہچان سکتے۔ اورنگ زیب، جس کے "رقعاتِ عالمگیری" فارسی میں ہیں، فارسی اور عربی کا عالم تھا۔ عالمگیر کی بڑی متنازعہ تاریخی شخصیت ہے۔ یہ بات اس کی معروف چھپ سے لگا نہیں کھاتی کہ وہ موسیقی کا رسیا تھا۔ اگرچہ اُس نے دربار میں موسیقی کی محفلوں پر پابندی لگا دی تھی، لیکن گوّیوں کے وظیفے برقرار رکھے تھے۔ فارسی میں ملک الشعرائی کا خطاب منسوخ کر دیا تھا، لیکن ہندی شاعروں کے لیے "کوی رائے" کا خطاب اس نے برقرار رکھا[1]۔ اورنگ زیب خود بھی ہندی (برج بھاشا) میں شاعری کرتا

---

[1] ڈاکٹر سید اسد علی: ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات: ص ۵۲ (ترقی اردو بورڈ ۱۹۷۹ء)

تھا۔ اندرونی شہادت موجود ہے کہ " بائی اودے پوری " (حرم) کے بارے میں یہ کوبتا ہے

تو گنٹ روی اودے کپنویا ہی تے کہت تم کو بائی اودے پُری
ان گن گنٹ گا ین کے الاپ وستار سر جوت دہپک
جو تو ہوں وتھا ہے دُری
جب جب گاوت تب تب اس سمدر لہریں اپجاوت
ایسی سرسوتی کون کو د پڑی
جات نمن جہان شاہ اورنگ زیب رتجھ رہے
یاہی تیں کہت تم کرو تھا روپ چا تُری

شاہ جہان نہ خود ہندی کا قدردان تھا، بلکہ اُس نے ہندی پڑھی تھی، اور اپنے بیٹوں کو بھی پڑھوائی تھی۔ داراشکوہ، اورنگ زیب ہی کا بھائی تھا، اور اس نے سنسکرت سے اوپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ سرمد کا دوست تھا، جسے اورنگ زیب نے قتل کرایا تھا۔ لیکن یہ جہاں بانی اور جہانداری کی باتیں ہیں " اودے پُری " بائی کے لئے ان چھندوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے — اور یہ اقبال یا اعتراف — کہ اورنگ زیب موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس کے قلم سے سرسوتی، علم اور فن کی د..وی کا ذکر بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے۔ دو اہم باتیں لسانی اہمیت کی ہیں۔ ایک یہ کہ شاہ اورنگ زیب کے علاوہ کوئی بدیسی لفظ نہیں ہے، اور یہ علم ہے۔ دوسری یہ کہ اُس نے سمندر نہیں بلکہ سمدر استعمال کیا ہے، اگرچہ سمندر بھی ہندی لفظ ہے۔ ایک بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ ہندی میں اورنگ زیب کی یہ شعری تخلیق اس کی شہزادگی کے زمانے کی نہیں، بلکہ اُس زمانے کی ہے، جب وہ شہنشاہ تھا۔ مغلوں میں آخری بڑا بادشاہ اورنگ زیب تھا۔ اُس نے ریختہ کی نہیں، ہندی کی سرپرستی کی۔

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ ولی جب دلّی آئے، پہلی بار، اور اپنا کلام میاں گلشن کو سُنایا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ فارسی شاعری کے یہ سارے مضامین

لہ آچاریہ چتر سین: برج ساہتیہ پر مغل پربھاؤ (پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء) ص ۲۳۵۔

اوفتادہ پڑے ہیں۔ انھیں کام میں کیوں نہیں لاتے۔ کون پوچھنے والا پڑا ہے[1]۔ یہ روایت کچھ اتنی رائج ہو گئی ہے کہ سعداللہ گلشن ولی کے رنگ میں انقلابی تبدیلی کا سبب تسلیم کئے جانے لگے، اور ولی دلی کے رنگ سخن میں تبدیلی کی وجہ بنے۔ ادبی روایتوں کی تبدیلی میں معاشرے کا ہاتھ ہوتا ہے، اور یہ کسی ایک شخص کی رہین منت نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس اہم "روایت" پر بھی غور کیا ہے[2]۔

"ممکن ہے یہ بات صحیح نہ ہو کہ سعداللہ گلشن نے ولی کو نصیحت کی تھی (۱۱۱۲ھ عالمگیری) کہ ان سارے مضامین کو ریختہ میں نظم کرو، جو فارسی شاعری میں بیکار پڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ روایت بھی قیاسی ہو کہ خان آرزو نے سودا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ 'مرزا، فارسی اب تمھاری زبان نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔۔۔۔۔۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے'، لیکن اس دور کے رجحان کے بارے میں یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی کی جگہ، اردو شاعری کو قبول عام ہوتا جا رہا تھا۔ ریختہ گوئی کا چسکا آہستہ آہستہ عام ہونے لگا۔ فارسی گھر کی بیگم تھی، جس کی عزت اور احترام، وقار اور جلال کا سکہ دلوں پر اب بھی چلتا تھا، مگر ریختہ مہدی افادی کی اصطلاح میں گھر کی وہ سانولی سلونی لونڈی بن گئی تھی، جس کا سادہ حسن دل موہے لیتا ہے۔"

لسانی تبدیلی پر ڈاکٹر محمد حسن کا خیال یہ ہے[3]۔

"۔۔۔۔ ریختہ نے ایک طرف ادب اور بول چال کی زبان کی خلیج پاٹ

---

[1] میر تقی میر: تذکرہ نکات الشعرا (ترجمہ ولی دکنی)

[2] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر: ص ۲۶۵۔

[3] ایضاً ص: ۴۴۔

دی، اور دوسری طرف عوام اور خواص کی باہمی خلیج کو پُر کر دیا۔ فارسی کبھی بھی عام۔ بول چال کی زبان نہیں بنی۔ وہ چند مجلسوں اور گروہوں کی زبان تھی۔ ایک حیثیت سے اس کی نوعیت وہی تھی، جو آخری دور میں سنسکرت کی ہو گئی تھی۔ فارسی امرا اور خواص کی زبان تھی، اور ادب و انشا کے لیے مخصوص تھی، جب کہ اردو کھڑی۔ بولی کا ایک مخصوص روپ، عوام کی۔ بول چال کی زبان بن گئی تھی (گیا تھا)۔ ریختہ نے پہلی بار شہری عوام کے جذبۂ اظہار کو زبان دی۔ ادبی زبان اور بول چال کی زبان کے فرق کو مٹایا، اور جو کام دیہات میں بولیاں کر رہی تھیں، اور ہندی شاعری کے ذریعہ سرانجام پا رہا تھا، اُسے شہر کے پیمانے پر تہذیبی ہمہ گیری اور لطافت کے ساتھ ریختہ نے پورا کیا۔ اس نے فارسی کو ذریعۂ اظہار بنانے سے گریز کیا، لیکن فارسی کی لطافت، شگفتگی، تازگی اور تہذیبی نفاست کو سمو لیا۔"

ایک بڑی عجیب سی بات، ایک حیران کن رجحان جو کھڑی بولی ہندی / اردو میں دخیل الفاظ کے سلسلے میں واضح ہے، وہ یہ کہ مسلمان تو زیادہ سے زیادہ فارسی، ترکی اور الفاظ سے دامن بچانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن ہندو حضرات باہر والوں کی زبان کے الفاظ کے استعمال کے شایقین تھے۔ اورنگ زیب، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر (ٹھمریوں، دادروں اور ہولی وغیرہ کے گیت) کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ محمد شاہ شراب رقص و نغمہ میں ایسا غرق تھا کہ رنگیلا کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ اس کی نشاط کی محفلوں میں عربی اور فارسی کا کلام نہیں گایا جاتا تھا۔ اسی کے درباری گائکوں نے، "سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیگی کو اس قدر مرغوب خاطر بنایا کہ دھرپد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ انھیں دونوں اُستادوں کے بنائے ہوئے خیال گائے جاتے تھے، اور انھیں کے راگ اب تک مستند مانے جاتے

ہیں[1] یہ سدا رنگ کون ہیں؟ بین نواز نعمت خاں۔ اور ان کی ایک بندش نمونے کے طور پر[2]

جھن جھن پائل باجے
کیسے جاؤں پی کو ملن
جاگے موری ساس ننندیا
اور دیورنیا اور جِٹھنیا
اگر سُنے مورے باگر دیکو
اور سن پاوے محمد شاہ رنگیلے

علی جواد زیدی مرزا حیرت دہلوی کی کتاب "حیاتِ طیبہ" کے حوالے سے، محمد شاہ رنگیلے کے بارے میں لکھتے ہیں:[3]

"بادشاہ کے سامنے ہر وقت تین سو برہنہ طوائفوں کا رقص ہوا کرتا تھا۔ جب تین سو کا ایک گروہ تھک جاتا تو اُن کی جگہ دوسری برہنہ طوائفیں آجاتیں۔ قلعے میں بیگموں کے چال چلن کی جو کیفیت تھی، وہ پیرس کی تماشا گاہوں سے بہت کچھ مناسبت رکھتی تھی۔ یہ بیگمیں کون تھیں؟ اکثر ڈومنیاں، بازاری کسبیاں . . . . . جن سے کسی زمانے میں محمد شاہ نے فریفتگی ظاہر کی تھی، وہ بیگم بن کے قلعے کی چہار دیواری میں مقید ہو گئی تھیں۔"

معاصر تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دار شاہ، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم، سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور محل میں اکثریت طوائفوں، ڈومنیوں، کسبیوں، اور ان کی اولادوں کی تھی۔ قلعۂ معلیٰ کی زبان انہی کی زبان تھی،

---

[1] کوثر تسنیم، "ہندستانی موسیقی کی ایک صنف، خیال" (مطبوعہ ماہنامہ آج کل، دہلی، اگست ۱۹۵۶ء، بحوالہ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر، ص: ۳۲۔

[2] ایضاً ص ۳۲ — ۳۳۔

[3] علی جواد زیدی: دو ادبی سکول: (طبع دوم) ۱۹۸۰: ص ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

اورقلعۂ معلیٰ کا محاورہ، جو کلاونتوں اور اربابِ نشاط کا محاورہ تھا، اُردو زبان کے لئے سند بن گیا۔ یہ محاورہ مغلوں کی زبان سے نہیں، لال کنور، ادھم بائی، نور بائی، پنّا بائی، تنّو بائی، اوما بائی کی زبان سے اُبھرا تھا۔ جن لوگوں نے زبانِ اردو مطابق محاورۂ قلعۂ معلیٰ، یا زبانِ قلعۂ معلیٰ کے ساتھ زبان کی پاکیزگی کا تصوّر وابستہ کر دیا وہ بعد کے لوگ تھے، جنھوں نے قلعہ کے ہر طرف دو دو کوس کسبیوں کی بستی کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کیں۔ کسبیوں، رقّاصاؤں اور طوائفوں ـــ اور خواتین شراب فروشوں کو نگاہِ کم سے دیکھنے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ اس معاشرے کا حصّہ تھیں۔ قلعۂ معلیٰ میں اُن کی زبان کا سکّہ چلا۔ یہ عوامی زبان تھی، جو قلعۂ معلیٰ میں پہنچی۔ وہاں یہ ٹکسالی زبان قرار پائی اور پھر ادب میں واپس آئی۔ قلعۂ معلیٰ کی زبان ایک Myth ہے۔ اور جو بات متھ بن جاتی ہے، اسے بقائے دوام مل جاتی ہے۔ اس تحقیق کا تعلق چونکہ اردو زبان سے بھی ہے، اس لئے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری تھا۔

جو زبان ایک طرف لال کنور، ادھم بائی، نور بائی، پنّا بائی تنّو بائی وغیرہ کی ہو، اور دوسری طرف جہاندار شاہ، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کی ہو، وہ کسی ایک فرقے کی زبان کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن اردو کو مسلمان فرقے کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ انگریز مستشرقوں نے اس ہندوستانی کو اردو کہا، جس میں فارسی الفاظ زیادہ ہوں، اور اسے مسلمانوں کی ادبی زبان بتایا۔ گریرسن[1] اور گارساں دتاسی[2] بھی ان میں شامل ہیں۔ دونوں اسے بنیادی طور سے مسلمانوں کی، اور مغربی ہندوستان کے شہروں میں بولی جانے والی زبان بتاتے ہیں۔ گریرسن اسے اُن ہندوؤں کی بھی زبان بتاتے ہیں، جو ایرانی کلچر کے اثر میں آگئے، اور گارساں دتاسی کو ہندوؤں کی اردو تصنیفات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کا اسلوب

---

[1] گریرسن: لنگوئسٹک سروے آف انڈیا، جلد اوّل، باب پندرھواں؛ ص ۱۶۴۔

[2] گارساں دتاسی: پانچواں لکچر (فارسی سے اردو میں ترجمہ (اکتوبر ۱۹۲۲) ص ۱۰۹

اختیار کیا، بلکہ اسلامی خیالات میں بھی رنگ گئے، اس حد تک کہ انھیں یہ باور کرنے میں مشکل پیش آئی کہ ہندو بھی ایسی شاعری کہہ سکتے ہیں۔

مغربی ہندی اور اردو ان مستشرقین کے نزدیک ہندوستانی کے ادبی روپ ہیں۔ ہندوستانی کے بارے میں گارساں دتاسی نے اپنے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں جو کچھ کہا، اسے مولوی عبدالحق اردو کے حق میں ایک فیصلہ سمجھتے ہیں خطباتِ عبدالحق میں ان کا بیان ہے :[1]

"گارساں دتاسی، جو اُردو زبان کے پروفیسر اور عالم، اور اس کے بڑے حامی تھے، اور جنھوں نے اپنے زمانے میں اردو کی یادگار خدمت کی، اور ایسی عمدہ دو کتابیں لکھیں، اور زبان کے متعلق ایسی قابلِ قدر معلومات مہیا کیں، جو کوئی اہلِ زبان بھی اپنی زبان میں نہ کرسکا، سنہ ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کہتے ہیں :[2]

"بہر نہج لوگوں کا خیال ہندستانی کی نسبت کچھ ہی ہو، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے، اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جاسکتی ہے۔ اس مسئلے کی نسبت کپتان اپکے مورسنے، جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں، اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے : بلاشبہ کچھ عرصے کے بعد ہندستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرلے گی۔ اس زبان کے توسط سے، لاکھوں اہلِ مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے، جو اندرونِ ملک میں ہزارہا میل

---

[1] عبدالحق: خطباتِ عبدالحق، (انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی): ۱۹۳۹ : ص ۹۸۔

[2] گارساں دتاسی: خطباتِ گارساں دتاسی: ۱۸۶۵ : ص ۵۸۴، بحوالہ مندرجہ بالا [1]

کی مسافت پھیل گئی ہے، ہندستان اور وسطِ ایشیا کے
لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ
لوگ ملتے ہیں، تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس
کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریقِ احسن
پورا کرتی ہے، اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی،
فارسی، عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ
اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان، دونوں
کے مقاصد پورا کرے۔ میرے خیال میں ہندستان کے
قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی
قدر ہندستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع
موجود ہیں۔

یہاں یہ بات اہم ہے کہ گارساں دتاسی نے ہندستانی زبان کی ساخت کے بارے میں جو بات کہی ہے، اُسے لسانیات میں ساخت کے معنوں میں نہیں لینا چاہیئے۔ یہاں گارساں دتاسی کی مراد ذخیرۂ الفاظ ہے۔ زبان ایک عمارت ہے اور اس میں الفاظ ـــــ ہندی فارسی اور عربی چُنے ہوتے ہیں۔ ساخت سے مراد ڈھانچہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ گارساں دتاسی نے ہندی کو، ہندستانی سے الگ زبان شمار کیا ہے۔ ہندی، اردو اور ہندوستانی کی سرحدیں بہت واضح نہیں ہیں۔ گارساں دتاسی کی عبارت، جو نقل کی گئی ہے، اگر ہندوستانی ہے، تو ساتھ ساتھ یہ اردو بھی ہے۔ سادہ زبان، براہِ راست کاروبار کی زبان، جو سرسیّد کا اسلوب ہے، وہی ہندوستانی ہے۔

ایک بار اردو اور ہندی زبانوں کو فرقوں سے گارساں دتاسی اور گریرسن نے جوڑ دیا، تو یہ بات روایت کی طرح ذہنوں سے چمٹ گئی۔ بابو فتح نراین سنگھ کے گھر پر بنارس میں، جو تحریک شروع ہوئی، اس نے بنارس اور الہ آباد کو لسانی فرقہ پرستی کا گڑھ بنا دیا۔ اور اس لسانی فرقہ واریت نے مہاتما گاندھی ایسے سیکولر ذہن کے مہا پرش کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ گاندھی نے

نیک نیتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کا پل بنانے کے لئے ہندی کو ہندوؤں کی زبان کی حیثیت سے، اور اردو کو مسلمانوں کی زبانوں کی زبان کی حیثیت سے ملانے کی کوشش کی۔ ان دونوں کو ملا کر وہ ہندوستانی کو تو فروغ نہ دے سکے، لیکن اس عمل میں یہ بات اُن کے، اور آبادی کے ایک بڑے حصے کے دلوں میں گھر کر گئی کہ ہندی، ہندوؤں کی زبان ہے، اور اردو مسلمانوں کی۔ گاندھی جی ایک اہم تاریخی شخصیت ہیں، اور ہندی، اردو، ہندوستانی کے لسانی منظرنامے میں ان کی تحریروں اور تقریروں کا بہت اہم رول ہے، اس لئے لائنل فیلڈن کے ہندوستان آنے تک، لسانی امور میں گاندھی جی کے نظریات کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔

اس سلسلے میں دو اہم کتابیں ہیں، جن میں گاندھی جی کی تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔ پہلی کتاب ہے "مشترکہ زبان (مہاتما جی نے کیا سوچا تھا)" جو اس وقت کے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری، قاضی عبدالغفار نے ۱۹۵۰ء میں مرتب کی تھی۔ دوسری کتاب ہے "گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ" اس کے مترجم اور مرتب ہیں مشہور صحافی عشرت علی صدیقی، اور یہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۰ء میں چھاپی۔ اب ہم اہم تحریروں، تقریروں کے اقتباسات دیں گے۔ "مشترکہ زبان" کے لئے م، "ز اور" گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ" کے لئے گ، ز کی علامتیں مقرر ہیں:

۱۔ ہر ایک پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی زبان کا — ہندو کو سنسکرت کا، مسلمان کو عربی کا، پارسی کو فارسی کا، اور سب کو ہندی کا گیان ہونا چاہیئے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی، اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیئے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانیوں کو تامل سیکھنی چاہیئے۔ سارے ہندوستان کے لئے تو ہندی ہی ہونی چاہیئے۔[1]

---

[1] ہندی سوراج ۱۹۰۹ ص ۱۲۴، بحوالہ گ ز ص ۱۳۔

۲۔ ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہندی اور اُردو دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اتری ہندوستان ہندو اور مسلمان، دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ان زبانوں میں فرق پڑھے لکھے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ پڑھے لکھے ہندو اپنی ہندی میں سنسکرت ملا دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اسی طرح لکھنؤ کے مسلمان اپنی اُردو میں فارسی ملا دیتے ہیں، اور اسے ہندوؤں کے سمجھنے کے لائق نہیں رکھتے۔ عام لوگوں کے لئے یہ دونوں زبانیں اجنبی ہیں، اور اُن کے کسی کام کی نہیں ہیں . . . . اتری ہندوستان کے لوگ جو زبان بولتے ہیں، وہ ایک ہے۔ آپ اسے چاہے ہندی کہہ لیں چاہے اردو۔ اسے اردو لکھاوٹ میں لکھ کر آپ اردو کہہ سکتے ہیں، اور اسی کو ناگری لکھاوٹ میں لکھیں تو یہ ہندی بن جاتی ہے۔ اب رہا لکھاوٹ کا سوال۔ فی الحال مسلمان یقینی طور سے اردو لکھاوٹ استعمال کریں گے، اور ہندو زیادہ تر دیوناگری میں لکھیں گے۔ میں زیادہ تر کی بات اس لئے کہتا ہوں کہ آج بھی ہزاروں ہندو اُردو میں لکھتے ہیں، اور ان میں سے کچھ تو ناگری لکھاوٹ جانتے بھی نہیں۔ آخر میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کوئی شک و شبہ نہیں رہ جائے گا، اور جب ان کے درمیان بے اعتباری کی تمام وجہیں دور ہو جائینگی، تو جس لکھاوٹ میں زیادہ طاقت ہے، وہ زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال ہو گی، اور اس طرح قومی لکھاوٹ بن جائے گی . . . . ہندی بولنے والے ہندو پنڈت، اور اردو بولنے والے مولوی، پورے ملک میں اپنی مذہبی تقریریں ہندی اور اردو میں کرتے ہیں، اور اَن پڑھ جنتا بھی ان کو سمجھ لیتی ہے . . . . اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا ہو گا کہ سارے ہندوستان میں مسلمان اردو بولتے ہیں، اور ان کی تعداد ہر صوبے میں خاصی بڑی ہے[1]

حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

۳۔ ساہتیہ کا دائرہ بھاشا کی بھومی جاننے پر ہی طے ہو سکتا ہے۔ اگر ہندی بھاشا کی بھی بھومی صرف اُتری صوبہ ہوگی، تو ساہتیہ کا دائرہ تنگ رہے گا۔ اگر ہندی بھاشا راشٹر بھاشا ہوگی تو ساہتیہ کی پھیلاوٹ بھی راشٹری ہو گی . . . . . . ہندی بھاشا وہ بھاشا ہے، جس کو اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، اور جو ناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔ یہ ہندی ایک دم سنسکرت لدی نہیں ہے، نہ وہ ایک دم فارسی شبدوں سے لدی ہوئی ہے . . . . . ہندوؤں کی بولی سے فارسی شبدوں کو بالکل الگ کرنا، اور مسلمانوں کی بولی سے سنسکرت کو بالکل الگ کر دینا غیر ضروری ہے . . . . . مسلمان بھائی عربی لکھاوٹ ہی میں لکھیں گے، ہندو ناگری لپی میں لکھیں گے . . . . ہندوؤں کو فارسی شبد تھوڑے بہت جاننے پڑیں گے، مسلمان بھائیوں کو سنسکرت شبدوں کا گیان حاصل کرنا پڑے گا . . . . ایسے لین دین سے اسلامی بھاشا کا بل بڑھ جائے گا۔[۱] . . . . ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی تو اُردو ہی راشٹر بھاشا ہے۔ اس بات سے یہ بھی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ ہندی یا اردو مغلوں کے زمانے سے راشٹر بھاشا بنتی جاتی تھی۔[۲]

بھاشا کی جیسی سیوا ہمارے راجہ مہاراجہ لوگ کر سکتے ہیں، ویسی

حاشیہ پچھلے صفحہ کا۔

[۱] گاندھی جی کا خطبۂ صدارت: بھڑوچ میں دوسری گجراتی کانفرنس: گجراتی سے ترجمہ بحوالہ گ تم ص: ۱۶ / ۱۷ - ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء

[۱] گاندھی جی کا خطبۂ صدارت: ہندی ساہتیہ سمیلن کے آٹھویں اجلاس میں جو ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ بحوالہ م ت ص ۸، ۹ اور ۱۰۔

[۲] ایضاً ص ۱۰۔

انگریزی سرکار نہیں کرسکتی۔ مہاراجہ ہولکر کی کونسل میں، کچہری میں اور ہر ایک کام میں ہندی کا، اور صوبائی بولی کا ہی استعمال ہونا چاہیئے۔ ان کے بڑھاوا دینے سے بھاشا اور زیادہ ترقی کرسکتی ہے۔ اس راجیہ کے اسکولوں میں شروع سے آخر تک سب تعلیم مادری زبان میں دینے کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ ہمارے راجا، مہاراجاؤں سے بھاشا کی بڑی بھاری سیوا ہوسکتی ہے[1]۔

۴۔ میں مدراس پریسیڈنسی کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ قومی کارکنوں کے ہندوستانی سیکھنے کی قومی ضرورت کو تسلیم کرلیں۔ مدراس سے باہر کے لوگ ہندوستانی زبان کو قریب قریب کسی مشکل کے بغیر سمجھ سکتے ہیں۔ . . . . . اس کا مطلب یہ ہے کہ ساڑھے اکیس کروڑ کی آبادی میں سے صرف تین کروڑ اسّی لاکھ لوگ، جو مدراس پریسیڈنسی میں رہتے ہیں، ہندوستانی زبان بولنے والے کی تقریر سمجھ نہیں سکتے۔ میں نے اس حساب سے مسلم آبادی کو نکال دیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ مدراس پریسیڈنسی کے زیادہ تر مسلمان ہندستانی سمجھتے ہیں! . . . . . پریسیڈنسی میں کئی جگہوں پر ھندی پرچار کے دفتر قائم ہیں، جہاں اُن لوگوں کو، جو ہندستانی سیکھنا چاہتے ہیں، بغیر فیس کے ہندستانی سکھائی جاتی ہے[2]۔

۵۔ مدراس پریسیڈنسی میں پچھلے ۱۸ مہینوں سے الہ آباد کے ہندی ساہتیہ سمیلن کی طرف سے ہندی پرچار کا زور دار کام ہو رہا ہے۔ پچھلے ہفتے بمبئی میں ہونے والے اگروال مارواڑی سمیلن سے میں نے جو اپیل کی تھی اس کے جواب میں بمبئی اور کلکتہ کے مالدار مارواڑیوں نے،

---

[1] ہندی ساہتیہ سمیلن کے آٹھویں اجلاس میں (اندور ۱۹۱۸ء) گاندھی جی کا خطبہ صدارت، بحوالہ گ ز، ص: ۲۵۔

[2] گاندھی جی: مدراس سے ایک اپیل (ینگ انڈیا، ۲۱ جنوری ۱۹۲۰ء)، بحوالہ گ، ز: ص ۲۸۔

جو وہاں موجود تھے، مدراس پریسیڈنسی میں پانچ سال کے ہندی پرچار کے لیے پچاس ہزار روپے کا چندہ اسی وقت دے دیا۔ انھوں نے ایک بار پھر یہ دکھا دیا ہے کہ ہندی کا کام ہندوستان کی اس دولت مند برادری کی ایک خصوصیت ہے [1]

۶۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ 'نوجیون' کو ہندی میں نکالنا کٹھن کام ہے۔ پھر بھی دوستوں کے زور ضد سے بے بس ہو کر اور ساتھیوں کے جوش کی وجہ سے میں 'نوجیون' کا ہندی ترجمہ نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنے وچاروں سے مجھے پریم ہے۔ میرا وشواس ہے کہ ان پر چلنے سے جنتا کو فائدہ ہوتا ہے، اس لئے اس کو ہندی میں چھاپنے کی خواہش مجھے بہت زمانے سے تھی، لیکن آج تک پرماتما نے اس میں کامیابی نہیں دی تھی۔ 'ہندستانی' کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کی کوشش میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں۔ 'ہندستانی' کے سوا کوئی دوسری زبان 'قومی زبان' نہیں ہو سکتی، اس میں کچھ شک نہیں۔ جس زبان کو کروڑوں ہندو مسلمان بول سکتے ہیں، وہی پورے ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی ہے [2]

۷۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں کئی ہندی ترجمے چھپتے ہیں۔ لیکن خواہش یہ ہے کہ 'نوجیون' اور 'ینگ انڈیا' کے خاص خاص مضمونوں کے مستند آزاد ترجمہ ایک ہی جگہ چھاپ دیا جائے۔ اس ایڈیشن کی ہندی صحیح معنوں میں 'ہندستانی' ہوگی، جو ہندی اور اردو سے مل کر بنی ہے یعنی آسان لفظ، جن کو ہندو اور مسلمان دونوں سمجھتے ہیں [3]

---

[1] گاندھی جی: ہندستانی (ہندی) کی ضرورت؛ ینگ انڈیا ۱۶ جون ۱۹۲۰ء؛ بحوالہ گ ز، ص: ۳۱۔

[2] گاندھی جی: ہندی نوجیون: ۱۹ اگست ۱۹۲۱ء بحوالہ گ ز: ص ۲۴۔ [3] گاندھی جی: 'ایک ہندی نوجیون'؛ ہریجن '۱۹ اگست ۱۹۴۲؛ بحوالہ گ ز ص ۲۵۔ (سنہ واضح طور سے نادرست ہے، یہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے ہے۔ ۱۹۲۱ء درست سنہ ہے۔

۱۔ یہ کانگریس طے کرتی ہے کہ دستور کی دفعہ ۳۳ میں یہ ترمیم کردی جائے:

> کانگرس کی کارروائی، جہاں تک ممکن ہوگا، ہندستانی میں چلائی جائے گی۔ انگریزی زبان یا کوئی صوبائی زبان بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ اگر تقریر کرنے والا ہندستانی نہیں بول سکتا، یا جب کبھی یہ ضروری ہو جائے، صوبہ کانگرس کمیٹی کی کارروائی متعلقہ صوبے کی زبان میں ہوگی، ہندستانی بھی استعمال کی جاسکتی ہے[1]

۹۔ ایک گجراتی مراسلہ لکھنے والے نے کچھ عرصہ ہوا، جب 'نوجیون' میں ایک مراسلہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ میں 'نوجیون' کو دیوناگری لکھاوٹ میں چھاپا کروں "تاکہ اس طرح اپنے اس عقیدے کو عمل میں دکھا سکوں کہ سارے ہندستان کے لئے ایک ہی لکھاوٹ ہونی چاہیئے۔ اور یہ کہ وہ لکھاوٹ صرف دیوناگری ہوسکتی ہے"، تاہم میں اس مراسلہ نگار کے مشورے پر عمل نہیں کرسکتا ..... یقیناً پورے سدھار کے راستے میں ہندو مسلم دیوانگی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ پھر بھی پہلے اس سے کہ دیوناگری لکھاوٹ ہندستان میں ایک عام حیثیت پاسکے، ہندو ہندستان کو اس بات کا قائل ہونا پڑے گا کہ سنسکرت اور دیوناگری اصل سے نکلی ہوئی تمام زبانوں کے لیئے ایک ہی لکھاوٹ ہونا چاہیئے۔ اس وقت ہمارے یہاں بنگال میں بنگالی لکھاوٹ ہے، پنجاب میں گورمکھی ہے، سندھ میں سندھی ہے، اتکل میں اُڑیا ہے، گجرات میں گجراتی ہے، اُندھرا پریش میں تلگو ہے (یہاں مترجم سے واضح طور سے غلطی ہوئی ہے، کیونکہ آندھرا پردیش کا وجود اس وقت نہیں تھا) تامل ناڈو میں تامل ہے (یہاں بھی

---

[1] ریزولیوشن نمبر ۸، انڈین نیشنل کانگریس، کانپور اجلاس ۱۹۲۵ء: بحوالہ گ،ز ص: ۳۷ (ینگ انڈیا، جنوری ۱۹۲۶ء)

مترجم سے واضح طور سے سہو ہوا ہے، کیونکہ اُس وقت مدراس پریسیڈنسی تھی) کیرالا میں ملیالائی، (اُس وقت ٹرونکور کوچن کی ریاست تھی، کیرالا کا وجود نہیں تھا۔ یہ مترجم کا سہو ہے) کرناٹک میں کنٹری (ریاست کا نام میسور تھا، علاقہ کرناٹک، تاریخ میں کرناٹک کے نواب کی وجہ سے مشہور ہے)، اور ان کے علاوہ بہار میں کیتھی اور دکھن میں موڑی لکھاوٹ رائج ہے۔ اگر تمام عملی اور قومی کام کاج کے لئے دیوناگری ان تمام لکھاوٹوں کی جگہ لے لے، تو یہ ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑا قدم ہوگا۔ اس سے یکجہتی پیدا کرنے، اور مختلف صوبوں کو ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب لانے میں مدد ملے گی . . . . . اور کسی لکھاوٹ کو اپنانے میں اتنی آسانی نہیں ہے، جتنی کہ دیوناگری لکھاوٹ کو اپنانے میں، اور نہ کوئی لکھاوٹ اتنی مکمل ہے، جتنی کہ دیوناگری لکھاوٹ۔ اس کام کے لئے ایک کل ہند ادارہ قائم ہے، یا کسی زمانے میں قائم تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت یہ سنستھا کیا کام کررہی ہے، لیکن اس کام کو انجام دینا ہے، تو یا تو اصل انجمن کو جاندار بنانا ہوگا، یا اُس کے لیئے ایک الگ ادارہ قائم کرنا ہوگا۔ اس تحریک کو ہندی یا ہندستانی کا ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے پرچار کرنے کی تحریک کے ساتھ کسی طرح خلط ملط نہ کرنا چاہیئے . . . . جب تک ہندو، مسلم تناؤ باقی ہے، اس وقت اس کی شکل یا تو اُس اردو کی ہوگی، جو فارسی لکھاوٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں فارسی اور عربی لفظوں کی کثرت ہوگی، اور یا اُس ہندی کی ہوگی جو دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہوگی۔ جب دونوں فرقوں کے دل مل جائیں گے، تو ایک ہی زبان کی دونوں شکلیں ایک دوسرے میں سما جائیں گی، اور ہمیں ایک ایسی زبان مل جائے گی، جو دونوں کے میل سے پیدا ہوگی، اور جس میں سنسکرت، فارسی، عربی یا دوسری

زبانوں کے وہ لفظ شامل ہوں گے، جو زبان کی پوری ترقی، اور وچاروں کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کے لئے ضروری ہوں گے۔[1]

۱۰۔ سنسکرت سیکھنا ہر ایک ہندستانی طالب علم کا فرض ہے۔ ہندوؤں کا تو ہے ہی، مسلمانوں کا بھی ہے، کیونکہ آخر اُن کے باپ دادا بھی تو رام اور کرشن ہی تھے، جنھیں پہچاننے کے لئے انھیں سنسکرت سیکھنی چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ سمبندھ رکھنے کے لئے اُن کی زبان سیکھنا ہندوؤں کا بھی فرض ہے۔[2]

۱۱۔ بنیادی حقوق کی دفعہ ۱۳ سے اقلیت والی قوم کے کلچر، زبان اور لکھاوٹوں کا تحفظ ہوتا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ اسلامی اور آریائی کلچر ایک دوسرے سے الگ تھلگ، اور بنیادی طور سے مختلف نہیں ہیں، پھر بھی مجھے یہ تسلیم کرنا ہی چاہیئے کہ مسلمان، اسلامی کلچر کو آریائی کلچر سے الگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں رواداری پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمیں اُردو زبان اور لکھاوٹ سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اور اس پر مسلمانوں کے اصرار کو سمجھنا چاہیئے۔[3]

۱۲۔ اس رزولیوشن میں کہا گیا ہے کہ اقلیت والی قوم کی زبان اور لکھاوٹ کی حفاظت کی جائے گی۔ مسلمان مانتے ہیں کہ اُن کا کلچر کچھ نرالا ہے۔ اگرچہ میری نگاہ میں تو ہندی اور اردو، دونوں کلچر یکساں ہیں۔ قرآن اور مہابھارت میں مجھے تو جدا جدا چیز نہیں ملتی۔ ایک ہی چیز ملتی ہے، لیکن چونکہ اپنی تہذیب کو نرالی چیز مانتے ہیں، اس لئے ہم رواداری سیکھنے کی کوشش کریں۔ لکھاوٹ بھی جانیں۔

---

[1] گاندھی جی: ینگ انڈیا، ۱۴ جولائی ۱۹۲۰ء: بحوالہ گ ز ص ۳۹—۴۱۔

[2] گاندھی جی: راشٹریہ شکش پریشد میں تقریر: ہندی نوجیون: ۳۱ مارچ ۱۹۲۱ء: بحوالہ گ ز: ص ۴۲

[3] گاندھی جی: کراچی کانگرس کی قرار داد (اقلیتوں کے کلچر کا تحفظ) پر اظہارِ خیال (ینگ انڈیا ۹ اپریل ۱۹۳۱ء) بحوالہ گ ز: ص ۴۵۔

سوراج ملنے پر جب ہم اس کا قانون بنائیں تو یہ ایک قدرتی بات بن جائے، جس کے لیئے آج ہم اس بات کو اپنے دل میں سمجھ لیں [1]

۱۴۔ (ہندی ساہتیہ سمیلن کا) سب سے پہلا اجلاس ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا . . . . . ۱۹۱۸ء میں اسی شہر میں اور اسی سمیلن کے سائے میں اس سنستھا (دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا) کا جنم ہوا . . . . آخر میں اس سنستھا کو سمیلن نے آزاد کر دیا . . . . . پنجاب کی بات میں چھوڑ دیتا ہوں، کیونکہ پنجاب میں تو اردو سب سمجھتے ہیں۔ وہاں تو صرف لکھاوٹ کی بات رہ جاتی ہے۔ اس سوال پر غور کرنے کے لیئے کاکا صاحب کی صدارت میں لکھاوٹ کانفرنس ہو رہی ہے۔ اگر ہندستان کو سچ مچ ایک قوم بنانا ہے، تو چاہے کوئی مانے یا نہ مانے قومی زبان تو ہندی ہی بن سکتی ہے، کیونکہ جو مقام ہندی کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری زبان کو کبھی نہیں مل سکتا۔ ہندو، مسلمان، دونوں کو ملا کر قریب ۲۲ کروڑ انسانوں کی زبان تھوڑے بہت ہیر پھیر سے 'ہندی ہندستانی' ہی ہے۔ اس لیئے مناسب اور ممکن تو یہی ہے کہ ہر ایک صوبے میں اُس صوبے کی زبان، سارے ملک آپسی کام کاج کے لیئے ہندی، اور بین الاقوامی کام کاج کے لیئے انگریزی استعمال ہو . . . . . . میں نے ابھی ابھی 'ہندی ہندستانی' لفظ استعمال کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جب آپ نے مجھ کو یہ عہدہ دیا تھا، تب بھی میں نے یہی کہا تھا کہ ہندی اس زبان کا نام ہے، جسے ہندو اور مسلمان قدرتی طور پر بغیر کوشش کے بولتے ہیں۔ ہندستانی اور اردو میں کوئی فرق نہیں۔ دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جانے پر وہ ہندی، اور عربی میں لکھی جانے پر وہ اُردو کہی جاتی

---

[1] ایضاً (نوجیون ۵ اپریل ۱۹۳۱ء) بحوالہ گ۔ز: ص ۵۴۔

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس موقعہ پر اپنے دکھ کی بھی کہانی
کہدوں۔ ہندی زبان قومی زبان بنے نہ بنے، میں اسے
چھوڑ نہیں سکتا۔ تلسی داس کا پجاری ہونے کے
کارن ہندی سے میری محبت رہے گی۔[1]

ہندی اور اردو میں تنازعہ شروع ہوچکا تھا۔ لسانی پہلو، جذباتی پہلو، فرقہ وارانہ زاویے ـــــ ان سب کا اندازہ، اور پس منظر واضح ہے۔ گاندھی جی عملی اور سیاسی انسان تھے۔ وہ کانگرس کے مقتدر رہنما نہیں، سب سے بڑے رہنما بھی تسلیم کر لیئے گئے تھے۔ جو کچھ وہ کہتے تھے یا لکھتے تھے اسے مذہبی تقدس بھی حاصل ہوتا تھا۔ انھوں نے نیک نیتی سے، اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھا اور بنایا۔ لسانی اعتبار سے بولی جانے والی ہندی اور اردو ایک ہی زبانیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جب انھوں نے اس طرح بیان کیا کہ ہندستانی اور اُردو میں کوئی فرق نہیں ہے، دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جانے پر وہ ہندی، اور عربی میں لکھی جانے پر وہ اردو کہی جاتی ہے۔ بار بار انھوں نے ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان بتایا، اور نیک نیتی سے ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ وہ اردو سے واقفیت حاصل کریں، اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندی سے واقف ہوں، تاکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو سمجھیں اور آپس کے بھید بھاؤ دور ہوں۔ جذبہ بہت اچھا تھا۔ لیکن اس نے یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھادی کہ ہندی، ہندوؤں کی زبان ہے۔ اور اردو، مسلمانوں کی زبان ہے، اور ایسی بیٹھادی کہ آج تک عقیدہ کی طرح یہ بات مانی جارہی ہے۔ آج کی بات، اپنے مقام پر بعد میں ہوگی۔ یہ تھا منظر نامہ "ہندی، اردو اور ہندستانی" کا اس وقت جب لائنل فیلڈن ۱۹۳۵ء میں براڈ کاسٹنگ کی ذمہ داریاں سنبھالنے ہندوستان پہنچے۔ اس ساری تاریخ سے نہیں، تو اس کے اہم پہلوؤں سے انھوں نے خود کو ضرور آگاہ کیا تھا، کیونکہ انگلستان ہی

---

[1] گاندھی جی: ہندی ساہتیہ سمیلن کے ۲۴ ویں اجلاس منعقدہ اندور میں صدارتی تقریر ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء

میں انھوں نے ہندوستانی قواعد اور اردو رسم خط پڑھنے اور سیکھنے کی بات کو. براڈ کاسٹنگ کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے. اتنی کہ خود نوشت[1] میں اس کا خاص طور سے ذکر کیا ہے. گاندھی جی کا ذکر بعد میں آئے گا، لیکن گاندھی جی ان کی دلچسپی کا مرکز عقیدت کی وجہ سے نہیں تھے، بلکہ انھوں نے یقیناً گاندھی جی کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اور ان میں یقیناً وہ تحریریں بھی ہونگی جن میں سے کچھ کے اقتباسات اس باب میں پیش کئے گئے ہیں۔

گاندھی جی کی ایک تحریر، جو ان کی خود نوشت میں ہے، اور جس کا انگریزی میں ترجمہ مہادیو ڈیسائی نے کیا تھا، اس سے فیلڈن ضرور واقف ہوں گے اس خود نوشت کا پہلا حصہ ۱۹۲۷ء اور دوسرا حصہ ۱۹۲۹ میں شائع ہوا تھا[2]۔ ثانوی تعلیم کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے، گاندھی جی نے لکھا:

In geometry there was nothing to memorize, whereas in Sanskrit, I thought, every thing had to learnt by heart. This subject was also commenced from the fourth standard. As soon as I entered the sixth I became disheartened. The teacher was a hard task master, anxious, as I thought to force the boys. There was a sort of rivalry going on between the Sanskrit and the Persian teacher. The Persian teacher was lenient. The boys used to talk among themselves that Persian was very easy and Persian teacher very good and considerate to the students. The 'easiness'

لہ The Natural Bent : Lionel Fielden

2 ہ An autobiography or the Story of My Experim[illegible] with Truth : M.K.Gandhi (Reprinted 1981) Pp.12, 13.

tempted me and one day I sat in the Persian class. The Sanskrit teacher was grieved. He called me to his side and said: 'How can forget that you are the son of a Vaishnava father? Won't you learn the language of your religion? If you have any difficulty, why not come to me? I want to teach you students Sanskrit to the best of my ability...'

This kindness put me to shame. I could not disregard my teacher's affection. Today I can not but think with gratitude of Krishnashanker Pandys. For if I had not acquired the little Sanskrit that I learnt then, I should have found it difficult to take any interest in our sacred books. In fact I deeply regret that I was not able to acquire a more thorough knowledge of the language, because I have since realized that every Hindu boy and girl should possess sound Sanskrit learning.

It is now opinion that in all Indian curricula of higher education, there should be a place for Hindi, Sanskrit, Persian, Arabic and English, besides of course the vernacular...

In reality, Hindi, Guj rati and Sanskrit may be regarded as one language, and Persian and Arabic also one. Though Persian belongs to the Aryan and the Arabic to the Semitic family of languages, there is a close relationship between Persian and Arabic, because both claim their full growth through the rise of Islam Urdu I have not regarded as a distinct language, because

it had adopted the Hindi grammar and its vocabulary is mainly Persian and Arabic, and he who would learn good Urdu must learn Persian and Arabic, as one who would learn good Gujrati, Hindi, Bengali or Marathi must learn Sanskrit.

بچپن کے جو تأثر ذہن کی ساخت زندگی بھر کے لئے بناتے ہیں، ہندی اور اردو کے سلسلے میں گاندھی جی کا خیال زندگی بھر اُن کے نظریے کا حصّہ، اسی بچپن کے تأثر کی وجہ سے رہا۔ گاندھی جی مذہبی آدمی تھے، فرقہ پرست بالکل نہیں تھے۔ لیکن مذہبی بنیاد پرستی ایک مہاتما کو تو فرقہ پرست نہیں ہونے دیتی، لیکن یہی بنیاد پرستی ان کو فرقہ پرستی کی بھٹی میں جھونک دیتی ہے، جو مہاتما نہیں ہوتے۔ گاندھی جی کے ذہن میں اردو اور ہندی زبانیں فارسی۔ عربی — اور سنسکرت سے جڑ گئیں، اور یہ زبانیں مذہب سے جڑ گئیں، اور یہ حساب کا سیدھا سا سوال ہے کہ اردو مسلمانوں کی، اور ہندی ہندوؤں کی زبان قرار پاگئی۔ یہ ہماری، سیاسی اور لسانی "تاریخ کا وہ باب ہے، جو حقیقت سے بھی دور ہے، اور خوشگوار بھی نہیں۔

گاندھی جی 'ہندی ساہتیہ سمیلن'، ہندی ساہتیہ پریشد اور ہندی پرچارنی سبھا اور ناگری پرچارنی سبھا کے روحِ رواں ہو گئے، اور اس کی وجہ سے کچھ بہت ہی ناخوشگوار واقعے ہوئے۔

اپریل ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتے میں ساہتیہ پریشد کا جلسہ ناگپور میں ہوا۔ اس میں گاندھی جی کے علاوہ مولوی عبدالحق، جواہر لال نہرو، اچاریہ نریندر دیو منشی پریم چند، اختر حسین رائے پوری، کے ایل منشی، کاکا کالیلکر اور ڈاکٹر راجندر پرساد وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی خود نوشت سوانح میں اس کا ذکر کیا ہے[1]

"اپریل ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتہ کی مقررہ تاریخ کو میں ڈاکٹر انصاری

لہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری: گردِ راہ (مکتبہ افکار، کراچی) ص ۱۰۲ — ۱۰۴۔

کی کوٹھی پہنچا تو مولوی صاحب (مولوی عبدالحق) کو موجود پایا۔ ۔ ۔
ہماری ٹرین شام کو حیدرآباد جاتی تھی، لہذا وقت کاٹنے کے لئے مولوی صاحب نے جامعہ ملّیہ کا قصد کیا، جو اس زمانے میں قرول باغ میں کرائے کے مکانوں میں واقع تھا۔ ہم پروفیسر مجیب کے گھر اُتر گئے، اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کو خبر کردی۔ باتوں باتوں میں ذاکر صاحب نے کہا کہ کل ناگپور میں گاندھی جی کا جلسہ ہے، آپ لوگ سرِراہ کیوں وہاں نہیں ٹھہر جاتے۔ معلوم نہیں مولوی صاحب کو وہ دعوت نامہ یاد تھا، یا نہیں۔ مجھے یاد ضرور تھا، مگر میں نے دانستہ اس کا ذکر نہ کیا تھا، کیونکہ تا ایں دم مولوی صاحب گاندھی جی کے مدّاح تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
غرض اس مشورے پر مولوی صاحب نے لبیک کہا کہ مختلف زبانوں کے دانشوروں سے ملاقات ہو جائے گی، اور گاندھی جی سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملے گا۔

گاڑی دوسرے دن صبح اٹارسی جنکشن پہنچی، جہاں الٰہ آباد کی ٹرین کا سنگم ہوتا تھا۔ اس میں پنڈت نہرو کے ہمراہ منشی پریم چند اور اچاریہ نربندر دیو کو برآمد ہوتے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساہتیہ پریشد کے جلسے میں گاندھی جی نے جو گل کھلایا، وہ سب کو معلوم ہے، اور اس کی جو روداد مولوی صاحب نے قلم بند کی تھی، وہ تاریخی دستاویز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو بحث یہاں شروع ہوئی اس نے آگے چل کر لسانی سیاست کی شکل اختیار کرلی، اور لامحالہ قومی سیاست کا ضمیمہ بن گئی۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ گاندھی جی نے خواہ مخواہ ہندی اور اردو کا قضیہ کیوں شروع کیا، اور ادبی مسائل کے بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جاکر اصل بھید کھلا۔ گاندھی جی باخبر سیاستدان تھے۔ لیکن ادبی اور ثقافتی معاملات میں اُن کے مشیر کے ایل منشی اور کاکا کالیلکر جیسے متعصب فرقہ پرست تھے، جن میں سے ایک گجراتی اور دوسرا مرہٹی کا نامی گرامی مصنف تھا۔

انھوں نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں، اور اگر فوری طور پر ادیبوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا، تو وہ کسی اور طرف بہک جائیں گے۔ بنا بریں گاندھی جی جلسے کی تشکیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس کی تاریخ ہندی ساہتیہ سمیلن کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی، جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح ساہتیہ پریشد کے جلسے میں ہندی کے طرفدار بڑی تعداد میں جمع ہو گئے، اور پس پردہ یہ طے پایا کہ اسی وقت یہ طے کرالیا جائے کہ قومی زبان ہندی اتھوا (یعنی) ہندوستانی ہوگی۔ یہ تجویز کانگریس کے اُس فیصلے کے منافی تھی کہ قومی زبان ہندوستانی ہوگی، جس سے مراد شمالی ہند کی وہ بول چال کی زبان ہے، جو ہندی یا اُردو میں لکھی جاتی ہے۔"[1]

کے ایم منشی اور کاکا کالیلکر کے بارے میں اختر رائے پوری کا یہ اندازہ کوئی ان کا داخلی تاثر نہیں ہے، سید سجاد ظہیر کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُسی زمانے میں انھوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ دونوں حضرات ادب میں جمہوری قدروں سے خائف ہیں۔ احیاء پرستی اور بنیاد پرستی ان کا شیوہ ہے ۱۹۳۵ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ سجاد ظہیر ہندوستان واپس آئے تو بمبئی میں کنھیالال منشی سے ملے:

"میں نے جب ترقی پسند مصنفین کا مجوزہ مینی فسٹو انھیں دیا تو اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر انھوں نے اُسے الگ رکھ دیا۔ . . . . انھوں نے مجھے بتایا کہ میں خود ایک ایسا ادارہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک جگہ جمع کر کے ایک واحد قومی زبان (ہندی) کے ذریعے سارے ملک میں پھیلائے۔ . . . . . کنھیالال منشی سومناتھ کے کھنڈروں کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

---

[1] سجاد ظہیر: روشنائی، ص ۳۱ اور ۳۳۔

اختر رائے پوری نے مولوی عبدالحق کی تحریروں کی طرف دھیان دلایا ہے۔ لیکن ان سے پہلے ڈاکٹر راجندر پرساد کے اس بیان پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا، جو انھوں نے اس سلسلے میں اپنی خود نوشت میں تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد ہندی ساہتہ سمّیلن کے ناگپور اجلاس کے صدر تھے[1]

"۱۱۶: راشٹر بھاشا کا پرشن
مجھے لکھنؤ سے ہی ناگپور جانا تھا۔ وہاں اکھل بھارتیہ ہندی ساہتہ سمّیلن ہونیوالا تھا، جس کا میں سبھاپتی نرواچت ہوا تھا، اور وہ ٹھیک کانگریس کے بعد تین چار دنوں میں ہونے والا تھا۔ اس لئے میں اسی گاڑی سے گیا، جس سے مہاتما گئے۔ ان کے ساتھ ہی وردھا گیا، اور وہاں سے سمّیلن کے دن ناگپور آیا۔

وردھا میں بیٹھ کر میں نے بھاشن لکھا۔ کچھ دنوں سے اس بات پر بحث چل رہی تھی کہ ہندی کی شبداولی میں ودیشی بھاشاؤں کے شبدوں کو لینا چاہیئے یا نہیں۔ سچ پوچھیئے تو پرشن کو یہ روپ دینا بھی اُچت نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی ہندی کا لیکھک، چاہے وہ کتنا بھی ودیشی شبدوں کا وررودھی کیوں نہ ہو، سبھی ودیشی شبدوں کا بہشکار نہیں کرنا چاہتا، اور نہ اپنے لیکھوں، اتھوا بھاشنوں میں ان کا بہشکار کرتا ہے۔ یہ جھگڑا ہندی اور اردو کا ہے۔ ہندی میں، جیسا اس کا روپ آج ہوگیا ہے، اور ہوتا جارہا ہے، سنسکرت کے شبدوں کا باہلیہ ہوتا ہے۔ اردو میں، جس طرح آج بڑھ اور پھول پھل رہی ہے، عربی اور فارسی شبدوں کی بہتات ہوا کرتی ہے۔ دونوں میں بہتیرے اچھے سلیکھک ہیں جو سادی اور سہج بھاشا بھی لکھتے ہیں۔ دونوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو سنسکرت، فارسی اور عربی شبدوں کو دیکھ کر کے گھبراتے ہیں، اور ڈرتے ہیں کہ ان سے ہندی کا روپ وکرت ہوجائے گا، اور وہ اردو بن جائے گی، تتھا اردو بگڑ کر ہندی

---

[1] ڈاکٹر راجندر پرساد: "آتم کتھا" ص ۵۱۳ — ۵۱۵

بن جائے گی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہندی کو ہندوؤں کی، اور اردو کو مسلمانوں کی بھاشا مانتے ہیں۔ اس طرح اس جھگڑے میں کچھ سامپردائکتا بھی آگئی ہے۔ یدیپی بہتیرے مسلمان کوی اور لیکھک ہوئے، جنھوں نے ہندی کی سیوا کی ہے، تتھا اُسی طرح بہتیرے ہندوؤں نے اردو کی سیوا کی ہے۔

کانگریس کے ودھان میں جہاں بھاشا کا ذکر ہے، وہاں نہ ہندی شبد کا ویوہار کیا گیا ہے، نہ اردو شبد کا۔ بلکہ وہاں ہندستانی شبد کا ہی استعمال ہوا ہے۔ جب گاندھی جی نے دکشن بھارت میں راشٹر بھاشا کا پرچار ۱۹۱۰ میں آرمبھ کیا تھا، تب ہندی ساہتیہ سمّیلن کے تتوادھان میں ہی آرمبھ کرایا تھا۔ اُسی سمے وہ اندور میں ساہتیہ سمّیلن کے سبھاپتی ہوئے تھے۔ کانگریس کے ودھان میں ہندستانی شبد کا ویوہار مہاتما جی اور شری پرشوتم داس ٹنڈن نے ہی کیا تھا۔ اُن کے ہی شبد کو کانگریس نے مان لیا تھا۔ دکشن بھارت میں جس سبھا کے دوارا راشٹر بھاشا پرچار کا کام آج بھی لیا جا رہا ہے، اس کا نام دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا ہے۔ اس سے سپشٹ ہے کہ گاندھی جی نے جب سے اِس کام کو ہاتھ میں لیا ہے، انھوں نے ہندی اور اردو کو دو بھنّ بھنّ بھاشا نہیں مانا ہے۔ یدیپی دونوں کی شبداولی میں انتر ہے، اور وہ انتر دن دن بڑھتا جا رہا ہے۔ تتھاپی دونوں کا ویاکرن پرایہ ایک ہی ہے، اور وہ ویاکرن دوسری کسی بھاشا کے ویاکرن سے پورا پورا نہیں ملتا۔ بھاشا تتو ودوں کا کہنا ہے کہ بھاشا کی وبھنتا شبداولی سے اُتنی نہیں ہوتی، جتنی اُس کے واکیوں کی گڑھن اور ویاکرن کے نیموں کے کارن ہوتی ہے۔ اس لیئے یہ ماننا انوچت اور بھاشا وگیان کے نیموں کے پرتکل نہیں ہے کہ ہندی اور اردو ایک ہی بھاشا کا نام ہے۔ اتھوا ایک ہی بھاشا کی دو شیلیاں ہیں — دو بھنّ بھاشیں نہیں۔ ہندستانی ہندی بھی ہے، اور اردو بھی، کیونکہ وہ پریہ کلشٹ شبدوں کو کام میں نہیں لاتا۔ وہ اپنا روپ ایسا رکھتا ہے، جس کو ہندی والے، اور اردو والے، دونوں ہی اپنا سمجھ سکیں۔

میں اس بات کا حمایتی ہوں کہ جس بھاشا کا شبد بھنڈار جتنا بھرا پُرا ہوگا، وہ بھاشا اتنی ہی ادھک اُنّت ہوگی۔ یدی ایک ہی ارتھ میں کئی شبد ہوں گے، تو سمے پاکر ان کے ارتھ میں تھوڑا بہت بھید ہوتا جائے گا، اور اس میں باریکیاں آتی جائیں گی۔ وچار کی سوکھشمتا کو ویکت کرنے کی شکتی ایسی بھاشا میں ادھک ہوتی جائے گی۔ جیتی جاگتی بھاشا، دوسری بھاشاؤں کے سمپرک سے یدی اُس میں گرہن اور سنگرہ کرنے کی شکتی ہے تو لابھ اٹھاتی جائے گی، اور اس کا شبد بھنڈار بڑھتا جائے گا۔ وہ اس بات سے ڈر کر گھونگھے کی طرح اپنی کھپڑیا کے اندر گھس کر اپنے کو بند نہیں کر لیتی، کہ باہر کی ہوا سے، باہر کے شبدوں سے، وہ پس جائے گی، اور اپنا استتو ہی کھو دے گی۔ وہ ہمت کے ساتھ کھلے عام سنگھرش میں آئے گی، اور دوسری بھاشاؤں کے اچھے بھاؤ گراہی شبدوں کو اپنے میں ملا لے گی۔ ہاں، ایسا کرنے میں، وہ اپنے نیموں کو، اپنے روپ کو نہیں بدلے گی — اپنی پوشاک، اور اپنی سجاوٹ کو بھلے ہی بدل دے، اور اس میں بھلے ہی وچتر تا لا دے۔

میں نے اپنے بھاشن کا یہی وشے رکھا، اور ہندی ساہتیہ سیویوں کے وچار ارتھ یہ پرشن اُپستھ کیا۔ میرا کہنا تھا کہ ہندی کو ودیشی شبدوں کے گرہن کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے — چاہے وہ فارسی اور عربی کے ہوں یا انگریزی کے۔ پر جو شبد ہندی میں آویں، اُنھیں ہندی بن جانا چاہیئے۔ ارتھات ہندی میں آکر وہ اپنے ساتھ عربی — فارسی یا انگریزی کا ویاکرن ہندی میں داخل نہ کریں، بلکہ وہ ہندی کرن کے انوشاسن کے ادھین ہو کر رہ جائیں۔ میرا یہی وچار آج بھی ہے۔ اُس سمے سے آج تک اس بات پر بحث بہت چھڑی رہی ہے۔ پر میں اپنے وچاروں میں ادھک درڑھ ہوتا گیا ہوں۔ اور کیول ان تین بھاشاؤں کے ہی شبد نہیں لینے پڑیں گے، ہندی کو راشٹر بھاشا بنتے بنتے بہتیرے گرامینٹ شبدوں کو بھی اپنے میں لے لینا پڑے گا — جو پرانتیہ بھاشائیں ہیں، ان کی شبداولی کے بھی بہتیرے شبد لے لینے پڑیں گے۔

ڈاکٹر راجندر پرساد کا خطبۂ صدارت فراہم نہیں ہے۔ یہ بہت عجیب سی بات ہے کہ اس طرح یہ ناپید ہو جائے لیکن ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس کا جو خلاصہ دیا "آتم کتھا" میں دیا ہے، اس کو مصدقہ نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اُن کا جو نقطۂ نظر ہے، وہ منطقی ہے، اور علمی اعتبار سے اس میں کوئی سقم نہیں ہے۔ انھوں نے ایک ماہر وکیل کی طرح اچھا استدلال پیش کیا ہے۔ پھر بھی ایک تضاد اس میں بری طرح کھٹکتا ہے، اور خیال ہے کہ مولوی عبدالحق کو بھی یہی تضاد کھٹکا ہوگا۔ شروع میں ڈاکٹر راجندر پرساد نے یہ بات کی ہے کہ کانگریس نے ۱۹۱۰ء میں ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان تسلیم کیا۔ لیکن خطبے میں نقطۂ عروج یہ ہے کہ ہندی راشٹر بھاشا ہوگی۔ ساہتیہ پرشد میں یہی بات مولوی عبدالحق کو کھلی تھی۔

اختر رائے پوری نے جسے ساہتیہ پریشد کہا، اور مولوی عبدالحق نے بھی، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، یہی نام بتایا ہے، ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس سنستھا کا نام راشٹریہ بھاشا پریشد بتایا ہے۔ "آتم کتھا" کے اس باب میں ان کے آخری جملے یہ ہیں:[1]

"ناگپور میں ایک اور سمّیلن ہوا۔ گاندھی جی نے دیکھا تھا کہ ہندی۔اردو کا پارسپرک ویمنسیہ بڑھتا جاتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان دونوں کے سمنویہ کا پریتن کیا جائے۔ اس کے لیے ایک ایسی سنستھا کی ضرورت تھی جس میں دونوں بھاشاؤں کے ودوان شریک ہوں، اور جو بنا کسی کھینچ تان کے کیول بھاشا کی ابھی وردھی کی درشٹی سے کام کریں۔ انھوں نے اس میں شری کنہیالال منشی کو، جو گجراتی ساہتیہ کاروں میں بہت اونچا ستھان رکھتے ہیں، لگانا چاہا۔ منشی، پریم چند اور مولوی عبدالحق صاحب کی سہایتا بھی لینی چاہی۔ سنستھا (راشٹر بھاشا پریشد) کا ادھویشن ناگپور میں ہی کیا گیا۔ اُپ دد کت سجن، تھا دوسرے لوگ نمنترت کئے گئے۔ اسی سبھا میں مولوی عبدالحق صاحب سے مت بھید ہو گیا۔ انھوں نے سمّیلن کے بعد کچھ ایسے لیکھ لکھے، جن میں گاندھی جی پر بھدّا آکرمن کیا گیا۔ اس لیے یہ پریشد مسلمانوں کی

---

[1] : ایضاً۔ ص ۵۱۹ — ۵۲۰۔

سبھا بتا دکر سکا۔ پر منشی پریم چند اور شری کنھیا لال منشی نے ، کاشی کے ہندی
پستر ہنس کو ، پریشد کے اوُپر سے کچھ دنوں تک چلایا۔ دُکھ کی بات ہے کہ منشی
پریم چند تھوڑے ہی دنوں کے بعد سورگ باسی ہو گئے۔ پریشد بہت
دنوں تک جیوت نہ رہ سکا۔"

ڈاکٹر راجندر پرساد کی اس تحریر میں جو بات کلیدی ہے ، وہ یہ ہے کہ "پریشد مسلمانوں کی سبھا بنا نہ کر سکا۔" ذہن اگر صاف ہوتے تو صرف زبان کی بات ہوتی۔ عبدالحق اردو کے نمائندے تھے۔ مسلمانوں کے نمائندے ہرگز نہیں تھے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا تھا ، اور یہ المیہ اردو کا نہیں ، ناگپور میں قومی قیادت کا ہے۔ اور اس کے دور رس نتائج ہوئے۔

ناگپور سمیلن میں جو کچھ ہوا ، اس نے مولوی عبدالحق کا دماغ ہلا کر رکھ دیا۔ وہ خود بھی اس ڈرامے کے ایک کردار تھے۔ اختر رائے پوری نے لکھا ہے[1]

"ساہتیہ پریشد کے جلسے نے مولوی صاحب کی زندگی اور انجمن (ترقی اردو) کے لائحہ عمل کو بدل کر رکھ دیا۔ حیدر آباد آتے ہوئے چند روز بعد ہم اورنگ آباد پہنچے تو سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے کمرے سے چرخہ اٹھا کر پھینک دیا۔ اور کھادی کے کپڑے تہہ کر دیئے۔ طاق سے وہ لٹیا بھی ہٹا دی ، جو لوک مانیہ تلک کبھی سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر نرمی کے بجائے سختی نمایاں ہو گئی ، اور آنکھوں میں فکر کی بدلی کے بجائے عزم کی دھوپ چمکنے لگی۔"

اس سے مولوی عبدالحق کے ذہنی ردِ عمل کا پتہ چلتا ہے ، اور یہی انجمن ترقی اردو کے کے رسالے "اردو" کے اپریل ۱۹۳۶ء کے شمارے کے اداریہ میں اور زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ اداریہ کا موضوع اور عنوان ، دونوں ہیں : "بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت۔" کچھ اقتباسات ہے[2]

---

[1] اختر رائے پوری ، گرد راہ : ص ۱۰۴

[2] رسالہ "اردو" (اورنگ آباد) اپریل ۱۹۳۶۔ ص ۲۱۵ سے۔

"اسس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اسس کے صدر تھے۔ انہیں تاریخوں میں ہندی ساہتہ سمیلن کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرساد . . . . . مسٹر کا کا کالیلکر اس (پریشد کے) اجلاس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈرس میں بھارتیہ ساہتہ پریشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں، کیونکہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹر ساہتہ سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے (پہلے) یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولہا پور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتہ پریشد کا خاکہ بہت پر زور طریقے سے پیش کیا۔ کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیالال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا، اور ہم ایک جا جمع ہوئے، تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی جسے عمل میں لانے کے لئے مسٹر کنھیالال منشی، ہری ہر شرما، اور گردھاری شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتہ سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتہ سمیلن کا اجلاس اندور میں ہوا۔ اسس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتہ سمیلن سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہندی ساہتہ سمیلن نے کا کا کالیلکر، ہری بھاوا و پادھیائے اور بابا رگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پریشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیا پریشد کے لئے ایک مہاراشٹر کمیٹی قائم کی جائے، جو ہندی ساہتیا سمیلن کو، بھارتیہ ساہتیا سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اس طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت اب رہا اس کا مقصد،

سو وہ اس قرار داد کے الفاظ میں :

"اس پریشد کا اُدیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا، اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا (ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندستانی میں ہوگا۔ . . . . پریشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا، جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جزو پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسوّدے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پریشد (انجمن) کی ساری کارروائی ہندی ہندستانی میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدّت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندستانی ہوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شائع کی، اُس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنی؟ فرمانے لگے کہ کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا، میں نے عرض کیا کہ یہ صحیح ہے، لیکن اُس وقت ہندستانی کے معنی ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے "اب میں نے اس کے معنے بنا دیئے ہیں، جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے"۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے ہندی ہندستانی، جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پریشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندستانی کا لفظ تنہا نہ استعمال کیا جائے، تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا

مفہوم اردو لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ ہندستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے، تو فرمایا کہ وہ ہندی، جو آگے چل کر ہندستانی ہونیوالی ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی۔ یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے، اور ہندستانی زبان وہ ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا ہے . . . . . سہپر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھیے یا ہندستانی کا۔ ہندی ہندستانی کے کوئی معنے نہیں، تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں، اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ کیوں نہیں چلتے، جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہو گی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لئے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے، اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس، اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا، اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا . . . . . . گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے ہندی ہندستانی کو بدل کر ہندی یعنی ہندستانی کے لفظ رکھ دیئے۔ اس پر اختر حسین رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندستانی، کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی — اور ہندی اور ہندستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں، اس لئے ہندی اور ہندستانی بے معنے ہو گا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ لکھنا مناسب ہو گا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے، اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے، اور

کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنھیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے۔ ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیئے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا چارہ نہیں۔ . . . لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمّیلن کے اُن نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا، جو جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرتِ رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمّیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی، جس کا انہیں حق حاصل نہ تھا، تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ . . . . . پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملّیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام موصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلّل ہے، اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں، جس نے ملک کی زبان ہندستانی قرار دی ہے . . . . . . اجلاس کے دوران جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی، گاندھی جی نے ایک ایسی بات کہی، جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے، اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ . . . میں بار بار یہ توجیہہ کرکے اپنی تسلّی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی، لیکن دل نہیں مانتا۔ . . . . . مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی، اردو یا ہندستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار ٹوکا، کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے، بلکہ بحث ہندی، اردو یا ہندستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں، جن کی زبان اردو ہے، اور وہ اردو کے ادیب ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مسلمان، جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لیئے اس بحث کو فرقہ واری رنگ نہیں دینا چاہیئے۔"

مولوی عبدالحق نے اس موضوع پر اور بھی لکھا ہے۔ اور گاندھی جی نے بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن پہلے منشی پریم چند کے خیالات

پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا، کیونکہ وہ ناگپور کے اجلاس میں شریک تھے، اور انھوں نے مولوی عبدالحق کا اداریہ پڑھنے کے بعد انھیں ۴ رجون کو ۳۶ء کو ایک خط لکھا[1]

دھنپت رائے دفتر رسالہ ہنس بنارس کونٹ

'پریم چند' ۲ رجون ۳۶ء

بھائی صاحب قبلہ تسلیم

اس ماہ کے اردو میں میں نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد' پر آپ کا مقالہ دیکھا، تو مجھے افسوس ہوا[2] جس کام کو اتنے نیک ارادے سے اٹھایا گیا تھا، اس کی بسم اللہ ہی غلط ہوتی نظر آتی ہے۔ آپ نے پریشد میں حاضرین جلسہ کا رُخ دیکھ کر شاید اندازہ نہیں لگایا کہ مذہبی پبلک کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں، بالعموم لوگ اسے اشتباہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک زبان کی جانب سے مخالفت ہو رہی ہے۔ اعلانیہ نہیں تو در پردہ سہی۔ کسی بھی زبان نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ کچھ مٹھی بھر لیڈر ضرور شامل ہو گئے ہیں، شاید اس خیال سے کہ یہاں بھی کچھ شہرت کمائی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس تحریک سے بہت کم کسی کو دلچسپی ہے۔ اردو میں جس طرح اس کا عدم وجود برابر ہے، اسی طرح ہندی میں بھی۔ چونکہ مہاتما جی کا اس بڑے کام سے تعلق بتلایا گیا ہے، اس لیئے تھوڑے سے خریدار ہو گئے ہیں۔ یہ تو اصلی حالت ہے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اداروں

---

[1] ماہنامہ "فروغ اردو" (اردو ہیم نمبر) لکھنؤ بابت فروری و جنوری ۱۹۶۸ء ص ۳۰-۲۲۔

[2] انجمن ترقی اردو ہند (دلی)، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دلی) اور خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری ۔ کہیں بھی اردو" کی فائل میں جون کا شمارہ نہیں ہے۔ منشی پریم چند سے سہو ہوا ہے۔ اپریل ۳۶ء کے شمارے میں ص ۲۱۵ سے ص ۲۲۸ تک ایڈیٹر نے " بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت" کے عنوان سے اداریہ لکھا تھا۔ پریم چند نے اسی پر اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا ہے ۔

کے پاس خوب پیسہ ہے، خوب خوش ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ تحریک اس خیال سے جاری کی گئی تھی کہ ہندوستان کے ادیبوں میں اور اردو ادبیات میں برادرانہ اور ہمدردانہ احساس پیدا ہو۔ زبان اس کی حتی الامکان سلیس رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر چونکہ مضامین لکھنے والے مختلف صوبوں کے لوگ ہوتے تھے، اور ہنس کا ایڈیٹوریل اسٹاف اکیلا میرا دم ہے، اس لیئے ہر ایک مضمون کی اصلاح مشکل تھی۔ یہ خیال بھی تحت الشعور میں تھا ہی کہ ہنس سے دلچسپی رکھنے والے ۹۹ فیصدی غیر اردو داں ہیں، اس لیئے فارسی اور عربی کا استعمال بے محل ہوگا، جیسا کہ کاکا لیکر (؟) صاحب نے فرمایا تھا، ہماری سلیس اردو ہی، غیر اردو داں اصحاب کے لیئے بعید از فہم ہے۔ زبان کی اصلاح تو رفتہ رفتہ ہو ہی سکتی ہے۔ جس طرح سنسکرت سے بھری ہوئی ہندی، اردو خط میں لکھی جاتے تو اسے کوئی نہ سمجھے گا، اسی طرح مغرب میں اردو سمجھنے والے ہندی میں یا دیگر صوبجات میں خال خال ہیں۔ اس اعتبار سے نہ سہی، ادبی لین دین کے خیال سے ہی یہ ضروری ہے کہ ہمارے ادیبوں میں اشتراک عمل ہو۔ ان میں ادبی اور علمی اور ذوقی مسائل پر تبادلۂ خیال ہو۔ اس پریشد میں تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ مگر آپ نے یہ تو محسوس ہی کیا کہ تین چار اردو داں احباب کی موجودگی نے لوگوں پر اتنا اثر کیا کہ قراردادوں کی زبان اردو ہو گئی، جواب ہے۔ ورنہ اس کے قبل وہ خالص ہندی زبان میں تھی۔ اگر یہ ارتباط روز افزوں بڑھتا جاتا، تو کیا آپ کے خیال میں زبان اور ادب پر اس کا اثر نہ پڑتا۔ اور اس سے قطع تعلق کر لینے پر یا مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو جانے پر کہ یہ ایک پولیٹیکل تحریک ہے، جو ہندی زبان کے پرچار کے لیئے جاری کی گئی ہے، کیا صورت حال بہتر ہو گی؟ جو بعد (بات) فی الحال ہے اس کے زیادہ ہو جانے کا امکان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے سال آپ حالات میں تغیر پاتے۔ اور دو چار سال میں جب اردو داں طبقہ کو اس تحریک سے اُنس ہو جاتا، آپ دیکھتے کہ آپ ہی اس پر قابض ہیں۔ میرے لیئے اس تحریک سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ میں ہندی اور اردو کو ہندوستان

(ہندوستانی) کے گھر میں لاکر ملا دوں۔ مجھے اس سال کامیابی نہ ہوتی۔ ایک دو سال اور نہ ہوتی۔ لیکن اگر اردو داں طبقہ میری امداد کرتا، تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ مگر جب آپ نے اعلانِ جنگ کر دیا تو مجھے بھی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ افتراق والی پالیسی معلوم نہیں کیوں اس قدر جلد ہمیں کھینچ لیتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مہاتما گاندھی ہندی کے خدا نہیں، اور نہ ان کی تاویل ماننے کے لیئے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ پربشد کی زبان ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ ہم ہیں جنھیں زبان کے مسئلے سے شغف ہے۔ انہیں اپنے اثر اور علم اور مشورے سے اس منزل کی طرف اُسے لے جانا چاہیئے۔ اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے تو وہ ہندوستانی بنے گی، سچے معنوں میں وہ الگ ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہندی ہندوستانی ہو کر رہ جائے گی۔ . . . . زبان کا مسئلہ یونہی حل ہو سکتا ہے کہ دو چار اصحاب مل کر ایک سو صفحہ کا رسالہ ہندوستانی میں نکالیں۔ اس میں ہندوستانی بھی کھلی ہوتی ہے۔ اس میں دو آدمیوں کو اس کا بار سونپا جائے اور جو لوگ اس اسکول کے حامی ہیں، وہ اس میں ہندوستانی زبان میں لکھیں۔ اگر دلّی والے اردو میں کریں تو میں یہاں سے اُسی رسالہ کا ہندی ایڈیشن ہو بہو بنارس سے نکالنے پر تیار ہوں۔ اپنے بل پر۔ حالانکہ میری حالت فاقہ کشی سے ایک ہی قدم پیچھے ہے۔ اس طرح یہ بھوت زیر کیا جا سکتا ہے۔ الگ ہو جانے سے تو وہ اور بھی شیر ہو جائے گا۔ . . . . . میں تو آپ کی رہنمائی میں دوزخ میں جانے کو بھی تیار ہوں، حالانکہ وہ کام بغیر آپ کی رہنمائی (کے) میں زیادہ صفائی سے کر سکتا ہوں۔ اس کا رسنہ مجھے خوب معلوم ہے۔

امید ہے آپ خوش ہیں   نیازمند

پریم چند

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ منشی پریم چند اردو کے نہ صرف شیدائی تھے، بلکہ ان میں نہ ـــــ فرقہ وارانہ عصبیت تھی اور نہ لسانی عصبیت۔ وہ قلم کے مزدور تھے۔ اردو ان کی کفالت کر سکتی تو شاید وہ ہندی کی طرف

راغب نہ ہوتے۔ روتی ٹروزی انھیں ہندی کی تصنیفات سے ملتی تھی، اس کے باوجود اردو انہیں عزیز رہی، اور اس حد تک کہ گاندھی وادی ہوتے ہوئے بھی، زبان کے سلسلے میں انھوں نے گاندھی جی کے "ہندی ہندستانی" نظریئے کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ انھوں نے اس خط میں لکھا ہے، انہیں اس سے اختلاف تھا، اور اس کا برملا اظہار کیا۔ مولوی عبدالحق، ساہتیہ پریشد کے ناگپور اجلاس سے کچھ اتنے بددل ہوگئے تھے، کہ انھوں نے منشی پریم چند کے پرخلوص مشورے پر عمل نہیں کیا۔ جولائی ۱۹۳۶ء کے "اردو" میں انھوں نے پھر گاندھی جی کے نظریے سے بحث کی لے مضمون۔ یوں شروع ہوتا ہے۔

" اکھل بھارتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں دو مضمون، اور دوسرا وہ خط جو انہیں جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کی جانب سے عین اجلاس میں وصول ہوا تھا۔ یہ خط سب کے سامنے برسرِ اجلاس پڑھا گیا تھا۔"

۹ مئی ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں اس خط کا ترجمہ شائع ہوا ہے، لیکن مکتوب نگار کا نام نہیں بتایا گیا ہے ۲؎ لیکن "جامعہ" کے مجیب نمبر میں یہ خط شامل ہے، اور اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۳؎

" میں چاہتا تھا کہ یہ خط بھیجنے کے بجائے میں خود ہی ناگپور آسکتا۔ ساہتیہ پریشد کے جلسوں میں شرکت کرنے کی مجھے اور بھی زیادہ خواہش تھی، اس لیے کہ پریشد کی پالیسی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جن سے مجھے اختلاف ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے مجھے دکھ ہوتا ہے، اور ہمارے ملک میں آپ کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے، جو اتنا فراخ دل ہو کر اپنے کٹر مخالف

۱؎ ایڈیٹر (مولوی عبدالحق)، افکار و واقعات (ہندی اردو کے متعلق گاندھی جی کی تصریحات) "اردو" جولائی سنہ ۱۹۳۶ء (ص ۴۳۵ تا ۴۵۷)

۲؎ "گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ" ص ۶۶ — ۶۷۔

۳؎ "جامعہ" (مجیب نمبر)۔

کو بھی نیک نیت سمجھتا ہو۔ یہاں میں آپ سے جو کچھ عرض کر رہا ہوں، اس سے کوئی ایسا شخص جس نے اپنے طور پر فیصلے کر لیئے ہوں، اگر بدتمیزی نہیں تو بے تکا پن ضرور سمجھے گا۔ لیکن آپ دوسروں کا جو لحاظ رکھتے ہیں، اس میں اتفاق کرنے والوں ــ اور اختلاف کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا، اور میں نے آپ کے در پر آنے کی ہمت اس لیئے کی کہ مجھے یقین ہے کہ میری بات دوستانہ انداز میں سنی جائے گی۔ اگر ہمیں کوئی سیاسی معاملہ طے کرنا ہوتا تو مجھے اپنا ٹھکانا معلوم تھا، لیکن موجودہ مسئلہ خاص طور پر تمدنی اور ادبی ہے، اور اسی لیئے اس کے متعلق اختلاف رائے ہونے پر میں آپ سے رجوع کرنے کو اپنا اور بھی بڑا اخلاقی فرض خیال کرتا ہوں۔ دوسرے لوگ چاہے جو سمجھیں، لیکن میرے خیال میں عوام کے مخلص خادم کے لیئے آج سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی کہ وہ ان مقصدوں سے، جو آپ نے اپنے سامنے رکھیں ہیں، اور اُس پالیسی سے، جس پر آپ عمل کر رہے ہیں، الگ جا پڑے۔ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا، جب تک کہ میں اپنے دل کی بھڑاس نکال نہ دوں گا، اور آپ کو اپنا ہم خیال، ورنہ ہمدردانہ بنالوں گا۔

پہلے میں بالکل شروع کی بات کروں گا پچھلے کئی برسوں سے کانگریس ایک مشترکہ سیاسی مقصد کے بنیادی حصے کے طور پر، بول چال کی ایک مشترکہ زبان کی علمبردار رہی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ بات عام جلسوں میں تقریر کرنے والوں کی بہت سی غلطیوں اور فروگذاشتوں کے کارن بنی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس اصول نے اردو کے ادبی حلقوں میں عام فہم زبان اور گھریلو انداز کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے، جس کا پہلے کوئی پتہ تک نہیں تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی ساری زندگی عربی کتابیں پڑھنے، اور ایسے موضوعات لکھنے میں صرف کی، جن کے اصطلاحی لفظوں میں ردّ و بدل سے مطلب بدل جاتا ہے۔ مگر اب اُن کے ایسے مصنّف تک نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی زبان کو آسان 'ہندستانی' بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیئے کہ مشترکہ ہندستانی زبان کا نصب العین اُنہیں بہت زیادہ عزیز تھا۔

کانگریسی حلقوں میں یہ مشترکہ زبان ہندستانی کہلائی۔ اگرچہ اس کے نام کے بارے میں کانگریس نے اردو اور ہندی بولنے والوں سے کوئی بات صاف طور پر طے نہیں کی تھی۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہوں، ناموں کے ساتھ جو باتیں جڑی ہوتی ہیں، اُن کی وجہ سے نام بہت بڑی سیاسی اور سماجی حیثیت رکھتے ہوں (ہیں)۔ اس لیئے ہماری مشترکہ زبان کو جو نام دیا جائے گا، اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ ابھی تک صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے، جو کسی ایک صوبے یا مذہبی فرقے تک محدود نہیں رہی ہے۔ سارے ہندوستان کے مسلمان یہ زبان بولتے ہیں[1] اور اتری ہند میں اس کے بولنے والوں کی تعداد مسلمان (مسلمانوں) سے بھی زیادہ ہے۔ اگر ہماری مشترکہ زبان اردو نہیں کہلائی جاسکتی، تب بھی اس کا نام کس سے کم ایسا ہونا چاہیئے جس سے مسلمانوں کے اس کام کا پتہ چل سکے، جو انھوں نے ایک کم و بیش مشترکہ زبان کو بنانے کے سلسلے میں انجام دیا ہے۔ ہندستانی سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے، لیکن ہندی سے نہیں۔ اس زبان کو مسلمان پچھلے زمانے میں پڑھتے رہے ہیں، اور اُسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان بنانے میں انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر حصّہ ضرور لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان سے ایسی مذہبی اور تہذیبی باتیں وابستہ ہیں، جن کو مسلمان مجموعی طور پر اپنا نہیں سکتے۔ (کذا) اس کے علاوہ یہ زبان اپنے اندر بہت سے ایسے لفظ شامل کرتی جارہی ہے، جو اکیلے اسی کے ہیں اور جن کو اُردو جاننے والے عام طور سے نہیں سمجھ سکتے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت پیش نہ آتی، اگر یہ رجحان نمایاں طور پر موجود نہ ہوتا کہ ہندی اور ہندستانی کو تو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا جائے لیکن اُردو اور ہندستانی کو کبھی اس طرح پیش نہ کیا جائے۔ آپ نے

---

[1] جنوبی ہند (اس وقت کی مدراس پریزیڈنسی، اور آج کے تامل ناڈو اور کیرالا) کے مسلمانوں کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں۔

پچھلے سال اندور میں جو تقریر کی تھی اس سے صاف طور سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں[1]، اور رسالہ 'ہنس' کے پہلے پرچے میں آپ نے جو پیش لفظ لکھا ہے، اس میں بھی آپ نے ان دونوں کو ایک ہی بتایا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہندی سے آپ کی مراد عوام کی زبان ہے — وہ زبان جس کو عام لوگ بولتے ہیں، اور جو ان کی تعلیم کے لیئے بہترین ذریعہ کا کام دے سکتی ہے۔ لیکن اس زبان کے بہت سے پرچارک جو ہندی بولتے ہیں، اُسے اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، اور جب وہ ہندستانی کی جگہ ہندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تو وہ لفظوں کا ایک نیا ذخیرہ، ایک نیا مذاق، اور خاص قسم کے سیاسی اور مذہبی مطالب لے آتے ہیں۔ میں اس رجحان کے خلاف آپ سے اپیل اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد بھی اس کا شکار معلوم ہوتی ہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو پریشد کے قائم ہونے سے بڑی خوشی ہوئی تھی، اس لیئے کہ میرا خیال تھا کہ اس طرح ایک مشترکہ زبان کے لیئے کوئی ٹھوس بنیاد بن جائے گی۔ میں نے رسالہ 'ہنس' کے اجرا کا بھی خیر مقدم کیا تھا۔ میں پریشد کے دوسرے کاموں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اگر 'ہنس' کے پرچوں سے اس کے رویئے اور اس کی پالیسی کا کوئی پتہ چلتا ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ اس سے میرے بہت سے خیال غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ منشی پریم چند صاحب غالباً آج ہماری سب سے بڑی ادبی ہستی ہیں، اور ان کم یاب لوگوں میں سے ایک ہیں جن کے لیئے ادب اپنی بات کہنے اور انسانیت کی سیوا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ اردو اور ہندی، دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اور ان کی ذات ہندو مسلم تمدن کی بہترین ادبی اور سماجی روایتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ 'ہنس' میں وہی زبان استعمال ہونا چاہیئے تھی، جو منشی پریم چند لکھتے ہیں۔

---

[1] ہندی اور ہندستانی کو

اسے انھیں روایتوں کا علمبردار ہونا چاہیئے تھا، جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیا (گیا)، اور اسی کی میں شکایت کر رہا ہوں۔ 'ہنس'، کے پڑھنے والوں پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ نمایاں طور پر کسی فرقے کا رسالہ ہے، دوسرے ہندی رسالوں سے زیادہ سنسکرت بھری ہندی استعمال کرتا ہے، اور ایسی زبان لکھتا ہے، جسے ہندستانی نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح جس طرح اسے انگریزی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی نگاہ یا مضمونوں کے انتخاب میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ ہندستانی قوم کئی فرقوں سے مل کر بنی ہے، یا یہ کہ ہندستان میں سوائے ایک کے کوئی اور تمدن بھی پایا جاتا ہے یہ فیڈریشن نہیں، بلکہ سامراج ہے۔

میرا مطلب ایک اس سے بھی چھوٹی سی بات سے صاف ہو جائے گا۔ ساہتیہ پریشد کو بھارتیہ کہا گیا ہے، ہندستانی نہیں کہا گیا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر بھارت کوئی مفہوم رکھتا ہے تو اس سے آریوں والا ہندستان مراد ہے، جس میں نہ صرف مسلمانوں کی، اور ہندستانی زندگی میں ان کے حصّے کی بلکہ سیکڑوں برسوں کی ترقی اور تبدیلی کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا اس سے الگ تھلگ رہنے اور پرانے زمانے کی طرف واپس جانے کی خواہش کا پتہ نہیں چلتا؟ اس کے علاوہ ہمارے پاس ہندی میں جو گشتی چٹھیاں آتی ہیں ان میں، بول چال والی زبان کے دو یا تین سے زیادہ لفظ نہیں استعمال کئے جاتے۔ مثلاً ہندی کے معمولی فقرے نیچے لکھے ہوئے کے بجائے خالص سنسکرت کا فقرہ نمن لکھت استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اگرچہ میں ناگری لکھاوٹ خاصی اچھی طرح جانتا ہوں، مگر یہ زبان میری سمجھ سے باہر ہے۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ سنسکرت اور عربی، دونوں زبانیں اصطلاحی لفظوں کے اعتبار سے مالا مال ہیں، لیکن ایک مشترکہ ہندستانی زبان اُن سے محض کسی ایک پر منحصر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ اگر عربی ایک بدیسی زبان ہے، تو سنسکرت بھی کبھی عام بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ اور جو شخص بول چال والی ہندی کا مطالعہ کرے گا اسے پتہ چل جائے گا کہ اس میں

سنسکرت کے جتنے بھی لفظ پائے جاتے ہیں، وہ وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہو گئے ہیں، اس لئے کہ مسلمان نہیں، بلکہ ہندستانی عوام ان لفظوں کو آسانی سے بول نہیں سکتے۔ گرام اور ورشں جیسے چھوٹے لفظ بھی بدل کر گاؤں اور برس ہو گئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے حمایتی ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لیئے کہ انھوں نے ان کی، اور بہت سے دوسرے لفظوں کی جگہ ان کی اصلی سنسکرت والی شکلیں لاکر رکھ دی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا قابلیت کے زعم میں کیا گیا ہے یا جہالت یا تعصب کی بنا پر، کیونکہ سنسکرت لفظوں کی بول چال والی شکلیں سب اردو نے اپنا لی ہیں۔ تاہم صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ان دوستوں کو براہ راست دلچسپی ایک زندہ اور بول چال والی زبان پھیلانے سے نہیں، بلکہ ہندستانی زندگی کو آریائی بنانے سے ہے۔ ہمارے ہندو بھائی چاہے سدھار کی کوشش کریں، اور چاہے رجعت پسندی (پرستی) کی طرف جائیں، اس سے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن معمولی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ایسی تحریکوں کو زبان کے مسئلے سے بالکل الگ رکھا جائے . . . .

. . . .

اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ شاید یہ باتیں آپ کے کسی پبلک بیان کی بنیاد بن جائیں۔ وہ باتیں یہ ہیں:

(۱) ہماری قومی زبان ہندستانی کہلائی جائے، نہ کہ ہندی۔

(۲) ہندستانی زبان کا کسی فرقے کی مذہبی روایتوں سے کوئی خاص تعلق نہ سمجھا جائے۔

(۳) کسی لفظ کو بدیسی یا دیسی کی کسوٹی پر نہیں، بلکہ اس کے رواج کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

(۴) اردو زبان کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی زبان کے مسلمان لیکھوں کے استعمال کیئے ہوئے تمام لفظوں کو رائج مان لیا جائے۔ البتہ اردو اور ہندی کی جو مذہبی حیثیت ہے، اُس پر اس قاعدے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۵) اصطلاحی الفاظ، خاص کر سیاسی اصطلاحیں تجویز کرتے وقت سنسکرت لفظوں کو، ان کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص ترجیح نہ دی جائے، بلکہ ایسے لفظوں کے اردو، ہندی اور سنسکرت سے قدرتی طور پر لیئے جانے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے۔

(۶) دیوناگری اور عربی، دونوں لکھاوٹوں کو رائج اور قاعدے کے اندر مانا جائے، اور ایسے تمام میں، جن کی پالیسی ہندستانی زبان کے حامیوں کے ہاتھ میں ہے، دونوں لکھاوٹیں سکھانے کا بندوبست کر دیا جائے۔

ممکن ہے بعض دوستوں کو یہ تجویزیں مسلمانوں کی مانگیں معلوم ہوں، لیکن ایسا ہے نہیں۔ تاہم میں جانتا ہوں کہ جب تک آپ کی طرف سے، اور پریشد کی طرف سے اس قسم کی کوئی ضمانت نہیں دی جائے گی، اس وقت تک اس بات کا کوئی سوال نہیں ہے کہ ایک مشترک زبان کی خاطر مسلمانوں کی ادبی کوششوں سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اسی خیال سے میں نے یہ تجویزیں آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں . . . . .‘‘

کنھیالال منشی کے اثر سے پریم چند کے رسالے ’ہنس‘ کی زبان نت سیم لدی ہندی ہو گئی۔ لیکن خود پریم چند زبان کے ساتھ اس تشدد کے حق میں نہ تھے۔ ایک بات تو انھوں نے ڈاکٹر (مولوی) عبدالحق کو اپنے ۲۸ جون ۳۶ء کے خط میں لکھی ہے، جو نقل کی جا چکی ہے۔ جولائی ۳۶ء کے اردو میں افکار و واقعات کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا۔ اس کا حوالہ بھی دیا جا چکا ہے۔ اسی شمارے میں ص ۶۲۶ سے منشی پریم چند کا ایک مضمون شروع ہوتا ہے[1]۔ اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے[1]:

’’مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی۔ ایک ناگری خط میں ٹھیٹھ ہندی، جسے بھاکھا یا ناگری کہتے ہیں۔ دوسری اردو، یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا ہندی

---

[1] منشی پریم چند، ہندی اور اردو کا مستقبل، مشمولہ ’’اردو‘‘ اورنگ آباد، ص ۶۲۶–۶۳۸۔

زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء سے پہلے کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کتاب کا نام چندراوتی ہے، اور اسے سول مسرا نے لکھا تھا۔ اس کے بعد ہی للولال جی، انشاء اللہ خاں وغیرہ کا نام آتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ سوا سو سال پہلے جس زبان کے (کی) نثر کا پتہ نہیں چلتا، وہ آج ہندوستان کی قومی زبان بن رہی ہے۔"

زبان کے نزاعی مسئلے پر خاصی تلخ بحثیں اخباروں میں ہوتیں، اور مولوی عبدالحق نے اس زمانے میں جو بھی خطبے دیئے ان میں کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ آگیا، کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے ذہن میں ہیجان تھا۔ صرف چند مثالیں[1]

(۱) "انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہندستان کی زبان ہندستانی ہوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ یہ فیصلہ معقول تھا، اور اس دوراندیشی پر مبنی تھا، جو اس قسم کی کانگریسیں ایسے موقعوں پر عمل میں لاتی ہیں۔ لیکن ان صاحبوں کے اطمینان کے لیئے کافی نہ تھا، جن کا منشا کچھ اور تھا۔ انھوں نے اس رزولیوشن کو طفل تسلّی سے زیادہ وقعت نہ دی، اور دوسری ادھیڑبن میں لگ گئے۔ اُن کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا۔ یعنی ہندی سمّیلن کا سالانہ اجلاس اندور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی۔ اس جلسے میں بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی:

ہندستان کے ان ادیبوں میں جو اپنے اپنے صوبوں کی زبان میں کام کر رہے ہیں، ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے، نیز ہندی زبان کے ارتقا میں ان کا اتحادِ عمل حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اصحابِ ذیل کی ایک کمیٹی قائم کرتی ہے۔۔۔۔۔

چنانچہ اس کمیٹی نے فوراً کام شروع کر دیا، اور ماہانہ ہندی رسالہ ہنس، جو ہندی کے مشہور ادیب منشی پریم چند کئی سال سے نکال رہے تھے، اس

---

[1] مولوی عبدالحق: خطباتِ عبدالحق "اردو کا حال اور مستقبل": ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء: لاہور: ص ۱۵۱/۵۲

ادارے کے تحت آگیا۔ یہ ادارہ بھارت ساہتیہ پریشد کے نام سے مشہور ہے (یعنی انجمن ادب ہند)، اور ہنس اب اس کا رسالہ ہے۔ منشی پریم چند کے ساتھ گجراتی زبان کے مؤرخ اور ادیب مسٹر کنھیالال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے۔ مہاتما گاندھی اس تحریک کے دینی باپ، اور مسٹر کنھیالال اس کے روح و رواں ہیں۔ چنانچہ ہنس کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں (یہ میں اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں، اگر اصل زبان سناؤں تو آپ کے سمجھانے کے لیے مترجم کی ضرورت ہوگی):

> اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمایئے، جو انھوں نے ہنس کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

> ہنس ہندستان بھر میں انوکھا پریتن ہے۔ یدی ہندی اتھوا ہندستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے، تو ایسے ماسک کی آوشکتا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں جو لیکھ لکھا جاتا ہے، اس کا پرچے راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہیئے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا پرچے دل چاہے ان کو ہنس دوارا پرت ماس ادھے روپے میں ادا کرے گا۔

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا۔ اب تک ملک کی زبان ہندستانی تھی۔ اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم اور باوقعت کانگریس نے اسے علی الاعلان تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اب ہندی یا ہندستانی کے الفاظ خاص ذہنیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔"

(۲) ۱۹۳۶ء میں بہار اردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت مولوی عبدالحق نے لکھا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ انھوں نے اس میں یہ بھی کہا ہے:۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

"ہندی اردو کا جھگڑا آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اٹھا تھا۔ لیکن اس زمانے کے مذہبی اور سیاسی اختلافات نے اسے اور چمکا دیا۔ پہلے ایک اُدھ جگہ تھا، اب سارے ہندستان میں پھیل گیا ہے۔ پہلے ہندی اردو ہی کا قضیہ تھا، اب ہندی، ہندستانی اور اردو کے ساتھ ہندی ہندستانی کا ایک نیا شاخسانہ کھڑا کیا گیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بہت معقول فیصلہ کیا تھا کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے، خواہ رسم خط کچھ بھی ہو۔ لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ جس مدبر ان دماغ نے یہ تجویز سوچی تھی، اور جنھوں نے اس پر آمنّا وصدّقنا کہا تھا، سب سے پہلے اب وہی اس سے انحراف کر رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی جدّت پسند طبیعت نے ایک نیا لفظ ہندی ہندستانی وضع کر کے گویا جلتی آگ میں تیل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جب مہاتما جی سے دریافت کیا گیا کہ اس جدید مرکّب لفظ سے آپ کی کیا مراد ہے، تو فرمایا کہ 'ہندی جو آیندہ چل کر ہندستانی ہو جائے گی'۔ . . . . اس کے یہ معنی ہوے کہ اس وقت ہم ایسی زبان اختیار کرنی چاہتے ہیں، جو سالہا سال تک، کئی صدی کی کوشش، جدوجہد اور محنت و مشقّت کے بعد ہندستانی ہو جائے گی۔ ہندستانی تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ پھر صدیوں تک انتظار کرنے، اور سالہا سال کی مصیبت اور کھکھیڑ اُٹھانے سے حاصل؟"[1]

مولوی عبدالحق نے ہر موقع کو احتجاج کرنے کے لیئے استعمال کیا۔ گاندھی جی کو بھی ان کے بہت سے عقیدت مندوں نے لکھے، اور گاندھی نے محسوس کیا کہ انھیں اپنے موقف کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ انھیں شاید یہ احساس بھی ہوا کہ کالیلکر اور منشی نے انھیں صحیح مشورہ نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹر تارا چند اس زمانے میں اُن کے قریب آ گئے تھے، اور شاید ان ہی نے لسانی صورتِ حال سے گاندھی جی کو آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے "ہندی۔ ہندستانی" کے سلسلے میں جو ایک بے لچک فیصلہ کر لیا تھا، اس میں نرمی آئی، لیکن بتدریج۔

---

[1] ایضاً خطبہ نمبر ۵؛ ص ۷۳-۸۸۔

(۱) " (بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی ناگپور قرار داد میں) 'ہندی ہندستانی' کا لفظ میرے کہنے سے رکھا گیا ہے۔ اور اس لیئے رکھا گیا ہے تاکہ ہندی کی تشریح کے پورے مفہوم کو ایک مرکب لفظ میں ادا کیا جا سکے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے تجویز کیا تھا کہ 'ہندی ہندستانی' کی جگہ صرف 'ہندستانی' کا لفظ رکھا جائے۔ مجھے ذاتی طور پر ان میں کسی لفظ پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بھارتیہ ساہتیہ پریشد اپنی اصل کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کا خیال اندور کے ساہتیہ سمیلن کے دوران پیدا ہوا تھا۔ اور سمیلن ہی کی چھتر چھایا میں ناگپور میں پریشد کو ایک مستقل شکل دی گئی تھی۔ اس لیئے حالات کو دیکھتے ہوئے 'ہندی' کا لفظ برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اس کی جگہ 'اردو' کا لفظ رکھ دینا غلط ہوتا۔ اس کے کارن میں اوپر بتا چکا ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں نے یہاں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، 'ہندی' 'ہندستانی' اور 'اردو' ایک ہی معنی رکھنے والے لفظ ہیں۔ اور عملی طور پر ایک ہی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔" [۱]

مولوی عبدالحق نے جولائی ۳۶ کے "اردو" میں، جو یقیناً اگلے مہینے شائع ہوا ہوگا، اس پر تبصرہ کیا ہے: [۲]

" . . . عجیب بات یہ ہے کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے جلسے میں سوال کرنے پر، جو تعریف انھوں (گاندھی جی) نے ہندستانی کی کی تھی، وہ وہی تھی، جو اب وہ ہندی کی کرتے ہیں، اور ہندی کی تعریف بالکل دوسری کی تھی۔ ہمارے لئے یہ بالکل ایک معمّہ ہے۔ . . . وہ فرماتے ہیں کہ ہندی ہندستانی کا لفظ میری تحریک پر اختیار کیا گیا تھا تاکہ اس مرکب لفظ کے ذریعے سے ہندی کی تعریف کے معنے صاف ظاہر ہو جائیں۔ اس مرکب کی مطلق ضرورت نہ تھی، جب کہ وہی مفہوم 'ہندستانی' کے لفظ سے

---

[۱] ایم کے گاندھی: ہریجن یکم اگست ۳۶ء (گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ ص ۷۷)

[۲] عبدالحق: رسالہ "اردو" بابت جولائی ۳۶۔ ص ۵۴۴۔ ۶۴۴۔

ظاہر ہوتا ہے، اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ . . . . . سب بحث کرنے کے
بعد وہ آخر میں حسبِ معمول فرماتے ہیں کہ 'ہندی'، 'ہندستانی' اور 'اردو'
مترادف لفظ ہیں، اور ان سے مراد ایک ہی زبان ہے۔ مہاتما جی اس معاملے
میں ہر مضمون کی تمہید دوسروں کے سو ظن سے شروع کرتے ہیں، اور اپنے
کو اور اپنے رفقا کو اس سے بری بتاتے ہیں۔"

اس سلسلے میں ایک نہایت اہم خط کا عکس ملا ہے، جو گاندھی جی کو مولوی عبدالحق نے دریا گنج دلی سے ۲۳ ستمبر کو لکھا تھا۔ سنہ میں اکائی اور دہائی کے ہندسے نہیں ہیں۔ مضمون سے واضح ہے کہ خط ۱۹۳۶ میں لکھا گیا ہے، کیونکہ اگلے برس تو اگست کے آخر میں ہندی اردو کے سوال پر پٹنہ میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرساد نے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے تھے۔ خط کا متن یہ ہے:

دریا گنج، دہلی
مورخہ ۲۳ ستمبر
مکرم گاندھی جی سلامت

آپ کا خط پہنچا۔ میری تقریر کی رپورٹ، جو اخبار میں چھپی ہے، اس میں ایک آدھ جگہ غلطی ہو گئی ہے۔ البتہ میں نے ضرور کہا تھا، اور اب بھی کہتا ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ ـــــــ "ابتدا میں ہندی اردو کا جھگڑا صرف بہار اور یو پی تک تھا، کبھی کم کبھی زیادہ۔ لیکن جب آپ نے اس میدان میں قدم رکھا، اور یہ اعلان کیا کہ اس ملک کی عام زبان یعنے "راشٹر بھاشا" ہندی ہے، اور سارے ملک، اور خاص کر اُن علاقوں میں اس کے پھیلانے پر کمر باندھی جہاں کی زبان کو ہندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا (جیسے صوبہ مدراس) تو یہ جھگڑا آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گیا۔"

آپ کو شاید یہ معلوم ہے یا نہیں کہ ہندو مسلمانوں نے جھگڑے کی ابتدا زبان (کے) مسئلے پر ہوئی (کذا)، پولیٹکل اختلاف بہت بعد کی بات ہے۔ زیادہ تر جھگڑے صرف بہار اور یو پی تک محدود تھے۔ لیکن جب آپ نے نئی ہندی کو "راشٹر بھاشا" بنانے کا

بیڑہ اُٹھایا، اور بڑی سرگرمی، غیر معمولی مستعدی اور لاکھوں روپے کے صرفے سے اس مہم کو چلایا تو . . . . . دبی ہوئی آگ پھر سلگ اٹھی۔ اور آپ کی کوششوں نے اس آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ مدراس میں ان جھگڑوں کو کون جانتا تھا۔ پنجاب میں ہندی اردو کی کوئی بحث نہ تھی۔ بمبئی میں اس کا کبھی ذکر نہ آتا تھا۔ آپ کی بدولت یہ فساد شہر شہر، گاؤں گاؤں گھر گھر پہنچ گیا۔ اور اس پرچار سے متاثر ہو کر، ہندو دیسی ریاستوں نے بھی اردو زبان کو اپنی ریاستوں سے خارج کر دیا، حالانکہ یہ زبان وہاں بہت زمانے سے رائج تھی۔

پچیس برس کے مسلسل پرچار، سینکڑوں اور ہزاروں کارکنوں کی دن رات کی محنت مشقت، اور لاکھوں روپے کے صرفے سے آپ نے وہ کام کیا، جو اس ہندی کے بڑے بڑے پریمی اور حامی گذشتہ اسّی سال میں نہ کر سکے۔ جب اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور آپ اس طرف سے مطمئن ہو گئے، تو اس وقت آپ . . . . . کہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہندستانی ہونی چاہیئے۔ لیکن اب (کیا ہو سکتا) ہے۔ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اگر آپ میری اس درخواست کو منظور کر لیتے جو میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے سالانہ اجلاس ناگپور (۱۹۳۶) میں کی تھی کہ اس ملک اور پریشد کی زبان ہندستانی ہونی چاہیئے، تو بہت سے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

پریشد کے اس اجلاس میں جب آپ سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا "وہ زبان جو کتابوں میں ہے، بول چال میں نہیں۔" ایک ایسی زبان کو جو بول چال میں نہیں، "راشٹر بھاشا" قرار دینا، اور اس زبان کو جو صدیوں سے بول چال میں ہے، نظر انداز کر دینا بڑی ناانصافی تھی۔ اور یہی بات فساد کی جڑ بن گئی۔

یہ صحیح ہے کہ آپ نے کبھی اردو دشمنی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن دانستہ یا نادانستہ ایسی تدبیریں اختیار کیں، جن کی وجہ سے زبان کا مسئلہ دن بدن پیچیدہ اور خراب ہوتا گیا، اور دلوں میں بدگمانی اور بیر بڑھتا گیا۔

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے، وہ بحث کی غرض سے نہیں لکھا، بلکہ اس زمانے میں جو واقعات گذرے، اور اُن کا جو اثر ملک پر ہوا، وہ میں نے صاف صاف آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے، تاکہ آپ کو اس مسئلے کا دوسرا رُخ معلوم ہو جائے۔

خدا آپ کو ۱۲۵ برس تک زندہ وسلامت رکھے، اور آپ کی ذات سے ملک کو جو نقصان پہنچا ہے، باقی عمر میں اس کی تلافی کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا خیر اندیش

عبدالحق

اس خط کے بارے میں گمان یہی ہے کہ ستمبر ۳۶ء میں لکھا گیا ہے، لیکن اس بات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ۳۷ء میں مولوی عبدالحق اور راجندر پرساد کے معاہدہ ہونے کے بعد گاندھی جی کو لکھا گیا ہو۔ ساہتیہ پریشد ناگپور میں ہندی اردو ہندستانی نزاع کے بعد اردو حلقوں میں خاصی سراسیمگی رہی۔ پروفیسر محمد مجیب کا خط پیش کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بہت محتاط آدمی تھے۔ ان کی کوئی تحریر تو نہیں ملتی، لیکن یہ کہ وہ اس مسئلے پر گاندھی جی اور اردو حلقوں کے درمیان رابطے کا کام کر رہے ہوں، ممکن، اور بہت ممکن ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے ۱۸ جون کو جو خط مولوی عبدالحق کو لکھا، اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے:

Vi ce-Chancellor,

Muslim University,
Aligarh,

Dated ۱۸ جون ۳۶ء

محبی تسلیم

میں نے ناگپور والے جلسے کا مضمون نہایت غور اور دلچسپی سے پڑھا۔ بلاشبہ اب ہم سب کو اردو کی ترقی ہی کی نہیں، بلکہ اس کی حفاظت کے لئے آمادہ ہو کر متحدہ کوشش کرنی چاہیئے، اور علی گڑھ پر میرے نزدیک سب سے بڑا حق ہے۔ چند دن ہوئے کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب

سے بھی تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ آئندہ دسمبر میں جو کانفرنس کی جوبلی ہونے والی ہے، اس موقع پر اس غرض کے لئے بھی ایک خاص اجتماع کیا جائے۔ اور حق (ہے) کہ آپ نے اردو کی ترقی کے لئے بہترین خدمات کی ہیں، اور چوتھائی صدی سے اس کے ہر پہلو پر غور کر رہے ہیں، اس لیئے آپ اس میں رہبری کریں۔ میں ذاتی طور پر .یو نیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر علی گڈھ میں یہ اجتماع ہوگا تو ہماری تمام خدمات آپ کے سپرد ہوں گی۔

کانفرنس کے موقع پر یہ آسانی ہے کہ اس اجتماع کے لئے کسی خاص انتظام کی ضرورت نہ ہوگی۔ والسلام

خاکسار

ضیا الدین احمد

اس زمانے میں گاندھی جی کی جو تحریریں اُن کے اخباروں نوجیون، ہریجن وغیرہ میں ہندی، اردو ہندستانی کے موضوع پر شائع ہوئیں، ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین یا ڈاکٹر تاراچند کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن ایسا قیاس کرنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ ان دو حضرات سے بھی گاندھی جی نے اگر مشورہ نہیں کیا، تو ان سے ملاقاتوں میں جو باتیں ہوئی ہوں گی، اُن کا اثر ان پر ضرور پڑا ہوگا۔ ہندستانی کمیٹی صوبہ بہار کے عنوان سے اپریل ۳۸ء کے "اردو" میں ص ۴۵۴ پر یہ عبارت ہے:

"پچھلے نومبر میں اس کے متعلق ذکر آچکا ہے۔"[1]

کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۲ مارچ کو پٹنہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں ہوا، اور اس میں شرکت کرنے والے تھے: پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس سنہا، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بی آر سکسینہ، مولوی عبدالحق سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر نرائن داس، پروفیسر بدری ناتھ ورما اور راجہ رادھکا رامن پرشاد سنہا۔

---

[1] رسالہ اردو اورنگ آباد بابت اپریل ۳۸ء۔

ہریجن سیوک کے ۱۰ مارچ ۴۲ء اور ۲۸ جون ۴۲ء کے شماروں میں گاندھی جی ڈاکٹر تارا چند کے خیالات تفصیل سے پیش کئے ہیں[1] جن میں ڈاکٹر تارا چند نے کھڑی بولی کے ادب کو برج بھاشا کے ادب سے پہلے کا بتایا ہے، اور کھڑی بولی ہی کو ہندستانی کہا ہے۔ خیال ہے کہ گاندھی جی کو دوبارہ ہندستانی کی طرف لانے میں ڈاکٹر تارا چند کا بھی اثر رہا ہوگا۔ اس اثر کا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جو گاندھی جی کے ایما پر ہوا تھا، اور جس کے بارے میں ہریجن میں یہ چھپا[2] عنوان سے "مبارک قدم"

"مولوی عبدالحق صاحب اور شری راجندر پرشاد نے ہندی اردو کی بحث پر جو مشترکہ بیان جاری کیا ہے، اس سے امید ہو سکتی ہے کہ یہ بحث اب ختم ہو جائے گی، اور جن لوگوں کو ایک بین صوبائی زبان بننے سے دلچسپی ہے، وہ اس معاملے کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث مباحثہ کر سکیں گے اور مشترکہ کارروائی کے لئے کوئی راہ نکال سکیں گے۔ وہ بیان یہ ہے:

پٹنہ میں ۲۸ اگست ۱۹۳۹ء کو بہار اردو کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر آپس میں، اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اردو ہندی ہندستانی کی بحث میں بدقسمتی سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اُن کو دور کر دیں، اور ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہم نے اس کے مختلف نکتوں کے متعلق آپس میں کافی اتفاق رائے پایا۔ ہم اس بات پر ایک رائے ہیں کہ

---

[1] مشترکہ زبان، ص ۹۳ — ۱۰۶۔

[2] گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ ص ۹۸ — ۱۰۰۔

ہندستانی ہندستان کی مشترکہ زبان ہو، اور اردو اور ناگری، دونوں حرفوں میں لکھی جائے، اور تمام سرکاری اور تعلیمی کام کاج کے لئے ان دونوں لکھاوٹوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ہندستانی سے ہم اتری ہندستان میں بولی جانے والی زبان کے زیادہ تر مشترک حصے کو مراد لیتے ہیں، اور ہمارا خیال ہے کہ اس زبان کی لغت کے لئے لفظ ڈھونڈھنے اور ان کو شامل کرنے میں ان لفظوں کے عام استعمال ہی کو کسوٹی بنانا چاہیئے۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اردو اور ہندی، اور دونوں ادبی زبانوں کے لئے ترقی کرنے کے پورے پورے موقعے فراہم کئے جانا چاہئیں۔ ہماری تجویز ہے کہ اردو اور ہندی کے عالموں کی مدد سے ہندستانی لفظوں کا ایک بنیادی لغت تیار کرنے کی کوشش کی جانا چاہیئے۔ ایسے لغت کی ترتیب کے لئے عملی طریقے سے سوچنے اور مختلف بڑے بڑے مسئلوں، مثلاً اصطلاحی لفظوں کے انتخاب کے طے کرنے کے لئے ہماری تجویز ہے کہ کسی قریبی تاریخ پر ایک مختصر نمائندہ کمیٹی طلب کی جائے، اور اس میں اردو اور ہندی کے ایسے اثردار حامی شامل ہوں جو اس بات پر عقیدہ رکھتے ہوں کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لایا جائے، اور ہندستانی زبان کو ترقی دی جائے، اور اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

امید کرنی چاہیئے کہ بیان دینے والے حضرات ہندستانی کے بنیادی لغت کو تمام جماعتوں کے لئے قابلِ قبول بنانے کے سلسلے میں جلد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے، اور ان کے ذہن میں جس مختصر کمیٹی کا خیال ہے

وہ اس کام کے لئے، اور مختلف بڑے بڑے مسئلوں کو طے کرنے کے لئے فوراً ہی بنادی جائے گی۔ اگر کام وقت پر انجام دینا ہے، تو میں اس بات پر زور دوں گا کہ کمیٹی کو واقعی مختصر ہونا چاہیئے۔

انجمن ترقی اردو کی پنجاہ سالہ تاریخ میں بھی اس تاریخی معاہدہ کا ذکر ہے[1]

"۔۔۔۔ ۱۹۳۲ء میں جب کہ دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت سب جگہ تسلیم کی جارہی تھی، پٹنہ یونیورسٹی کی سنیٹ میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ میٹرک تک ذریعۂ تعلیم ہندستانی کر دی جائے اہلِ اردو اصولاً اسے قبول کرنے پر تیار تھے، مگر چاہتے تھے کہ ہندستانی اچھی طرح سے واضح کر دی جائے۔ مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ایک خاص جلسہ پٹنہ میں منعقد کیا۔ علیگڑھ، دہلی، لکھنؤ کے چند اساتذہ، مصنفین و ناشرین شریک تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے صدارت کی (۲۸/ اگست ۱۹۳۷ء)۔ اہلِ جلسہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے متفق تھے، مگر جب تک اس زبان کی صحیح تعریف معین نہ ہو جائے، درسی کتابوں کا اردو اور ہندی میں الگ الگ لکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ ایک قرارداد (۵) میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ 'ہندستانی زبان کے قواعد، اصطلاحات لغات کے لئے (حکومتِ بہار کی طرف سے) ایک کمیٹی مقرر کی جائے، جس میں انجمن ترقی اردو اور ہندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ہوں۔ ایسی کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو، اتفاق سے کام لیا جائے، لیکن اختلاف کی صورت میں ۔۔۔۔ اردو کتابوں کے متعلق ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے'۔

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو (انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۳ء) مرتبہ سید ہاشمی فریدآبادی (ص ۷۶ ۔ ۷۸)

اسی دن، سہپہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری جلسے میں آئے، اور متعلقہ مسائل پر دوستانہ بحث و اتفاقِ رائے کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک متفقہ اعلان سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان مرتب اور شائع کیا گیا۔

(متن کے الفاظ کچھ مختلف ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہریجن، کا جو متن 'گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ' کے حوالے سے دیا گیا ہے، وہ ترجمہ ہے۔ لیکن نفسِ مضمون وہی ہے۔)

پنجاہ تاریخ انجمن ترقی اردو سے یہ اہم تفصیل بھی معلوم ہوتی ہے[1]

"بہار کی کانگریس وزارت میں تعلیم کا محکمہ ڈاکٹر سید محمود کو تفویض ہوا تھا۔ انھوں نے ہندستانی لغت نیز درسیات کی تیاری کے لئے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ماہرینِ تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کا جلسہ مارچ ۳۸ء میں ہوا۔ ہندستانی لغت اور صرف و نحو کی تالیف کا کام مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر تاراچند کے سپرد کیا گیا۔ سب سے اہم تصریحی قرار داد (۵) یہ منظور ہوئی کہ:

> مولوی عبدالحق صاحب مجاز کیے جاتے ہیں کہ ہندستانی زبان کی لغت تیار کریں، جس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہئیں، جو مستند ہندی مصنفوں نے استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کیے جائیں، جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

. . . .

مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی میں اردو ہندی دال

---

[1] ایضاً، ص ۷۹، ۸۰۔

مددگاروں سے لغت مرتب کرا دی، جس کے مسوّدات کمیٹی
کے سکریٹری صندوقوں میں بھر کر پٹنے لے گئے تھے۔ لیکن کتاب
کی تکمیل واشاعت کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اور جہاں تک معلوم
ہے، یہ امید افزا منصوبہ مسوّدات کی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔"

ریڈیو پروگراموں کی زبان، بول چال کی زبان کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی۔ سرسیّد نے جس نثر کو وقار بخشا تھا، وہ رفتہ رفتہ بوجھل ہوتی گئی۔ فیلڈن نے بولی جانے والی زبان کو پھر "ریڈیائی ادب" کے سنگھاسن پر بٹھایا۔ اگرچہ وہ اردو رسم خط سیکھ کر آئے تھے، لیکن رسم خط سے ہٹ کر، جہاں انھوں نے زبان کی بات کی ہے، ہندوستانی کی بات کی ہے، اردو یا ہندی کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب دلی اسٹیشن میں (اور بعد میں دوسرے اسٹیشنوں میں) بات چیت کے شعبے قائم ہوئے، تو 'ہندوستانی ٹاکس' کا شعبہ قائم ہوا۔ ہندی یا اردو کا نہیں۔ اور یہ اس وقت ہوا جب احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائرکٹر، اور ذوالفقار علی بخاری ڈائرکٹر پروگرام، پھر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر اور بعد میں اسٹیشن ڈائرکٹر ہوئے۔ ہندی اردو ہندوستانی تنازع کی مختصر روداد بیان کی جا چکی ہے۔ اپنی خود نوشت میں ذوالفقار بخاری نے کچھ افسوسناک باتیں لکھی ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ اُن کی اُس زمانے کی ذہنیت کی نہیں، بلکہ سرگزشت لکھتے وقت کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی کے زمانے میں اُن کے یہ خیال ہو ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ فیلڈن کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ اگر فیلڈن کو ان کے ان خیالات کا پتہ چلتا تو جس طرح سیٹھنا اور دوسروں کو اُس نے چلتا کیا تھا، ذوالفقار کو بھی واپس آرمی ہیڈ کوارٹرز شملہ بھجوا دیا ہوتا۔ چھوٹے بخاری نے لکھا ہے[1]

"پروگراموں میں اردو کے خاص لب و لہجہ سے ہندو حضرت بلبلا اُٹھے۔
ہر طرف سے شور ہوا کہ ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ دہلی ریڈیو کی زبان
بڑی سخت ہے۔ ہندوؤں پر گراں گذرتی ہے۔ اس زبان کو نرم کرنا چاہیئے۔

---

[1] سید ذوالفقار علی بخاری، سرگزشت: ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

اردو زبان میں نہیں بلکہ پروگرام ہندستانی زبان میں پیش کرنے چاہئیں۔
یہ وہ زمانہ ہے، جب گاندھی جی نے اردو کی جگہ ہندستانی زبان کا علم بلند کر رکھا تھا۔ اب اگر اس ہندستانی زبان کی کوئی ڈکشنری ہوتی، ہندستانی زبان میں کوئی ادب ہوتا، تو ہم بھی کہتے کہ چلو بھائی ہم ہندستانی زبان ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس مفروضہ زبان کو ہم کیونکر اختیار کرتے، جس کا نہ کوئی ادب تھا، نہ کوئی فرہنگ، نہ کوئی باپ تھا، نہ کوئی ماں!"

زبان کسی ایک فرقے کی نہیں ہوتی۔ دلّی میں پنڈتوں اور کائستھوں کی زبان مسلمانوں کی زبان سے مختلف نہیں تھی۔ کرخنداری البتہ مسلمان کاریگروں تک بڑی حد تک محدود تھی، اور ریڈیو اس زبان میں پروگرام نہیں کرتا تھا۔ "بلبلا اٹھے" لکھ کر ذوالفقار نے نیک نیتی اور خوش مذاقی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں کہ کنھیالال منشی اور کالیلکر کے اثر کے تحت گاندھی جی ہندوستانی کی تاویل ہندی ہندوستانی کر رہے تھے، اور ہندوستانی کے حق میں جہاد مولوی عبدالحق کر رہے تھے! ذوالفقار کی یہ بھی افسوسناک بے خبری ہے کہ ہندوستانی کا کوئی فرہنگ نہیں تھا۔ انھیں کے برادرِ اکبر، سید احمد شاہ بخاری کے زمانے میں ایک Lexicon بنایا گیا تھا۔ انھوں نے یہ خیال بھی نہ کیا کہ اگر ہندوستانی کوئی زبان نہیں تھی، تو ٹاکس کے شعبے ہندی اور اردو کے الگ الگ ہونے کے بجائے ہندوستانی کا ایک شعبہ کیوں تھا۔ دوسرا شعبہ انگریزی ٹاکس کا تھا۔ ڈرامہ کا بھی ایک ہی شعبہ تھا۔ اردو ہندی کے الگ الگ شعبے نہ تھے۔

ذوالفقار جس زمانے میں بمبئی میں اسٹیشن ڈائرکٹر تھے، انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کچھ ایسی باتیں کہیں جس سے اخباروں میں اشتعال انگیز خبریں چھپیں۔ مرارجی ڈیسائی وزیر اعلیٰ اور کنھیالال منشی وزیر داخلہ تھے۔ ذوالفقار لکھتے ہیں:[1]

"ہمیں دربار میں طلب کیا گیا۔

---

[1] ایضاً: ص ۱۲۹۔

اس زمانے میں کانگریس کی حکومت میں یاسین نوری بھی وزیر تھے۔ میں نے انھیں ٹیلی فون کیا، اور پوچھا کہ کیوں بھائی کفن سر سے باندھ کر آؤں یا سر ہتھیلی پر رکھ کر۔ کہا، سر ہتھیلی پر رکھ کر۔ میں اشارہ پا گیا، اور زمین کے سینے پر لاتیں مارتا ہوا منشی کے کمرے میں داخل ہوا۔

میں بہت عاجز انسان ہوں، محض مصلحت کی بنا پر رعب ڈالنے کے لیئے یہ اکڑفوں اختیار کرلی تھی، مگر واہ رے منشی! میں دندناتا ہوا اس کے کمرے میں گیا، مگر اس نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کاغذات پڑھنے ہی میں مصروف رہا۔ پڑھتے پڑھتے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ میرا ایکٹنگ (کرنا) سب اکارت گیا، اور میں یوں کرسی پر بیٹھ گیا، جیسے کوئی بھیگا ہوا کپڑا پرات میں ڈال دیا جائے۔ کافی دیر میں خاموش بیٹھا رہا، اور کافی دیر منشی صاحب کاغذات کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ آخر فرمایا سناؤ، ریڈیو کیسا چل رہا ہے۔ میں نے کہا، صاحب ابھی تو چل نہیں رہا مگر چلے گا۔ کہا۔ ہاں، مگر دیکھو زبان آسان ہونی چاہیئے، بالکل آسان، جواہرلال کی زبان نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ ہم بات ہم بات بولتا ہے۔ میں نے کہا، صاحب یہ ہم بات کیا؟ میں سمجھا نہیں، فرمایا: جب کبھی اس کو کہنا ہو ضروری بات تو وہ ہم بات بولتا ہے۔ اب میں سمجھا کہ منشی صاحب کو پنڈت جی کی اہم بات، ہم بات سنائی دی۔ منشی صاحب نے لکچر پلانا شروع کیا، اور فرمایا کہ عربی کے الفاظ زبان سے نکال دینے چاہیئیں تاکہ عوام زبان کو سمجھ سکیں۔ میں نے کہا عربی کے الفاظ زبان سے خارج کر دیئے تو کئی وزیروں کو اپنے نام بدلنے پڑیں گے۔ فرمایا، کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا آپ کا نام عربی ہے، منشی عربی کا لفظ ہے!"

یہ ایک ذہنیت ہے۔ اس کے بہت بعد کی بات ہے۔ ۵۰ء اور ۵۲ء کے درمیان کی، جواہرلال نہرو تقریر کرنے کے لئے براڈکاسٹنگ ہاؤس دلّی آئے، انگریزی کے مسوّدے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد، انھوں نے اسٹیشن ڈائرکٹر سے پوچھا کہ Minorities کے لئے ہندی میں کیا لفظ ہے، اسٹیشن ڈائرکٹر نے کہا: اَلپ سنکھیک

کی حکومت نے اس کے لئے الپ سنکھیک کی اصطلاح وضع کی ہے۔ جواہرلال غصّہ سے بھڑک اُٹھے اور انھوں نے سخت لفظ استعمال کیا۔ انگریزی مسوّدہ ریکارڈ کرانے کے بعد، انھوں نے فی البدیہہ اس کا ترجمہ ہندستانی میں کیا، اور "کم گنتی والوں" کی اصطلاح استعمال کی۔ اقلیت کے لفظ سے وہ واقف تھے۔ لیکن ظاہر ہے اس اصطلاح سے کروڑوں عوام واقف نہیں تھے۔ وزیراعظم کے مخاطب زوہ لوگ تھے جو الپ سنکھیک کے معنے سمجھتے تھے، اور نہ صرف وہ جو اقلیت کے مفہوم سے واقف تھے۔ براڈ کاسٹنگ کی زبان، ادبی زبان صرف ادبی پروگراموں کے لیئے ہو سکتی ہے۔ عام پروگراموں کے لئے نہیں۔

جواہرلال کی ریکارڈنگ کے وقت دلّی کے اسٹیشن ڈائرکٹر پروفیسر بی پی بھٹ، اور اُن کے نائب پی ایس بھاٹیہ تھے۔ بھٹ ڈائرکٹر جنرل اور بھاٹیہ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدوں سے ریٹائر ہوتے اس واقعے کی تصدیق کرلی گئی ہے، اور بی پی بھٹ نے تحریری طور پر اس کی اجازت دی ہے کہ اُن کے حوالے سے یہ بات اس مقالے میں شامل کی جا سکتی ہے۔

زبان کے سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی ایک ثقہ راوی نے بیان کیا ہے، لیکن اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ مردوں کو شری، شادی شدہ عورتوں کو شریمتی اور غیر شادی شدہ عورتوں کو کماری لکھا اور کہا جائے۔ جواہرلال نہرو نے اپنے لیئے ہدایت جاری کی کہ انھیں پنڈت یا شری نہ کہا جائے۔ صرف جواہرلال نہرو کہا جائے۔ اس حکم پر عمل ہوا بھی اور نہیں بھی۔ مثلاً ابوالکلام آزاد مولانا ہی رہے، شری نہ ہوئے۔ جنوبی ہند میں رواج تھا کہ مسلمانوں کو "جناب" لکھا اور کہا جاتا تھا۔ جواہرلال کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ چکرورتی راجگوپال اچاری بنگال کے گورنر، پھر گورنر جنرل، پھر مرکزی وزیر ہونے کے بعد مدراس کے وزیراعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے۔ جواہرلال نے راجہ کو توجہ دلائی کہ یہ بات خلافِ قاعدہ ہے۔ جناب کہنے سے شری کے مقابلے میں زیادہ احترام ظاہر ہوتا ہے۔ راجہ جی کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ ان کا جواب تھا۔ ہم دیوتاؤں کو شری کہتے ہیں، اس کے بارے میں غور کرنا چاہیئے کہ شری کے لفظ سے عام

انسانوں کو مخاطب کرنا مناسب ہے؟

ذوالفقار بخاری نے کسی لگی لپٹی کے بغیر لکھا ہے: [1]

"کانگریسی زبان، یعنی ہندستانی کے خلاف تو میرا خون کھول ہی رہا تھا، میں نے سوچا کہ ہندستانی زبان پر تقریریں کرائی جائیں۔ کانگریسی تو اس موضوع پر تقریریں بولیں گے۔ ان کے مقابلے میں ہم اردو کے حامیوں کو لاکھڑا کریں گے، اور دیکھیں گے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

چنانچہ ہندستانی کیا ہے؟ کے موضوع پر راجندر پرشاد بھی بولے، اور کرپلانی بھی۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی تقریریں کیں، اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے بھی۔ اب یاد نہیں اس سلسلے میں اور کس کس نے حصہ لیا، لیکن اتنا یاد ہے کہ اردو کا بول بالا رہا۔"

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ "ہندستانی کیا ہے؟" سلسلے کی تقریروں سے ذوالفقار علی بخاری کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تقریریں ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء سے ۲۵ فروری تک دلّی اسٹیشن سے ہوئی تھیں، اور اس کے براڈکاسٹر تھے، ڈاکٹر راجندر پرساد، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر ذاکر حسین، اچاریہ نریندر دیو اور آصف علی۔ اس زمانے میں ذوالفقار بمبئی میں اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔ اچاریہ کرپلانی اور خواجہ حسن نظامی نے اس موضوع پر، اور بات چیت کے اس سلسلے میں کوئی براڈکاسٹ نہیں کیا تھا۔ ذوالفقار کی خوش قلمی اپنی جگہ مسلّم، محمد حسین آزاد کی طرح خیال کو کہانی بنادینا بھی تسلیم، لیکن یہ بات کہ وہ ثقہ راوی ہیں، ایسا نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کے دوسرے بیانات بھی مشتبہ ہوگئے ہیں۔ زیب داستاں کے لیئے، انھوں نے داستاں میں کنٹربیونٹ کو جائز سمجھا ہے، اور اس نے تاریخی صداقتوں کا خون کردیا ہے۔

فیلڈن کی تحریر سے اقتباس پیش کیا جاچکا ہے کہ جب بخاری برادرز کا رپوریشن کی لب بر لب مہم شروع ہوئی، تو ذوالفقار کو دلّی سے ہٹا کر سیٹھنا کی جگہ بمبئی کا اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، اور اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی اس عہدے پر دلّی نہیں

---

[1] ایضاً، ص ۱۴۰

آئے، اور نہ کسی اور عہدے پر صدر دفتر میں۔ جون ۱۹۳۸ء میں ذوالفقار بمبئی کے
اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔ ایچ آر لوتھرا لکھتے ہیں: ل

In June 1938 the Archbishop of Bombay wrote to the Bombay station asking for the relay of the Catholic Service, in addition to those from the Anglican Church, already being broadcast. The Station Director (Z.A.Bokhari) referred the matter to the Controller of Broadcasting, adding that....

ایک اور ثبوت بھی ہے۔ احمد شاہ بخاری نے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو دلّی سے ایک تقریر
نشر کی تھی "براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے" اس وقت لکھشانن تھے۔ اس تاریخی
تقریر کا ذکر اس مقالے میں آئے گا۔
لوتھرا نے اپنی کتاب کے ۴۲ ویں باب میں "ہندستانی کیا ہے؟" سلسلے کے نشریوں
کا ذکر کیا ہے ٢ه

AIR broadcast a series of talks under the title; "What is Hindustani?" in 1939 from February 20 to 25, and those who spoke were Dr. Rajendra Prasad, Maulvi Abdul Haq, Dr. Tara Chand, Zakir Hussain, Acharya Narendra Dev and Asif Ali. It seems a pity that the scripts of what this very distinguished panel of broadcasters said are no longer available.

ڈاکٹر ذاکر حسین، اچاریہ نریندر دیو اور آصف علی کے براڈ کاسٹ کے مسودے تو
حاصل نہ ہو سکے۔ لیکن مولوی عبدالحق نے ۲۱ فروری ۱۹۳۹ء کو جو بات چیت براڈکاسٹ

Pp 246- Indian Broadcasting : H.R.Luthra ل

٢ه ایضاً: ص ۲۵۷ -

کی تھی، وہ خطباتِ عبدالحق میں شامل ہے۔ صفحہ ۱۶۵ سے صفحہ ۱۷۲ تک[1] ہندستانی کے سوال پر ناگپور کے ساہتیہ پریشد کے اجلاس (۱۹۳۵ء) میں مولوی عبدالحق کی گاندھی جی سے معرکہ آرائی ہو چکی تھی۔ ذوالفقار اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ مولوی عبدالحق ہندستانی کے مخالفین میں سے نہیں بلکہ اس کے علمبرداروں میں سے تھے۔ یہی ڈاکٹر تاراچند کے بارے میں بھی درست ہے، اور بالآخر ڈاکٹر راجندر پرساد اور مولوی عبدالحق کے درمیان پٹنہ میں معاہدہ ہوا۔ مولوی عبدالحق نے ہندستانی کیا ہے؟ یوں اس کی تشریح کی :

"ہندستانی کا لفظ آج کل بھڑوں کا چھتہ بنا ہوا ہے۔ اب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اس چھتے کو چھیڑا ہے، تو اسے ڈنک سہنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔

زبان کے معنوں میں ہندستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہلِ زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے، جو سترھویں صدی سے اس ملک میں آنے شروع ہوئے، اس زبان کو، جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی تھی 'اندستان'، 'اندستانی'، اور بعد ازاں ہندستانی کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اس وقت فروغ ہوا، جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کالج کے انگریزی استاد تو اس زبان کو جس میں میرامن کی باغ و بہار، شیر علی افسوس کی آرایشِ محفل، حیدر علی کا طوطی نامہ، طپش کی بہارِ دانش وغیرہ لکھی گئیں ہندستانی کہتے ہیں، لیکن ان کتابوں کے لکھنے والے اپنی کتابوں کی زبان کو اردوئے معلیٰ، ریختہ یا ہندی کہتے ہیں۔ مثلاً میرامن نے اپنی کتاب باغ و بہار یا قصہ چہار درویش کو ایک عرضی کے ساتھ پیش کیا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اردوئے معلیٰ

---

[1] خطباتِ عبدالحق (مولوی عبدالحق)، ہندستانی کیا ہے ص ۱۶۵ ـــ ۱۷۲۔

کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ اسی عرضی کے آخر میں یہ شعر ہے:

سو اردو کو آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگلا ہندوستاں

اس کتاب کے دیباچے میں زبان کی تاریخ بیان کرتے وقت یہ لکھتے ہیں: حقیقت اردو زبان کی بزرگوں سے کے منہ سے یوں سنی۔ میر شیر علی افسوس، آرائشِ محفل میں لکھتے ہیں کہ اس کے تمام مطالب کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ مرزا طپش شمس البیان میں اپنی زبان کو روز مرہ فصحائے اردوئے معلیٰ کہتے ہیں، اور اپنی بہارِ دانش ہندی میں اس زبان کو ایک ہی شعر کے (ایک) مصرع میں تو ہندی زبان اور دوسرے میں اردو لکھا ہے:

شرف اس نے ہندی زباں کو دیا
دیا نظم اردو کو یہ مرتبا

اور چند اشعار کے بعد اسے ریختہ کہتے ہیں:

دقایق ہیں ہے ریختے کے نام

حیدر بخش حیدری قصۂ حاتم طائی کی زبان کو ریختہ کہتا ہے۔ میر امّن گنجِ خوبی میں گلکرائسٹ کو اردو کا قدردان لکھتا ہے۔ مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب نو آئینِ ہندی میں لکھتا ہے کہ اس نے قصۂ آذر شاہ اور سمن رخ کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ جان گلکرائسٹ اپنی تصانیف میں ہندستانی اور اردو، دونوں لفظ اس زبان کے لئے استعمال کرتے ہیں گارساں دتاسی کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن وہ زیادہ تر ہندستانی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے بھی جامِ جہاں نما کی زبان کو اردو بتایا ہے۔ کلکتہ بیپٹسٹ مشن نے جو انجیلِ مقدس کا ترجمہ چھاپا تھا، اس کے سرورق پر لکھا ہے "یونانی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا" لیکن اس کے نیچے انگریزی زبان میں In the Hindustani Language. لکھا ہے۔ بابو کاشی ناتھ بسواس کرانی اپنی کتاب قصۂ سوہن مسمّیٰ بہ

گلدستۂ انجمن کے سرورق پر لکھتے ہیں 'انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا'، ڈاکٹر اے جے لارنس راہن سن کروسو کے ترجمے اور مسٹر جیمس کورکورن اپنی تاریخِ چین، اور ڈاکٹر فریڈرک جان اپنی اصولِ تشریح کی زبان کو اردو ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کالج، علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی مرزا پور سیریز کی جتنی کتابیں چھپیں، اُن سب پر اردو ہی کا لفظ لکھا ہے۔ غرض وہ تمام کتابیں جن کے نام میں نے لیئے ہیں، اسی زبان میں ہیں، جسے آج کل اردو کہتے ہیں۔ انگریز اسے ہندستانی کہتے تھے۔ ہندستانی سے ان کی مراد، وہ صاف اور فصیح زبان تھی، جو بول چال میں آتی تھی۔ یعنی ایسی زبان جو مقفّیٰ اور پُر تکلف نہ ہو، جس کا رواج اس زمانے کی بعض کتابوں میں پایا جاتا تھا۔ اردو، ریختہ، ہندی اس زمانے میں ہم معنی لفظ تھے۔ چنانچہ مرزا جان طپش نے اپنی کتاب شمس البیان میں ہندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: 'ہندی عبارت از زبانِ موزونِ دہلی است'، یعنی ہندی سے مراد دلّی کی فصیح زبان ہے۔ جدید ہندی، جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے، نئے زمانے کی پیداوار ہے۔ اس نے فورٹ ولیم کالج میں جنم لیا۔ دراصل یہ اردو کا بچّہ ہے، وہ اس طرح کہ عربی فارسی کے لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت لفظ بٹھادیئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارا ادب، ہندستانی کے لفظ سے خالی ہے۔ اردو کے کسی مستند اہلِ زبان، اور غالباً ہندی کے اہلِ زبان نے بھی اس لفظ کو زبان کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کیا۔ جب اس زمانے میں ہندی اردو کے جھگڑے نے زور پکڑا، اور دونوں فریق ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے تو انڈین نیشنل کانگریس نے رفعِ شر کے خیال سے ہندستانی لفظ اختیار کیا، اور اس کو ہندستان کی عام زبان قرار دیا۔ لیکن کانگریس نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی، اور نہ یہ بتایا کہ اس سے کیا مطلب ہے۔ وہ شاید اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ آج کل سیاسی لوگوں نے

جہاں اور چیزوں کو سیاست میں سان لیا ہے، غریب زبان بھی ان کی نظر کرم فرمائی، کا شکار بن گئی ہے۔ اب سوچ بچار کے بعد ہندستانی کے یہ معنی قرار پائے ہیں کہ وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اور جو ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ سے پاک ہے۔ اصل میں ہندستانی کی یہ تعریف ڈاکٹر گریرسن کے بیان سے لی گئی ہے، اور اس تعریف کو اکثر ان لوگوں نے قبول کر لیا ہے جو ہندستانی کے حامی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زبان ہے بھی؟ اگر اس سے مراد وہ زبان ہے، جسے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انگریز ہندستانی کہتے تھے، اور ہمارے اس وقت کے ادیب ریختہ، ہندی اور اردو سے موسوم کرتے تھے، تو بے شک یہ ایک زبان ہے، اور اب بھی ہندستان میں بولی، اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہ زبان ہے، جو آج کل بعض جدت پسند حضرات نے گھڑنی اور ڈھالنی شروع کی ہے، تو وہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہ زبان لی جائے جو دونوں، ہندی اردو بولنے والوں میں مقبول ہو، تو وہ ابھی وجود میں نہیں آئی ہے۔ بول چال کی زبان کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن جہاں ادب کی سرحد آتی ہے، وہ رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ہندی، ہندستانی کا لفظ ایجاد کیا تھا۔ چونکہ بے جوڑ تھا، مقبول نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ آسان اردو کا نام ہندستانی ہوا۔ آپ فرمائیں گے کہ آسان ہندی کو ہندستانی کیوں نہ کہیں؟ ضرور کہیئے، کیونکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، جدید ہندی اردو ہی کا تو چربہ ہے رہی یہ بات کہ زبان سادہ اور آسان ہو، تو بول چال میں تو عموماً سادہ ہی ہوتی ہے۔ جب بچوں یا معمولی پڑھے لکھوں کے لیئے کوئی کتاب یا قصے کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بھی زبان سادہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ ہماری عادت پر موقوف نہیں، دنیا کی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ مگر جب کوئی اچھی نظم لکھنی ہوتی ہے، یا علمی یا ادبی بحث آپڑتی ہے، تو سادہ زبان کا نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ محض زبان کا

آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہیئے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں، ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ۔ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدّی ہو۔ دوسرے ہر ایک کا طرزِ تحریر الگ ہوتا ہے۔ کسی کا کوئی رنگ ہے، اور کسی کا کوئی ڈھنگ یہ ہر ایک کے مزاج اور افتادِ طبیعت پر منحصر ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں، یوں لکھو۔ اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں۔ وہ نیا ڈھنگ تو کیا اختیار کرے گا، اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ جو آج کل چاروں طرف آسان آسان کا پرچار کیا جا رہا ہے، مجھے تو یہ کچھ بے جا سا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں کہ جہاں چاہا، اُٹھایا، رکھ دیا۔ اس کے گنوں کو پرکھنے والے مشّاق ادیب ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اُٹھا کر دیکھئے۔ ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے، ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائے گی۔ علاوہ اس کے، آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں یعنی ہر ایک چیز، جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے، دوسرا اُسے آسان سمجھتا ہے جسے میں آسان سمجھتا ہوں، وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہے۔ اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے، اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے۔ دہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آگیا، تو ایسا ہی برا ہے، جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد اور اُن کے ساتھیوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہندی اور ہندستانی میں سنسکرت لفظ ملانے کی اس لئے ضرورت ہے کہ اسے بنگال اور جنوبی ہند کے لوگ سمجھ سکیں۔

ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ جب بنگال اور جنوبی ہند میں جائیں تو ایسی ہی سنسکرت ملی زبان میں بات چیت یا تقریر کریں، اور جب صوبۂ سرحد اور پنجاب میں جائیں تو فارسی عربی ملی زبان، تو ایسی صورت میں ہندستان کی ایک مشترکہ زبان کہاں رہی، جس کے لیئے یہ سب جتن کئے جا رہے ہیں؟
اور عجیب بات یہ ہے کہ اس سنسکرت ملی ہی زبان کی وجہ سے جنوبی ہند والے ہندی یا ہندستانی کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ اُن کو بدگمانی ہے کہ ہندی کے حیلے سے سنسکرت زبان پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم ان کی زبان اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں۔
ہماری زبان اگر زندہ زبان ہے، تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ اس سے کوئی زندہ زبان نہیں بچ سکتی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدّت سے رائج چلے آ رہے ہیں، انھیں خارج کر دیں، اور ان کی جگہ ڈکشنریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے اور کرخت الفاظ داخل کر دیں، جن کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلابازیاں کھائے، اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں، اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، خواہ کسی زبان کے ہوں، وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں۔ اُنھیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہے۔ جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنی زبان کے دوست نہیں، دشمن ہیں۔
نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہے۔ اندھا دھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کئے جا سکتے۔ جو بندھ گیا، سو موتی، جو کھپ گیا وہ ہمارا، اور جو نہیں کھپا وہ سو غیروں کا غیر۔
بہار گورنمنٹ نے ایک ہندستانی کمیٹی بنائی ہے اور ہندستانی زبان کی گریمر، لغت اور مدرسوں کے لیئے ریڈرس لکھوانی تجویز کی ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے لئے ریڈریں اس زبان میں لکھنا تو کچھ مشکل

نہ ہو گا، لیکن اونچے درجوں کے لیئے، جہاں زبان کی ادبی شان بھی رکھنی ضروری ہوتی ہے، کتابیں لکھنے میں مشکل پڑے گی۔ اس سے زیادہ مشکل اصطلاحات بنانے میں ہو گی۔ اس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اگر اس نے بیچ کا کوئی ایسا راستہ نکال لیا، جو مقبول ہو سکے، تو یہ اس کی بڑی جیت ہو گی۔ کم از کم آپس کی بات چیت اور کاروبار کے لیے بہت کارآمد ہوگی۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ ہندستانی زبان کسے کہتے ہیں تو میں اُس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس زبان میں میں نے آج تقریر کی ہے، یہی ہندستانی ہے۔

ہماری تنقید کے لیئے دو جملے دیئے گئے ہیں۔ ایک جملہ یہ ہے:

'فیڈرل لیجس لیچر کے لئے فہرستِ رائے دہندگان تیار کرانے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی، اس بارے میں سر این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی'۔ اس جملے میں اگرچہ فیڈرل لیجس لیچر، لا ممبر اور اسمبلی کے لئے انگریزی لفظ استعمال کیئے گئے ہیں، لیکن جملے کا مطلب صاف سمجھ میں آتا ہے۔ روشنی ڈالنا انگریزی محاورے کا ترجمہ ہے۔ لیکن اب 'روشنی ڈالنا' اور 'روشنی پڑنا' اردو میں استعمال ہونے لگے ہیں، اور ان کا مفہوم کسی دوسرے لفظ سے اس خوبی سے ادا نہیں ہوتا۔ جس طرح پہلے فارسی محاوروں کے ترجمے داخل ہو گئے تھے، اب بعض انگریزی محاوروں کے ترجمے داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں، بشرطیکہ زبان میں کھپ جائیں۔ اس سے زبان میں وسعت ہوتی ہے۔ دوسرا جملہ یہ ہے: 'سنکیت پرانیہ ویوستھاپکا پریشد میں ایک پرشن کا اتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے اُن اُدیوگ دھندوں کی سوچی دی، جن کی انتی کے لیئے سرکار نے سہائتا دینا سویکار کیا ہے'،

اس جملے میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہے، اور مطلب سمجھ میں

نہیں آتا۔ یہ ہماری زبان نہیں۔ یہ سراسر بناوٹی زبان ہے۔"

جیسا کہ خود مولوی عبدالحق نے کہا ہے، ان کی یہ گفتگو بول چال کا نمونہ ہے، اور اگر کسی زبان کو ہندستان کی نسبت سے ہندستانی ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے، کہ ملک کے بیشتر حصوں میں اس سے کام چلایا جا سکتا ہے، تو وہ یہی زبان ہے۔

ڈاکٹر تاراچند کے بھانجے، "عالم میں انتخاب دلّی" کے مصنف، آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے ابتدائی دنوں میں ریڈیو سے وابستہ تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر تاراچند کی یہ تقریر کتابچے کی صورت میں چھپی تھی۔ افسوس ہے کہ کسی لائبریری یا ذاتی ذخیرے میں ابھی تک یہ نہیں ملی۔ ہندستانی کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند کا نظریہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ "ہریجن سیوک" کے ۱۰ مارچ ۴۲ء کے شمارے میں، ان کے ۲ر فروری کے اس خط کا متن ہے جو انھوں نے کاکا کالیلکر کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے لسانی منظرنامے کی تاریخ کے کچھ گوشوں کے بارے میں لکھا ہے[1]

"ہندستانی اور برج، دونوں بول چال کی زبانیں تھیں پہلے۔ جب صرف بول چال کے کام آتی تھیں، تو ان کی کیا حالت تھی، یہ کہنا مشکل ہے۔ تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی میں سعد سلمان نے ایک دیوان ہندی[2] میں لکھا تھا۔ پر اس دیوان کا ایک بھی شعر اب نہیں ملتا۔ تیرھویں صدی سے ہندی یا ہندستانی کا پتہ لگتا ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہندستانی کا اچھا ساہتیہ دکھن میں تیار ہو گیا تھا۔ اس ادب کی بھاشا وہی کھڑی بولی ہے، جو آج کل کی ہندی کی بنیاد ہے۔ برج بھاشا کی کوئی تحریر ۱۶ویں صدی سے پہلے کی ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ برج کی راج کو

---

[1] مشترکہ زبان؛ (ہریجن سیوک، ۱۰ مارچ ۴۲ء)؛ ص ۹۶۹۴۔

[2] ہندوی — بقول حضرت امیر خسرو لاہوری ہندوی — جو آج سرائیکی کہلاتی ہے۔

میں کچھ پد برج میں ہیں۔ لیکن اس کے لکھے گئے زمانے کے بارے میں، اور خاص کر اس کے اُن حصّوں کے بارے میں، جو برج زبان میں ہیں، صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ اُنہیں سولہویں صدی کا مانتے ہیں۔ برج سے پہلے راجستھانی کا ڈلنگل کا رواج تھا۔ راسو زیادہ تر ڈلنگل میں ہی لکھا ہوا ہے۔ برج کا سب سے پہلا کوی سور داس ہے، جو سولہویں صدی کا ہے۔ ہندستانی کا سب سے پہلا ادب مسلمانوں کا لکھا ہی ملتا ہے۔ مسلمان سادھو سنتوں نے، اس میں دھرم کی تشریح کی ہے، اور صوفی مت کے اصول بیان کئے ہیں۔ پھر کویوں نے کویتائیں لکھیں۔ مسلمانوں کا لکھا ہونے کی وجہ سے اس ساہتیہ میں ہندی اور فارسی کے شبدوں کا میل ہے۔ اس کی آوازوں میں فارسی عربی کی آوازیں مثلاً ق، غ، ض مل گئی ہیں۔ یہ آوازیں برج میں نہیں ہیں، لیکن موجودہ ہندی میں ہیں۔ مسلمانوں نے جس بول چال کی زبان کو اپنے کام میں لیا، وہ میرٹھ اور دلّی کے آس پاس کی بولی ہے۔ وہ آج بھی دلّی سے روہل کھنڈ کے بیچ کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ اس بولی کو کھڑی بولی (ہندستانی) کہتے ہیں۔ ہندستانی، موجودہ ہندی اور اردو، ایک ہی بولی کے تین روپ ہیں۔ آج کل کی ہندی، ہندستانی کی ادبی شکل ہے، جس میں سنسکرت کے شبد آزادی کے ساتھ اور بہتات کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں فارسی اور عربی کے شبد اصلی شکل میں بہت ملے ہوئے ہیں۔ ہندستانی سے میرا مطلب اُس ادب کی بھاشا سے ہے، جس کی بنیاد کھڑی بولی ہے، پر جو نہ تو صرف سنسکرت کے اصل شبدوں کو اپناتی ہے، نہ صرف عربی فارسی کے۔ بلکہ دونوں کے شبدوں کو اپناتی ہے۔ کسی کے لکھنے کی طرز ایسی ہے کہ جو سنسکرت کی طرف جھکتی ہے۔ کسی کی فارسی کی طرف۔ لیکن ہندستانی لکھنے والے، جہاں تک بن پڑتا ہے سنسکرت

اور عربی فارسی دونوں کے لفظوں کی بھرمار سے پرہیز کرتے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہمیں نہ ہندی کو، جس میں عربی فارسی سے پرہیز اور سنسکرت سے زیادہ میل ہے، دیش کی عام بھاشا ماننا چاہیئے۔ یا تو ہندوؤں کو ہندی اور مسلمانوں کو اردو مان کر، دونوں کو ایک سا درجہ دیا جانا چاہیئے، یا کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ہندستانی جو دونوں کے بیچ کی بھاشا ہے، عام بھاشا۔ کل ہند کی بھاشا مان لی جائے جب تک ہم یہ کہتے رہیں گے کہ ہندی ہماری راشٹر بھاشا ہے، تب تک جھگڑے میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ یا تو اردو کو بھی راشٹر بھاشا مان لیجئے، یا ایسی بھاشا منظور کیجئے، جو دونوں زبانوں کی جڑ کے خزانوں سے لفظ ادھار لے سکے۔ مجھے تو وشواس ہے کہ میرا یہ کہنا سچ پر مبنی ہے۔ پر میں جانتا ہوں کہ وچاروں کے جھگڑے کے سامنے سچ کی لو جھلملانے لگتی ہے، اور اس کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس جھگڑے کی آندھی سے دیش کو بچانے میں مدد کریں۔ زبان کا سوال، سماج کا — اور سماج کا سوال آزادی کا سوال ہے۔ زبان کے سوال کے حل پر تھوڑا بہت آزادی کا دار و مدار ضرور ہے۔ اس سے میں دلچسپی لیتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ آپ کی مدد کی خوش قسمتی حاصل کروں۔"

ہریجن سیوک کے ۲۸ / جون ۱۹۴۲ء کے پرچے میں بھی ڈاکٹر تارا چند کی ایک اور تحریر ہے، جس میں تفصیل سے زبان کے تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نقطۂ نظر وہی ہے، اور کم و بیش باتیں بھی وہی۔

تیسرا باب

زبان۔ تقریر سے تحریر تک

"ابتدا میں لفظ تھا، اور لفظ خدا تھا"

"انسان، حیوانِ ناطق ہے"

دنیا کے تمام صحیفے، بولے ہوئے الفاظ کو جمع کرکے مرتب کئے گئے ہیں۔
لفظ کی تقدیس تھی، بولے ہوئے لفظ کی، کیونکہ لفظ حق تھا، اور حق کا ترجمان. کتابت
اور تحریر کی ایجاد سے پہلے لفظ زبان اور ہونٹوں سے حقیقت بیان کرنے، خواہش یا خیال
کا اظہار کرنے کے لئے ترسیل کا ذریعہ تھا، اور ایسا آج بھی ہے، لیکن تحریر کی ایجاد نے
عبارت آرائی کا ایک ایسا اسلوب ابھارا، جو بول چال سے ذرا مختلف تھا. چھاپے خانے سے
تحریر کے اسلوب کو بول چال کے اسلوب سے اور بھی دور کر دیا. فورٹ ولیم کالج میں، انیسویں
صدی کے آغاز سے. بول چال کی زبان کو تحریر کی زبان بنانے پر خاص طور سے توجہ دی گئی۔
اس سے ایک طرف ادبی صحافت کی زبان کی نشو ونما ہوئی، جس کی سب سے اچھی مثال
محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" ہے، اور دوسری طرف ابلاغِ عامہ کی نثر نے فروغ
پایا. اس کی سب سے اچھی مثالیں سرسید احمد خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی کی نثر
ہر ادیب کا انفرادی اسلوب بھی ہوتا ہے، اسی لئے وقت کے اسلوب کی چھاپ کے ساتھ
ساتھ مصنف کی انفرادیت کی چھاپ بھی اس پر ہوتی ہے. سرسید کے جونیئر ہم عصروں
میں حالی، شبلی، شرر، نذیر احمد، عبدالحق، ابوالکلام آزاد، سبھی ہیں، لیکن سب
کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں. سب کو اپنے گھر کی زبان لکھنے کا دعویٰ ہے۔
اور سنجیدگی ہے! زبان جو بولی جاتی ہے، وہ علاقوں میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ

ایک ہی ہوتی ہے۔ محاوروں میں کچھ فرق ہوسکتا ہے۔ مقامی تلفظ میں فرق ہوسکتا ہے لیکن لکھتے وقت تحریر کے اسلوب بدل جاتے ہیں، لفظ اگرچہ وہی ہوتے ہیں۔

ریڈیو کی زبان کے لئے، فیلڈن 'ہندوستانی' کا تصوّر ذہن میں لے کر آئے تھے۔ اس تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کا کام جن کے سپرد ہوا۔ انھوں نے ادبی اسلوب کو زیادہ اہمیت دی۔ اور اتنی زیادہ شدّت سے اس پر عمل کیا کہ بول چال کا اسلوب گہنا گیا۔ Spoken Word ایک تصوّر ہی رہا:

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
اگر نہ ہو تو کہاں جائیں — ہو تو کیوں کر ہو؟

لکھی ہوئی عبارت، اگر بول چال کا تحریری روپ ہو تو وہ ریڈیو کی زبان ہے۔ عبدالحق، محمود بیگ اور مسعود ے چند اور کو چھوڑ کر، اوروں سے یہ آسان کام نہ ہوسکا، شاید اس وجہ سے مصنّف جتنا معروف ہوتا ہے، اتنا ہی اپنے اسلوب سے مجبور ہوتا ہے۔ ایک عادت سی ہوجاتی ہے لفظوں کو موتی کی طرح پرونے کی، خاص طور سے ان موقعوں پر جب کہنے کے لیئے کوئی اہم بات، کوئی فکر انگیز نکتہ نہ ہو۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیان کرنے کے لیئے نکتہ ہے، لیکن اس کی اہمیت کو دوچند کرنے کے لیئے ذہن کو پکڑ لینے والے جملے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تاکہ " خاص بات " عامیانہ نہ معلوم ہو، اور "عام بات" ہو تو تہہ دار معلوم ہو۔ شبلی کی گٹھی ہوئی، ترشی ترشائی ہوئی نثر بظاہر بے ساختہ ہوتی ہے، حقیقتاً نہیں۔ اور ابوالکلام آزاد جب اندھی گلی میں پہنچ جاتے ہیں تو شعر کا سہارا لیتے ہیں؛ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

ریڈیو آیا تو، اس وقت یہ اسلوب نثر کے تھے:

۱۔ الہلال اور البلاغ کا اسلوب، جس میں خطابت زیادہ تھی، منطقی استدلال کم۔

۲۔ لکھنؤ کے ہمدم اور ہمدرد کا اسلوب۔ یہ صحافت کا اسلوب تھا، اور اسے سید جالب کا اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اودھ پنچ اور دلگداز کے اس اسلوب سے اس نے ارتقا پایا تھا، جسے ادبی صحافت کہہ سکتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر اس سلسلے میں اہم نام ہیں۔

۳۔ لاہور کے اخباروں کا اسلوب، خاص طور سے زمیندار اور انقلاب وغیرہ کا۔

ظفر علی خاں — نثر اور نظم دونوں میں اور عبدالمجید سالک سب سے اہم نام ہیں۔ احتجاج اِس صحافت کی بنیاد ہے۔

۳۔ جب نئے خیالات آتے ہیں، تو لفظیات کے ساتھ ساتھ اسالیب بھی بدلتے ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، لاہور ایک اہم مرکز تھا — اور شاید اہم ترین بھی بے قافیہ نظم۔ یوں تو محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شررؔ کے یہاں بھی ہے، لیکن خیالوں کی نئی باڑھ کے ساتھ ڈاکٹر تصدّق حسین خالدؔ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے تجربوں کے ساتھ آئی، جو حلقۂ اربابِ ذوق کی بنیاد بنی۔ نثر میں، نپے تلے الفاظ کے ساتھ عبارت لکھنے کی بہترین مثال احمد شاہ بخاری خود ہیں۔ اُن کی شہرت پطرس کے مضامین پر ہے، جو کسی مشہور مصنّف کی مختصر ترین کتاب ہے۔ دوسرا نام امتیاز علی تاج کا ہے۔ ان دونوں کے سوچنے اور موضوع کو برتنے کا ڈھنگ مغربی ہے، کردار اور واقعات اور ماحول بے شک دیسی ہوں۔

ایک تجربہ کار براڈ کاسٹر، جو شروع کے دنوں سے آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ آرٹسٹ، ڈرامہ نگار، پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ رہے، اور دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہے، ایک ملاقات میں انھوں نے یہ تجزیہ کیا کہ برصغیر میں پنجاب پر انگریزوں کا تسلّط سب سے آخر میں ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں سب سے پہلے تسلّط کلکتہ پر ہوا تھا۔ وہاں مشرقی علوم کا چرچا رہا، اگرچہ سب سے پہلے مغربی افکار وہاں آئے، اور لوگوں نے انگریزی پڑھی۔ اہلِ پنجاب نے انگریزی طور طریق اپنائے اور انگریزی کلچر کو بھی تعلیم کے ساتھ قبول کیا۔

کھنّہ کی بات میں وزن ہے۔ لیکن یہ اثر ان زمینداروں کے گھرانوں پر تھا جن کے مربعے دیہات میں تھے، لیکن بود و باش شہروں میں تھی۔ پنجاب چونکہ فوج کی نفری اور افسروں کا بھی گڑھ تھا Mess Barracks کی زبان اور اس کا کچھ کلچر بھی گھروں میں پہنچا۔ زندگی میں جو نئے اثرات آئے، کھنّہ کا کہنا ہے کہ ان کی وجہ سے جہاں نثر میں Precise بات کرنا آئی، Extended Artificiality بھی اسی کے ساتھ آئی۔

یہ تصنّع شاید اس لیے بھی، ڈھکا چھپا ہونے کے باوجود، نظروں سے اوجھل

نہیں رہتا، کیونکہ انگریزی زبان اور انگریزی کلچر، جیسا کہ اس ملک میں، اُس زمانے میں سمجھا جاتا تھا، ان کی ایک مانی ہوئی پہچان Under Statement کا رویّہ ہے، اور یہ رویّہ اہلِ پنجاب کا نہیں ہے۔

۵۔ مغربی اثرات پنجاب ہی میں نہیں، دم توڑتی ہوئی نوّابی اور جاگیرداری کے گڑھ، اودھ، یعنی لکھنؤ میں بھی آئے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ "انگارے"،[1] ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، جس نے جنس کے سلسلے میں جاگیرداری کی اقدار کے کھنڈروں کو بھی مسمار کرنے کی کوشش کی۔ یہ صرف نئے خیالات اور نئے نظریات کی بات نہ تھی، بلکہ یہ ایک نیا اسلوب بھی تھا، جو مغربی نثر سے متأثر تھا۔

۶۔ وہ اسلوب، جو بول چال کا اسلوب تھا، اور ریڈیو کے لیے سب سے زیادہ لائقِ تقلید نمونہ تھی، وہ پریم چند کی زبان تھی۔

پریم چند کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کہانیوں میں اُن کے کردار ہی اپنی زبان نہیں بولتے، پریم چند اپنے بیان میں بھی کرداروں کے خیال کے عمل کو، اور واقعات کو ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو کرداروں کی زبان سے بہت مختلف نہیں ہوتی۔ مشہور ہے کہ وہ ہر کہانی لکھ کر پہلے اپنے "رؔسیا" کو سناتے تھے۔ جہاں جہاں وہ ٹوک کر وضاحت چاہتا، پریم چند نوٹ کر لیتے، اور وہ حصّے بدل دیتے۔

فیلڈن ریڈیو پر بول چال کی زبان کو تقدیس دینے کا جو تصوّر لے کر آئے تھے، اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کے سپرد ہوا۔ نیا میڈیم تھا، نئی روایات قائم ہونا تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ دونوں بھائیوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی، اور وہ ادبی زبان، اس کے چٹخارے، ایجاز، اشارے، کنایے، شوخیِ تحریر کو بول چال کی زبان کے افادی پہلو سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ ادب، براڈکاسٹ کا ایک گوشہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ براڈکاسٹنگ کے ہر پہلو پر ادبی شخصیتیں چھا گئیں، وہ جن سے رسم و راہ تھی، یا جن سے رسم و راہ کی ضرورت تھی۔

"ساقی"، "منادی" اور دوسرے رسالے اور جریدے اُٹھا کر دیکھیں تو احساس

---

[1] انگارے :

ہوتا ہے کہ چند نام ہیں، جو بار بار براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔

ذوالفقار علی بخاری اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں[1]

"آغا اشرف کو ساتھ لے کر ہر ایک کے دورِ دولت پر حاضری دی، اور بصد التماس انھیں ریڈیو پر تقریر کرنے کے لیئے رضامند کیا۔ ڈاکٹر انصاری، خواجہ حسن نظامی، بھائی آصف علی، مرزا محمد سعید، نواب خواجہ عبدالمجید، ڈاکٹر ذاکر حسین، بیگم سربلند جنگ، آغا شاعر قزلباش، شمس العلما مولوی عبدالرحمان، منشی پریم چند، مرزا فرحت اللہ بیگ، پرنسپل رشید احمد صدیقی۔ کس کس کا نام گناؤں۔ یہ تھے ہمارے مستقل طور پر تقریریں نشر کرنے والے حضرات۔ لاہور میں ابھی ریڈیو جاری نہ ہوا تھا۔ مگر سالک اور امتیاز علی تاج کے بغیر محفل سونی ہو جاتی۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا کہ یہ حضرات لاہور سے ٹیلی فون پر بولیں، اور ہم دہلی سے ان کی تقریر نشر کریں۔"

دلّی میں اسٹیشن قائم ہوا تو شروع کے اہم براڈ کاسٹروں میں سید انصار ناصری اور فضلِ حق قریشی بھی تھے۔ ۲۱ اپریل ۳۶ء کو فضل حق قریشی نے جو بات چیت[2] اور ۲۱ جون ۳۶ کو انصاری نے جو کہانی نشر کی، یہ ہیں[3]

---

[1] سیّد ذوالفقار علی بخاری۔ "سرگزشت" ص ۳۲۔

[2] فضل حق قریشی: "بھابی جان نے ریڈیو خریدا"۔ "ساقی" مئی ۳۶ء

[3] سید انصار ناصری: "جوگی" ساقی جولائی ۳۶ء

فضل حق قریشی روزنامہ

بھائی جان سے ریڈیو خریدا

جو دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے ۲۱ اپریل کو دن کے ڈیڑھ بجے پڑھا گیا۔

دہلی میں براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کو قائم ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ کہ ہر گھر سے ریڈیو کی آواز بلند ہونے لگی۔ مکانات کی چھتوں پر دو دو بانس اور ان کے درمیان کھنچے ہوئے تار نظر آنے لگے۔ موٹروں میں بجائے ہورن کے ریڈیو بجنے لگا۔ سیٹھ صاحب کی کوٹھی سے لے کر پنواڑی کی دوکان تک اس کی دلچسپی عام ہوگئی۔ بھلا ایسی صورت میں ہماری بھابی جان کس طرح خاموش رہتیں۔ دو چار دن تو انہوں نے اپنی بہن کے مکان پر جاکر سنا۔ اور پھر اپنی عادت کے مطابق بھائی حمید سے جھگڑنے لگیں کہ خود اپنے مکان پر ایک ریڈیو سیٹ کا ہونا ضروری ہے۔ بھابی جان کوئی بات بغیر دلیل کے نہیں کرتیں۔ چنانچہ ریڈیو کے فائدوں پر ایک ایسا لکچر دیا کہ شاید اس کے موجد کے وہم و گمان میں بھی وہ باتیں نہ آئی ہونگی۔ اور یقیناً براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے ڈائرکٹر صاحب بھی ان سے ناواقف ہونگے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارے بھولے بھالے بھائی صاحب اپنی چہیتی بیگم کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اور تہیہ کرلیا کہ ریڈیو سیٹ ضرور خریدا جائے مگر سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ مکان میں بجلی کا انتظام نہیں تھا اور بیٹری کا خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مکان تبدیل کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ مثل مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ بجلی والا مکان ملا۔ مگر ایسا خراب کہ اُسے مکان ہی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم بھابی جان کو پسند تھا۔ غسل خانہ نہیں ہے تو نہ سہی۔ چھت ٹپکتی ہے تو کیا ہوا۔ صحن ناکافی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بجلی چاہیئے تھی جو موجود ہے۔ خیر مکان کی تبدیلی کے بعد دوسرا مرحلہ ریڈیو سیٹ خریدنے کا تھا۔ جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، جاپانی

اور امریکن۔ غرض ہر ملک اور ہر قسم کی ساخت کا سیٹ آزمایا گیا۔ مگر انتخاب کرنے میں کافی وقت اٹھانی پڑی۔ جاپانی نمونے کو تو محض اس لئے نظرانداز کر دیا کہ وہ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں اس کی نلکیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دوسرے ملکوں کا پروگرام اس کے ذریعہ نہیں سنا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ ایک امریکن سیٹ خریدا گیا۔ جو سستا تھا۔ اور کسی قدر اچھا بھی۔ اس کے بعد ایک نئی بحث شروع ہوئی۔ بھائی حمید کہتے تھے کہ اسے بیٹھک میں رکھا جائے۔ اور بھابی جان کا حکم تھا کہ نہیں ہمارے کمرے میں۔ بھائی حمید کی دلیلیں معقول تھیں۔ اس لئے خلافِ معمول بھابی جان نے سر جھکا لیا۔ اور بیٹھک کے ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر اُسے جگہ دی گئی۔ پانچ چھ دن تو پڑوس کا کوئی بچہ بھی آکر نہیں جھانکا۔ کیونکہ محلے میں یہ نئے نئے آکر رہے تھے، مگر جب اچھے اچھے گانے اور عمدہ عمدہ تقریریں سنائی دیں تو سب کا اشتیاق بڑھا۔ اور کوشش ہونے لگی کہ اس دلچسپی میں حصّہ لیا جائے۔ دن کے وقت عورتوں کے لئے خاص پروگرام ہوتا ہے۔ اور چونکہ بھائی حمید دفتر ہوتے تھے۔ اس لئے بھابی جان تنہا اس سے لطف حاصل کرتی تھیں۔ البتہ شام کو چھ بجے بیٹھک میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی تھی۔ دفتر کے تمام دوست اور دوسرے ملنے جلنے والے سبھی آڈٹتے۔ جن میں سے مسٹر دتّ اور نذیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ وہ بھائی حمید کے لنگوٹیا یار تھے۔ مگر ہماری بھابی جان ان دونوں کے نام سے جلتی ہیں۔ مسٹر دتّ جو تمباکو نوشی کے عادی مجرم ہیں۔ ہر جگہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ دینا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور پھر اس کے جلے ہوئے ٹکڑے لاپرواہی سے اِدھر اُدھر اس طرح پھینک دیتے ہیں گویا تمام کمرہ ان کے نزدیک ایش ٹرے (ASHTRAY) ہے، ایک بار آپ ریڈیو کے بکس پر سگریٹ رکھ کر بھول گئے۔ اور اس طرح اس کی بہت سی لکڑی جل گئی۔ کئی مرتبہ سیٹ کے اندر سے جلی ہوئی دیاسلائیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے نکلے۔ دوسرے دوست یعنی نذیر صاحب پان اس کثرت سے کھاتے ہیں، کہ ہر وقت ان کا منہ جگالی کرنے والے جانوروں کی طرح چلتا رہتا ہے۔ سفید چاندنی اور براق سی دیواروں پر سرخ پیک کے دھبے شاہد ہوتے ہیں کہ یہ حضرت عادت کے لحاظ سے مسٹر دتّ کے بھائی ہیں۔ کئی دفعہ انھوں نے بھی ریڈیو سیٹ کو اُگالدان بنا لیا اور دری اٹھا اٹھا کر کمرے میں پچاسیوں مقام

پر پیک تھو کی. حتیٰ کہ ایک روز بھابی جان کا ٹمپریچر بہت تیز ہوگیا۔ اور انھوں نے ہر ہٹلر کے کے لہجہ میں اپنے پیارے شوہر کو نوٹس دیدیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ سیٹ ان کے کمرے کے اندر منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ فوراً اس حکم کی تعمیل ہوگئی۔ بھابی جان خوش تھیں کہ وہ مصیبت دور ہوئی۔ لیکن جب دوستوں کے ساتھ بھائی حمید نے بھی باہر رہنا شروع کر دیا۔ تو اکیلے ان کا جی گھبرانے لگا۔ اب اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں تھی۔ کہ پڑوس کی کسی عورت کو بلا لیا کریں چنانچہ ایک روز میر صاحب کی بیوی کو جن سے محض تعارف کی حد تک جان پہچان تھی دعوت دی کہ آج کا پروگرام بہت دلچسپ ہے۔ آپ سننا چاہیں تو تشریف لے آئیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ خوشی خوشی آئیں اور دوسرے دن اپنی خالہ زاد بہن کو بھی ساتھ لے آئیں۔ اب ان خالہ زاد بہن کی سینئے کہ انہیں جو دلچسپی معلوم ہوئی تو دو چار دن بعد بھابی جان سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنی بھاوج کو لے آیا کروں۔ بھلا وہ کیوں انکار کرتیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھیں کہ کسی طرح دلبستگی کا سامان پیدا ہو۔ چنانچہ وہ بھی آنے لگیں۔ پھر ان بھاوج صاحبہ نے اپنی جیٹھانی کو اور جیٹھانی نے اپنی دیورانی کو اور دیورانی نے اپنی خالہ کو اور خالہ نے اپنی ممانی کو اور ممانی نے اپنی پھوپی کو اور پھوپی نے اپنی چچی جان کو بلانے کی اجازت لی۔ پھر ان سب نے علیحدہ علیحدہ اپنی سہیلیوں اور پڑوسنوں کو اور پھر ان سہیلیوں اور پڑوسنوں نے اپنی اپنی سہیلیوں پڑوسنوں اور رشتہ داروں کو بلانے کی تجویز پیش کی۔ اور ہماری بھابی جان نے ہر ایک کی درخواست کو بخوشی منظور کر لیا۔ یہاں تک کہ زنجیر کی کڑی کی طرح سلسلے سے سلسلہ ملتا گیا۔ اور روزانہ نئی نئی عورتوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ جب مسٹر دتّ اور نذیر صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے دوست کے مکان پر روزانہ ریڈیو سننے کے لئے زنانہ کانفرنس ہوتی ہے تو انھوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ہماری بیویاں بھی آجایا کریں۔ بھائی حمید نے فوراً اسے منظور کر لیا۔ اس شرط پر کہ ان کی بیگم صاحبہ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ کیونکہ تھوڑے عرصے سے وہ اپنی چہیتی بیوی سے ذرا ڈرنے لگے تھے۔ ہماری بھابی جان نذیر صاحب کی بیوی کلثوم زمانی سے واقف تھیں۔ پردہ باغ میں تعارف ہوچکا تھا۔ اس لئے ان کو بلانے میں مطلق تامل نہ ہو۔ البتہ لکشمی دیوی یعنی مسز دتّ کا نام سن کر کسی قدر ناک بھوں چڑھائی کہ وہ ہندو ہیں۔ ان کی چائے وغیرہ کا علیحدہ انتظام کیونکر ہوا کرے گا۔ لیکن جب انھوں نے سنا کہ محترمہ لکشمی دیوی صاحبہ انٹرنیشنل خیالات کی عورت ہیں۔ اور مسلمان عورتوں کے

ساتھ اس طرح شیر و شکر ہو کر ملتی ہیں گویا خود بھی مسلمان ہیں۔ تو بھابی جان بہت ہی خوش ہوئیں۔ اور اسی وقت پرچے لکھکر ملازم کے ہاتھ بھیجدئے۔ تاکہ شام ہی سے وہ دونوں آنے لگیں۔ نذیر صاحب کی اہلیہ اتفاق سے بیمار ہو گئی تھیں، اس لئے انھوں نے جواب میں معذرت لکھدی۔ مگر لکشمی دیوی صاحبہ جو عرصہ سے اس موقعہ کی تاک میں تھیں، دو گھنٹے پہلے ہی آدھمکیں اور اپنے ساتھ چھوٹی بہن اور بھاوج کو بھی لے آئیں۔ چنانچہ بھابی جان نے بھی دلچسپی کی غرض سے ان تمام عورتوں کو قبل از وقت بلالیا۔ جو روزآنہ آیا کرتی تھیں۔ اور اس طرح اس دن چار سے چھ بجے تک ان کے کمرے میں بہت سے زندہ ریڈیو بجتے رہے۔ بھابی جان ان سب کی خاطر تواضع چائے اور پان سے کرتیں۔ تاکہ وہ روزآنہ آیا کریں۔ اور اگر ان میں سے کوئی صاحبہ کسی دن غیر حاضر رہتیں تو ملازم کو بھیج کر انھیں بلوالیا جاتا۔ دلچسپ چیزوں کے وقت ریڈیو بجتا رہتا۔ لیکن پکے گانوں یا خشک تقریروں کے شروع ہوتے ہی اسے بند کر دیا جاتا۔ اور اس وقفہ میں مختلف گھریلو واقعات پر روشنی ڈالی جاتی۔ یا پھر چائے اور پان کے شغل میں سب مصروف ہو جاتے۔ کیونکہ بے تکلفی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ بعض عورتوں نے مستقل طور پر اسے اپنا ہی گھر سمجھ لیا تھا۔ حتیٰ کہ اگر بھوک ہوتی تو چائے کے ساتھ بسکٹ بھی طلب کر لئے جاتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی فرش خراب ہوا نقصان الگ۔ لیکن نہ انھیں پروا نہ بھابی جان کو خیال، پہلے بیٹھک کے فرش کو مسٹر دت اور نذیر صاحب داغدار بناتے تھے مگر اب ان کے کمرے کی چاندنی کو شیخ صاحب کی بیوی سے لے کر حکیم جی کی ملازمہ تک سب کے بچے نہایت دریا دلی سے خراب کرنے لگے۔ کوئی دن بھی اتفاق سے ایسا نہیں گذرا جبکہ دو چار بچوں نے اسے پیشاب سے پاک نہ کیا ہو۔ اور دوسری قسم کی رفع حاجتوں کے لئے تو صحن بہت کافی تھا۔ چنانچہ صبح کے وقت کوئی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ انگنائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح بیت الخلاء بنی ہوئی ہے گویا کسی گاؤں کے قریب کی زمین ہے۔ لیکن بھابی جان کو یہ بھی ناگوار نہ گذرتا کیونکہ اس تمام بدتمیزی کی ذمہ دار عورتیں ہوتی تھیں۔ اور جس طرح مرد اپنی جنس کے لئے تمام رعائتیں مخصوص کرسکتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنی صنف کے لئے بہت کچھ قربانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اسی جذبۂ ایثار کے ماتحت ہماری بھابی جان نے ریڈیو کی کوئی چیز کبھی شروع سے آخیر تک نہیں سنی۔ ان کا زیادہ وقت چائے تیار کرنے پان بنانے اور چھالیہ کترنے میں

گذرتا تھا یا پھر کسی کے روتے ہوئے بچے کو لے کر خاموش کرنے کی غرض سے انگنائی میں چلی جاتیں تاکہ دوسری عورتوں کے لطف میں فرق نہ آنے پائے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ خاص دہلی کے ایک نامی گھرانے کی لڑکی تھیں، انھیں دہلی کی روایتی وضعداری کا ہر وقت خیال رہتا تھا اس لئے خود میزبان ہونے کے سبب سے اپنے مہمانوں کی خاطر بعض تکلیفیں بھی برداشت کر لیتی تھیں۔ چنانچہ جب کمرے میں بیٹھنے کے لئے جگہ نہ رہی تو اس کی بہت سی چیزیں باہر دالان میں رکھ دی گئیں۔ تاکہ گنجائش نکل آئے اور جب دالان کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو ہر قسم کے سامان کو بیٹھک میں اس طرح بھر دیا کہ بیٹھک اپنے ارتقائی منازل طے کئے بغیر ایک دم گودام بن گئی۔ ریڈیو کا رسالہ "آواز" جس میں روزانہ کا پروگرام چھپتا ہے ضرور خریدا جاتا۔ حکیم جی کی بیوی جو غلطی سے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ سمجھتی تھیں اسے پڑھ کر گھڑی میں وقت دیکھتی جاتیں اور جب دلچسپ چیز شروع ہوتی تو ریڈیو کا سلسلہ دوبارہ جاری کر دیا جاتا۔ مگر اس دوران میں بھی باہمی گفتگو ختم نہ ہوتی، اسی لئے عورت کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی خاموشی میں بھی ایک قسم کا تکلم پنہاں ہوتا ہے۔ اکثر ریڈیو میں کسی تقریر یا گانے پر بحث ہونے لگتی اور ایسی بحث ہوتی کہ لڑائی کی نوبت آجاتی۔ مگر خود بھابی جان نے ان جھگڑوں میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ سب کی باتیں سن کر دل ہی دل میں مزا لیتیں اس تکا فضیحتی سے بالکل الگ، بعض دن ایسے پُرلطف مذاق بھی ہو جاتے کہ انھیں سنکر داد دینے کو جی چاہتا۔ مثلاً ایک روز کوئی زیادہ عمر کے بزرگ تقریر فرما رہے تھے ایک تو ان کی آواز ہی بھاری تھی اس پر مسلسل کھانسی نے ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا۔ ہر دو جملوں کے بعد کھانستے اور پھر شروع ہو جاتے، اچانک ہماری بھابی جان کو کچھ خیال آیا اور انھوں نے سوچا کہ لاؤ ذرا دل لگی کریں۔ ایک دم میر صاحب کی بیوی سے جو ریڈیو سیٹ کے سامنے ہز ماسٹرز وائس کے کتے کی طرح خاموش بیٹھی بڑے غور سے تقریر سن رہی تھیں بناوٹی گھبراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں کہ بہن ذرا ہٹنا اب کے انھیں کھانسی اٹھی تو بلغم بھی تھوکیں گے۔ اور بغیر سوچے سمجھے میر صاحب کی بیوی اچھل کر اس طرح پرے ہٹ گئیں گویا سچ مچ ہی ان پر بلغم آ پڑے گا۔ فوراً ایک قہقہہ لگایا گیا اور میر صاحب کی بیوی شرما کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھیں۔ ایک اور لطیفہ سنیئے۔ ایک دن لکشمی دیوی صاحبہ ایریل کی ڈوری دیکھ کر بھابی جان سے کہنے لگیں۔ "بہن! اگر یہ الگنی ذرا

نیچی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ کم از کم بچی کے پوتڑے ہی لٹکا دئے جاتے۔" بھابی جان ہنس کر بولیں "اے واہ یہ خوب کہی۔ گندے پوتڑے لٹکائے جائیں تو آواز میں بد بو پیدا ہو جائیگی اور سننے والوں کے کان سڑ جائیں گے"۔ بعض انجان عورتوں کے لئے یہ نئی چیز عجوبہ تھی، وہ حیران تھیں کہ اتنی تیز آواز کیونکر اور کہاں سے نکلتی ہے جبکہ گراموفون کی طرح نہ اس پر کوئی ریکارڈ چڑھایا جاتا ہے اور نہ کوئی سوئی وغیرہ لگائی جاتی ہے، بعض عورتیں جھانک جھانک کر اس کے اندر دیکھتیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے کون کون سے پرزے حرکت میں ہیں لیکن ہر چیز کو ٹھہری ہوئی حالت میں دیکھ کر اور زیادہ حیران ہوتیں، بعض بڑی بوڑھیاں گانے کی لے کے ساتھ اپنی پن کٹیوں کی آواز کی سنگت کرتے ہوئے ارشاد فرماتیں کہ بس قیامت نزدیک ہے۔ انسان خدا کی برابری کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ میں نہ یہ دنیا ہوگی اور نہ اس دنیا میں بسنے والے۔ بھابی جان نے ہماری زبان سے براڈ کاسٹنگ اور ریڈیو کے متعلق جو کچھ سنا تھا اسے اپنے الفاظ میں بڑے فخر کے ساتھ سب کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کرتیں اور ایسے انداز میں گویا خود انھوں نے اس سائنس کا گہرا مطالعہ کیا ہے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ ہوا میں وہ کونسی چیز ہے جو ہماری آواز کو بغیر کسی تار یا کھمبے کے تمام دنیا میں پھیلا دیتی ہے۔ اب سنیئے کہ واقعات نے پلٹا کھایا اور اس رنگ میں بھنگ ملنی شروع ہوئی۔ مسٹر دت کا چھوٹا بچہ غیر معمولی طور پر بہت شریر تھا۔ روز آنہ ایک نہ ایک چیز کا خون کر دیتا۔ کبھی چائے کی پیالی توڑ دی۔ کبھی کتھے چونے سے دیواروں پر پھول بوٹے بنا دیئے۔ ایک دن قینچی لے کر پلنگ کی نئی چادر کئی جگہ سے کتر دی۔ بھابی جان کو یہ باتیں ناگوار معلوم دیتیں مگر کچھ نہ کہتیں۔ تاہم اس وقت انہیں بہت غصہ آتا جب وہ ان کی ننھی بچّی کو ستاتا اور ایک روز تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بچّی کی کلائی اتنی زور سے مروڑی کہ وہ بلبلا اٹھی۔ آخر ماں کی ممتا بھابی جان سے سہار نہ ہوئی، انھوں نے بھائی حمید سے، بھائی حمید نے مسٹر دت سے اور مسٹر دت نے اپنی بیوی سے شکایت کی۔ مگر بے سود۔ بچّے کی شرارتیں بدستور جاری تھیں حتیٰ کہ ایک دن اس نے میز پر رکھے ہوئے ریڈیو سیٹ کو اس طرح پھینکا کہ اسکی تین بتیاں ٹوٹ گئیں، نقصان معقول تھا۔ جب بھابی جان کو معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس روپے خرچ ہونگے تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کر باز آئے ایسی دلچسپی سے اور فیصلہ کیا

کراب سیٹ کو کبھی درست نہ کرایا جائے۔ اُدھر کچھ عرصے سے انہیں اس بات کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ میاں صاحب بارہ بارہ بجے تک باہر رہنے لگے ہیں، کہیں ایسا معاملہ تو نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی دلبستگی کے لئے کوئی الگ جگہ تلاش کر لی ہو۔ اور اس کا ناگوار اثر خود ان کی ذات پر پڑے، لہٰذا ریڈیو کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور سب کو یہ خبر بھی سنا دی۔ چنانچہ پھول کی ڈالی ٹوٹتے ہی بلبلیں دوسری جانب پرواز کر گئیں۔ جب ہمیں اس انقلاب کی خبر ہوئی تو بہت تعجب ہوا کہ آخر چوروں کی خاطر گدڑی کیوں چھوڑی جائے، کیا ضرورت ہے کہ محلے کی تمام عورتیں یہاں آئیں، خدا نے ان کو دولت دی ہے۔ ایسی کنجوسی کس کام کی۔ اپنے اپنے گھر پر ریڈیو لگوائیں اور سنیں۔ لہٰذا بھابی جان کا ریڈیو درست کر دیا اور بھائی حمید کو تاکید کر دی کہ ہمیشہ چھ بجے کے بعد گھر پر رہا کریں اور وعدہ کیا کہ کبھی کبھی ہم خود بھی آجایا کریں گے۔ مثل مشہور ہے کہ کالے کے سامنے چراغ نہیں جلتا، جب عورتوں کو معلوم ہوگا کہ ہمسائی کے میاں اور دیور گھر میں رہتے ہیں تو کسی میں آنے کی ہمت ہی نہیں ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بھابی جان کو ہماری تدبیر بہت پسند آئی ہم روزانہ اخبار میں پروگرام پڑھ لیتے ہیں اور جس دن اپنے مطلب کی چیز ہوتی ہے وہاں چلے جاتے ہیں۔ بھائی حمید پابندی کے ساتھ گھر پر ہی رہتے ہیں، وہ بھی خوش تھیں کہ ہم نے ان کو روز کی آوارہ گردی سے بچالیا۔ وہ تمام عورتیں جو بھابی جان کے مکان پر آتی تھیں بہت ناراض ہوئیں۔ بعض بگڑ بھی گئیں اور غصہ میں طرح طرح کے فقرے کسے، ایک نے کہا اب یہ مغرور ہو گئی ہیں ہم غریبوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ دوسری نے کہا کنجوس ہیں، بجلی کے خرچ سے بچنا چاہتی ہیں۔ تیسری صاحبہ بولیں کہ چائے پلاتے ہوئے دم نکلتا ہے۔ غرض یہ کہ سو منہ اور ہزار باتیں۔

سید انصار ناصری دہلوی

"جوگی"

رات کی مدھم سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ غمگین ستاروں کی سبز روشنی ابھی تک زائل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مادھوپور کی گلیوں میں زندگی کی لہر پیدا ہو چکی تھی کیونکہ گاؤں کے رہنے والے جو گجر دم جاگنے کے عادی ہوتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ستاروں کی چمک میں سبزی مائل جھلملاہٹ کا پیدا ہونا صبح کی نزدیکی کی علامت ہے۔

پو پھٹی اور اُفقِ مشرق پر نمودار ہونے والی روشنی کی لکیر آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ستارے ایک ایک کرکے غائب ہو گئے۔ سیاہی اس طرح گم ہو گئی جیسے کوئی پری چہرہ اپنے سیاہ ریشمی بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھ لے اور اس کے مسکراتے ہوئے چہرہ سے نور کی کرنیں پھوٹ نکلیں ــــــ اُجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی اپنا شفاف اُجلا سینہ کھولے ہوئے صبح کی ٹھنڈی روشنی کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ نیند میں بہنے والی موجیں بیدار ہو چکی تھیں اور ایک نرم و سُبک تموج کے ساتھ ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی لہرا رہی تھیں۔ دُور دُور جہاں تک نظر جاتی زندگی رات کے نشے سے چور انگڑائی لیتی نظر آتی ــــــ آسمان دھل دُھلا کر صاف ہو گیا۔ اور نیلگوں چھت کے نیچے، بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں جہاں چڑیاں اور فاختائیں صبح کی عبادت میں مصروف تھیں ــــــ پھوس کے بے قاعدہ بنے ہوئے جھونپڑے، کچے پکے اونچے نیچے مکان اور چھوٹی بڑی دیواریں نظر آتی تھیں ــــــ گیہوں کے پکے ہوئے کھیت دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہی کھیتوں کے درمیان سے پتلی پتلی بے شمار پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی ہر طرف کو جاتی تھیں ــــــ ندی کے

کنارے ایک چھوٹا سا مندر اور گھاٹ بنا ہوا تھا جہاں صبح و شام گاؤں کی عورتیں تانبے پیتل کے کلسے لئے پانی بھرنے جمع ہوتیں اور تھوڑی دیر کے لئے اچھی خاصی رونق رہتی ——— کلسوں کی آواز۔ چاندی اور کانسی کے زیوروں کی جھنکار۔ بچوں کی چہل پہل لڑکیوں کے بے حجاب قہقہے، ہنسی مذاق، دھول دھپّا، اٹھکھیلیاں۔ بہوؤں کی شرمیلی زیرِ لب مسکراہٹ، میٹھی میٹھی باتیں بڑی بوڑھیوں کے دودھ دہی کے قصّے۔ کھیتی اور بارش کے امکانات پر تبادلۂ خیال، غرض انہی باتوں سے مادھوپور کے گھاٹ پر روزانہ میلے جیسی رونق رہتی۔

چونکہ ابھی سویرا تھا اس لئے مادھوپور کے گھاٹ پر مجمع شروع نہیں ہوا تھا البتہ ایک لڑکی۔ بارہ تیرہ برس کا ارمان بھرا سن۔ گاڑھے کے موٹے اور بھدّے لباس میں لپٹی لپٹائی۔ سر پر پیتل کا چمکتا کلسا رکھے ایسے انداز رفتار سے جس کی نقل نہیں ہو سکتی ایک خاص لچک اور نرمی کیساتھ، قدم قدم پر جادو جگاتی ہوئی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ایک ہاتھ کمر پر اور ایک حسین برہنہ بازو گھڑے کو سنبھالے ہوئے۔ چمکدار بڑی بڑی آنکھوں میں شوق اور ارمانوں کی تحریر تھی۔ اور کُندن سی پیشانی پر بھولپن کا نور۔ سانولے سلونے چہرے پر جوانی اور صحت کا غازہ تھا ——— یہ الھڑ لڑکی چمپا تھی آج وہ کتنی خوش تھی۔ اُس کا سوامی آج اُسے اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے گا۔ اُس کی سسرال ندّی کے اُس پار بہت دُور واقع تھی، جہاں کے لوگ، مکانات اور سڑکیں عجیب و غریب تھیں۔ بھولی چمپا کے دل میں امیدوں کا طوفان تھا۔ وہ سراپا انتظار تھی۔ امیدوں اور انتظار کے اس دلکش احساس کے ساتھ ذرا ذرا سا خوف بھی شامل تھا۔ معلوم نہیں سسرال کیسی ہو۔ لوگ کس طرح پیش آئیں۔ ساس نندیں کیسا سلوک کریں۔ لیکن یہ خوف فوراً جاتا رہتا جب دُلہن بننے کا اشتیاق اس کے معصوم دل میں گدگدی پیدا کر دیتا۔ پتی کے چاؤ کی رنگین تصویریں اس کے سامنے آتیں وہ مسکرا دیتی اور دھڑکتے ہوئے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے قدم تیز کر دیتی۔

جب ندّی پر پہونچی تو سورج اپنے آتشیں جھروکے سے مسکراتا ہوا نکل رہا تھا۔ کنول کھِل کھِل کر اس نورانی دیوتا کو سلامی دے رہے تھے۔ کنارے پر اُگی ہوئی لمبی لمبی گھاس جھوم رہی تھی۔ یکایک مندر کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا۔ چمپا شوق اور ارمانوں کی

سندر بالا چونک پڑی۔ پھر ایک خیال آیا۔ گھاٹ پر کلسا رکھا۔ ہلکے ہلکے قدموں سے مندر میں داخل ہوئی۔ نگاہیں جھکا کر سراپا صدق اور خلوص سے ٹھاکر جی کی مورت کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بولنے کی طاقت کہاں۔ دل کی کہانی آنکھیں کہہ رہی تھیں جن سے اس وقت سچائی اور خلوص کے آنسو بہ نکلے تھے۔ پوجا سے فارغ ہو کر پجاری کے چرن چھوئے۔ بوڑھے برہمن نے دُلار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "دھن ہو بیٹی! کیوں آج کچھ اداس نظر آتی ہے؟"

چمپا نے دبی زبان سے کہا۔ "مہاراج! آج میرا گونا ہے۔ سسرالئے آئیں گے اور مجھے ...... " اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی اور منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس رونے میں امید و بیم سکھ اور دُکھ۔ کامرانی اور نامرادی کے عجیب عجیب سے احساسات تھے۔ پجاری نے کہا: "گھبرا نہیں بیٹا۔ سب اچھا ہی ہو گا۔ بھگوان تجھے سدا سکھی رکھیں۔" اتنا کہہ پجاری نے زور سے سنکھ بجایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس آواز نے چمپا کے دل میں ہمت اور بھروسہ پیدا کر دیا۔ وہ مسکرا دی اور ایک بار اور ٹھاکر جی کی مورت کو ڈنڈوت کرتی ہوئی اُلٹے قدموں مندر سے باہر نکلی۔ گھاٹ پر اور بہت سی عورتیں جمع ہو گئی تھیں جن میں کچھ اس کی سہیلیاں بھی تھیں۔ سہیلیوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"اری آج تو تیرا وہ آنے والا ہے ــــ کیا نام اس کا؟"

دوسری بولی۔ "کھچڑو!"

چمپا نے لجا کر کہا۔ "واہ کھچڑو تو تیرے والے کا نام ہو گا۔ جنم جلی کہیں کی۔"

دوسری بولی۔ "ہمیں بھی یاد کرے گی کبھی۔ یا ہر وقت اپنے اس کلچھڑے کے پاس گھسی رہے گی۔"

تیسری بولی۔ "نا بہن! تمہیں بھلا وہ کیوں یاد رکھے۔ نئی نویلی دُلہن ہو گی۔ پتی سو جان سے نثار ہوں گے، ہاتھوں چھاؤں رکھی جائے گی۔ تمہیں بھلا وہ کیوں یاد رکھے۔ اس کی بلا۔ بس یہ ہو گی اور اس کے پران پیارے ہر دیشور، پتی دیو! چوبیس گھنٹہ اُنہیں کی گود آباد رہے گی۔" وغیرہ وغیرہ۔ غرض ایسی ہی خوش گپیوں کے درمیان پانی بھر گیا اور آپس میں چہلیں کرتی ہوئی بے ساختہ کھیلی ہوئی سہیلیاں واپس آئیں۔

دنوں کے ساتھ مہینے، رُت، اور سال بھی بیت گئے۔ ایک روز پھر چمپا مندر کی جانب اُداس اور بھاری قدموں سے جاتی ہوئی دکھائی دی۔ لیکن افسوس اب ان خوبصورت پاؤں میں کڑے نہیں تھے۔ رفتار کی وہ موسیقی بھی ختم ہو چکی تھی۔ چمپا بے چاری بیوہ ہو گئی تھی۔ سسرال میں دو سال رہ کر کچھ دن کے واسطے پی ہر آئی اور یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ اس کا پتی، خوبصورت، سجیلا کڑیل جوان، ملازمت کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر میں گیا تھا اور وہیں مر گیا۔ آہ! اس کمسنی کے زمانے میں دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی اور اُسے ساری نعمتوں سے محروم ہو جانا پڑا۔ سرمستی، کاجل پھول خوشبو۔ ماتھے کی بندی، زیور، رنگدار کپڑے۔ غرض سہاگ کی ساری نشانیاں اب اُس پر حرام تھیں۔ وہ پھر مادھو پور آگئی تھی تاکہ اپنی بوڑھی ماں کی سیوا کر سکے۔ گاؤں کی ساری آبادی اُسے منحوس سمجھتی تھی۔ ساتھ کی کھیلی سہیلیاں بھی اُس کے سایہ سے گھبراتیں۔ کہیں اس کے کلنک کی سیاہی اُچٹ کر ان پر بھی نہ لگ جائے۔ مادھو پور کی بھری آبادی میں اگر کسی شخص کو اس سے ہمدردی تھی تو وہ مندر کے بوڑھے پجاری کو اور بس۔ وہی اس کے آنسو پونچھتا اسے صبر اور شانتی کی تلقین کرتا۔ ٹوٹے ہوئے دل کو ڈھارس دیتا۔ چمپا کو ماں کی سیوا سے جب بھی فرصت ملتی وہ مندر میں جا بیٹھتی۔ جنگلی پھولوں کے ہار بنا بنا کر ٹھاکر جی کی مورتی پر چڑھاتی۔ مندر میں جھاڑو دیتی اور ندی کے پانی سے مندر کا فرش دھوتی۔

انہی دنوں میں ایک روز ایک طویل قامت، گورا چٹا خوبصورت جوگی بھبوت ملے۔ چمٹا بجاتا ہوا نہ معلوم کہاں سے آنکلا۔ اور مندر کے آگے دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ مادھو پور میں جوگی جی کے آنے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ گاؤں کی ساری عورتیں خوش اعتقاد تھیں وہ ہر روز جوگی جی کی تعظیم کو مندر میں جمع ہو جاتیں۔ جوگی جی کی آنکھوں میں عجیب کشش تھی۔ ایسی زبردست روحانی طاقت تھی کہ کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ جوگی جی کسی روز گیتا پڑھتے، کبھی رامائن سناتے یا کوئی اور مقدس کتاب پڑھتے۔ لوگ اپنی اپنی منتیں لے کر ان کے پاس آتے اور وہ ہر شخص کو دھول کی چٹکی دے دیا کرتے۔ جوگی جی کی سیوا، خاطر مدارات میں سب سے زیادہ محنت اور تن دہی سے جو ہستی ہمہ وقت مصروف رہتی وہ چمپا تھی۔ جوگی جی کے آرام کے لئے ذرا ذرا سی بات کا

خیال رکھتی۔ ان کے لئے پانی بھرتی۔ آگ جلاتی اور کبھی کبھی جبکہ گاؤں سے روٹی آنے میں دیر ہوجاتی تو خود ہی روٹی بھی پکا دیتی اور روز شام کو گاؤں سے دودھ کی ٹھلیا بھر کر لاتی۔ اس کے علاوہ جب جوگی جی کتھا کہتے یا کچھ اور پڑھ کر سناتے تو سب سے زیادہ غور اور توجہ سے وہی ان کے ایک ایک لفظ کو سُنتی، چاہے بہت سی باتیں اُس کی سمجھ سے باہر ہوتیں۔ لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہر وقت جوگی جی کے چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی۔ اُس کے دل میں کریدتی سی لگی رہتی۔ کئی مرتبہ دل کی بے چینی ایک سوال بن کر اس کے ہونٹوں تک آئی مگر ہمت نہ ہوسکی۔ بوڑھا پجاری تاڑ جاتا اور اس سے پوچھتا تو وہ کچھ جواب نہ دیتی۔

دن گذرتے گئے، ایک دفعہ سورج گرہن کے موقع پر، دُور دُور سے آدمی مادھو پور والی ندی میں اشنان کے لئے اور ٹھاکر جی کی مورتی کے درشنوں کو جمع ہوئے سینکڑوں آدمی تھے جن میں اتفاق سے چند عورتیں چمپا کی سسرال سے آئی تھیں صبح کے وقت جبکہ جوگی جی گھاٹ کی سیڑھیوں پر آسن جمائے، آنکھیں بند کئے مالا جپ رہے تھے، ایک عورت نے کہا۔ "ارے یہ تو ہیرالال معلوم ہوتا ہے، چمپا کا پتی۔ ذرا دیکھو تو۔" دوسری نے اپنے گھونگھٹ کو دو جنا اُلودا نگلیوں سے سرکاتے ہوئے کہا۔ "ارے ہاں، بالکل ویسی ہی شکل ہے۔ ناک نقشہ بالکل ویسا ہی ہے۔" تیسری نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "ہاں، شکل تو ویسی ہی ہے پر دیہی ذرا پتلی ہے۔ ہیرالال بچارا اب کہاں وہ تو کب کا سُرگ باش ہوا۔ غریب چمپا کا جیون ملیا میٹ ہوگیا ـــــ" عورتوں کے اس طرح بولنے سے جوگی جی کی آنکھ کُھل گئی۔ گیان میں فرق آیا اور وہ چُپ چاپ اُٹھ کر مندر میں آ گئے۔ یہ باتیں چمپا بھی آم کے پیڑ کی اوٹ میں چھپی سُن رہی تھی۔ اس طرح کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور تنفس کی رفتار دو چند ہوگئی تھی۔ اس کی بے چینی ہزار گناہ بڑھ گئی۔ صبح و شام ایک ہی فکر میں غلطاں پیچاں رہتی۔ جب کبھی جوگی جی کی طرف نگاہ اُٹھاتی تو نظریں مجسّم سوال بن جاتیں۔

دن گذرتے جا رہے تھے۔ بالآخر وہ زمانہ آیا جب ساری دُنیا بہار کے نشہ میں چُور ہوگئی۔ پھاگن کا مست مہینہ بسنت کی رُت، ہر طرف رنگینی تھی، شادمانی تھی، عیش تھا اور حسین چمپا بھی اسی رنگینیِ چمن کی ایک نورس پھیلی کلی تھی، جوانی کے نشے سے سرشار، روپ کی دولت سے بھرپور۔ لیکن اجاڑ دل کے ویرانے میں ہمہ وقت غم واندوہ کی تاریک سوگوار گھٹائیں چھائی رہتیں، بے نور آنکھوں میں کثرتِ اشک ریزی سے اُداسی اور پژمردگی ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہوگئی تھی۔

ایک رات جبکہ سُنسان فضا میں گیدڑ اور اُلّو کی بھیانک آوازیں دہشت پیدا کر رہی تھیں، جوگی جی کسی ضرورت سے مندر سے باہر آئے تو گھاٹ کی سیڑھیوں پر انہیں کوئی تاریک سا سایہ نظر آیا۔ وہ قریب آئے۔ ڈانٹ کے پوچھا "کون ہے؟" چمپا نے آگے بڑھکر جوگی جی کے چرن چھوتے ہوئے کہا۔ "میں ہوں، گروجی۔ آپ کی داسی چمپا۔" "گروجی نے حیرت سے پوچھا۔ اس سمے یہاں کیسے؟" چمپا خاموش تھی مگر اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اُس کے زرد رُخسار پر بہ رہے تھے۔ گروجی نے پوچھا "چمپا!! تم رو رہی ہو؟ کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔" چمپا پر موت کی سی خاموشی مسلّط تھی گروجی پھر بولے۔ "چمپا! مجھے بتاؤ تمہیں کیا دکھ ہے۔ تعجب ہے میں اتنے دن سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ بولو، چمپا کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ شاید میں کسی طرح تمہاری مدد کرسکوں۔" گروجی کے اس دلاسے نے دل کے زخموں پر کاری ضرب لگائی اور آنسوؤں کا ایک سیلاب چمپا کی آنکھوں سے جاری ہوگیا۔ اپنی ملگجی ساری کا پلّو مُنہ پر ڈال کر چمپا خوب روئی۔ جب گروجی کا اصرار بہت بڑھ گیا تو بولی۔ "گروجی، میں پاپن ہوں، کیا کہوں، آپ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" گروجی نرمی سے بولے۔ "نہیں، چمپا! تم ضرور کہو، پرماتما سب کے گناہ معاف کرنے والا ہے تم ضرور کہو۔ کیا بات ہے۔ جس نے تمہارا چین وآرام چھین لیا ہے۔" چمپا نے کہا: "میں نہیں بتا سکتی گروجی۔" گروجی نے کہا۔ "چمپا میری خاطر تجھے بتانا پڑے گا۔ کیا بات ہے۔ تجھے کس نے دُکھ پہنچایا ہے۔" "تو کیا بتا ہی دوں گروجی؟" چمپا نے ہمّت کرکے کہا۔ "ہاں، ہاں، ضرور!!" گروجی نے کہا۔

چمپا نے کمال ہمّت اور اپنے ہردے کی ساری شکتی سے کام لے کر کہا: "گروجی،

آپ ہی نے مجھے دُکھ پہونچایا ہے۔" گرو جی پر گویا بجلی سی گری۔ حیرت سے پوچھا۔" میں نے، وہ کیسے؟"

چمپا نے کہنا شروع کیا۔" سُنیئے گرو جی! آج سے . برسوں پہلے میری شادی ہوئی۔ ابھی دو برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرا سوامی دنیا سے گذر گیا۔ مجھ پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر رفتہ رفتہ صبر آگیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دل میں مصیبت کو برداشت کرنے کی طاقت اُبھلی تھی کہ آپ یہاں تشریف لائے ___" اتنا کہہ کر چمپا رُک گئی۔ گرو جی بولے۔

"ہاں، ہاں، کہو۔ پھر"

چمپا نے کہا۔" پھر کہا۔ کیا آپ وہی نہیں ہیں۔ کیا آپ کا شُبھ نام ہیرالال نہیں ہے کیا آپ ہی آج سے . برسوں پہلے اس مادھو پور گاؤں سے پنچوں کے سامنے میری بانہہ پکڑ کر مجھے اُس ندی کے پار اپنے گھر نہیں لے گئے تھے۔ کیا آپ ہی نے مجھے اپنا جیون بھر کا ساتھی نہیں بنایا تھا ___ کیا آپ ہی میرے سوامی، میرے پتی دیو نہیں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تب بھی اس وقت "ہاں" کہہ دیجئے۔ آشا اور اُمید کا جو دیا اس وقت میرے دل میں ٹمٹما رہا ہے۔ اُس کی جوت کو قائم رکھنا آپ ہی کے ہاتھ ہے۔ یہ اُمید بڑھتے بڑھتے اب میری زندگی بھر کی ساتھی بن گئی ہے۔ اس آس کے ٹوٹتے ہی میں بھی زندگی کے اس پاپ سے اپنا پنڈ چھڑا لوں گی۔ بولئے گرو جی۔ کیا آپ ہی اس وقت جوگی کے روپ میں میرے سوامی نہیں ہیں، بولیئے کیا آپ وہی نہیں ہیں۔ بولئے۔ بولئے ___" چمپا کی اس بید ھڑک زوردار تقریر نے گرو جی کے حواس پر بجلی گرادی تھی۔ وہ بے چینی سے اپنے دانت پیس رہے تھے ___ بالآخر بولے "ہاں، چمپا میں ہی ہوں ہیرالال۔ آج معلوم ہوا کہ تم وہی چمپا ہو۔ پر اب" گرو جی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ چمپا دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ آج اس نے اپنے مرے ہوئے پتی دیو کو پھر پالیا۔ کیا سنسار بھر کی کوئی بھی خوشی اس کی اس وقت کی خوشی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ بیوہ نہیں رہی۔ لوگ اب اسے ددھوا کہہ کر منحوس نہ سمجھیں گے بلکہ "جوگن" کہہ کر ادب کریں گے۔

کچھ دیر بعد گرو جی بولے۔" میں نے اپنے مرنے کی خبر اس وجہ سے مشہور کردی

تھی کر تو مجھے ڈھونڈنے نہ نکلے۔ اور دودھوا بن کر صبر کا پتھر دل پر رکھ لے۔ پر تو نے پا ہی لیا۔ لیکن مجھے اب بھی مرے برابر ہی سمجھ۔ کیونکہ اب میں جوگی ہوں۔ اس دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں، تو مجھے بھول جا۔"

چمپا نے نحیف و نزار لہجہ میں کہا۔ "چاہتی تو یہ تھی کہ میں بھی آپ کے ساتھ رہوں۔ پر جیسا آپ کا حکم۔"

گرو جی بولے۔ "میں آج ہی یہاں سے جاتا ہوں۔ خبردار جو اب اپنا من میلا کیا۔ میں پھر تجھ سے نہ ملوں گا۔"

چمپا بولی۔ "جو حکم مہاراج!!"

گرو جی اسی وقت روانہ ہو گئے۔ چمپا نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ آخری بار ان کے قدموں کو چوما اور اُن کے پاؤں کے نیچے کی خاک لے کر اپنے سر پر ڈال لی۔ دوسرے دن مندر کے بوڑھے پجاری نے گاؤں بھر میں یہ واقعہ مشہور کر دیا کیونکہ وہ خود چھُپ کر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ چمپا جوگن کا نام اب بھی مادھوپور میں عزت اور ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ [1]

[1] یہ مضمون ۲۱ جون ۳۶ء کو دہلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا۔

سیّد انصار ناصری دہلوی

زبان کا تعلق معاشرے اور معاشرت، دونوں سے ہوتا ہے۔ جس طرح اچھے ڈراموں اور فکشن میں مختلف کرداروں کی زبان ایک ہوتے ہوتے بھی اپنی انفرادی پہچان رکھتی ہے، اسی طرح مختلف ادیبوں کا اسلوب بھی یوں مختلف ہوتا ہے کہ وہ اپنے "پسندیدہ "کردار مختلف ماحولوں سے لیتے ہیں۔ نذیر احمد، راشد الخیری اور شرر کے ناولوں کا ماحول اور ہے۔ پریم چند علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کا ماحول اور ہے۔ اسی لیۓ ان کے اسالیب بھی مختلف ہیں، اور زبان ایک ہوتے ہوئے بھی ایک نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ زبان، لفظوں کے برتنے سے اسلوب کا روپ اختیار کرتی ہے۔ انسان ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک نہیں، اور یہی بات زبان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے شروع کے دنوں میں جن لوگوں کو "بولا ہوا لفظ" ریڈیو کے اسلوب میں ڈھالنا تھا، وہ اپنی ذاتی پسند یا ناپسند ــــــ یا پھر اپنے طبقے کے کردار، یا اپنے فرقے کی چاؤ کی وجہ سے اس راستے سے بھٹک گئے، جو اپنے فرضِ منصبی کے طور پر انھیں بنانا چاہیئے تھا۔

جنگ عظیم سے پہلے، جب ذوالفقار بخاری، بمبئی میں اسٹیشن ڈائرکٹر تھے، تو اس زمانے کو یاد کرتے ہیں [1]

"ایک دن مجھے خیال آیا کہ علامہ راشد الخیری کی کتابوں کو ڈرامائی انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ تو اس عقیدت کے باعث جو میں مولانا سے رکھتا تھا، اور کچھ دلی کی زبان سے وابستہ رہنے کی خاطر، میں نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔ یعنی ہر ہفتے عورتوں کے پروگرام میں علامہ راشد الخیری کے ناول کا مناسب حصہ خود مائکروفون پر پڑھتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب میں نے علامہ راشد الخیری کے ناولوں کے اقتباسات پڑھ کر سنائے تو کیا عورتیں اور کیا مرد، سبھی یہ پروگرام سننے لگے۔ اس پروگرام سے ہمارا حوصلہ بڑھا، اور ہم نے شرر مرحوم کے ناولوں کے اقتباس بھی پیش کرنا شروع کیئے۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] سید ذوالفقار علی بخاری، سرگزشت؛ ص ۱۷۰ ــ ۱۷۲؛

سننے والوں کو راشد الخیری اور شررؔ کے ناولوں کے اقتباس سن کر دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا چسکا پڑ گیا۔ اور جب ہم نے منشی پریم چند کے افسانے ریڈیو پر پیش کیے تو لوگوں کو مزہ نہ آیا۔ پکار اٹھے کر: "ہم کو جو پلانی ہے تو دنیا سے منگا دے۔"

راشد الخیری کے سلسلے میں ذوالفقار بخاری کے بیان کو قبول کرنے میں کئی قباحتیں ہیں۔ اُن کی خود نوشت سے ذرا بڑا اقتباس نقل کرنا ضروری ہے[1]

"بمبئی میں ڈرامہ پیش کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ تھیٹر وہاں کے بچے بچے کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اور پھر فلم ایکٹروں اور فلم کمپنیوں کی بھرمار، مگر میں نے ہمت نہ ہاری، اور نہایت انہماک سے ڈرامے کیئے۔ دہلی سے کچھ ایکٹر ساتھ لے گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر یہ ڈرامے تو ہوتے رہے، مگر مجھ پرائُ کے ساتھ ساتھ یہ دھن بھی سوار رہی کہ عورتوں کے پروگرام میں مختصر ڈرامے پیش کئے جائیں، اور وہ بھی ایسے، جو خاص عورتوں کے لئے لکھے گئے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ سوچ بچار کے بعد ایک دن مجھے خیال آیا کہ علامہ راشد الخیری کی کتابوں کو ڈرامائی انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے بہت بڑی دولت ہاتھ آگئی۔ میں علامہ مرحوم سے ڈرتا تھا۔ جب کبھی دہلی میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، مرعوب ہو کر آیا۔ ہر چند کہ وہ شفقت سے پیش آتے تھے، اور مجھے اپنا نیازمند گردانتے تھے، مگر ان کے علم وفضل کی ہیبت مجھ پر طاری ہو جاتی تھی۔ مجھے اب یہ ڈر ستانے لگا کہ اگر علامہ مرحوم کی کسی کتاب کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا، تو حضرت بگڑ نہ جائیں۔ چنانچہ محض علامہ کے خوف سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اُن کے ناول کو ڈرامے میں تبدیل نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے اُن کا ناول مناسب تدوین کے ساتھ پڑھ کر سنایا جائے۔"

---

[1] ایضاً ص ۔ ۱۷۰، ۱۷۱۔

ذوالفقار بخاری نے بات کو کہانی بنانے کا فن محمد حسین آزاد سے سیکھا۔ محمد حسین آزاد نے امیر خسرو کے حقہ پینے سے لے کر میر تقی میر کے سفر میں، ہم سفر سے بات نہ کرنے تک کی کہانیاں بنائیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں تمباکو ہندوستان میں آئی نہیں تھی۔ لیکن ان کہانیوں کی وجہ سے "آب حیات" میں جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ ذوالفقار نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن جگ بیتی میں نہیں، آپ بیتی میں۔ ان کا پیرایۂ بیان دلنشیں اور دلکش، لیکن ان کے "واقعات" فرضی ہیں، اور وہ لائق اعتبار راوی نہیں ہیں۔

ذوالفقار کو فیلڈن نے ڈائرکٹر پروگرام منتخب کیا تھا، اور ترقی دے کر انھیں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر بنایا گیا۔ جب پہلی جنوری ۱۹۳۶ء کو دلی اسٹیشن سے براڈکاسٹ شروع ہوئے تو احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائرکٹر، اور چھوٹے بھائی ذوالفقار ان کے نائب تھے۔ جون ۱۹۳۶ء میں جب احمد شاہ ڈپٹی کنٹرولر ہوئے، تو ذوالفقار دلی کے اسٹیشن ڈائرکٹر ہوئے۔ جب بی بی سی کے معنی بخاری براوز کارپوریشن لیے جانے لگے، تو جنوری ۱۹۳۸ء میں این اے ایس لکشمانن دلی کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ذوالفقار کو بمبئی کا اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔[1]

راشد الخیری کا انتقال ۳ فروری ۱۹۳۶ء کو ہوا تھا۔[2]

ذوالفقار کتنے معتبر راوی ہیں، اس پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۵ء کو وہ دلی آئے تھے، ریڈیو میں ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے۔[3] پہلی جنوری ۱۹۳۶ء سے دلی اسٹیشن سے براڈکاسٹ شروع ہوئے۔ ۳ فروری کو راشد الخیری کی وفات ہوئی۔ ذوالفقار نے ان کی صحبت سے کیا استفادہ کیا ہوگا، اور کتنا نیاز ان کی خدمت میں حاصل ہوگا، یہ بھی اس تحقیق کا موضوع نہیں۔ یہ بات البتہ اس تحقیق کے موضوع سے غیر متعلق نہیں کہ جب ذوالفقار نے بمبئی سے راشد الخیری کے اقتباسات نشر کرنا شروع کیے، تو مصنف بقید حیات نہیں تھے، اور یہ کہ اس

---

[1] ایچ آر لوتھرا: انڈین براڈکاسٹنگ: ص ۱۱۶ اور ص ۱۱۸۔

[2] انتخاب نثر (حصہ دوم) اترپردیش اردو اکادمی، ص ۵۔

[3] ذوالفقار بخاری: سرگزشت ص ۸۔

وقت وہ راشد الخیری کے ممکنہ ردِ عمل سے گھبرا رہے تھے، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ چھوٹے بخاری نے جو کہانی گھڑی ہے، وہ حقیقت سے علاقہ نہیں رکھتی۔

ذوالفقار نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ انھوں نے راشد الخیری کے کس ناول سے اقتباسات پڑھے، اور شررؔ کے کس ناول کا انتخاب کیا۔ اور یہ بلاوجہ نہیں ہے۔

یہ ساری کہانی اس لئے گھڑی گئی ہے کہ ثابت کیا جائے منشی پریم چند کی نثر، ابلاغ کے لئے موزوں اور دلچسپ نہیں۔ راشد الخیری اور شررؔ زیادہ مقبول ہوئے، سننے والوں میں!

راشد الخیری اور عبدالحلیم شررؔ کی مقبولیت یا مبیّنہ مقبولیت جس طرح ثابت کرنے کے لیئے ذوالفقار نے کہانی کے تانے بانے بُنے ہیں، وہ وقت کی کسوٹی پر بھی پوری نہیں اتری۔ اُن کی آپ بیتی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے اس سے چند برس پہلے ہی یہ لکھی گئی ہو گی۔ راشد الخیری کی دہلوی زبان اور شررؔ کی لکھنوی زبان اگر بمبئی والے مرد و زن پسند کر سکتے تھے، تو اس ریڈیو پاکستان نے اپنے سامعین کو اس سے کیوں محروم رکھا، جس کے سربراہ خود ذوالفقار رہے! پریم چند کی کہانیاں ہی نہیں، ان کے ریڈیو روپ، انھیں کی زبان میں معمولی سی تبدیلی کے بعد نشر ہوتے، اور مقبول ہوتے۔ شطرنج کے کھلاڑی تو ایک اچھی فلم بھی بنائی گئی۔ اور کفن نہ صرف ریڈیو پر ڈرامے کے روپ میں نشر ہوئی، بلکہ اس کی ٹیلی فلم بھی بنی۔ راشد الخیری یا شررؔ کے کسی ناول کو یہ سعادت پاکستان میں بھی نہیں ملی۔

زبان کو بھی اشرافیہ کی زبان اور سوقیانہ زبان کے خانوں میں بانٹ دیا گیا۔ زبان جو ابلاغ کے لیئے ہے، فصحا اور غیر فصحا کے لیئے الگ الگ ہو گئی۔ پہلے دیہات کی زبان کے مقابلے میں شہر کی زبان کو ترجیح دی گئی۔ پھر شہروں میں بھی کچھ شہر مخصوص کیئے گئے، کہ وہ زبان اور ادب کے دبستان بنے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مخصوص شہروں کے مخصوص محلّوں کی زبان کو مستند قرار دیا گیا — اور پھر اس کے بعد اس محلّے، یا ان محلّوں کے سارے باسی فصحا نہیں قرار پائے۔ یہ رتبۂ بلند چند خاندانوں کو دیا گیا۔ زبان کے سلسلے میں ایسی غیر معقول درجہ بندی کچھ اُردو ہی کے حصّے میں آئی۔ یعنی فصاحت اور بلاغت چند نفوس کی جاگیر ہو گئی۔

ریڈیو پر اردو کا المیہ یہ ہے کہ دورِ اوّل میں اس پر زندہ دلانِ پنجاب کا تسلّط ہوا۔ اردو کی جو خدمت پنجاب نے کی ہے، اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ صدر مقام دلّی تھا، اس لئے کھلے طریقے سے زندہ دلانِ پنجاب کی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ لاہور میں تاجور نجیب آبادی وغیرہ حریف تھے۔ یہاں دلّی اور لکھنؤ والوں کو حلیف بنا لیا گیا۔ لیکن مقصود اردو کا دائرہ وسیع کرنے کے بجائے تنگ کرنا تھا۔ چنانچہ منشی پریم چند کی زبان میں وہ چٹخارہ نہیں ملا، جو بول چال کی زبان پر فارسی عربی کے ملمع والی زبان میں ہوتا ہے، کریہہ "سوقیانہ" نہیں ہوتی۔

تقابلی مطالعہ کے لئے ایک نظر منشی پریم چند، راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر کے اسالیب پر ڈالیں، تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

کفن، منشی پریم چند کی مشہور کہانی ہے۔ یہ یوں شروع ہوتی ہے:

> جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا، دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے، اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا، دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی، اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔
>
> گھیسو نے کہا: "معلوم ہوتا ہے، بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا، دیکھ تو آ۔"
>
> مادھو نے دردناک لہجے میں کہا: "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔"
>
> "تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ زندگی کا سکھ بھوگا، اسی کے ساتھ اتنی بے وفائی؟"

راشد الخیری نے لکھنے کا فن اور انداز، دونوں ڈپٹی نذیر احمد سے سیکھے۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب مختلف ہے۔ پند و نصیحت ۔ زیادہ تر بالواسطہ یعنی

تمثیلی روپ ہیں، نذیر احمد کے یہاں بھی ہے، اور یہ کوئی عیب نہیں ہے، اگر لکھنے کے آداب کی پابندی کی جائے۔ راشد الخیری المیہ فضا پیدا کرنے کو اپنا فن سمجھتے ہیں، اور اسی لیئے انھیں مصوّرِ غم کہا گیا۔ غم کے تاثرات وہ واقعات کے تانے بانے کے بجائے تاثرات کے بیان سے ابھارتے ہیں۔ زبان ان کی بھی روزمرّہ ہے، لیکن نام نہاد اشرافیہ کی۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں انشائیہ کا رنگ غالب ہے۔ انشائیے کی زبان سیدھے بیان کے اسلوب سے مختلف ہوتی ہے۔ منشی پریم چند کی کہانی کفن ان تمام المیوں سے بڑا المیہ ہے، جو راشد الخیری انشائیہ کے انداز میں لکھتے ہیں۔ لیکن المیہ کا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ "مظلوم کی فریاد" کا یہ ٹکڑا:

> "افسوس ہوتا ہے ان شوہروں کی حالت دیکھ کر، جو بیوی کے معنی ہی خدمت گزار کے سمجھتے ہیں۔ مانا کہ بعض جگہ بیویوں کی قدر وہ ہو رہی ہے، جو ہونی چاہیئے، مگر اُن سے بہت زیادہ جگہ وہ مٹی پلید ہو رہی ہے، جو نہ ہونی چاہیئے۔ میاں، ساس، نند، نند کے بچے، دیور، جیٹھ، ان کی اولاد، غرض ان سب کو رضا مند رکھنا اس کا فرض۔ کوسنے، فضیحتان، طعن و تشنیع اُس کا انعام، طلاق کا ڈراوا، دوسرے نکاح کی دھمکی اس کی خدمتوں کا صلہ۔ پاپڑ بیلیں، ایک ایک کا آگا تاگا۔ ایک ایک کی للو پتو، غرض زندگی کیا ہوئی وبال ہو گئی۔ پکاؤ، ریندھو، سیو، پرو و، جھاڑو بہارو، لیپو پوتو، مگر پھر بھی کسی کو بھا نو ہی نہیں۔ آنے جانے والے پھوہڑ بتائیں۔ ملنے جلنے والے کیڑے ڈالیں۔ زبان دراز وہ، کام چور وہ، غرض کوئی ایسا عیب نہیں، جو اعمال نامے میں موجود نہیں ہو، ناقص العقل اس کا خطاب، بے وقوف اس کا لقب۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی اس سے بہتر ہے، جس کو موت کی کبھی تمنا نہیں ہوتی۔ یہ بحث کہ جو بیویاں اپنے فرائض ادا نہیں کرتیں، کس سلوک کی مستحق ہیں؟ یا بیویوں پر شوہروں کے کیا حقوق ہیں؟ — آیندہ سہی۔ اس وقت تو افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے، بیویوں کے مقابلے میں انسانیت ہی کھو بیٹھے ہیں..."

اس میں شک نہیں کہ راشدالخیری عام بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔ اور نثر کا یہی اسلوب ہے جو ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ ترسیلی بھی ہے۔ سادہ نثر لکھنا سب سے زیادہ آسان ہے، لیکن اردو میں سادہ نثر لکھنے کی ہمت اہل قلم کو اس ڈر سے نہیں ہوئی کہ اُن کی تحریر کو عامیانہ اور سوقیانہ نہ سمجھا جائے۔ اسی وجہ سے میرامّن کی باغ و بہار آجانے کے بعد بھی، بلکہ اس کی ضد میں رجب علی بیگ سرور نے (قصہ) فسانۂ عجائب لکھا چھاپہ خانے کی وجہ سے، اور اخباروں کی وجہ سے بول چال کی زبان کو ادبی وقار مل چکا تھا۔ سرسید احمد خاں نے جب آثارالصنادید لکھی تھی، تو وہ مسجع اور مقفیٰ عبارت میں تھی۔ زبان کی اور مرصع کاری کے لیئے انھوں نے شیخ امام بخش صہبائی کی مدد بھی لی۔ لیکن بعد میں سرسید ہی ترسیلی نثر کے سب سے بڑے علمبردار ہوئے۔ اردو نثر کے دو روپ، اگر دیکھا جائے تو انیسویں صدی کے شروع ہی سے اردو کا رجحان ترسیلی روپ کی طرف ہو چلا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کے علاوہ انشا کی رانی کیتکی کی کہانی ہے۔ نظم میں ترسیلی زبان کی مثال نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہے۔ ترسیلی روپ میں بول چال کی مٹھاس ہے۔ ادبی روپ کی مثال غالب کے خطوط ہیں۔ ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اخباروں نے ترسیلی روپ کو فروغ دیا۔ لیکن بعد میں اخباروں پر بھی ادبی روپ کا غلبہ ہونے لگا۔ ابوالکلام آزاد کے اخباروں الہلال اور البلاغ میں یہ روپ ملتا ہے، اور اس نے دوسرے اخباروں پر اس طرح اثر ڈالا کہ ان میں ادبی نثر مختلف کالموں میں آگئی، اور ادبی صحافت کا روپ نکھرا۔ ظفر علی خاں کے اخباروں میں بھی ادبی صحافت ہے۔ یہ دراصل ترسیلی نثر ادبی چاشنی کے ساتھ ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا پریم چند کی نثر دوسرے طرز کی ہے۔ انھوں نے ترسیلی زبان کو ہی ادبی زبان بنا دیا، اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ سرسید نے ترسیلی نثر اپنے خیالات کے پرچار کے لیئے مضامین میں استعمال کی تھی۔ پریم چند نے اسے تخلیقی ادب کی اعلیٰ ترین سطح تک پہنچا دیا۔

عبدالحلیم شرر ناول نگار تھے، لیکن وہ صحافی بھی تھے۔ ''معرکۂ چکبست و شرر'' سے ہٹ کر بھی انھوں نے اخباروں کے لیئے، خاص طور سے '' دلگداز'' کے لیئے زندگی کی مختلف حقیقتوں سے متعلق مضامین لکھے۔ ان مضامین میں بول چال کی،

صحافت کی ترسیلی زبان نہیں، بلکہ ترسیلی زبان بہت زیادہ ادبی چاشنی کے ساتھ ہے، اور اس کا اثر زبان کے اسلوب پر نمایاں ہے۔ "گزشتہ لکھنؤ" کے پہلے دو پیراگراف:

"اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق، اور اسی مرثیۂ پاستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتزاعِ سلطنت ان ہی کے عہد میں ہوا۔ اس لئے تمام اہل الرائے کے ہدفِ سہام اور نسائے ملامت وہی بن گئے، اور قریب قریب تسلیم کرلیا گیا کہ زوالِ سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اُن دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں، اور بڑی بھلی، سب طرح کی قدیم حکومتیں، دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا، اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُلٹا، جو بہادر، اور زبردست، اور ہوشیار مانے جاتے تھے؟ دہلی میں مغل شہنشاہی کا، اور بنگالہ میں نوابِ ناظمِ بنگالہ کا استحصال کیوں ہوا؟ حالانکہ اُن ہی میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اریکہ آرائے سلطنت میں بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا، حالانکہ ان کی تباہی، لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ اِس عہد میں اِدھر اہلِ ہند کی غفلت اور جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہنچ گیا تھا، اور اُدھر دولتِ برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی، قابلیت، جفاکشی، اپنی کوششوں اور اپنی اعلا تہذیب و شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانایانِ فرنگ کی ذہانت و طباعی، خوش تدبیری و باضابطگی، ہندوستان کی جہالت و خود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا، اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں

میرا ساتھ نہ دے گا، مٹ جائے گا۔ زمانے کے اس ڈھنڈورے
کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی، اور سب مٹ گئے۔ ان ہی
مٹنے والوں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی، جس کے زوال کا بار غریب
واجد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔"

عبدالحلیم شرر کی یہ نثر کسی طرح بھی ترسیلی نثر نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے مقابلے میں راشد الخیری کی نثر فوری طور پر، لفظ بہ لفظ سمجھی جاتی ہے۔ پریم چند کی نثر شاید اس لیئے ذوالفقار بخاری کو اچھی نہیں لگی کہ اس میں نوابوں، اعلیٰ طبقوں کی بات نہیں، درمیانہ طبقہ کی بھی بات نہیں۔ وہ اکثر ان لوگوں کی بات کرتے ہیں، جو سماج میں بالکل گرے پڑے لوگ ہیں۔ پریم چند کے یہاں اعلیٰ یا درمیانہ طبقے کے بھی کردار آتے ہیں، لیکن اسی تناسب سے جس تناسب سے وہ سماج میں ہیں، اور ان میں بھی گلیمر نہیں!

جب فیلڈن نے ریڈیو کا کاروبار شوق سے سنبھالا تھا، تو ولنگڈن وائسرائے تھے۔ ۳۶ء کی گرمیوں میں لِن لتھ گوان کی جگہ آئے۔ ذوالفقار کو یہ کام تفویض ہوا کہ بمبئی جائیں اور وہاں سے نئے وائسرائے کے ساتھ خاص ٹرین میں آئیں، اور سفر کے دوران ہی میں وائسرائے کی تقریر کا ترجمہ ہندوستانی میں کریں، جو دلی پہنچ کر وائسرائے کے بہ نفسِ نفیس خطاب فرمانے کے بعد پڑھا جائے گا، اور اخباروں میں چھپے گا۔ ذوالفقار نے یہ ترجمہ بازاری زبان میں نہیں، درباری زبان میں کیا تھا۔ ترجمہ باقی نہیں ہے، لیکن اس کی کیفیت لوتھرا کے بیان سے واضح ہے [1]

It is interesting to find from the issue of May 7, 1936 of the radio programme journal 'The Listener' that the broadcast from Delhi of The Urdu translation of Lord Linlithgow's speech on his arrival in India (as the new Viceroy) was made under conditions

---

[1] Indian Broadcasting: H: R. Luthra PP 256-7.

of some difficulty. His E xcellency was particularly insistent that no copies of the speech should be released until after it had been broadcast. The Controller of Broadcasting was asked to send a translator from Delhi to Bombay, where he would travel back in the Viceregal train, translating his speech on route. He had to make two copies, one for the broadcast, and one for the Press. The translation, about 3,000 words, was required to be 'scholarly'...

"Some listeners rang up to congratulate us the distinction and dignity of the language, but one press reporter said that whoever was responsible for the vernacular rendering of it must have had some strange notions of hs job.....he did not want the average listener to follow His Lordship's speech." According to the programme journal, this criticism raised the most interesting point____should the language of a broadcast be scholarly or colloquial?

وائسرائے کی تقریر کے ترجمے کے سلسلے میں ذوالفقار نے سرگزشت میں نہایت دلچسپ کہانی بیان کی ہے ، مکالموں سمیت۔ ترجمے کے سلسلے میں صرف اسقدر ہے:[1]

" لن لتھگو مع بہیر و بنگاہ اسپیشل ٹرین میں بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ اس خاکسار کو بھی اس ٹرین کے ایک کونے کھدرے میں جگہ مل گئی۔ تقریر چھوٹی بھی تھی اور پھسپھسی بھی۔ لہذا ترجمہ کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔"

---

[1] ذوالفقار علی بخاری ؛ سرگزشت ؛ ص ۴۷۔

بنیادی سوال یہ نہیں ہے کہ انھیں ترجمہ کرنے میں کوئی تکلیف ہوئی یا نہیں بنیادی سوال وہ ہے، جو اس زمانے میں، اخبار میں اُٹھایا گیا، یعنی عام سننے والے یا اوسط سننے والے کے پلّے کچھ پڑا کہ نہیں!

بازاری زبان اور درباری زبان کی یہ کشمکش چلتی رہی، اور براڈکاسٹر سامعین کی پرواہ کیئے بغیر اپنی زبان لکھتے رہے، اور براڈکاسٹ کرتے رہے۔ براڈکاسٹر کون تھے؟ یہ اپنی مرضی سے نہیں آتے تھے، بلکہ ان کو خاص طور سے براڈکاسٹ کے لیئے کنٹریکٹ اور دعوت نامہ بھیجا جاتا تھا۔ ادبی پروگراموں کے لیئے تو ایک مجبوری تھی۔ ہر ادیب اپنے اسلوب کی وجہ سے بلایا جاتا تھا، کوئی ادیب براڈکاسٹ کے لیئے اپنا اسلوب چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ لیکن خبروں میں، اور دوسرے خاص سامعین کے پروگراموں میں، جنھیں اس زمانے میں — Minority Programmes کہتے تھے اور آج Specific Audience Programmes کہتے ہیں ادبی زبان لادنے کی کوئی وجہ یا ضرورت نہ تھی۔ بچوں کے پروگرام، خواتین کے پروگرام، دیہاتی بھائیوں کے پروگرام کی زبان اسی وقت مختلف ہو سکتی ہے، جب ان پروگراموں کے لیئے براڈکاسٹر بھی عام طور سے مخصوص سامعین کے طبقے ہی سے چنے جائیں۔ یا پھر پروگرام پیش کرنے والے کمپیئر (Comperes) خاص طور پر تربیت یافتہ ہوں، یا خاص صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ جیسے موہنی حمید، جو لاہور میں ڈرامہ آرٹسٹ تھیں اور بچوں کو کہانی سنانے کے فن میں ایسی ماہر تھیں کہ بچے تو بچے، بڑے بھی پچیس برس ادھر تک شمالی ہند میں ہر شام کو ریڈیو پاکستان صرف موہنی حمید سے کہانی سننے کے لیئے لگاتے تھے! ان پروگراموں میں ماہرین کو لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے، جو لازمی طور سے اپنے فن میں تو ماہر ہوتے ہیں لیکن ان کا اچھا براڈکاسٹر ہونا ضروری نہیں۔ کمپیئر انھیں لقمہ دے کر، ان کے نکتے سامعین تک پہنچانے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے مستقل کردار پروگراموں کے لیئے تراشے گئے۔ یہ نہایت تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہر زبان میں اسٹاک کیرکٹر مشہور ہوئے۔ لیکن اردو میں سعیدہ بانو (آپا جان)، شوکت تھانوی (بدھو) — لکھنؤ میں، اور ذوالفقار علی بخاری (بھئی خاں)

بمبئی میں، صرف تین کردار، اسٹاک کیرکٹرز کی حیثیت سے ابھرے اسی کی وجہ شاید اس کے سوا کچھ نہیں کہ براڈ کاسٹنگ میں بھی، روزمرّہ پر ادبی محاورے اور ادبی اسلوب کو ترجیح ہی نہیں دی گئی، اس کو حاوی کیا گیا۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ریڈیو پروگراموں کے تین اہم مقصد ہیں تفریحِ طبع، اطلاعات اور تعلیم۔ تفریحی پروگراموں میں ریڈیو نے واقعی قابلِ قدر کام کیا۔ فیچر اور میگزین پروگراموں کے اسالیب کا ارتقار ہوا۔ ریڈیو ڈرامہ صنف کی حیثیت سے ادب کا حصّہ بنا۔ جھلکی کا فارمیٹ بھی یہی ہے۔ فکاہیہ بات چیت بھی ریڈیو کی دین ہے، ورنہ "اسے" کے نام پر سجّاد حیدر یلدرم کے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"[1] یا چند اور مضامین کے علاوہ ہمارے ذخیرے میں زیادہ کچھ نہیں تھا۔ یلدرم کا یہ انشائیہ اگست ۱۹۰۰ء کے "معارف" میں چھپا تھا، اس لئے فکاہیہ ریڈیو بات چیت اسلوب کی روپ ریکھا ہیں یلدرم تک پہنچتی ہے، اور یلدرم پر "اودھ پنچ" کے اثرات ہیں۔

اس استدلال میں کچھ جان تو ہے کہ دیہی علاقوں کے سامعین اپنے پروگرام میں صرف کھیتی باڑی ہی کے بارے میں سننا نہیں چاہتے۔ اور خواتین کو صرف کھانا پکانے، گھروں کی صفائی، بچوں کی پرورش ہی کے موضوع سے دلچسپی نہیں۔ وہ کچھ اور بھی سننا چاہتی ہیں۔ لیکن کیا ان پر ادب کی بوچھار کرنا ضروری ہے؟ کیا یہ ضروری تھا کہ بمبئی کی خواتین کو راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر کے ناول کے اقتباسات سنا کر، دلّی اور لکھنؤ کی زبان کی تربیت دی جاتی؟ پروگراموں کا شیڈول کیسے بنایا جائے اس بات کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن زبان یقیناً ہے زبان ایک حصّہ علاقہ کے لیے خاص ہوتا ہے۔ اس میں لفظوں کا استعمال اور تلفّظ، دونوں شامل ہیں۔ معیاری زبان کی اپنی اہمیت ہے، لیکن براڈ کاسٹنگ کو ترسیل، اور ابلاغِ عامہ کی زبان چاہیئے۔ اس لیئے بمبئی کے لیئے دلّی اور لکھنؤ کی شستہ اردو، جو کچھ کتابوں میں ہے — اور خود ان شہروں میں رائج نہیں، زیادہ موزوں نہیں۔ ریڈیو کا مقصد یہ یقیناً ہے کہ ایک علاقے کے سامعین کو دوسرے علاقوں کی زندگی، رہن سہن، حالات، تہذیبی روایات سے روشناس کرائے، لیکن اس کے لئے مخصوص سامعین کے پروگرام مشکل سے ہی مناسب سمجھے جا سکتے

---

[1] سجاد حیدر یلدرم: مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ: انتخابِ نثر حصّہ دوم: ص ۱۲ (اردو اکادمی، لکھنؤ)

ہیں۔ یہ بات یقیناً ذہن سے اوجھل نہیں کی جا سکتی کہ "مخصوص سامعین" اپنے پروگرام کے مخاطب ہونے کے ساتھ جنرل پروگرام بھی تو سنتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے سارے پروگرام جنرل چنک میں ہونا چاہیں۔ یہ براڈ کاسٹنگ کا اصول ہے، اور اس اصول کی خلاف ورزی ان دنوں میں کی گئی، جب دلی سے زیادہ پروگرام ہندستانی میں ہوتے تھے۔ ہندوستانی پروگراموں میں، ادبی اردو کی بالا دستی رہی، اور اس نے جو ردِ عمل پیدا کیا، وہ بہت خوشگوار نہیں تھا۔

اس میں شک نہیں کہ خواجہ حسن نظامی ایک منجھے ہوئے، صاحب طرز صحافی اور ادیب تھے۔ ان کی جیسی نثر لکھنے والے، اُن کی ہم عصروں میں کم تھے۔ سی پارۂ دل اول[1] کے مضامین، دو حصّوں میں ہیں۔ دوسری جلد کا نام "کانا باتی"[2] ہے، جس میں خواجہ صاحب کی اکیس ریڈیو نشریات شامل ہیں، تفصیل سے ذکر متعلقہ باب کے تحت آئے گا۔ یہاں ان کی دو تقریریں پیش کی جا رہی ہیں، جو دلّی سے دیہاتی پروگرام میں نشر ہوئیں۔

دلّی ریڈیو کے دیہاتی پروگرام مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۹ء کیلئے خواجہ حسن نظامی کی تقریر

کُوکٹ ہَری

یہ چھوٹا سا گاؤں مقبرہ ہمایوں کے جنوب میں جمنا دریا کے کنارہ واقع ہے۔ پہلے اس نام کا ایک ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ جی آئی پی ریلوے آگرہ جانے کے لیے دلّی سے روانہ ہوتی تھی تو پہلے حضرت نظام الدین اسٹیشن آتا تھا اور پھر کیلو کھری۔ مگر اب یہ اسٹیشن ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے جمنا دریا کیلو کھری کے نیچے بہتا تھا۔ اب ذرہ پرے ہٹ گیا ہے۔ کیلو کھری سے آگے خضر آباد گاؤں واقع ہے۔ یہ کیلو کھری کی بربادی کے بعد سلطان علاء الدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خاں نے آباد کیا تھا۔

---

[1] اور [2]: خواجہ حسن نظامی، سی پارۂ دل حصّہ اوّل اور حصّہ دوم (دفتر ہفتہ وار منادی)

ہندوستان میں اسلامی سلطنت سلطان شہاب الدین محمد غوری کے ایک غلام سلطان قطب الدین ایبک نے قائم کی تھی۔ جو ترک نسل کا غلام تھا۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش ہندوستان کا بادشاہ ہوا وہ بھی ترک نسل کا غلام تھا۔ التمش کے بعد اس کی بیٹی سلطانہ رضیہ نے پانچ برس تک بادشاہی کی۔ پھر سلطان غیاث الدین بلبن بادشاہ ہوا۔ یہ بھی ترک نسل کا غلام تھا۔ غیاث الدین بلبن کا ولی عہد ملتان کے قریب مغلوں کی لڑائی میں شہید ہوگیا تو بلبن نے اپنے پوتے کیقباد کو ولی عہد بنا دیا۔ کیونکہ کیقباد کا باپ بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا۔ جب سلطان بلبن کا انتقال ہوا تو کیقباد تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے کیلوکھری کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ کیقباد سے پہلے سب سلطان بادشاہوں کی تخت گاہ مہرولی میں یعنی قطب مینار کے پاس تھی۔ کیلوکھری کا نام کیقباد نے تین الفاظ سے بنایا تھا۔ ایک اپنے نام کا پہلا لفظ کے دوسرا لفظ لوک جو سنسکرت لفظ ہے اور تیسرا ھری۔ یہ بھی سنسکرت لفظ ہے۔ لوک کے معنی دُنیا کے ہیں۔ اسی واسطے مرنے کے بعد کی دنیا کو ہندی زبان میں پرلوک کہتے ہیں۔ اور ھری کے معنی ہیں خدا والی کیونکہ ہری نام خدا کا ہے۔ ہندو قوم کے بڑے بھی پہلے افغانستان کے مشہور مقام ھری میں رہتے تھے۔ اور وہاں سے ہندوستان میں آئے تھے۔ اب اس ھری مقام کو ھرات کہتے ہیں۔ جو افغانستان کے مشہور شہر قندھار سے تین منزل دور ہے۔

کیقباد کے باپ دادا بھی چونکہ وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے تھے اور ہرات میں بھی رہے تھے۔ اس واسطے کیقباد نے ہری نام بھی اپنے پایہ تخت میں شامل کیا تھا۔ پس کیلوکھری کا نام اس طرح ہوا کے لُوک ہَری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد کی تخت نشینی لال کوٹ قلعہ دہلی میں ہوئی تھی۔ جہاں قطب مینار واقع ہے۔ لیکن تخت نشینی کے بعد کیقباد نے نئی دلی جمنا کے کنارہ بسائی اور اس کا نام کے لوک ہری رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی طرح کیقباد کی ماں بھی ہندو تھی اور اسی وجہ سے کیقباد کو سنسکرت زبان کے الفاظ اور جمنا دریا سے رغبت تھی۔ اور اس نے جمنا کے کنارے بہت عالیشان محل بنوائے تھے مگر ان محلوں کا نام سلطان محمد تغلق کی طرح سُرگ دوار ہندی نام نہیں رکھا تھا بلکہ قصر کیقباد نام رکھا تھا۔ کیقباد کو بہت چھوٹی عمر میں بادشاہت مل گئی تھی اور اس کے مصاحب بہت

بڑے تھے اور اس کا وزیر بھی شریر آدمی تھا۔ کیقباد رات دن شراب خواری اور عیاشی میں مُبتلا رہتا تھا۔ اور وزیر نے جان بوجھ کر اس کو ان بری عادتوں میں ڈالا تھا۔ تاکہ سارے ملک کی بادشاہت وزیر کے ہاتھ میں آجائے اور بادشاہ عیش و عشرت میں سلطنت سے غافل رہے۔ جب یہ خبر کیقباد کے باپ بغرا خاں کو بنگال میں پہنچی تو اس نے اپنے بیٹے کیقباد کو خط لکھا کہ تو اپنے وزیر سے ہوشیار رہ۔ وہ خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ بغرا خاں کا خط وزیر کے ہاتھ لگا اس نے بادشاہ کو نہ دیا۔ اور بادشاہ سے آکر کہا کہ آپ کے باپ بغرا خاں آپ سے بغاوت کرنی چاہتے ہیں اس واسطے مصلحت یہ ہے کہ آپ ان کے نام فرمان بھیجئے کہ انہوں نے اب تک آپ کی اطاعت کا خط کیوں نہیں بھیجا۔ کیقباد نے جواب دیا میں اپنے باپ کو ایسا خط نہیں لکھوں گا۔ تخت کے حقدار تو وہی تھے۔ لیکن چونکہ وہ دلّی سے بہت دور تھے۔ اس واسطے دادا نے مجھے بادشاہ بنا دیا۔ یہ سنکر وزیر نے کہا بادشاہی میں باپ بیٹے کا خیال نہیں ہوا کرتا۔ آپ ایسی نرم دلی ظاہر کریں گے تو سب گورنر باغی ہو جائیں گے۔ آخر مجبور ہو کر کیقباد نے باپ کے نام وزیر کے کہنے کے موافق خط بھیجدیا باپ نے جواب دیا میں تیری اطاعت کرنے اور تیرے تخت کے آگے جھکنے کے لئے راضی ہوں اور میں بہت جلدی دہلی میں آکر یہ رسم ادا کروں گا۔ اس کے بعد بغرا خاں بہت بڑی فوج کے ساتھ دلّی کی طرف چلا وزیر نے کیقباد سے کہا آپ کے باپ کا ارادہ بُرا معلوم ہوتا ہے آپ بھی فوج لے کر دلی سے بڑھیئے ورنہ وہ دلی پر آگیا تو آپ کو قتل کر کے خود بادشاہ بن جائے گا چنانچہ کیقباد بھی بہت بڑا لشکر لے کر باپ سے لڑنے کو چلا۔ اور کئی منزل دور پہنچا تھا کہ بغرا خاں کا لشکر سامنے آگیا۔ دونوں فوجیں صف بندی کر کے ٹھہر گئیں۔ اور لڑائی کا سامان کرنے لگیں۔ حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء رحؒ کے مشہور مرید حضرت امیر خسروؒ کیقباد کے خاص مصاحب تھے اور حضرت امیر خسروؒ کی ماں اور کیقباد کی ماں آپس میں رشتہ دار بھی تھیں۔ اس واسطے کیقباد امیر خسروؒ کا بہت کہنا مانتا تھا۔ امیر خسروؒ نے کیقباد سے کہا کہ باپ سے لڑنا بہت بُری بات ہے۔ یہ وزیر اپنے مطلب کے لیئے آپ کو باپ سے لڑانا چاہتا ہے اس واسطے آپ لڑائی سے پہلے مجھے اپنے باپ کے پاس بھیجئے۔ تاکہ میں صلح کی

بات چیت کر دں۔ کیقباد نے خفیہ امیر خسروؒ کو بغرا خاں کے پاس بھیجدیا۔ امیر خسروؒ پہلے بغرا خاں کی بیوی یعنی کیقباد کی ماں کے پاس گئے۔ اور اس کو سارے حالات سنائے۔ بغرا خاں کی بیوی نے بغرا خاں کو سمجھایا اور بغرا خاں نے امیر خسروؒ سے وعدہ کرلیا کہ میں لڑائی ملتوی کرتا ہوں۔ اور کل اپنے بیٹے کی اطاعت کے لئے دربار میں آؤں گا۔ چنانچہ امیر خسروؒ کیقباد کے پاس واپس آئے اور سب حالات بیان کیئے کیقباد نے وزیر کو حکم دے کر دربار آراستہ کرایا۔ اور خود تخت پر بیٹھا اور سب امرا بھی ہاتھ باندھ کر تخت کے سامنے کھڑے ہوئے اور وزیر بھی دست بستہ سامنے کھڑا ہوا۔ بغرا خاں غلاموں کی طرح کمر باندھے اور ہاتھ جوڑے ہوئے دربار میں داخل ہوا اور جونہی بیٹے کو تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا فوراً جھکا اور زمین پر سر رکھ کر تعظیم ادا کی۔ اس کے بعد آگے بڑھا تو دربار کے چوبداروں نے آوازدی۔ دوسری دفعہ تعظیم دو۔ بغرا خاں پھر جھکا اور زمین پر سر رکھا۔ جب تخت کے قریب پہنچا تو نقیبوں نے پھر پکار کر کہا تیسری تعظیم ادا کرو۔ بغرا خاں پھر جھکا اور چاہتا تھا کہ زمین پر سر رکھے کہ کیقباد تخت سے کودا اور اپنے باپ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور رونے لگا۔ اور کہا مجھ سے زیادہ نالائق دُنیا میں کوئی بیٹا نہ ہوگا۔ آپ تخت پر بیٹھیئے میں آپ کی تابعداری میں نیچے کھڑا ہوں گا۔ بغرا خاں رونے لگا اور اس نے کیقباد کو سینے سے لگالیا اور اس کا منہ چوما اور اس کے بعد قسم دے کر کہا کہ میں نے اپنا حق تجھ کو دیا۔ تو میرے سامنے تخت پر بیٹھ۔ اور مجھے بنگال کی گورنری مرحمت کر۔ میں اس جگہ سے واپس چلا جاؤں گا۔ آخر باپ کے اصرار کرنے پر کیقباد تخت پر بیٹھا اور اپنے باپ کے واسطے بھی کرسی منگائی اور اس کو بھی بٹھایا۔ دربار کے بعد بغرا خاں اپنے بیٹے کو زنانہ میں لے گیا کیقباد کی ماں نے بیٹے کو پیار کیا اور پاس بٹھایا۔ اس کے بعد بغرا خاں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ وزیر کو الگ کر دیا جائے اور عیاشی سکھانے والے سب مصاحب بھی جدا کر دیئے جائیں۔

مگر جب بغرا خاں بنگال کو واپس چلا گیا۔ تو کیقباد نے اسی جگہ وزیر کو علیحدہ کر کے نیا وزیر مقرر کر دیا اور دوسرا حکم دیا کہ اس علاقہ میں جتنی

خوبصورت عورتیں اور خوبصورت لڑکے ناچنے گانے والے ہوں ان کو بلایا جائے چنانچہ وہ سب جمع ہوئے اور کیقباد دیں رات دن شراب خواری اور عیاشی میں مصروف ہوگیا امیر خسروؒ نے باپ کی نصیحت یاد دلائی تو کیقباد نے جواب دیا میرے باپ بوڑھے ہوگئے ہیں اور جوانی ان سے رخصت ہو چکی ہے۔ میں اپنی جوانی کو بیکار کھونا نہیں چاہتا۔ بس میں نے ان کے کہنے سے وزیر کو تو علیحدہ کردیا مگر ان دل رباؤں کو علیحدہ نہیں کرسکتا اس کے بعد دلی میں واپس آیا۔ اور کیلو کھری کے محلوں میں رات دن عیش عشرت کرنے لگا۔ اور سارا خزانہ نئے وزیر کے ہاتھ میں دیدیا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے آخر سامانہ ریاست پٹیالہ کے ایک فوجی افسر جلال الدین خلجی نے بغاوت کی اور وہ فوج لے کر دلی میں آیا اور شاہی فوج سے اس کی لڑائی ہوئی۔ شاہی فوج بھاگ گئی۔ اور خلجی کیلو کھری کے محلوں میں داخل ہوا اور خاص کیقباد کے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ کیقباد شراب خواری کی کثرت کے سبب فالج میں مبتلا ہے اور پلنگ پر پڑا ہے۔ خلجی نے حکم دیا اس کو دوشالہ میں لپیٹو اور پھر اس کے لکڑیاں مارو۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور لکڑیاں مار مار کر اس خوبصورت نوجوان ترک شہنشاہ کو مار ڈالا گیا۔ یہ غلام خاندان کا آخری شہنشاہ تھا۔ خلجی نے قتل کرنے کے بعد دوشالہ میں لپٹی ہوئی لاش کو جمنا دریا میں ڈال دیا۔ اور جس جگہ آخری غلام شہنشاہ کی لاش ڈبوئی گئی تھی اسی جگہ آجکل جہالت اور بے علمی کی غلامی کو ڈبونے کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ ملیہ کی عمارتیں بنوائیں کیلو کھری کے اس مضمون کے بعض حصے ریڈیو والوں کی مصلحت کے سبب نشر نہیں ہوئے تھے اس لئے یہ اعلان ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ سننے والوں کو یہ مضمون پڑھتے وقت شبہ نہ ہو۔

ریڈیو والوں نے جن الفاظ کا نشر نامناسب خیال کیا وہ ہمارے خیال میں نامناسب نہیں ہے۔ ایڈیٹر

یہ تقریر ہفتہ وار ''منادی'' کے صفحات سے لی گئی ہے۔
خواجہ حسن نظامی کی زبان، اپنی سادگی میں جادو کا اثر رکھتی ہے۔
لیکن کیا اس زمانے میں، آج سے چالیس برس پہلے، دلی کے اطراف میں

جو گاؤں تھے۔ یہ زبان وہاں کا روزمرہ تھا؟ آج ان میں سے بہت سے گاؤں دلّی شہر نے جذب کر لیئے ہیں۔ دلّی کے یہ براڈکاسٹ میو، میواتیوں کے لئے بھی تھے۔ ہریانہ کے جاٹوں کے لئے بھی، فریدہ آباد میں رہنے والوں کے لئے بھی باغپت اور مظفر نگر کے کسانوں کے لئے بھی۔ کیا موضوع اور زبان کے اعتبار سے کے لوک ہری اور چراغ دہلی جیسی معلوماتی اور تاریخی تقریریں اپنے مخصوص سامعین کی زبان میں تھیں، یا ان کے لیئے کوئی افادی پہلو رکھتی تھیں؟

دلّی ریڈیو کے دیہاتی پروگرام کے لئے خواجہ حسن نظامی کی تقریر

چراغ دہلی

جو ۱۱ راگست ۱۹۲۹ء کی شام کو دھلی سے نشر ہوئی

چراغ دہلی ایک چھوٹے سے قصبہ کا نام ہے۔ جو نئی دہلی سے قطب مینار جانے والی سڑک سے پورب کی طرف دو میل دور ہے اس قصبہ میں ہندو مسلمان ملے جلے رہتے ہیں۔ اور یہاں ایک مشہور درگاہ بھی ہے۔ جس کی وجہ سے اس آبادی کو چراغ دہلی کہتے ہیں۔ ان بزرگ کا نام مخدوم نصیرالدین رحمتہ اللہ علیہ تھا۔ اور لوگ ان کو ۶ سو برس سے چراغ دہلیؒ کہتے ہیں۔ یہ بزرگ اجودھیا کے رہنے والے تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور جانشین تھے۔ ان کو ۶ سو برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔

سلطان علاءالدین خلجی نے سیری کے نام سے۔ جو دلّی بسائی تھی اس میں ایک قلعہ بھی بنایا تھا۔ جس کا نام قلعہ علائی تھا۔ اس قلعہ علائی کی فصیل کے برابر سلطان فیروز شاہ تغلق نے ایک بڑی فصیل بنائی تھی اور اس کے اندر اپنے پیر حضرت چراغ دہلی کی درگاہ بھی بنوائی تھی۔ تغلق خاندان کے بعد جب لودھی خاندان کی بادشاہت ہوئی تو لودھی خاندان کا پہلا بادشاہ سلطان بہلول لودھی بھی اس درگاہ کو بہت مانتا تھا۔ اور جب وہ مرا تو اس کی قبر بھی درگاہ کے پاس بنوائی گئی۔

حضرت مخدوم نصیرالدین رحؒ کو چراغ دہلی کہنے کے دو قصے مشہور ہیں ۔
ایک تو یہ ہے کہ جب غلام خاندان کے آخری شہنشاہ سلطان کیقباد کو سامانہ پٹیالہ کے حاکم سلطان جلال الدین خلجی نے قتل کر کے خلجی خاندان کی بادشاہت قائم کر لی تو کیقباد کے سب امیر وزیر اور فوجی افسر بے روزگار ہو گئے کیونکہ خلجی نے ان کو نوکری سے الگ کر دیا۔ اور نئے آدمی بھرتی کر لیے۔ وہ بیکار لوگ بارہ ہزار تھے۔ اس زمانہ میں سیدی مولہ نام کے ایک فقیر دلی میں رہتے تھے جن کو کیمیا بنانی آتی تھی کیونکہ اُن کی آمدنی ظاہر میں کچھ نہ تھی مگر وہ ہزاروں آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلاتے تھے۔ کیقباد کے بارہ ہزار بیکار نوکر بھی سیدی مولہ کے پاس چلے گئے اور سیدی مولہ کے لنگر کا کھانا کھانے لگے کچھ دن وہ لوگ سیدی مولہ کے خانقاہ میں رہے اور لنگر کا کھانا کھاتے رہے کہ کسی دشمن نے جلال الدین خلجی سے جاکر چغلی کھائی کہ سیدی مولہ بادشاہ بننا چاہتے ہیں اور انہوں نے بارہ ہزار آدمی جمع کر لئے ہیں۔ بادشاہ نے یہ خبر سنتے ہی فوج بھیجکر سیدی مولہ اور ان بارہ ہزار آدمیوں کو پکڑوا کر اپنے سامنے بلوایا اور پوچھا کہ تم نے میری بادشاہی کے خلاف سازش کیوں کی۔ ان سب نے جواب دیا کہ آپ سے کسی نے جھوٹ کہا ہے ہم نے سازش نہیں کی۔ بادشاہ نے کہا اچھا ہم آگ جلواتے ہیں اگر تم سچے ہو تو آگ میں کود جاؤ۔ اگر تم آگ میں نہ جلے تو ہم سمجھیں گے کہ تم سچے ہو۔ نہیں تو آگ تم کو جلاکر خاک کر دے گی۔ سیدی مولہ اور ان بارہ ہزار نے یہ بات مان لی۔ مگر دربار کے مولویوں نے کہا کہ حضور آگ کا کام تو جلانا ہے سچا ہو یا جھوٹا ہو دونوں کو آگ جلادیتی ہے۔

مولویوں کی یہ بات سن کر بادشاہ نے کہا اچھا آگ نہ جلاؤ مگر یہ بتاؤ کہ جو الزام ان پر لگایا گیا ہے۔ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے دربار والوں نے کہا کہ الزام سچا ہے کیونکہ دربار کے مخبر نے اپنے کانوں سے ان کو بادشاہی کا تختہ اوندھا کرنے کی باتیں سنی تھیں۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا ان سب کو ہاتھیوں کے سامنے ڈال دو۔ یہ حکم ملتے ہی سیدی مولہ اور ان بارہ ہزار آدمیوں کو ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا اور ہاتھیوں نے ان سب کو اپنی سونڈوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا اور پیروں سے کچل ڈالا۔ مگر جوں ہی سیدی مولہ قتل ہوئے آندھی آگئی۔ اور اندھیرا چھا گیا۔

ہوا کے زور سے شاہی خیمے اکھڑ گئے گھوڑے بھاگ گئے۔ سارے شہر کے مکانوں کی چھتیں اڑ گئیں اور ہر گھر کے چراغ گل ہو گئے۔ شہر کے ہندو مسلمان عورت مرد بچے چیختے تھے اور خدا کی پناہ مانگتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزیر بھاگے بھاگے پھرتے تھے اور ان کو آندھی سے بچنے کا ٹھکانہ نہ ملتا تھا بادشاہ چیختا تھا کہ سیدی مولا مجھے مارتا ہے مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔ وہ تلوار لے کر مجھ پر حملہ کرنے آرہا ہے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس رات سارے شہر میں اندھیرا تھا کیونکہ آندھی کے زور سے امیروں اور غریبوں سب کے گھروں کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ مگر حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کے گھر میں چراغ روشن تھا اور ان کے چراغ کی لَو ایسی قائم تھی کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ آندھی چل رہی ہے۔ اس واسطے سب لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ تو چراغ دہلی ہیں۔ کہ ان کے سوا سب کے چراغ گل ہو گئے ہیں۔

دوسرا قصہ یہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں سلطان غیاث الدین تغلق اپنا قلعہ تغلق آباد میں بنوا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ وہ باولی بنوا رہے تھے جو ان کی درگاہ کے پاس ہے چونکہ ساری دلی کے راج مزدور بادشاہ کے قلعہ میں کام کرتے تھے اس واسطے حضرت کی باؤلی بنانے کے لئے رات کو آتے تھے۔ تغلق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا دشمن تھا اس نے حکم دیا کہ دن کو میرا قلعہ بنانے والے رات کو بھی کام کریں گے تو میرا کام خراب ہو جائیگا اس واسطے نظام الدین اولیاءؒ کو شہر میں کوئی شخص تیل نہ دے۔ نہ تیل ہوگا نہ رات کو باؤلی بن سکے گی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس حکم کی خبر سنی تو اپنے مرید حضرت مخدوم نصیر الدینؒ سے پوچھا کہ باؤلی میں پانی نکلا ہے یا نہیں۔ حضرت مخدوم صاحبؒ نے جواب دیا ہاں پانی نکلا ہے۔ حضرت نے فرمایا اچھا وہ پانی کو نڈوں میں بھروا دو اور موٹی موٹی بتیاں ڈال کر روشن کر دو۔ وہ پانی تیل کا کام دے گا۔ چنانچہ حضرت مخدوم صاحبؒ نے باؤلی کا پانی کونڈوں میں بھر کر جلایا تو پانی تیل کی طرح جلنے لگا۔ جب سے حضرت مخدوم صاحب کو چراغ دہلی کہنے لگے۔

چراغ دہلی کی آبادی دلّی سے ۳ میل دور ہے اور قطب مینار سے بھی تین چار میل دور ہے اور کالکاجی کے مندر سے دو میل دور ہے۔ پہلے یہاں سڑک نہ تھی۔ مگر اب مسٹر جنکس چیف کمشنر دہلی نے قطب مینار کی سڑک سے ایک نئی پکی سڑک بنوادی ہے جس سے چراغ دہلی کی زیارت کرنے والوں کو بہت آرام ہو گیا ہے۔ اس سڑک کے دونوں کناروں پر بہت مشہور تاریخی عمارتیں اور مسجدیں اور شاہی قلعہ کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جن کی انگریزی سرکار نے مرمت کرادی ہے اور وہاں چوکیدار نوکر رکھ دیئے ہیں اور دور دور کے سیاح چراغ دہلی کی درگاہ اور بہلول لودھی کا مقبرہ اور پرانی مسجدیں دیکھنے جاتے ہیں۔

چراغ دہلی کی فصیل کے پاس قلعہ علائی کی ٹوٹی ہوئی فصیل پڑی ہے۔ اس فصیل کے نیچے ہندوستان کے بہت مشہور قاضی کا مزار ہے۔ جن کا نام مولانا سید محی الدین کاشانی رحؒ تھا۔ اور جو سلطان کیقباد کے زمانہ میں تمام ہندوستان کے قاضیوں کے افسر تھے۔ اور سید مولہ کی گرفتاری کے وقت ان کو بھی پکڑا گیا تھا۔ مگر یہ بے قصور ثابت ہوئے اور ان کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحؒ کے مرید اور قربت دار تھے۔ اور ان کی اولاد اب تک درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحؒ میں موجود ہے چراغ دہلی اور اس کے اس پاس جتنے گاؤں ہیں ان سب کے رہنے والوں میں تعلیم کا شوق ہے۔ اور ہر جگہ سرکار نے اسکول بنوا دیئے ہیں۔ اور ان دیہات کے بہت سے باشندوں نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سرکار میں بڑی بڑی نوکریاں حاصل کرلی ہیں۔ اور فوجوں میں بھی نوکر ہیں۔

چراغ دہلی کے پاس ایک گاؤں شیخ سرائے ہے۔ یہاں مشہور بزرگ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحؒ کی اولاد میں سے ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اور یہاں کے رہنے والے پنیر بھی بہت عمدہ بناتے ہیں۔ جو دہلی شہر میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ حضرت نصیرالدین چراغ رحؒ دہلی سے چشتیہ نظامیہ خاندان جاری ہوا جس کے لاکھوں ماننے والے مرید تمام ہندوستان میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کا سالانہ عرس

رمضان کی ۲۷ تاریخ کو ہوتا ہے۔ جس میں دہلی اور اطراف کے بہت لوگ جمع ہوتے ہیں۔

ہندی اور اردو، دو ادبی روپ تھے، لیکن بولی کے دو واضح روپ نہیں تھے۔ لیکن جب غیر ادبی پروگراموں میں بھی ادبی اسلوبِ نگارش حاوی ہوا، تو لکھی جانے والی زبان مائکروفون پر بولی جانے لگی۔ پروگراموں میں بھی، اور خبروں میں بھی۔ اور یہ صورت خاصی پریشان کن تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں اسٹیشن ڈائرکٹروں کی جو کانفرنس ہوئی، اس کے بارے میں ہنس راج لوتھرا نے لکھا ہے کہ:[1]

۱۔ آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی یہ ہے کہ ہر اسٹیشن سے جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں وہ اپنے علاقے کی لسانی حقیقت کے آئینہ دار ہوں۔ ڈرامہ نگار اور صداکار، دونوں اسٹیشن کے علاقے کے ہوں، اور یہ کہ عملے کی ناواقفیت کی وجہ سے پروگراموں کو نقصان نہ ہو۔

۲۔ تقریروں اور اسپوکن ورڈ کے دوسرے پروگراموں کے بارے میں بھی یہی رہنمایانہ اصول ہوگا۔

۳۔ خبروں کے سلسلے میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ جن علاقوں میں ہندوستانی خبریں ریلے کی جاتی ہیں، وہاں وہ زیادہ سے زیادہ سننے والوں کی سمجھ میں آئیں۔ ہندوستانی خبریں پشاور، لاہور، لکھنؤ، دلّی اور بمبئی کے اسٹیشنوں سے ریلے کی جاتی تھیں۔

لوتھرا نے ڈائرکٹوریٹ جنرل کے ایک نوٹ کا بھی حوالہ دیا ہے، جو ۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو سارے اسٹیشنوں کو بھیجا گیا تھا۔ اس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ ہندی اور اردو کے حلقوں میں جو شدید اختلافات ہیں، ان کو کم کرنے کے لئے ہندوستانی کو اپنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ دونوں زبانوں کے لفظوں کے ذخیرے میں جو اختلافات ہیں، وہ ناقابلِ عبور خلیج نہ بنیں، اور ہندوستانی لنگوا فرانکا بن سکے۔ چونکہ براڈکاسٹ میں رسمِ خط کا کوئی سوال نہیں، خبروں اور کچھ تقریروں اور اسپوکن ورڈ پروگراموں کو بہ یک وقت

---

[1] Indian Broadcasting: H.R. Luthra, P. 258-59

ہندی بھی کہا جا سکتا ہے، اور اردو بھی، اور انھیں ہندوستانی کہیں تو کوئی تنازعہ بھی نہیں۔

اس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان پر نکتہ چینی کرنے والوں کا مقصد نہ تو آسان زبان ہے، اور نہ مشترکہ زبان۔ بلکہ وہ تو ایسی زبان وضع کرنا چاہتے ہیں، جس میں صرف دیسی شبد ہوں، سارے بدیشی لفظوں سے پاک۔ آل انڈیا ریڈیو انتہائی صورتوں کے حق میں نہیں ہے (اسے فارسی، عربی، ہندی یا انگریزی الفاظ کے استعمال میں باک نہیں)۔ اسی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو برابر ایسے لفظوں کے متبادل استعمال کر رہا ہے، جو عادتاً مترجم لکھا کرتے تھے۔ یہ متبادل لفظ انگریزی، سنسکرت، ہندی، فارسی اور عربی کے آسان اور عام وفہم لفظ ہیں۔

اس نوٹ میں اس مانگ کی طرف بھی اشارہ ہے، جو کچھ حلقوں کی طرف سے کی گئی ہے کہ ہندوستانی بلیٹن کو دو میں بانٹ دیا جائے۔ ہندی خبریں اور اُردو خبریں۔ ڈائرکٹر جنرل نے اس بات پر بھی دھیان دلایا کہ ایسا کیا گیا تو تفرقہ پیدا کرنے اور فرقہ واریت بڑھانے والی قوتوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر ہندی سماچار اور اردو خبروں کے دو بلیٹن کر بھی دیئے گئے، تو اس سے نہ صرف وقت و وسائل ضائع ہوں گے، بلکہ آسان اور عام فہم زبان لکھنے کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ ہندی سماچار آسان ہندی میں اور اردو خبریں آسان اردو ہی میں رکھنا ہوں گی۔ چونکہ اردو اور ہندی دو ادبی اسلوب ہیں، دو مختلف زبانیں نہیں، آسان اردو اور آسان ہندی قریب قریب ایک ہی ہوں گی۔[1]

۷ راگست ۱۹۴۰ء کو چکرورتی راج گوپال اچاریہ نے مدراس میں یہ بات ایک بیان میں کہی:

"اگر آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستانی بولنے کی کوشش چھوڑ دی اور ہندی اور اردو میں دو بلیٹن نشر کرنا شروع کئے تو یہ المیہ ہوگا۔"

---

[1] ایضاً، ص ۲۵۹۔

لوتھرا لکھتے ہیں، اور بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ اشتعال دونوں حلقوں میں زوروں پر تھا، اور آل انڈیا ریڈیو سیاسی تنازعہ کا موضوع بن گیا۔[1]

لسانی مسئلہ جس طرح ریڈیو کے باہر فرقہ وارانہ شکل اختیار کر چکا تھا اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کی ہندوستانی بھی فرقہ واریت کی بھٹی کا ایندھن بنا دی گئی۔ لوتھرا کا کہنا ہے کہ ریڈیو کی ہندوستانی کا جھکاؤ اردو، فارسی کی طرف تھا، اور پریس میں اس کے خلاف مہم چل رہی تھی۔ اسٹیشنوں اور ڈائرکٹوریٹ جنرل نے لاکھ وضاحتیں کیں لیکن ان کی سنتا کون؟ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں سوالات پوچھے گئے کہ اردو اور ہندی پروگراموں کو جو وقت دیا جاتا ہے، اس کا تناسب کیا ہے، اور کس تناسب سے ان پر روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اور پھر یہ سوال بھی کیا گیا کہ ہندو فنکاروں کو کتنا روپیہ دیا گیا اور مسلم فنکاروں کو کتنا؟ پنڈت گوند مالویہ نے یہ سوال بھی پوچھا کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی خبروں کے بلیٹن فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں، اور اگر یہ درست ہے تو کیا حکومت انگریزی سے ہندوستانی بلیٹنوں کا ترجمہ دیوناگری میں کرانے کے لئے بھی تیار ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ہندوستانی بلیٹن جو انباؤنسر پڑھتے ہیں، ان کی ضرورت کے مطابق رسم خط اختیار کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی کے خلاف ناراضگی کے اظہار کے طور پر ہندی ساہتیہ سمیلن نے جے پور کے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ہندی کے لیکھک آل انڈیا ریڈیو کا بائیکاٹ کریں گے۔ ۵ مئی ۱۹۴۶ء کو یہ بائیکاٹ ختم ہوا۔[2]

عبوری حکومت کے قائم ہوتے ہی آل انڈیا ریڈیو سے اردو کو ختم کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد تو کھلم کھلا اردو کو ریڈیو نکالا دے دیا گیا۔ مملکتِ خداداد پاکستان نے اپنی سرکاری زبان اُردو قرار دی تھی، اس لئے ہندوستان میں اسے بدیسی زبان کہا گیا، اسے لسانی اقلیت کی نہیں، ایک

---

[1] ایضاً: ۲۶۰ -

[2] ایضاً: ص ۲۶۱ -

مذہبی اقلیت کی زبان کی طرح برتا گیا۔ مذہبی فرقہ پرستی ایک طرف گاندھی جی کے قتل کا سبب بنی، اور دوسری طرف اس نے لسانی عصبیت کا روپ اختیار کیا، اور اردو ہی نہیں ہندی بھی اس کا شکار ہوئی۔ بڑی شد و مد کے ساتھ ہندی سے تدبھو شبدوں کو ہٹا کر ان کی جگہ تت سم شبد رکھے جانے لگے، اور اس نے ایسی انتہائی صورت اختیار کی کہ ریڈیو کے ادبی پروگرام ہی نہیں سماچار بھی سروں پر سے گذرنے لگے۔ جواہر لال نہرو تو اس روش کے خلاف تھے ہی، خود نائب وزیر اعظم، جو کابینہ میں انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ کے بھی وزیر تھے، یعنی سردار ولبھ بھائی پٹیل، اُن کو بھی آل انڈیا ریڈیو کے ہندی سماچار اور دوسرے پروگرام سن کر، اپنے کانوں پر پتھر اور ذہن پر ہتھوڑے چلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ۱۴ر دسمبر کو انھوں نے ایک خط اپنے وزیر مملکت آر آر دیواکر کو لکھا۔ دیواکر نے اپنے ۵ر دسمبر کے خط میں اپنے محکمے کے کابینہ وزیر سے لسانی پالیسی کی وضاحت چاہی تھی۔ سردار پٹیل نے خط کے شروع ہی میں واضح کر دیا کہ زبان کے سلسلے میں ریڈیو کا طریقہ قومی زبان کے سلسلے میں حکومت کے رویے سے مختلف ہونا چاہیئے۔ دستور ہند کے آٹھویں شڈول میں تمام زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا، اور یہ آئین اگلے مہینے کی ۲۶ تاریخ کو نافذ کرنے کے لیئے تیار تھا۔ سردار پٹیل قومی زبان اور سرکاری زبان کے فرق سے ناواقف نہیں رہے ہوں گے۔ لیکن شاید وہ زمین کی حقیقتوں کو دستور کی نزاکتوں پر ترجیح دیتے تھے، اور ان کے ذہن میں ہندی ہی قومی زبان تھی سردار پٹیل نے دیواکر کو لکھا کہ آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی یہ ہو کہ وہ سرکاری زبان کی اہمیت کو سمجھے، اور اپنے مقصد کا بھی لحاظ رکھے۔ آل انڈیا ریڈیو کا مقصد صرف قومی زبان کو ترقی اور وسعت دینے تک محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کا دائرہ کہیں زیادہ بڑا ہے۔ یعنی بات عام آدمی کی سمجھ میں آئے۔ رائے عامہ استوار کرنے، اور عوام کے ذوق کو سدھارنے کی ہر کوشش رائیگاں ہی جائے گی، اگر اظہار کے لیئے ایسی زبان استعمال نہ کی گئی جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آل انڈیا ریڈیو پاکیزہ، واضح اور باوقار

زبان استعمال کرے۔ یہ تمام خوبیاں سادگی میں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لئے قومی زبان کے سلسلے میں آئینی ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے، آل انڈیا ریڈیو کا رجحان کسی قدر مختلف ہوگا۔ عام تفہیم اور عام ترسیل آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی کا بنیادی اور رہنمایانہ نکتہ ہونا چاہیئے۔

اس اختلاف کی نوعیت کے بارے میں، اور یہ کہ یہ کس حد تک ہو، اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جیسے جیسے ہندی کو سارے ہندوستان میں قبولیت عام مل جائے۔ آج یہ صورت نہیں ہے، اور یہ حقیقت اس بات سے واضح ہے کہ انگریزی کو (آئین کے نفاذ کے بعد) پہلے پندرہ برسوں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ آج بھی آپ یہ مان کر چل نہیں سکتے کہ پندرہ برس بعد ہندی خود بخود یقینی طور پر انگریزی کی جگہ لے لے گی۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہندی کو تسلیم اور قبول کرانے ہمیں کن مشکلوں کا سامنا کرنا ہے۔ پندرہ برس بعد کون سے ذہنی رجحانات نمایاں ہوں گے، یہ ایک غیر یقینی عنصر ہے۔ آپ کی لسانی پالیسی، یہ فرض کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی، کہ پندرہ برس بعد ہندی اتنی تیزی سے منزلیں طے کر چکی ہوگی، کہ وہ عوام کی عام طور پر مقبول زبان بن گئی ہوگی، چاہے وہ عام طور سے سرکاری قومی زبان بن گئی ہو۔ دشواری یہ بھی ہے کہ ہندی کو مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں کے اپنی زبانوں سے پیار اور اُن پر فخر کو سہن کرنا ہوگا۔ دشواری یہ بھی ہے کہ ہندی کے مجاہدوں کو اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ قومی زبان انتہا پسندی سے نہیں بنتی، اور نہ یہ قانون سے ٹھونسی جا سکتی ہے۔ بلکہ بتدریج، شعوری طور پر، غیر شعوری طور پر، تحت الشعوری طور پر وقت کے ساتھ رائج ہوتی ہے۔

اگر ہم اس کو کسوٹی مان لیں کہ زبان عام فہم ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہمیں ماننا چاہیئے۔ تو واضح طور پر ریڈیو کی زبان کو کٹر ہندی کے ادبی تصورات سے مختلف ہونا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو ادبی کلب نہیں ہے، اور نہ اسے کبھی یہ ہونا چاہیئے۔ ایک بار یہ اس قسم کا کلب بن گیا، تو یہ "خواص" کے لئے ہو جائے گا اور ایک قومی ادارے کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جو بھی آل انڈیا ریڈیو کا سربراہ ہو، ضروری ہے کہ اس کے ذہن اور نظر کی وسعت، زبان، ادب، لفظوں کے انتخاب،

اظہار کے اسالیب کے تنگ دائروں کو رد کرے۔ بنیادی رویہ وسیع الخیالی کا ہو، اور مقصد ایسے الفاظ کا انتخاب ہو، جو سادہ بھی ہوں اور پروقار بھی، زبان عام فہم ہو، اسلوب اور طریقۂ اظہار اعلیٰ معیار کے ہوں۔ اگر باپو کی تقریروں کا توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے، زبان کے معیار کو کسی بھی طرح کم کئے بغیر۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ اصطلاحات کے لئے سنسکرت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہونگا کہ ——— عبوری وقفہ میں آپ کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ یا تو وہ انگریزی لفظ استعمال کریں، جو اچھی طرح سمجھے جاتے ہیں یا بیان کا ایسا پیرایہ استعمال کریں جس میں اصطلاح کے ساتھ اس کی تشریح بھی کر دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی اس طرح وضع کی گئی، اور اس پر اس طرح عمل ہوا، تو نہ صرف ہم ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے، بہتر طور پر بڑھا وا دیں گے بلکہ اپنے مقصد کے لئے اچھی طرح کام کر سکیں گے، اور ہمارا مقصد ہے آل انڈیا ریڈیو سننے والوں کے وسیع حلقے کی خدمت۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، مجھے یہ درست یا دانشمندی کی بات نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو کلیتاً علاقائی خطّے میں پھینک دیا جائے۔ ایک لحاظ سے، ہندی کی طرح اُردو بھی ایک علاقے سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ وہ جو یہ زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، کسی ایک جغرافیائی رقبے میں گھٹے ہوئے طور پر آباد نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے اردو، دوسری علاقائی زبانوں سے مختلف ہے۔ اردو والے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چار کروڑ مسلمان (ہندوستان میں) ہیں، جن میں سے زیادہ تر اردو بولتے ہیں۔ پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھی ہیں، جن کی اکثریت یقینی طور سے، کسی اور ہندوستانی زبان کے مقابلے میں یہ زبان (اردو) بہتر بولتی اور سمجھتی ہے۔ مشرقی پنجاب میں، اسی سال جن لوگوں نے ورناکیولر کے فائنل امتحان دیئے اُن میں سے انہتر (٦٩) فیصدی نے اُردو زبان اپنائی۔ یوپی میں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد مرکوز ہے۔ اس لیئے میرے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ آپ اردو کو کسی ایک علاقے میں محدود نہیں کر سکتے۔

ہاں یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان خاص طور سے شمالی ہند کے بڑے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں، جیسا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کو کرنا چاہیئے، تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے لیئے یہ ممکن ہوگا، کم از کم اس وقت، کہ اردو کو محض ایک علاقے کی زبان، ایک خاص علاقے کی زبان مانیں، اور اس علاقے کے ریڈیو اسٹیشن کی خاص زبان یا معاون اور دوسری زبان مانیں۔ پنجاب اور یو پی کے ریڈیو اسٹیشنوں کی خاص زبانوں میں سے ایک کے طور پر اردو کو بھی شامل کرنا ممکن ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر پبلسٹی اور ایک سیکولر مملکت کے آدرشوں اور کلچر کو مسلمانوں اور شرنارتھیوں میں بڑھاوا دینے کے آلے کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کو موثر طریقے سے استعمال کرنا ہے، تو ہمیں، موجودہ وقت کے لیئے، دلی کے پروگراموں کا ایک حصہ اردو کے لیئے رکھنا ہی چاہیئے۔

میں نے اپنے خیالات پوری طرح اور صفائی سے اس مشکل سوال پر ظاہر کر دیئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا کام مشکل ہے، اور ایک سے زیادہ گوشوں سے آپ پر دباؤ ہے، تو چاہیں گے کہ زبان کے معاملے میں آپ انتہا پسندی کا رویہ اپنائیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں (یا تو) اپنی آدرش پرستی کو نرم کرنا ہوگا یا عملی وجوہ کی بنا پر اپنی پسند اور ترجیحات میں کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ اگر ہم ان حالات کو نظر سے اوجھل ہونے دیتے ہیں، جن میں قومی زبان سے متعلق پالیسی وضع کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے، تو جس کاز کو ہم بڑھاوا دینا چاہتے ہیں، اس کی خدمت کرنے کے بجائے، ہم مثبت طور پر اس کے خلاف کام کرنے کے مرتکب ہوں گے۔ اس لیئے میں یہ چاہوں گا کہ ہم اس مسئلے پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں، اور پوری طرح یہ بات سمجھیں کہ داؤ پر کیا لگا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی وضع کرنا چاہیئے۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس سوال کی اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے، جو نظریئے آپ اس سلسلے میں حاصل کریں، اور جو پالیسی آپ تجویز کرنا چاہیں، کابینہ سے اس کی منظوری لیں۔

آپ کا مخلص
ولبھ بھائی پٹیل

دی آنرایبل شری آر آر دیواکر وزیر مملکت، آئی اینڈ بی، نئی دلی۔

Camp Pilani

14 December, 1949

My dear Diwakar,

Thank you for your letter of 5 December, 1949 regarding the language policy of AIR and the I & B Ministry.

I am afraid our approach in regard to AIR has to be somewhat different from our approach to the question of national language. AIR's language policy, while taking note of the Official language, must have due regard for the objective. The objective of AIR cannot be confined to the propagation or promotion of the national language. It is much more comprehensive, viz. it has to make itself understood and appreciated by the common man. Any attempt on the part of AIR to mould public opinion or to promote and improve public tastes, is bound to fail, if it does not express itself in a language which can be understood by the greatest possible number. I realise that the aim of AIR must also be to express itself in a language which is chaste, precise and dignified. All these virtues can, however, be present in simplicity. Although,

therefore, there should be a somewhat different bias, having regard to the constitutional provisions regarding national language, the criterion of general intelligibility must remain as the guiding point of AIR language policy.

As regards the nature and extent of the bias, that must obviously be more and more pronounced as Hindi becomes the generally accepted language of the whole of India. The fact that it is not so today is implicit in the recognition of English as the official language for the first fifteen years. You cannot assume, even now, that at the end of the period of fifteen years, Hindi would automatically take the place of English. We have found what difficulties we have to face in getting Hindi recognised and accepted. What attitude of mind will be displayed at the end of fifteen years is an uncertain factor. Your language policy, therefore, cannot even proceed on the assumption that, fifteen years hence, Hindi would make such rapid strides as to become the generally acceptable language of the people, even though it might be the generally acceptable official national language. The difficulty proceeds as much from the fact that Hindi has to contend with the linguistic pride of the various linguistic areas as from the fact that the protagonists of Hindi itself have to realise that a national language is not formed by fantacism, nor is it imposed by statute, but grows consciously and sub-consciously by the efflux of time

with the inevitability of gradual recognition.

If we, as I think we must, accept the criterion of general intelligibility, then obviously the standard of AIR language has to be different from the literary conceptions of orthodox Hindi AIR is not, and should never be, a literary club. Once it is constituted into a club of that sort, it would become exclusive and cease to be a national institution. Whoever is at the head of AIR has, therefore, to be guided by breadth of vision and of outlook which should transcend extremism in language, in literature in the chose of words and in the selection of forms or idioms of expression. The basic approach must be catholic and the aim should be to select words which combine with simplicity the dignity of language and with the intelligibility a high standard of expression and style. If one carefully studies Bapu's speeches, one would realise that this aim is quite capable of realisation without doing violence to the standard of language. For technical expressions, I agree that you will now have to resort more and more to Sanskrit; at the same time, in the interim period, I feel that it will still be necessary for you either to use wider-understood English words or to evolve a style of a narrative which, while giving a technical term, amplify its meaning. I am sure, if the language policy of AIR were conceived and directed in this way, we shall not only be promoting much better the cause of Hindi as a national language but also be

serving much better what would obviously be our aim viz. the service of the large body of AIR listeners.

As regards Urdu, I am doubtful of either the propriety or the wisdom of relegating it entirely to the regional domain. In a sense, Urdu, like Hindi, cannot belong to one region. Those who speak and understand this language are not concentrated in one geographical area. To this extent, Urdu differs from other regional languages. Its votaries are spread all over India. There are four crores of Muslims, most of whom speak this language. There are refugees from Punjab, a majority of whom definitely speak and understand this language better than any other Indian language. In the East Punjab, even this year 69% of those who appeared for the Vernacular Final Examination adopted Urdu as their language. In UP, there is a large concentration of those who speak the Urdu language. It is therefore, quite clear to me that you cannot confine the Urdu language to any one particular region, though you can say that it is mainly spoken in a large portion of Northern India. If you recognise this fact, as I think you must, I do not think it will be possible for us, at least for the time being, to treat Urdu merely as the language of a particular region and thereby to consider it as the main or the main subsidiary language of any particular AIR station. It is possible to include it as one of the main languages of AIR stations in Punjab and UP, but I feel that, if we have to make

AIR effective as an instrument of publicity and promotion of ideals of a secular State and culture amongst a large majority of Muslims and refugees, we must for the time being, assign a portion of our AIR programme from Delhi to Urdu.

I have expressed my views fully and frankly on this very difficult question. I know that your task is difficult and that you are under pressure from more than one quarter who would like you to adopt an extremist attitude in the matter of language, but I think we have to mellow our idealism, or our predilections, by practical considerations. If we lose sight of the circumstances in which we must work our policy regarding national language, we would not be doing a service but a positive disservice to the very cause which we wish to promote. I would, therefore, ask that we must give this problem a very serious consideration, fully recognising and realising what is at stake. It is in this light that we should formulate the language policy of AIR. I also feel that, having regard to the importance of this question, you must obtain the approval of the Cabinet to whatever policy you wish to suggest, in the light of the views which you might obtain on this question.

Yours sincerely,

Vallabhbhai Patel

The Hon'ble Shri R.R. Diwakar,

Minister of State, I&B, N.Delhi.

لوتھرا نے اپنی کتاب له کے چوبیسویں باب کو سردار پٹیل کے اس خط کے دو اقتباسات پر ختم کیا ہے، اور دیواکر کو سردار پٹیل کا جانشیں بتایا ہے۔ دیواکر منسٹر آف اسٹیٹ تھے، اور کابینہ میں ریڈیو اور اطلاعات کا قلمدانِ وزارت سردار پٹیل ہی کے پاس تھا۔ لوتھرا نے اس باب میں سردار پٹیل کے پرائیویٹ سکریٹری وی شنکر ٹه کے دو نوٹ بھی نقل کیے ہیں۔ ۸ ر اپریل ۱۹۴۸ء کے نوٹ میں درج کیا گیا ہے کہ "عزت مآب وزیر (سردار پٹیل) نے اسٹینڈنگ کمیٹی (ایڈوائزری کمیٹی) کی ۲۰ ر مارچ ۴۸ء کی روداد دیکھی۔ وہ اس سفارش کو منظور نہیں کرتے کہ کانسٹی ٹوائنٹ اسمبلی اور سکیورٹی کونسل وغیرہ کے لیے متبادل ہندی اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ عام تفہیم، اور وزیرِ اعظم کے نظریے کا لحاظ رکھتے ہوئے، جس سے وہ اتفاق کرتے ہیں، وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عام طور سے رائج سمجھے جانے والے لفظوں کی جگہ سنسکرت لفظوں اور فقروں کا استعمال (خبروں کے) بلیٹنوں کو ناقابلِ فہم بنا دے گا۔ یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ خبروں کے بلیٹن ہندوستانی میں ہونا ہیں، نہ کہ ہندی میں۔"

وی شنکر کا دوسرا نوٹ ۲۷ ر اپریل ۴۸ء کا ہے، اور یہ زیادہ تیکھا ہے۔ "عزت مآب وزیر (سردار پٹیل) یہ محسوس کرتے ہیں کہ عام تفہیم کی جس پالیسی کی انھوں نے ہدایت کی تھی، پچھلے مہینوں میں اس سے انحراف ہوتا رہا ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ آل انڈیا ریڈیو کوئی ادبی کلب نہیں ہے، اور اس لیے یہ ادبی قلابازیوں اور کرتبوں کے لیے فورم نہیں ہو سکتا۔ شبد بھنڈار طے کرنے کے لیے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ نشر ہونے والی ہماری خبریں پڑوس کے علاقوں میں بھی سمجھی جاسکیں اور اندرونِ ملک بھی۔ کسی خاص قسم کی زبان کے لیے جوش کی جگہ عام طور سے سمجھی جانے والی اصطلاحوں کی ضرورت ہے۔"

له ایچ آر لوتھرا: انڈین براڈکاسٹنگ ص، ۲۷۶۔

ٹه ایضاً: ص، ۲۶۹۔

لوتھرا نے ایک اور اہم نوٹنگ کا بھی حوالہ دیا ہے[لہ]۔ ڈائرکٹر نیوز نے ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء ڈائرکٹر جنرل (سی۔ بی۔ راؤ) سے ہدایت چاہی کہ "انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم" کا فقرہ ہندی بلیٹن میں استعمال کیا جائے یا اس کا بھی ترجمہ کیا جائے، جو ہندی سپروائزر کی تجویز ہے۔ ڈائرکٹر جنرل نے جواب دیا کہ انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم ہی استعمال کیا جائے، اور دیکھا جائے کہ سننے والے کیا کہتے ہیں؟

"ہندوستانی" کو مستعمل کرنے کی ایک کوشش احمد شاہ بخاری کے زمانے میں ۱۹۴۰ء میں کی گئی تھی۔ آٹھ ہزار انگریزی لفظوں کی ایک فرہنگ تیار کی گئی تھی۔ اس میں طریقہ یہ استعمال کیا گیا تھا کہ پہلے نمبر شمار۔ پھر انگریزی لفظ۔ ہندی متبادل۔ اردو متبادل۔ مجوزہ ہندوستانی متبادل۔ کیفیت۔

A. I. R. LEXICON

اب یہ فرہنگ اتنی کم یاب ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی بھی کسی لائبریری میں موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے نمونے پر ہندی کی ایک فرہنگ تیار کی گئی ہے، جو نیوز سروسز ڈویژن کے لیے پبلی کیشنز ڈویژن نے شائع کی ہے۔

आकाशवाणी के समाचार विभाग की ओर से
सूचना और प्रसारण मंत्रालय के
प्रकाशन विभाग द्वारा
प्रकाशित

Published by the Publication Division
Ministry of Information & Broadcasting
on behalf of
The News Services Division, All India Radio,

لہ ایضاً ص ۲۷۱ ۔

۱۹۴۴ء کی آل انڈیا ریڈیو کی تیار کی ہوئی ہندستانی فرہنگ کم یاب ہے، نایاب نہیں۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر محمد حسن کے پاس تھا، جو انھوں نے ہمدرد لائبریری تغلق آباد میں محفوظ کرا دیا ہے۔

جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کی خواہش اور ہدایتوں کے باوجود ریڈیو میں ہندی اور اردو کا فصل بڑھتا گیا۔ ایک طرف اردو کو ہندی کی شیلی کہا جاتا تھا، دوسری طرف اس شیلی سے اس حلقے کو ڈر بھی لگتا تھا، جن کا ایک مفادِ خصوصی پیدا ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اردو کے پروگرام کم ہوتے گئے، اور ہندی تت سم کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی وجہ سے بوجھل ہوتی گئی، اور جتنی بوجھل ہوتی گئی اتنی ہی زیادہ ناقابلِ فہم ہوتی گئی۔ اس پر ہندی کے حلقوں میں بھی دبے الفاظ میں اعتراف کیا گیا، لیکن یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا گیا کہ تت سم لدی ہندی جنوبی ہندوستان اور دوسرے غیر ہندی علاقوں میں اپنی شبداولی کی وجہ سے زیادہ قابلِ فہم ہوتی ہے۔ یہ بات حقیقت سے بہت دور تھی، اور ہندی کی مخالفت جنوبی ہند ہی سے شروع ہوئی، اور اس طرح ایک لسانی مسئلہ سیاسی تحریک کا حصہ بن گیا۔ جنوبی ہند میں کہیں اردو کے خلاف کوئی تحریک نہیں ابھری، جو ہندوستانی ہے، اور اردو سے وہاں لوگوں کو کوئی پرہیز نہیں۔

۱۹۶۲ء میں جب ریڈیو اور اطلاعات کے وزیر، ڈاکٹر بی وی کیسکر الکشن ہار گئے، تو ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نہ صرف اس محکمے کے وزیر ہوئے، بلکہ کابینہ درجے کے وزیر بنائے گئے۔ وہ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے۔ جنوب سے آئے تھے، اس لیے ہندی اردو کے نزاع کے سلسلے میں وہ غیر جانب دار تھے، اور ریڈیو کے لیے اس زبان کو مناسب سمجھتے تھے، جو فوری طور پر سمجھ میں آئے۔ کوچوں اور بازاروں میں بولی جانے والی زبان۔ ڈاکٹر ریڈی خود بھی ترسیل اور ابلاغِ عامہ کی زبان کے سلسلے میں ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ پھر وزیر اعظم نے بھی ان سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کہا۔ جواہر لال نہرو، ڈاکٹر کیسکر کی روش سے مطمئن نہ تھے۔ ڈاکٹر ریڈی نے جون ۱۹۶۲ء کے تیسرے ہفتے میں ایک سیمی نار آل انڈیا ریڈیو، دلی کے اسٹوڈیوز میں منعقد کرایا، جس میں

مختلف اسٹیشنوں پر کام کرنے والے ہندی اور اردو پروگراموں کے پروڈیوسروں اور اسسٹنٹ پروڈیوسروں کو طلب کیا گیا۔ اس سیمی نار کی صدارت خود ڈاکٹر گوپال ریڈی نے کی۔ ریڈیو اور اطلاعات کے نائب وزیر، شیام ناتھ، ڈائرکٹر جنرل بی پی بھٹ، ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کرشن سروپ ملک (پرویز)، ڈائرکٹر پروگرام پالیسی، پی سی چٹرجی (جو بعد میں ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے)، چیف پروڈیوسر ودھ بھارتی نریندر شرما، موسیقی کے ایڈوائزر ٹھاکر جے دیو سنگھ، اردو کے ساہتیہ صلاح کار ڈاکٹر سید عابد حسین، ہندی کے صلاح کار سمترانندن پنت، اور دلّی کے اسٹیشن ڈائرکٹر ڈاکٹر رام مراٹھے بھی شامل تھے۔ ڈائرکٹر جنرل نے وزیر اور نائب وزیر کا رسمی استقبال کیا، ڈاکٹر گوپال ریڈی نے بھی ایک رسمی تقریر کی، جس میں براڈکاسٹ کی زبان کی اہمیت پر توجہ دلائی، اور پروڈیوسروں کو دعوت دی کہ وہ سیمی نار میں اس بات پر تبادلۂ خیال کریں کہ کس طرح پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ سننے والوں کے لیئے قابلِ فہم بنایا جا سکتا ہے۔

ہندی لابی اوور ٹائم کر رہی تھی۔ ہندی کے ڈپٹی چیف پروڈیوسر آرسی ٹنڈن ایک لمبی تقریر لکھ کر لائے تھے، جو انھوں نے پڑھ کر سنائی۔ اس میں حروفِ جر، ہیں، تھے، پر، تک — اور ہے، نہیں اور چند اور لفظوں کو چھوڑ کر، صرف تت سم استعمال کئے تھے، جن میں سے چند ہی سمجھ میں آسکتے تھے۔ سرینگر سے آئے ہوئے اسسٹنٹ پروڈیوسر نے، اس تقریر کے دوران ہی میں ایک پرزہ ڈائرکٹر جنرل کو دیا، جس میں انگریزی میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ اس تقریر کے فوراً بعد اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جائے۔ پرزہ وزیر موصوف کو پیش کیا گیا، انھوں نے نام پڑھ کر پوچھا "سرینگر" سے۔ ڈائرکٹر جنرل نے اثبات میں جواب دیا۔ ٹنڈن کی تقریر ختم ہوتے ہی سرینگر کے اسسٹنٹ پروڈیوسر کو بلایا گیا۔ اس نے کہا، ابھی ابھی ٹنڈن مہودے نے جو تقریر پڑھی، وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اسی زبان میں آل انڈیا ریڈیو کے ہندی پروگرام ہوتے ہیں، اسی زبان میں خبریں ہوتی ہیں۔ نریندر شرما نے غصّے میں کہا: آپ کتنی ہندی جانتے ہیں؟ ۔ جواب ملا، جن کے لیئے ہندی پروگرام براڈکاسٹ کئے جاتے ہیں، ان کی اکثریت اوسطاً جتنی ہندی

جانتے ہیں اس سے زیادہ جانتا ہوں۔ نریندر شرما نے دوسرا سوال داغا: آپ نے کتنی ہندی پڑھی ہے؟ جواب دبا گیا۔ جن کے لئے ہندی پروگرام ہوتے ہیں، اُن کے اوسط سے کم نہیں۔ شرما پھر کچھ کہنے جا رہے تھے کہ سمترانندن پنت نے اشارہ کر کے منع کر دیا، کیونکہ پنت جانتے تھے کہ اردو کے اُس اسسٹنٹ پروڈیوسر کی کویتائیں چودہ برس پہلے ہندی کے رسالے "ہنس" میں چھپی تھیں، جو بنارس سے نکلتا تھا، اور جسے امرت رائے اور امرت لال ناگر ایڈٹ کرتے تھے۔ مقرر نے صدر سے اجازت مانگی کہ اسے ٹوکا نہ جائے۔ اور پھر اس نے کہا: میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ وہاں عام بول چال کی زبان اگر فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے، تو اردو کہی جاتی ہے، اور دیوناگری لپی میں یہی لکھی جائے تو ہندی کہلاتی ہے۔ ہندی اور اردو والے کسی ترجمان کے درمیان میں آئے بغیر براہِ راست ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اردو کے پروگرام اتنے کم ہیں کہ اردو والوں کو یوپی اور پنجاب میں پڑوس کے ریڈیو اسٹیشنوں کو لگانا پڑتا ہے، خبروں کے لئے بھی، کیونکہ ہندی کی خبریں جو آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوتی ہیں، سروں پر سے گذر جاتی ہیں۔ ریڈیو حکومت نے اپنی تحویل میں رکھا ہے، کیونکہ وہ اس سے کچھ اہم کام لینا چاہتی ہے۔ جمہوریت کا تصوّر عام کرنے کے لیے ترقی کے کاموں سے آگاہ رکھنے کے لیے اور لوگوں کو ان کاموں میں اپنا رول ادا کرنے کا احساس دلانے کے لیے۔ مشترکہ قومیت کا احساس دلانے کے لیے۔ لیکن اُردو والوں کو کوئی اہم پروگرام نہیں ملتا۔ وہ اڑوس پڑوس کے پروگرام سنتے ہیں۔ سنتے ہیں تو ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ ان میں ہندو مسلمان اور سکھ کی قید نہیں۔ اردو والے دوسرے ملکوں کے اسٹیشن سننے پر مجبور ہیں۔ یا تو ہر اہم پروگرام اردو میں بھی ہو۔ ہر نیشنل پروگرام اردو میں ہو تا کہ اردو والے بھی اس ملک کے مختلف حصّوں کی حقیقتوں سے، حالات سے، روایات سے واقف رہیں۔ یا پھر ہندی کے پروگرام ایسی زبان میں ہوں، جو سب کی سمجھ میں آئیں۔ آخر فلمیں بھی تو بنتی ہیں، اور پیسہ خرچ کر کے لوگ فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس لیئے کہ ان کی زبان بول چال کی زبان ہے۔ ریڈیو بھی زبان کا مسئلہ اسی طرح حل کر سکتا ہے۔

پھر تین دن کے کسی اجلاس میں زبان کے مسئلے پر بات نہیں ہوئی۔ آخری اجلاس میں ڈاکٹر گوپال ریڈی پھر آئے اور اُن کے سامنے کچھ متفقہ تجویزیں رکھی گئیں،

جن کے لیے انھیں بتایا گیا کہ حاضرین نے بڑی توجہ سے اس مسئلے پر غور کیا۔ حالانکہ الگ الگ ٹولیوں میں غور اس بات پر کیا گیا تھا کہ وزیر کے سامنے اردو پروگراموں کی جو مانگ رکھی گئی ہے، اس کی کاٹ کس طرح کی جائے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گوپال ریڈی ایسی زبان کے حق میں تھے، جو عام فہم ہو۔ سردار پٹیل نے دیواکر کو جو کچھ لکھا تھا، ڈاکٹر ریڈی اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ پی سی چٹرجی نے اس سیمینار کی یاد بس ایک خط میں سمیٹی ہیں۔

Dear Sir,

I have not the honour of knowing you personally .but why I draw your attention to an important grievance of Urdu listeners of your programmes on AIR.

1. Various National programmes are broadcast from All India Radio. These include:
    1. National Programme of Classics.
    2. National Programmes of Drama.
    3. N.P. of Contemporary Literature.
    4. N.P. of features.
    5. National Symposium of Poets.

2. The purpose of these programmes is to foster the feeling of emotional integration by keeping the listener informed about the developmental work in progress in different parts of the country and acquainting him with the literary and cultural traditions of the different regions.

3. These programmes are broadcast simultaneously in all the languages from all the stations of All India Radio. But there

is one notable exception: and that is Urdu.

4. Urdu has been written off on the flimsy plea that it has not been recognised as the language of any region. The result is that the Urdu listeners, whose number is considerable, are just not aware of all that which is put forward through these programmes. It is the language of Jammu & Kashmir

5. Urdu has been denied its rightful place on all the planes. It is one of the national languages recognised in the constitution, yet no national Programme is broadcast in it. It is the language of a very important cultural minority. All the efforts in the direction of national and emotional integration of the country, which ignore or treat with contempt this cultural minority or its language, are bound to be fruitless.

6. I shall be glad if you will be pleased to look into this affair.

Your's Sincerely

Shri G.Gopala Reddi

Union Minister for Information & Broadcasting

اوستھی نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ریڈیو کی زبان کے کردار میں اس تبدیلی کا ذکر کیا ہے جو نومبر ۱۹۴۹ء کے بعد ہوئی اور سادہ زبان کی بجائے تت سم لدی بھاشا کی طرف تیز رفتار سفر شروع ہوا۔[1]

Although the Indian listener used to have short editorial comments at that time, the change from Hindustani to Hindi as the language of news bulletins was not commented upon or publicised anywhere. It seems AIR's Hindi language policy was dealt with in a semi-secret manner. The character of the language also changed and highly Sanskritized expressions came to be used. It was argued that even if the people could not follow the language of the Hindi news bulletins they would learn it by constant listening. This was the line taken by Dr. Keskar who had assumed office. It was during this period that the Prime Minister complained that he could not understand the language in which his Hindi speeches were reported in AIR's news bulletins. Meanwhile steps had been taken to broadcast separate news bulletins in Urdu. Urdu first figured as a language of news bulletins in the Indian Listener for the week commencing Sunday, December 18, 1949. There were then two Urdu news bulletins a day at 9 a.m. & 8 p.m. Relay of the Urdu bulletins did not appear in the programmes of Delhi or any other station. In April 1950 Urdu bulletins were shown for the first time as being relayed by Hyderabad station.

Although himself a Sanskrit scholar, P.M.Lad, who became

---

[1] Broadcasting in India: G.C. Awasthy ص ۱۳۱ - ۱۳۵

Secretary to Government in the I&B, Ministry in 1954 was clear-sighted enough to see the folly of this line of approach. He realised that the function of AIR's news bulletins was to convey information to masses. AIR was not an esoteric cultural society for the propagation of purity in language. From his time, therefore, began the movement for reform of the language of AIR's Hindi news bulletins. The Hindi writers and scholars whom Dr.Keskar had given lucrative appointments in AIR as advisors and producers were strongly entrenched and made every effort to hold back this movement. Unfortunately Lad passed away and there was no one to pursue this policy with vigour. Nevertheless, with occasional proddings from the Prime Minister, it continued to gain momentum.

Shortly after Dr. Gopala Reddi assumed charge as Minister of Information and Broadcasting, following the defeat of Dr. Keskar in the 1962 elections, he took up the question of the language policy of AIR's Hindi news bulletins. Dr. Reddi's contention was that the language used in Hindi news bulletins was not understood by the vast majority of listeners in the Hindi-speaking region. He contended that Urdu words in current coinage should not be excluded from the bulletins and should be preferred to esoteric words of Sanskrit origin. The simplification of language should not be confined to Hindi news alone. The same principles should be employed in presenting news in Urdu. In effect, this policy meant that Hindi and Urdu should be brought closer

together. From the point of view of radio, this was perfectly sound.

Dr. Reddi summoned AIR's Producers and Assistant Producers of Spoken Word Programmes in Hindi and Urdu to a seminar at broadcasting House in June, 1962. He expounded his ideas and there were subsequent discussions on how "simplification" was to be achieved in practice. Following the seminar, a definite experiment was made to model the Hindi and Urdu news bulletins on the lines advocated by him. In particular, an experiment was tried out in which identical texts were used for the Hindi and Urdu news bulletins at 1.40 and 1.50 p.m. The news items included were not all common to the two news bulletins, but where this was so, the language used was identical. ....While the discussions at the Spoken Word Producers' Seminar, and subsequent decisions, were not officially reported, at that time the whole story leaked out into the press. The Hindi fanatics in AIR, appointed during the Keskar regime, no doubt saw to this. Members of Parliament from Uttar Pradesh and Bihar rallied round the slogan of "Hindi in Danger". ....When Parliament met for its monsoon session the storm broke. Dr. Reddi was criticized for his attempts to Urduise Hindi and for trying to reverse the Hindi policy pursued by AIR over the past decade. The argument was also put forward that if the language used in the bulletins was

Sanskritized, people throughout the country could understand it since the regional languages shared with Hindi a common base. Dr. Reddi made a spirited defence. The Prime Minister rallied in support. He had disclosed at a press conference at the end of June that when Dr. Reddi assumed charge as Minister for Information and Broadcasting, he had suggested that he might look into the question of the language used in AIR's Hindi news bulletins. He went on to say that he had not entirely approved of the Hindi policy pursued by Dr. Keskar. ....The Hindustan Times of the 6th August, said that the Congress Parliamentary party had adopted a resolution orally proposed by Mr. Nehru, that so far as possible the Hindi used by AIR should be simple but "nothing should be done to militate against the genius of Hindi". It was at this stage that the Chinese invasion occurred. All controversial issues were put into cold storage. There followed the abortive VOA deal and the replacement of Dr. Gopala Reddi by Mr. Satya Narain Sinha as Minister for Information and Broadcasting. With Mr. Sinha at the helm of affairs, acutely susceptible to the powerful Bihar lobby in Parliament, AIR is undergoing another metamorphosis in its language policy.

پی سی چٹرجی نے اودستھی کا حوالہ دیا ہے۔ اودستھی کی کتاب سے اقتباس پیش کرنے سے پہلے آصف فیضی کے اس اہم خط پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا، جو انھوں نے ڈاکٹر گوپال ریڈی کو لکھا تھا۔ ۷ رجون ۶۲ء کے اس خط کا مسودہ، جس میں انھوں نے اپنے قلم سے ترمیمیں کی ہیں، ایک خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ دونوں خط یہ ہیں:

مشفقی

یہ خط آج ہی وزیر اطلاعات کی خدمت میں بھیجا گیا، اس سے پیشتر بے حد مصروف تھا، نیز ایک معروضہ وزیر اعظم کی خدمت میں روانہ کیا ہے جس میں وسط ایشیا کے متعلق ضروری تحقیقات کرنے کی التجا کی ہے،

جس میں (۱) لسانیات

(۲) زراعت

(۳) اقتصادیات

(۴) سیاست

نیز معلومات کا زور دیا گیا ہے، واللہ اعلم کیا کریں گے۔

اشو اور بچوں کو دعا، یہاں سب آپ کی یاد کرنے والے ہیں،

والسلام آصف

۷-۶-۶۲

براڈکاسٹ کی زبان کو بول چال کے قریب لانے اور زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے میں پڑوسی ملکوں سے تین لڑائیوں اور انتخابات کا بڑا ہاتھ ہے۔ مقصد بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنے ہم وطنوں، اور سرحد پار کے لوگوں تک پہنچانا تھی۔ اس لئے ہر پروگرام بول چال کی زبان میں ہوا۔ کسی قوم پرست، سنسکرتی پریمی نے تت سم لدی یا فارسی زدہ شیلی میں گانے نہیں لکھے۔ "اے میرے وطن کے لوگو" اور "کشمیر کے باغات سے" قسم کی زبان عام طور پر استعمال ہوئی۔

ستیہ نراین سنہا کابینہ درجے کے وزیر تھے۔ ان کے پاس انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ کے ساتھ کمیونی کیشنز کا بھی قلمدان تھا۔ پروفیسر شیر سنگھ ریڈیو اور اطلاعات اور اندر کمار گجرال، دو وزرائے مملکت تھے۔ گجرال ڈاک اور تار کا محکمہ دیکھتے تھے۔ انفارمیشن براڈکاسٹنگ نے کئی وزیر دیکھے۔ نندنی ست پتھی، خود اندرا گاندھی، اندر کمار گجرال، ودیا چرن شکلا، لال کرشن ایڈوانی، پرشوتم کوشک، وسنت ساٹھے، ایچ کے ایل بھگت، دی این گاڈگل اجیت کمار پانجہ۔

اندر کمار گجرال کے دورِ وزارت میں اُردو کے لئے سب سے زیادہ کام ہوا۔ اردو کے لئے گجرال کمیٹی رپورٹ سے قطع نظر، ریڈیو سے نہ صرف زیادہ اُردو پروگرام نشر ہوئے، بلکہ مختلف اسٹیشنوں سے پروگرام بھی شروع کیے گئے۔ اس سے بھی اہم کام یہ ہوا کہ اردو پروگراموں کے لیے یونین پبلک سروس کمیشن سے پروگرام افسروں کا انتخاب کرایا گیا۔ ان ہی کے دور میں سنسکرت میں خبروں کے بلٹین شروع ہوئے۔ اور شعوری طور پر ہندی سماچاروں میں تدبھو اور چھانٹے گئے، اور تت سم کا تناسب اس قدر بڑھا کہ سنسکرت کے وارتہا اور ہندی سماچاروں میں فرق برائے نام رہ گیا۔ اگر اردو کے پروگرام بول چال کی زبان میں ہوتے (اور ان میں خبریں بھی شامل ہیں) تو اردو ملک کے بڑے حصّہ پر چھا جاتی۔ لیکن ہندی کی ضد میں اردو خبروں اور سماچاروں کی زبان، نامانوس فارسی اور عربی لفظوں کے بے جا استعمال سے بوجھل ثقیل اور عام سامعین کے لئے ناقابلِ فہم ہو گئی۔ اس رجحان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن نچلی سطح پر کام کرنے والے "اردو کے محافظوں" نے اپنا

---

1. Broadcasting in India · G.C. Awasthy P. 131-135

کام جاری رکھا۔ یہ ایک پیراڈاکس ہے، اور اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہے کہ اردو کے پروگرام افسروں نے اُردو کی حفاظت کے نام پر اردو کو بول چال سے دور کر کے اپنے سننے والوں کی تعداد کم کر دی۔

لسانی مسئلہ، فرقہ وارانہ مسئلہ بنا اور ساتھ ساتھ سیاسی مسئلہ بھی، کیونکہ ہندی لابی، سنسکرت لابی ہو گئی، اور یہ لابی اردو مخالف لابی بھی بن گئی۔ اندر کمار گجرال اردو کے لئے کچھ اسی لو جہ سے کر سکے، کہ انھوں نے ہندی لابی کی جائز اور ناجائز مانگیں پوری کیں۔

۱۹۷۳ء میں اردو ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے، ایک سوال کے جواب میں گجرال نے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی نہیں، بلکہ کمیونی کیشن (ابلاغ عامہ) کی پالیسی ہے۔ ہندی اردو تنازعہ میں غیر جانب دار رہنے کے لئے انھوں نے یہ خوبصورت جملہ کہا تھا، لیکن یہ کلی شے بن گیا۔

۱۹۷۹ء میں جب پی سی چٹرجی کی کتاب[1] چھپی تو اس کے تیسرے باب میں "چاہیئے: ایک کمیونی کیشن پالیسی" کے تحت انھوں نے لکھا:

A few years ago Mr. I.K. Gujral, who was then Minister for Information & Broadcasting, a person with a flair for language and himself a first rate communicator, said that what we need in AIR is a communication policy, not a language policy. Since then it has become a neat slogan which we have been reeling of in parrot fashion whenever questions about language and communication.

When he coined this excellent phrase, Mr. Gujral presumably had various points in mind. For instance, one intention could have been to deny that AIR need be bothered about the purity of

---

Two Voice : P.C. Chatterji P 19-20

language. Since AIR has been dogged by purism in language, not only in Hindi and Urdu but almost in all the regional languages, this is a point worth making. We certainly need to get nearer the idiom of the people, the language of their actual speech. With the microphone going out more and more, with more important discussions a lot more of the spoken word is coming over AIR. Whether it has influenced to any considerate extent the script writers and news translators employed in broadcasting, is another education. ... ... let me get back to the slogan about AIR's need for a communication, not a language policy. The big weakness of the slogan stems from the fact that, in radio at least, if not in life, the major means of communication is language. So, if you wish to be critical, you could say that a communication policy without a language policy, makes little sense. Communication and language can not be divorced from each other. What we need is a language policy which makes for communication.

ایمرجنسی نافذ ہونے کے تھوڑے دنوں بعد ہی گجرال کو انفارمیشن براڈ کاسٹنگ سے ہٹا دیا گیا، اور ان کی جگہ ودیا چرن شکلا وزیر ہوئے۔ تمام ضابطے بالائے طاق رکھ دیئے گئے اور سنجے گاندھی کے تحت، جن کی کوئی آئینی حیثیت، ایک عام شہری کے علاوہ نہیں تھی۔ ودیا چرن شکلا نے وزارت کے سکریٹری سید مظفر حسین برنی، انڈین پولیس سروس کے ایک افسر، پرشاد (ایڈیشنل سکریٹری)، ڈاکٹر ایشور داس (جوائنٹ سکریٹری) اور ٹیلی کمیونی کیشن کے ماہر ڈاکٹر راؤ (مشیر) کی مدد سے ریڈیو اور ٹی وی کا کاروبار چلانا شروع کیا۔ ڈاکٹر راؤ، گوئبلز کے اس خیال پر پکا یقین رکھتے تھے کہ ایک بات بار بار دھرائی جائے تو

سننے والے زچ ہوکر اُسے حقیقت مان لیتے ہیں۔ چنانچہ حکم ہوا کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہر پروگرام میں
بیس نکاتی پروگرام کی برکات واضح کرے۔ ڈائرکٹر جنرل پی سی چٹرجی نے ڈاکٹر ایشور داس کو ایک
تفصیلی خط لکھا تھا کہ تھوک میں بیس نکاتی پروگرام سامعین شاید ہی خریدیں، اس لیے صرف
چند پروگرام اس موضوع پر ہوں۔ چٹرجی نے اس خط کی نقلیں سب اسٹیشنوں کو بھی بھیجدیں۔ کہ
قاعدے سے ان کا مشورہ قبول کیا جانا چاہیئے تھا، لیکن ہوا یہ کہ پرسا دنے، جو عہدے میں
ڈائرکٹر جنرل سے بڑے نہیں تھے، کڑے لفظوں میں ڈائرکٹوریٹ جنرل کو لکھا کہ وزارت
کے احکامات کی تعمیل ہو۔ چنانچہ ان احکامات کی تعمیل اس شدت اور شد و مد سے ہوئی کہ
ریڈیو والے اور سننے والے نہ لیں۔ لوگوں نے ریڈیو سننا چھوڑ دیا۔ Radio Research
یہی رپورٹیں بھیجتا تھا کہ سارے ملک میں بیس نکاتی پروگرام بکتے۔ بوڑھے جوان مرد عورتیں،
سب بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایمرجنسی کبھی ختم نہ ہو۔ شروع میں تو رپورٹوں
پر اطمینان کا اظہار کیا گیا، لیکن جب پرسا دنے انٹیلی جنس بیورو اور ریسرچ اینڈ انالیسس
ونگ کی رپورٹیں دیکھیں تو حقیقت کھلی۔ پر کوئی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ پالیسی غلط ہے۔
طے ہوا کہ جس زبان میں پروگرام ہو رہے ہیں، وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔
ہندی لابی اتنی مستحکم تھی کہ اس طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا
تھا۔ یہ اطلاعات بھی خفیہ ایجنسیوں سے ملیں کہ اردو پروگرام نسبتاً سمجھ میں آجاتے ہیں، اور
کچھ شوق سے بھی لئے جاتے ہیں۔ دوردرشن کے وہ پروگرام، جو فلموں، فلموں کے ٹکڑوں یا فلمی
زبان میں خود دوردرشن کے تیار کئے ہوتے ہیں، دیکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری سمجھا
گیا کہ اردو پروگراموں پر توجہ دی جائے، کہ ان کے ذریعے سے ہی عوام تک پیغام کی ترسیل
ہو سکتی ہے۔ سارے شمالی ہندوستان میں اردو کی مقبولیت واضح ہوئی تو اسے استعمال کرنے
کی فکر ہوئی۔ اگر اردو کام آسکتی ہے، تو وقتِ ضرورت اس سے کام ضرور لینا چاہیئے۔
چنانچہ سنجے گاندھی نے کنبہ بندی کا پیغام عام کرنے کے لیے لتا منگیشکر اور کشور کمار کو
فیملی پلاننگ کے جلسے میں گانے کے لئے طلب کرایا۔ کشور کمار نے ''مفت'' گانے سے انکار
کیا، تو ریڈیو اور ٹی وی پر اس کے ریکارڈ بند کر دیئے گئے۔ باقیوں نے عبرت پکڑی اور
اطاعت قبول کی۔ اردو پروگراموں میں اضافے تک کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ چنانچہ
۲ ستمبر ۱۹۷۶ کو ودیا چرن شکلا نے ایک میٹنگ کی صدارت کی۔ روداد:

اردو کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں ادب، ادب کی زبان، صحافت اور ریڈیو پروگراموں کی زبان کا جائزہ لیا گیا اور تفصیلی سروے وزارت کو بھیجا گیا، اس پر غور کرتے کرتے ایمرجنسی کے دن پورے ہو گئے۔ انتخابات کا اعلان ہوا۔ ایسے نازک وقت میں ان نفاستوں کے بارے میں کون سوچتا۔ حکومت بدل گئی۔ لال کرشن اڈوانی نئے وزیر ہوئے۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اردو کی جو صورت تھی، اسے برقرار رہنے دیا۔ پرشوتم کوشک ایک ناپائیدار حکومت کے وزیر تھے۔ انھوں نے بھی اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا۔

۱۹۸۰ء میں اندرا گاندھی دوبارہ اقتدار میں آئیں تو وسنت ساٹھے کو انفارمیشن براڈکاسٹنگ کا قلمدان دیا گیا۔ ٹیلی ویژن تجربے کے مرحلے سے نکل چکا تھا، اور بڑے پیمانے پر اس میں توسیع ہو رہی تھی۔ وسنت ساٹھے کی توجہ زیادہ تر ٹیلی ویژن پر رہی۔ رنگین ٹیلی ویژن تجرباتی طور پر ہندوستان میں آچکا تھا۔ زبان کے معاملے پر کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی اقلیتوں اور لسانی اقلیتوں کے تئیں اندرا گاندھی کا رویہ بدل چکا تھا۔ وہ واضح کر چکی تھیں کہ لسانی اکثریت اور مذہبی اکثریت کے بل پر وہ اقتدار میں آئی ہیں، اور انھیں اقلیت کی تائید کی ضرورت نہیں۔

یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کی انجمن کے صدر (اب سابق صدر، اور سرپرست) ڈاکٹر محمد حسن نے بتایا کہ اردو اساتذہ کا ایک ڈیلی گیشن وزیر اعظم سے ملا، تو، انجمن کے صدر نے ان سے اردو کو بہار اور یوپی میں دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ سن کر وہ سنجیدہ ہو گئیں، اور پوچھا، اس کے عواقب کے بارے میں آپ نے غور کیا ہے؟ ڈاکٹر محمد حسن نے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھے گی؟ اندرا گاندھی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

اندرا گاندھی کے دورِ ثانی میں اردو کی صورتِ حال ریڈیو میں وہی رہی جو پہلے تھی۔ البتہ ناگپور اسٹیشن سے، جو وسنت ساٹھے کا حلقۂ انتخاب تھا، جون ۱۹۸۰ء سے ہفتہ وار ۳۰ منٹ کا اردو میں پروگرام شروع ہوا۔ پروگرام کا افتتاح خود وسنت ساٹھے نے کیا۔ انھوں نے دو باتوں پر زور دیا۔ ایک یہ کہ ناگپور اور نواحی علاقوں میں مراٹھی بھائیوں کو اردو سے دلچسپی ہے، اور وہ شوق سے اردو پڑھ رہے ہیں۔ دوئم یہ کہ منشی پریم چند کی زبان عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہے۔ یہ ہندی بھی ہے۔ اور اردو بھی۔ اور ریڈیو براڈکاسٹ ایسی ہی زبان میں ہونا چاہئیں۔

Ministry Of Information and Broadcasting

Brief record of discussions held by MIB in his Chamber in Parliament House at 11 A.M. on September 3, 1976 regarding Urdu Services of AIR and Doordarshan Kendra, Amritsar.

Present

Minister of I&B

Dy. Minister of I&B

Ministry of I&B:

1.	Shri S.M.H. Burney	...	Secretary
2.	Dr. Ishwar Dass	...	JS (P&C)
3.	Shri A.V. Narayanan	...	DS (B)

D.G.A.I.R.

1.	Shri P.C.Chatterji	...	DG
2.	Shri U.L.Baruah	...	DDG
3.	Shri P.Mathur	...	Director (Ext. Services)
4.	Shri S.N.Kaul	...	Dy. Director (Ex. Services)
5.	Shri Aziz Hanfee	...	PEX

Doordarshan

1.	Shri N.L.Chowla	...	Addl. DG
2.	Shri G.K.Mthur	...	DDG
3.	Shri A.S.Tatari	...	StationDirector. Doordarshan Kendra, Amritsar.

1. The meeting was intended to find out how far Urdu services put out by AIR/Doordarshan Kendras were popular in India and Pakistan. The discussion emerged as a result of a press review feature circulated by the Indian News and Feature Alliances on "A Media relationship with Pakistan" based on letters received by AIR and Amritsar Doordarshan Kendra from listeners in Pakistan.

2. DG AIR pointed out that the Urdu Service of AIR was started on May 15, 1966 as part of its External Services. Within $6^1/_2$ months of its inception as many as 76,695 letters were received from listeners both in India and Pakistan, which were 44.4% of the total number of letters received by External Services Division. By 1971, the service had reached 73.3% mark i.e. 1,97,655 letters were received. When dak was resumed with Pakistan, the postal rates in that country were raised. Yet, the Pakistani listeners of the Urdu Service responded in large numbers. Today, the monthly receipt of letters from across the border ranges between 1000 to 2500. In India also, the Urdu Service has been very popular. During 1975, the Urdu Service received 1,36,027 letters from its listeners in the country. Upto August 31, 1976 the Service received 96,715 letters from the listeners in India. The listeners' response from India was mostly from Jammu, Himachal Pradesh, Punjab, Uttar Pradesh, Rajasthan, Gujarat,

parts of M.P., parts of Maharashtra etc.

3. The total duration of Urdu Service at present is 10 hours, divided into three transmissions from 7 A.M. to 10 A.M. in the morning, 2 P.M. to 5 P.M. in the afternoon and 8 P.M. to midnight in the night. The Service aims at presenting the totality of life and culture of the country through Urdu language. The most popular programme of course is the request programme which is broadcast thrice during the day, one in each transmission. The next in popularity is the listeners' letters programme broadcast twice a week. The response to interviews, particularly with the film personalities, is also encouraging. Listeners to serious programmes are also in considerable number and their comments are enlightening. The listeners in Pakistan offered mixed reaction to news and press reviews, commentaries and discussions on political topics.

4. DG AIR showed to MIB a few samples of letters received from across the border which were very moving and showed abundance of goodwill in the hearts of a large number of people in Pakistan towards this country.

5. DM stated that the basic problem was what kind of Urdu language we were using in our programmes. Was it persianised,

making it difficult for the masses to understand it easily? If so, a complete review of our language policy was required. He felt that AIR should use the language of the masses in its programmes be it Hindi or Urdu. It should not be the language which was ordinarily used in arguing in a court of law; it should be the language for communicating to the people. He also enquired if the 100 Kw transmitter at Goraya, near Jullundur, was powerful enough to be heard all over Pakistan as the Rajkot Mewat transmitter (which was actually operating on half of its power at present) was a beamed mostly towards West Asian countries.

6. MIB desired that the Urdu Service should primarily be for listeners in India and the language used in the programmes, should be simple so that it is possible to convey our point of view and to popularise the language. Further more, our aim in beaming an Urdu Service to Pakistan should be not only to reach Urdu speaking people who have migrated from India but also the others. Our language should accordingly be such as they can understand easily and we should not try to impose our own Urdu on them. A careful analysis should be made of the type of Urdu that the regional stations of Pakistan Radio use.

7. After detailed discussion, MIB gave the following directions:-

(1) DG AIR should make a careful analysis of the Urdu language used by (a) Regional Stations of Pakistan Radio in programmes put out by them; (b) listeners in Pakistan in the letters received in AIR/Doordarshan kendra, Amritsar; and (c) Urdu newspapers in Pakistan.

(2) The timings of the Urdu broadcast should also be examined. It should be specifically examined whether the number of radio stations putting out Urdu programmes should be increased.

(3) Similarly, an analysis should be made of the kind of Urdu and Hindi that is spoken and understood in different parts of this country. Here, the aim should be to bring the spoken Hindi and Urdu as nearer to each other as possible so that inter-changability of words may become possible. Toward this end, discussions should be held with scholars in the Universities, thinkers, poets, publishers, newspaper men etc. to arrive at a commonly acceptable language. An experiment may also be made in some programmes of AIR, where alternative words from Hindi and Urdu may be used.

(4) The percentage of Urdu programmes put out from Amritsar Doordarshan Kendra is 7 per cent. The percentage of Urdu programmes put out by Lahore TV Station should be worked out.

8. It was decided that AIR should complete the above exercise in about a month's time and submit its report to the Ministry so that it may be possible to give further directions in the matter.

No.606/4/76-TV New Delhi-1, dated the 21st Sept.,1976

Copy forwarded to :

1. DG:AIR (Shri P.C. Chatterji)
2. DDG:AIR (Shri U.L. Baruah)
3. Director, Ext. Services (Shri P. Mathur), AIR
4. Dy. Director, Ext. Services (Shri S.N. Kaul), AIR
5. PEX (Shri Aziz Hanfee), AIR
6. Addl. DG (Shri N.L. Chowla), Doordarshan
7. DDG: Doordarshan (Shri G.K. Mathur)
8. SD, Doordarshan Kendra, Amritsar (Shri A.S. Tatari)

R.K. Gupta

Under Secretary

Copy also to :

1. SA to MIB
2. PS to DM
3. PS to Secretary
4. PS to Addl. Secretary
5. JS (P&C)
6. DS (B)

ٹیلی ویژن کے پھیلاؤ سے اردو کو تقویت ملی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں:

۱۔ شروع میں اہم پر [illegible]، جو مقبول ہوئے فلموں سے آتے۔ پوری فلم ہفتے میں پہلے ایک بار ہوتی تھی، پھر دو بار ہونے لگی۔ چند کو چھوڑ کر تقریباً ساری فلمیں بول چال کی زبان میں ہوتی ہیں۔

۲۔ فلمی گانے، وہ غزلیں ہوں یا گیت، بول چال کی زبان میں ہوتے ہیں، اور یہی اردو ہے۔

۳۔ فلموں کی وضع پر ٹی وی فیچر بھی فلموں میں رائج زبان میں لکھے گئے۔ ان میں ریوتی سرن شرما کا سیریل اور بھی غم ہیں زمانے میں، منوہر شام جوشی کے سیریل ہم لوگ اور بنیاد — اور دوسرے سیریل خاندان، رجنی، مسٹر یوگی اور پنچھی وغیرہ شامل ہیں، کہ یہ سب فلموں کے نمونوں پر لکھے گئے ہیں۔ غالب بھی ایسا ہی ایک سیریل ہے۔

۴۔ ٹیلی ویژن کے لئے وہ سارے پروگرام، جو مسودہ سامنے رکھے بغیر، زبانی ہوتے ہیں چاہے وہ اسٹوڈیو سے ہوں یا اسٹوڈیو کے باہر ریکارڈ کئے گئے ہوں، عام طور سے بول چال کی زبان میں ہوتے ہیں۔

۵۔ غزل ایک صنف کی حیثیت سے ہندی ادب اور موسیقی، دونوں میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ سامعین کے سامنے گائی جانے والی یا پڑھ کر سنائی جانے والی غزلیں بول چال ہی کی زبان میں ہوتی ہیں۔

ریڈیو میں بھی فلموں یا فلمی گانوں پر مبنی پروگراموں کی زبان، بول چال ہی کی زبان ہوتی ہے۔ پھر ڈرامے میں، جیسا کہ دستور ہے، کردار اپنی زبان بولتے ہیں۔ اس لئے ہر اچھا ہندی ڈرامہ، اردو ڈرامہ بھی ہوتا ہے۔ ریڈیو کے پروگرام تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ سب اسٹوڈیوز میں ریکارڈ نہیں کئے جا سکتے۔ اسٹوڈیوز کے باہر ریکارڈ کئے جانے والے پروگرام علاقے کی بول چال کی زبان ہی میں ہوتے ہیں۔ اردو کے علاقوں میں ریکارڈ کئے جانے والے پروگراموں کی زبان، از روئے کاغذات اردو نہ بھی ہو، تو بھی، ہوتے اردو ہی کے پروگرام ہیں۔ البتہ کبھی کبھی اسٹوڈیو سے پڑھی جانے والی روایت تت سم لدی زبان بھی ہوتی ہے پہلے ایسا زیادہ ہوتا تھا۔ اب یہ رجحان کم ہو رہا ہے، اور نفیس اردو بولنا، اعلیٰ مرتبہ کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ پیش ہے، تشریف رکھیئے، فرمایئے وغیرہ رائج ہونے لگے ہیں، دوبارہ رائج ہونے لگے ہیں۔ اردو روزمرّہ کو اگر شکایت ہے، تو ریڈیو کے لئے تقریریں لکھنے والوں سے، اردو کے ادیبوں سے! آکاش وانی پٹنہ سے براڈکاسٹ ہونے والی ایک تقریر کا یہ ابتدائی حصّہ ہے[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

سیرت حضرت علی

مظفر نواب شیخپوروی

حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی عام انسانوں کی سی نہیں جن کی صفات و سیرت کا احاطہ کیا جائے یا بیان سیرت کو آسانی سے ضبط تحریر میں لایا جا سکتا ہو۔ آپ کی ذات گرامی سراپا سیرت تھی۔ اس لیے آپ کی سیرت کے کسی ایک رُخ اور گوشہ پر روشنی ڈال کر سوال سیرت کو اختتام کی منزل پر پہنچا دینا غلط ہوگا۔ علیؑ کی سیرت بحرِ ذخائر کی حیثیت رکھتی ہے ضرورت اس اتھاہ سمندر میں غواصی کی ہے۔ چنانچہ وہ ہر ایک گوہر نایاب جو غواصی کے بعد دستیاب ہوگا اس بیش بہا موتی کی مثال سیرتِ علی ہے اور ایسی سیرت کی توضیح و تشریح کے لیے عمرِ خضر درکار ہے پھر بھی سیرتِ علی خاطر خواہ طور پر احاگر نہ ہو سکے گی، بلکہ سچ تو یوں ہے کہ تشنۂ توضیح رہ جائے گی۔ وہ ذات جن کی صفات و پاکیزگی کردار و سیرت کا ادیان و مذاہب عالم کے ہر مکتبۂ فکر کے لوگ متفق ہوں۔ ان کے سیرت کے سلسلے میں خامہ کوتاہ رقم کو جنبش دینا بمصداق اس امر کے ہوگا کہ آفتاب روشن کو چراغ دکھایا جائے۔ ہاں سیرتِ علی کے سلسلہ میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر رسولِ اسلام یہ فرما سکتے ہیں کہ حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں یا ایک ہی نورِ واحد سے میری اور ان کی تخلیق ہے تو میں کیوں نہیں یہ جرأت کروں اور بہ بانگِ دہل اس کا اعتراف کروں اور زمانے کو بتاؤں کہ حضرت علی علیہ السلام کے کردار و سیرت و مراتب و مدارج و مناصب کے لئے یہی ایک اہم قولِ پیغمبرِ اسلام اور ارشادات جلیلہ کافی ہے۔ ہاں تو علی ہیں کون؟ حضرت علی جن کی ذات بابرکات بہ اعتبار سیرت و کردار مسلم الثبوت اور ناقابل اشتباہ تردید ہے۔ اس عالمگیر شخصیت کے پدر بزرگوار ہیں جن کی قربانیوں اور ایثار پر عالم انسانیت کو ناز ہے اور قولِ رسولؐ کے علاوہ کلام ربانی بھی رطب اللسان ہے۔ فدینا ھو بذبح العظیم ۰

ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والی تقریروں کا یہ کوئی نادر نمونہ نہیں ہے۔ بی بی سی سے نشر ہونے والی ایک تقریر سن کر پاکستان سے ایک سننے والے نے یہ خط لکھا:

لہ آواز۔ یکم اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۳۔

Directorate General :All India Radio

No. 21(2)/73-PI Dated New Delhi the 13th Sept., 73.

Memorandum

The question of Urdu spoken-word has been engaging the attention of the Ministry and the Directorate General for quite sometime. The various points were discussed in a meeting on 18.1.73 with DDG (I), DES, Addl. DES, JDNS, DP(P), DP(PP) and DCP(U). DCP(U) had earlier prepared a note on the subject.

DCP(U) was asked to make a survey of the news bulletins, announcements and talks broadcast in the Home Service as well as in the External Services Division. A copy of the first survey report pertaining to Urdu service, broadcast is attached. It may be useful not only for the ESD, NSD but also for stations which originate Urdu programmes. Action should be taken in accordance with the suggestions made to make the language of Urdu broadcasts simple and close to the spoken idiom.

P.C. Chatterji

Dy. Director General (P)

Copy to :

DG/DDG(TV)/DDG (I)/DES/SDD.

Station Directors

All India Radio

Bangalore, Dharwar, Hyderabad, Bhopal, Indore, Nagpur, Leh, Calcutta, Mathura, Jaipur and Radi Kashmir, Srinagar and Jammu.

Spare copies-10.

۶.۱.۸۶

حیدرآباد سندھ

جناب من

آج شام کو بی بی سی سے آپ کا انٹرویو سنا، کچھ زبان کے بارے میں۔ آپ کا یہ کہنا کہ اصل زبان یعنی ہندوستانی کو ہند کے دستور میں جگہ نہیں دی گئی اور ہندوستانی زبان جو عوام الناس بولتے ہیں اس کا ذکر خالص زبان کے سپاہیوں نے ممنوع کر رکھا ہے بالکل صحیح ہے۔ بازاروں میں بولی جانے والی زبان وہی ہندوستانی ہے جو کراچی لاہور یا دہلی اور بمبئی میں بولی جاتی تھی اور اب بھی بولی جاتی ہے۔ یہاں ریڈیو اور ٹی وی پر مشکل اُردو اور آپ کے یہاں مشکل تر ہندی سنتا ہوں تو سر پھوڑ لینے کو جی چاہتا ہے۔ اہل علم اگر اپنی ہندی کو سنسکرت آمیز اور اپنی اُردو کو عربی آمیز بنا لیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ ان کے قاری محدود ہیں اور حلقہ بھی مخصوص ہے لیکن ریڈیو ٹی وی بلکہ اخباروں میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیئے جو ہندوستان اور پاکستان کے گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ باگ بولتے آئے ہیں اور اب بھی بولتے ہیں۔

میں بی بی سی اکثر سنا کرتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہندی سروس میں کسی ہندوستانی کا انٹرویو نشر کیا گیا۔ انٹرویو لینے والے کی کٹھن ہندی اور جواب دینے والے کی رسیلی ہندوستانی میں بڑا فرق معلوم ہوا۔ ایک کی زبان سنکر دماغ کی رگیں کھنچ گئیں اور دوسرے کی گفتگو سنکر احساس ہوا جیسے ماں کی گود میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، آخر مادری زبان جو ہوئی۔

کیا میں نے غلط کہا؟

آج آپ کی باتیں سنکر سید سلیمان ندوی مرحوم یاد آگئے۔

فقط
نیازمند
نعیم الرحمٰن

لکھی جانے والی زبان اگر بولی جانے والی زبان ہو تو یہ خوبی ہے، لیکن اگر براڈکاسٹ کی زبان، بولی جانے والی زبان نہیں تو یہ عیب ہے۔

چوتھا باب

اردو پروگراموں کی زبان کا تجزیہ

براڈکاسٹ کا اسلوب تحریر کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے، اور وہ اس وجہ سے جو کچھ نشر کیا جائے، وہ فوراً سمجھ میں آ جائے۔ ایک لفظ ایک بار بولا جاتا ہے۔ نہ صرف لفظ وہ استعمال کئے جائیں، جو رائج ہوں اور عوام سمجھتے ہوں، بلکہ جملوں کی ساخت بھی بول چال کی ہو۔ ڈراموں کے مکالموں ہی میں نہیں، بلکہ بات چیت میں بھی۔ ریڈیو کی اصطلاح میں تقریبا ٹیچ نہیں ہے۔ ٹاک کی اصطلاح انگریزی میں بی بی سی نے استعمال کی۔ اسے گفتگو یا بات چیت کہنا چاہیئے، نہ کہ تقریر، جواب بھی آل انڈیا ریڈیو کے کچھ اسٹیشنوں پر رائج ہے۔ ریڈیو ٹاک میں متکلم اسٹوڈیو میں ہوتا ہے، اور سامع ریڈیو سیٹ کے سامنے اپنے گھر میں۔ یہ ضرور ہے کہ گفتگو دو طرفہ نہیں ہوتی، لیکن اچھی ریڈیو گفتگو میں براڈکاسٹر مائکروفون کو ایک آلہ ہی نہیں سمجھتا، جو اس کی آواز کو الکٹرومیگنیٹک لہروں میں بدلتا ہے، بلکہ مائکروفون کو وہ سامع یا سامع کا نمائندہ سمجھتا ہے، اور بے تعلقی سے بات نہیں کرتا، بلکہ سامعین سے براہ راست مخاطب ہو کر افہام و تفہیم کا ذاتی رشتہ پیدا کرتا ہے۔ لفظ نہیں دہرایا جا سکتا۔ جملہ بھی نہیں دہرایا جا سکتا۔ اس لیے جملہ چھوٹا ہو۔ پیچیدہ جملے کی براڈکاسٹ کے اسلوب میں کوئی گنجائش نہیں۔ اخبار یا کتاب میں عبارت سمجھ میں نہ آئے تو دوبارہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر کوئی مشکل لفظ ہے، تو لغت میں اس کے معنی بھی دیکھ سکتا ہے۔ ریڈیو براڈکاسٹ میں یہ سب ممکن نہیں۔ اگر کوئی لفظ براڈکاسٹ میں ایسا آ جائے کہ سامع نے اس کے بارے میں چند لمحے بھی سوچا، تو اتنی دیر میں کئی جملے گذر جائیں گے سلسلہ ٹوٹ جائے گا، اور براڈکاسٹ بے مصرف ہو گا۔

آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس، اس ملک میں سب سے بڑی اردو سروس ہے

اس باب کے لیے اس سروس سے براڈ کاسٹ ہونے والے کچھ پروگراموں کے حصوں کا تجزیہ پیش ہے:

''جہاں نما'': تاریخ: ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء : براڈ کاسٹ کا وقت شام سوا آٹھ بجے

ص : ۱۔ پیپلز پارٹی اپنی اکثریت کا سہارا لے کر، ایک ایسا آئین بنانے کے لئے کوشاں ہے کہ جس میں وزیر اعظم کو ایک ڈکٹیٹر کے سے اختیارات ہو جائیں۔ حزب اختلاف کے ان خدشات کو اس مخالفانہ کارروائی سے تقویت پہنچتی ہے کہ جو پاکستان میں آئین سازی کی مخالف آوازوں کو دبانے کے لئے جاری ہیں۔

ص : ۸۔ اخبار کے خیال میں ایکٹ کو نافذ کرنے اور یو پی کے مسلم ووٹروں کو برگشتہ کرنے کا ایک دوسرے سے جو تعلق ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ص : ۱ کی عبارت، جو اقتباس کی گئی ہے، کُل دو جملوں پر مشتمل ہے۔ پہلے جملے میں ۲۹ لفظ ہیں۔ اور اتفاق یہ ہے کہ دوسرے جملے میں بھی ۲۹ لفظ ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ زبان بھی درست نہیں ہے، یہ تحریر کا اسلوب ہے، اور وہ بھی طبعزاد تحریر کا نہیں۔ یہ اسلوب پیچیدہ انگریزی جملے کو پیچیدہ اردو جملے میں منتقل کرنے کا ہے۔ '' ایک ایسا آئین بنانے کے لئے کوشاں ہے کہ جس میں . . . . .'' کہ بیانیہ کا یہ استعمال اگر غلط نہیں، تو اَٹ پٹا ضرور ہے، کیونکہ اس طرح نہ بولتے ہیں، اور نہ لکھتے ہیں۔ کوشاں اور خدشات، خبروں، یا حالاتِ حاضرہ کے تبصروں کے لیے مناسب نہیں۔

براڈ کاسٹ کے لیے عبارت کا اسلوب کچھ یوں ہونا چاہیئے تھا:

'' نیشنل اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی بھاری اکثریت ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اس غالب اکثریت کے زور پر پیپلز پارٹی ایسا آئین بنانا چاہتی ہے جس میں وزیرِ اعظم کے اختیارات غیر محدود ہوں۔ ان اختیارات پر کوئی پابندی نہ ہو۔ وزیرِ اعظم کو ایسے مطلق اختیارات حاصل ہوں، جو آمریت میں ڈکٹیٹر کے ہوتے ہیں۔ حزبِ اختلاف ایسے کسی آئین کے حق میں نہیں۔ اس کی آواز سختی سے دبائی جا رہی ہے۔ اس سے حزبِ اختلاف کو بڑے اندیشے پیدا ہو گئے ہیں۔''

ص ۸: کی عبارت پر تبصرہ ختم ہوتا ہے۔ برگشتہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں ہوا ہے مسلم ووٹروں کو کس سے برگشتہ کرنے کا ذکر ہے، یہ بات صاف نہیں ہے، اس لیے اُلجھن کا باعث ہے۔ یوں بھی برگشتہ خبروں اور خبروں پر تبصروں یا اخباروں کے اداریوں کے ترجموں کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پریس ریویو: تاریخ: ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء : براڈکاسٹ کا وقت: ۳ بج کر ۴۰ منٹ (سہ پہر)

ص ۱: "۔ ۔ ۔ یہ ہند اور پاکستان کو ایک ہی سطح پر رکھنے کی مصنوعی اور بناوٹی کوشش ہے۔" "مصنوعی اور بناوٹی کوشش" کوئی زبان نہیں ہے۔ جملہ تحریر کے اسلوب میں بھی، اور براڈکاسٹ کے لیے بھی یوں ہونا چاہیے تھا۔

"ہندوستان اور پاکستان کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسا کرنا زیادتی ہے۔"

ص ۲: "اس برصغیر میں امریکی فوجی مداخلت کسی اس شخص کے لئے تعجب خیز نہیں ہے، جس نے امریکی جغرافیائی پالیسی کی پیش رفت کو نظر میں رکھا ہے۔"

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس ایک جملے میں بھی ۲۹ لفظ ہیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ پیچیدہ جملہ براڈکاسٹ کے اسلوب کے لیے موزوں نہیں ہے، تبصرہ نگار نے geo-Politics کو جغرافیائی پالیسی کہا ہے، جو مضحکہ خیز ہے۔ جملہ بہت الجھا ہوا ہے، اور ریڈیو کے ایک سامع کے لیے اس کا سمجھنا، اور فوراً سمجھنا ممکن نہیں، کیونکہ "جغرافیائی پالیسی" کے کوئی معنی نہیں۔ زبان کے اعتبار سے بھی "تعجب خیز" درست نہیں۔ "حیرت کی بات نہیں"، یا ناقابلِ فہم نہیں" لکھا جا سکتا تھا۔ برِصغیر سے پہلے "اس" کی بھی ضرورت نہیں۔ "پیش رفت کو نظر میں رکھا ہو" بھی خبروں اور حالاتِ حاضرہ کے پروگراموں کے لئے ٹھیک زبان نہیں۔ "کسی ایسے شخص" براہ راست انگریزی کے Any one کا ترجمہ ہے اور اُردو کے محاورے میں ایسے مقام پر عجیب لگتا ہے۔ یہی بات یوں بھی لکھی جا سکتی تھی:

"جو لوگ امریکہ کے خصوصی مفادات اور دنیا میں اس کی علاقائی پالیسیوں سے واقف ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ برصغیر میں فوجی مداخلت کی وجہ کیا ہے؟"

اخبارات کی رائے: تاریخ: ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء: براڈکاسٹ کا وقت: ۳ بجکر ۴۰ منٹ (سہ پہر)

ص: ۵: " پاکستان کو ہتھیار مہیا کرنے پر پابندی ہٹانے کے سلسلے میں امریکہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ صرف بہانہ بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔"

پورا جملہ الجھا ہوا ہے۔ " پابندی ہٹانے کے سلسلے میں" بھی غلط نہیں ہے، لیکن "پابندی ہٹانے کے حق میں" زیادہ اچھا طرزِ بیان ہے۔ دلیل کی جمع دلائل درست ہے، لیکن جمع ہندوستانی قاعدے سے بنانا چاہیے۔ دخیل لفظوں کی، اگر فارسی / عربی جمع رائج ہے، جیسے خیالات تو حرج نہیں۔ "وہ صرف بہانے بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں"۔ صرف زائد لفظ ہے۔ کچھ نہیں کافی تھا۔ ہیں زیادہ ہے۔

تبصرہ: تاریخ: ۱۵ مارچ ۱۹۸۳ء

تبصرہ یوں شروع ہوتا ہے:

" کاشتکاری کے قومی کمیشن نے پارلیمنٹ کو دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام کے سلسلے میں جو عبوری رپورٹ پیش کی ہے اُس پر اخبارات میں خاصا ردِ عمل ہوا ہے۔"

اداروں کے نام اور اصطلاحیں طے ہو جائیں تو ہمیشہ وہی استعمال کرنا چاہئیں ورنہ سننے والوں کے لیے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور ترسیل ادھوری ہوتی ہے۔ ادھوری ترسیل، ناکام ترسیل ہے۔ "زراعت سے متعلق قومی کمیشن" رائج ہے، اور اس سے انحراف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجموعی کا لفظ نہ صرف فضول ہے، بلکہ اس سے بات بھی الجھ جاتی ہے۔ "اخبارات میں خاصا ردِ عمل ہوا ہے" ترسیل کی زبان نہیں ہے۔ "اخباروں نے بھی اس کے بارے میں لکھا ہے"۔ سیدھا اور صاف سمجھ میں آنے والا جملہ ہے۔ "ردِ عمل" کی ضرورت نہیں تھی۔ انگریزی کاپی کا شاید یہ لفظی ترجمہ ہے۔ خاصا، مبہم ہے، 'کافی کچھ' یا بہت کچھ فوراً سمجھ میں آنے والے فقرے ہیں، اور ان کے معنی بھی واضح ہیں۔

اسی تبصرے میں ایک جملہ یہ بھی ہے:

" سچ تو یہ ہے کہ کمیشن کی تجویزیں رجعت پسندی کی طرف مائل ہیں۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ "رجعت پسندی" کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ "رجعت پرستی" لکھا جانا چاہیے تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ پروگرام، جس کے سامعین دوسرے ملک میں ہوں، اور اس ملک سے نہایت دوستانہ تعلقات نہ ہوں، تو اس میں اپنے

کسی قومی کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں یہ کہنا مناسب نہ تھا۔

اسی تبصرے میں یہ عبارت بھی ہے :

"کمیشن نے جس اسکیم کا سجھاؤ دیا ہے، اس میں کچھ قابل عذر چیزیں ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ اسکیم قطعی طور پر سیاسی نہیں ہے، کیونکہ یہ صرف زرعی اصلاحات کا احاطہ کرتی ہے۔ زمین کو یکجا کر کے موجودہ مالکان میں دوبارہ تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زمینی ملکیت کا موجودہ انداز دائمی نوعیت کا ہو جائے گا۔ اس طرح کے کسی بھی نظام میں مالداروں اور کسانوں کے بااثر طبقے کو ہی فائدہ پہنچنے والا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے صوبوں کے تجربات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ زمینی چک بندی بہت طویل اور دشوار طلب عمل ہے۔ فی الحال جو طریقہ کار ہے، اس کے تحت، خوشحال اور بااثر طبقے ہی زمین کا زیادہ حصہ پانے کی پوزیشن میں ہیں۔"

زبان کے بارے میں کوئی بات نفسِ مضمون سے بالکل الگ ہٹ کر نہیں ہو سکتی، کیونکہ مضمون بنیادی ہے، اور زبان سے اسی کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل یہ چک بندی کی اسکیم کی بنیاد پر منصوبہ بنایا گیا۔ بڑے کسانوں اور "مالداروں" کی تو بڑی بڑی زمینیں تھیں چھوٹے کسانوں کی چھوٹی چھوٹی زمینیں، اور وہ بھی ٹکڑوں میں مختلف جگہوں پر بکھری ہوئی تھیں اس حقیقت کو سامنے رکھیں، تو زیادہ فائدہ مارجنل یعنی چھوٹے کسانوں کو تھا۔ یہ بات ان لوگوں کو پسند نہیں تھی، جن کے بڑے رقبے تھے، کیونکہ بکھرے ہوئے چھوٹے رقبے، چک بندی کے بعد بڑے رقبے کی صورت میں چھوٹے کسانوں کو ملتے۔ تبصرہ نگار کا طبقاتی کردار صاف بول رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر جی ایس بھلا نے انگریزی میں یہ تبصرہ لکھا۔ ہوم سروس میں یہ براڈ کاسٹ شاید قابلِ اعتراض نہ ہوتا، اگر سیدھی بات چیت کے بجائے پروفیسر بھلا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے، اور دوسرے جوان کا اس پر بحث کرتے۔

مجموعی طور سے ترجمہ براڈ کاسٹ کے اسلوب میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، جو فوراً سمجھ میں آجاتے ہیں، لیکن کچھ پہلو اور بھی ہیں۔

۱۔ "اس میں کچھ قابلِ غور چیزیں ہیں"۔ لفظ چیزیں درست نہیں ہے۔

باتیں بہتر ہے۔ ''اس کے کچھ قابلِ غور پہلو بھی ہیں۔'' بھی ہو سکتا تھا۔

۲۔ ''۔ ۔ ۔ کیونکہ یہ زرعی اصلاحات کا احاطہ کرتی ہے۔'' یہ تحریری اسلوب ہے۔ براڈ کاسٹ کی زبان نہیں۔ ''اس کا تعلق زرعی اصلاحات سے ہے۔'' صاف جملہ ہوتا تو اچھا تھا۔

۳۔ '' زمین کو یکجا کر کے موجودہ مالکان میں اس کی دوبارہ تقسیم ہوتی ہے۔'' جو لوگ چک بندی سے واقف نہیں، وہ اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ کچھ یوں لکھنا چاہیئے تھا۔ ''ایک گاؤں میں مختلف لوگوں کی ساری زمینوں کی پیمائش کی جائے گی، اور ہر شخص کو اس کی زمینوں کا مجموعی رقبہ ایک جگہ دے دیا جائیگا۔'' ''مالک کی جمع مالکان'، درست ہے، لیکن یہ پٹواریوں کی زبان ہے۔ براڈکاسٹ کی زبان ''مالکوں'' ہے۔

۴۔ ''اس کے معنی یہ ہیں کہ زمینی ملکیت کا موجودہ انداز دائمی ہو جائے گا۔'' زمینی ملکیت درست نہیں ہے۔ ''زمین کی ملکیت'' ہونا چاہیئے تھا۔ انداز کے بجائے طریقہ ہونا چاہیئے تھا۔ دائمی فوراً سمجھ میں آنے والا، اور سب کو سمجھ میں آنے والا لفظ نہیں ہے۔ مستقل لکھنا چاہیئے تھا۔

۵۔ ''اس کے علاوہ بہت سے صوبوں کے تجربات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ زمینی چک بندی بہت طویل اور دشوار طلب عمل ہے۔'' ہندوستان میں صوبے نہیں، ریاستیں ہیں۔ یا تو پردیشوں لکھا جاتا، یا ریاستوں۔ ''زمینی چک بندی'' درست نہیں۔ زمین یا زمینوں کی چک بندی لکھنا چاہیئے تھا۔ ''طویل اور دشوار طلب عمل'' تحریری اسلوب ہے۔ ''لمبا اور مشکل عمل ہے۔'' عمل سے بہتر کام ہے۔

''جہاں نما''۔ تاریخ: ۱۵ مارچ : براڈکاسٹ کا وقت: سوا آٹھ بجے شام

''پاکستان کو امریکی ہتھیاروں کی، اور ہند کو روسی ہتھیاروں کی فراہمی کو ایک ہی سطح پر رکھنا گمراہ کن کوشش ہے۔''

''گمراہ کن کوشش'' درست نہیں ہے۔ یہ بات کچھ اس طرح لکھنا چاہیئے تھی۔ ''امریکہ، پاکستان کو ہتھیار دے رہا ہے، ہم سوویت یونین سے ہتھیار

حاصل کر رہے ہیں۔ ہتھیار دونوں ملک لے رہے ہیں، لیکن دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے دونوں کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ جو ایسا کرتے ہیں، وہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

کم سے کم لفظوں میں بات کہنا ادب میں بہت اچھی بات ہے۔ اسے ایجاز کہتے ہیں۔ لیکن ریڈیو پروگرام میں، خاص طور سے اگر اس کی نوعیت سیاسی ہو، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کے قاعدے کو ہمیشہ نہیں اپنایا جا سکتا۔ مقصد خیال کی ترسیل ہے، اور اسی کی اہمیت ہے۔

اخبارات کی رائے: تاریخ ۱۶ مارچ: براڈ کاسٹ کا وقت شام ۸ بجکر ۲۰ منٹ

"پاکستان کو امریکی ہتھیاروں کی دوبارہ فراہمی ایک بدقسمت واقعہ ہے۔"

شاید unfortunate incident کا ترجمہ بدقسمت واقعہ لیا گیا ہے۔ اُردو کے محاورے میں یہ درست نہیں ہے۔ "افسوسناک" یا "تکلیف دہ" بات لکھنا چاہیئے تھا۔

"جہاں نما" تاریخ ۱۶ مارچ : شام سوا آٹھ بجے۔ براڈ کاسٹ

ص ۱: ". . . . مسٹر سورن سنگھ نے مسٹر سنگھ ورما اور دوسرے ممبرانِ پارلیمنٹ کو بتایا۔ . . ." "پارلیمنٹ کے دوسرے ممبروں کو بتایا" درست زبان ہے۔ ممبر انگریزی لفظ ہے، اور اردو میں بھی رائج ہے، دخیل لفظ کی حیثیت سے۔ اس کی جمع ہندوستانی قاعدے سے ہی بنانا چاہیئے۔ لوگ ممبران لکھتے اور بولتے ضرور ہیں، اور ظاہر ہے سمجھتے ہیں لیکن فارسی / عربی قاعدے سے جمع بنانا کیا ضروری ہے؟

ص ۲: ". . . . مسٹر سورن سنگھ، مسٹر بھوپیش گپتا کی اس تجویز پر غور و خوض کرنے کے حق میں تھے۔" غور و خوض غلط نہیں ہے، لیکن یہاں مناسب نہیں ہے۔ پھر غور کا لفظ رائج ہے، خوض رائج نہیں ہے۔ رائج سے مراد یہ ہے کہ سامعین کی اکثریت کے لیے یہ نامانوس لفظ ہے۔ پھر خوض کے اضافے سے معنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لیے صرف غور کافی تھا۔

"مسٹر سورن سنگھ نے کہا کہ اگر پاکستان، ہند اور پاکستان کے باہمی گفت وشنید میں بنگلہ دیش کی شمولیت پر پابندی نہ لگائے، تو اس سے جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل ہونے میں مدد ملے گی۔" عبارت الجھی ہوئی ہے۔ بات چیت کے بجائے گفت وشنید اسے بول چال سے اور دور پھینک دیتی ہے۔ یہ بات یوں بھی لکھی رکھی جا سکتی تھی:

"مسٹر سورن سنگھ نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کی آپس کی بات چیت میں اگر بنگلہ دیش کے حصہ لینے پر پاکستان اعتراض نہ کرے تو مناسب ہوگا۔ اس سے جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل کرنے میں مدد ملے گی۔"

ص ۹: "اخبار ہندوستان ٹائمز، ترکی کی موجودہ صورتِ حال پر اداریہ قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔ ۔ ۔" قلم بند کرنا اور لکھنا، ایک ہی بات ہے۔ یہ ہاؤلہ ہے۔ جیسے نوش کرتے ہوئے کھایا، فرماتے ہوئے کہا وغیرہ! اس کے علاوہ دنیا بدل گئی ہے۔ اُردو اخباروں کے اداریے قلم بند کیے جاتے ہیں۔ انگریزی اخباروں میں تو ایڈیٹوریل اسٹینوگرافر کو ڈکٹیٹ کیے جاتے ہیں، جو ٹائپ کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ یہ تو خیر ذرا ہٹ کر بات ہے۔ قلم بند اور اس قسم کی زبان ریڈیو براڈکاسٹ کی نہیں ہے۔ سیدھی سی بات سیدھے طریقے سے کہنا چاہیے تھی۔

"۔ ۔ ۔ ۔ انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے ترکی کی صورتِ حال پر اداریے میں لکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔" یہ ہے براڈکاسٹ کی زبان۔

ایک اور نمونہ

"۔ ۔ ۔ دریں اثنا فوج نے یہ دھمکی دی ہے۔"

دریں اثنا تو اب تحریر کی زبان بھی نہیں رہی ہے۔ شاذ ہی کوئی لکھتا ہو۔ جو کام اور سے یا اس درمیان میں سے چل سکے، اس کی جگہ خواہ مخواہ دریں اثنا لکھنے کی ضرورت؟

ص: ۱۰ "۔ ۔ ۔ فوج کے نمائندے کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تو فوج ملک پر قابض ہو جائے گی ۔ ۔ ۔" "انتخاب عمل میں نہیں آیا" روزمرے سے دور ہے۔

" ملک پر قابض ہو جائے گی " بھی کوئی اچھا جملہ نہیں ہے۔ صاف طریقے سے بات کہی جا سکتی تھی:

" اگر فوج کے نمائندے کو منتخب نہیں کیا گیا، تو فوج حکومت سنبھال لے گی۔ . . . "

"اخبارات کی رائے" ۱۶ مارچ: براڈ کاسٹ کا وقت: سہ پہر ۳ بج کر ۴۰ منٹ

ص: ۲ "اخبار مزید لکھتا ہے کہ امریکی خارجی امور کے شعبے کے ترجمان نے دوسرے ممالک کے ذریعے پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے، وہ عالمی رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔"

"مزید لکھتا ہے"، بول چال کی زبان نہیں ہے۔ خارجہ امور کی جگہ خارجی امور غلط ہے۔ "کے شعبے" زیادہ ہے۔ وزارتِ خارجہ کا ترجمان کافی ہے۔ کس شعبے کا ترجمان ہے، یہ نہیں بتایا گیا ہے۔ "مترادف" براڈ کاسٹ کی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ "آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے" کافی تھا۔ مترادف کی جگہ "کے برابر" بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ عبارت کو چھوٹے جملوں میں توڑا جا سکتا تھا:

" اخبار یہ بھی لکھتا ہے کہ پاکستان کو دوسرے ملکوں کے ذریعے ہتھیار دیئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں امریکی امورِ خارجہ کے ترجمان نے جو وضاحت کی ہے، وہ رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش ہے۔"

ہند پارلیمانی کارروائی: تاریخ: ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء: براڈ کاسٹ کا وقت: سہ پہر ۴ بجے

پروگرام کا عنوان ہی نادرست ہے۔ "ہند پارلیمنٹ کی کارروائی" ہونا چاہیئے۔ اُردو میں دخیل لفظ کو کرنے میں کیا دانشمندی ہے؟ کارروائی چونکہ دلّی سے نشر ہوتی ہے، اس لیئے ظاہر ہے ہماری پارلی منٹ کی ہوگی۔ اس لیئے "پارلی منٹ کی کارروائی" سے زیادہ مناسب کوئی اور عنوان نہیں ہو سکتا۔

ص: ۱ ا۔ " حالیہ مہینوں میں یہ خوشگوار علامت پیدا ہوئی ہے کہ جہانین نے

تعلقات میں بہتری لانے کی اُمید کا اظہار کیا۔"

علامت کے بجائے فضا ہونا چاہیئے۔ جانبین (فریقین) کی طرح تھانہ اور کچہری کی زبان ہے ریڈیو ڈرامے میں ایسے کردار ہوں تو وہاں یہ لفظ ٹھیک ہے۔ حالاتِ حاضرہ او تبصروں کے لیئے یہ لفظ نہیں ہے۔ "تعلقات میں بہتری لانے" کے بجائے "تعلقات بہتر بنانے" ہونا چاہیئے تھا۔

تبصرہ : تاریخ : ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء

دوسرے پیراگراف کا پہلا جملہ ہے :

"ہند میں غربت استحصال کا نتیجہ ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے یہ استحصال صدیوں جاری رہا۔"

یہ تبصرہ انگریزی کمنٹری کا ترجمہ ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے :

Poverty in India is the result of exploitation, during several centuries, by foreign rulers.

پروگراموں میں صدیوں کا تعین کرنا چاہیئے۔ ایسے براڈ کاسٹ ہوتے رہتے ہیں، جن میں بیرونی حکمرانوں کا ذکر ہوتا ہے، اور ان میں اورنگ زیب ہی نہیں اکبر کو شامل کیا جاتا ہے۔ ایسے پروگراموں میں بات واضح ہونا چاہیئے۔ غیر ملکی حکمرانوں کا ذکر ہو، تو زمانے کا واضح تعین ہونا چاہیئے، ورنہ ریڈیو براڈ کاسٹ شعوری یا غیر شعوری طور پر نا خوشگوار اور نادرست تاریخ کا احساس پیدا کر رہے ہیں۔

ص ا: "ہند کے منصوبہ بندوں کا خیال ہے کہ اس غربت کو دور کرنے کے لیئے ابھی دسیوں سال درکار ہیں۔" "منصوبہ بندوں" مضحکہ خیز ہے۔ منصوبہ سازوں یا ہمارے منصوبہ بنانے والوں، استعمال کرنا چاہیئے تھا۔

اقتصادی جائزہ : تاریخ ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء :

ص : ۵ : "منظم شور و غل کے اس دور میں خوب و زشت کا تعین بہت دشوار ہے۔ بجٹ پر بالخصوص معروضی محاکمہ دشوار تر ہے۔"

کچھ اردو ناقد تو ایسی منتعلق نثر لکھتے ہیں، خاص طور سے اس وقت جب ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی۔ ایسی فارسی زدہ نثر اقتصادی جائزے کے لیئے یقیناً

نامناسب ہے۔ اس عبارت میں صرف یہ الفاظ دیسی ذخیرے کے ہیں: کے 'اس' 'میں' 'کا' 'بہت' 'ہے' 'پر' ہے۔ باقی سب وہ دخیل الفاظ ہیں، جن میں سے دشوار کو چھوڑ کر، جو دوبار آیا ہے، اور شور و غل کے علاوہ باقی الفاظ بول چال میں کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ دو جملے عبرت کے طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہیں کہ براڈکاسٹ کی زبان کیا نہیں ہونا چاہیئے۔

بچوں کی خبریں، تاریخ: ۲۱ مارچ ۱۹۷۳ء

بچوں کے لیئے اس بلٹین میں یہ جملے بھی ہیں:

۱۔ ''ان کھیلوں کے علاوہ معذور افراد کو عملی زندگی گذارنے کی تربیت دینے والے بیس اداروں نے اپنے یہاں کے معذور بچوں اور بڑوں کی بنائی ہوئی تصویروں کی ایک نمائش کا انتظام کیا۔''

بچوں کے لیئے بولا ہوا جملہ ۳۴ لفظوں کا ہے۔ یہ تحریر کی زبان ہے، اور وہ بھی بچوں کے لیئے نہیں!

۲۔ ''ان کی طرف سے مایوس ہونا مناسب نہیں۔''

بچے مخاطب ہیں۔ کہنا چاہیئے تھا۔ دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ لگن کے ساتھ کوشش کریں گے، تو کامیاب ضرور ہوں گے۔

۳۔ اس مشین کے یاد داشت کے حصے میں چونسٹھ آوازوں کا مجموعہ محفوظ ہے۔ اگر کچھ اس طرح بچوں کو سمجھایا جاتا: ''ہم تم سنتے کان سے ہیں، لیکن کانوں کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ یاد رکھنے کا کام دماغ کا ہے۔ جب ہم کوئی پہلے سنی ہوئی آواز سنتے ہیں، تو دماغ یاد دلا دیتا ہے کہ یہ سنی ہوئی آواز ہے، اور کس کی ہے۔ اس مشین کو بھی چونسٹھ آوازیں یاد رہتی ہیں۔

۴۔ ''اس انوکھی مشین کے ذریعے مختلف زبانوں کی صوتی تحقیق کرنے میں مدد ملے گی۔''

صوتی تحقیق، بچوں کی سمجھ سے اوپر کی کوئی چیز ہے۔ کچھ اس طرح بچوں کو سمجھایا جا سکتا تھا: زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کچھ آوازیں دونوں زبانوں میں ہوتی ہیں، اگر ہم دو زبانوں کو لیں۔ اب کچھ آوازیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو ایک میں ہوتی ہیں، دوسری میں نہیں۔ زبانوں میں آوازوں کے بارے میں کام کریں، تو یہ مشین بہت مدد کر سکتی ہے۔

۵۔ ''اس نے توپ کے گولوں کے خول امریکہ سے ردّی کے بھاؤ خرید لیے۔''
ردّی کاغذ اور گتے وغیرہ کو کہتے ہیں۔ باقی ردّی نہیں، کباڑ کہلاتا ہے۔ توپ کے گولوں کے خول کے بجائے بموں کے خول لکھنا چاہیے تھا۔

تبصرہ: تاریخ ۲۱ مارچ ۱۹۷۳ء

۱۔ ص ۲: ''جنوبی افریقہ نسلی تعصّب سے متعلق ایک کلاسیکی مثال کا آئینہ دار ہے۔''
یہ تبصرے، خبروں، حالاتِ حاضرہ کی زبان نہیں۔ کلاسیکی ادب کی زبان شاید ہو سکتی ہے۔ دراصل غلطی انگریزی کاپی کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش میں ہوئی ہے۔ لفظی ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ آئینہ دار کے اُس پاس کا لفظ انگریزی کاپی میں نہیں ہے۔ انگریزی:

South Africa represents a classic example of the manifestation of racial intolerance.

براڈکاسٹ کے لیے، یہ بات اردو میں یوں کہی جانا چاہیے تھی:
''جنوبی افریقہ نسلی تعصّب کی بدترین مثال ہے۔''

۲۔ ''گاندھی جی نے وہیں سے اپنی عدم تشدّد پر مبنی مدافعانہ تکنیک شروع کی۔''
یہ جملہ براڈکاسٹ کے اسلوب سے بہت دور جا پڑا ہے۔ اور وجہ یہی ہے کہ ترجمہ میں مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خبروں کے ترجموں میں اگر کوئی بیان ہے تو اس کا ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ لغوی بھی ہو اور با محاورہ بھی۔ اگر محاورے سے زیادہ نہیں، زیادہ دور جا پڑے تو بھی قابلِ قبول ہے۔ لیکن تبصروں میں بنیادی مسوّدہ اتنا ''مقدس'' نہیں ہوتا۔ مقصد ہوتا ہے کہ جو نکات اس میں ہیں، اسی استدلال سے پیش کیے جائیں۔ انگریزی کاپی:

...It was there that Gandhi Ji started and developed his technique of non-violent resistance.

یہ بات براڈکاسٹ کے لیے کچھ اس طرح لکھنا چاہیے تھی:
''اور یہیں گاندھی جی نے اہنسا اور عدم تشدّد سے زیادتیوں کا مقابلہ کرنے کا طریقہ شروع کیا۔''

۳۔ ص ۴: ''سفید فام حکّام کے ذہنوں پر سفید نسل کے تحفّظ کا ایسا بھوت طاری ہے۔ ۔ ۔ ۔''

بھوت طاری نہیں ہوتا، بھوت سوار ہوتا ہے۔

۴۔ "اُنھیں بجلی کے شاک دیئے جاتے ہیں۔ انتہائی بے دردی سے انھیں کوڑے لگائے جاتے ہیں، اور اُنھیں خودکشی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔"

یہ اس انگریزی عبارت کا ترجمہ کیا گیا ہے :

Electric shocks, brutal floggings and suicides in highly compromising situations have been revealed in inquests.

یہ بات اُردو میں، براڈکاسٹ کے لیئے یوں لکھی جا سکتی تھی :

"عدالتی تحقیقات سے بجلی کے جھٹکے دینے، بے دردی سے مار پیٹ اور انتہائی تکلیف دہ حالات میں خودکشی کے واقعے سامنے آئے ہیں۔"

ص ۵: ۵۔ "تہذیب یافتہ ممالک اس صورتِ حال کو قبول نہیں کر سکتے۔"

"تہذیب یافتہ ممالک کے بجائے تہذیب ملک" ہونا چاہیئے تھا۔

جہاں نما، تاریخ ۲۳ مارچ : براڈکاسٹ کا وقت سوا آٹھ بجے شام

ص ۱: "۔ ۔ ۔ ۔ ہند کی وزارتِ خارجہ کے ذمہ داران کو ایک بار پھر اُمید کی کرن ابھرتی ہوئی نظر آئی ہے۔"

"کے ذمہ داران" اور "ابھرتی ہوئی" کاٹ دیں تو جملہ براڈکاسٹ کے لیئے مناسب ہوگا۔ یوں بھی لہر ابھرتی ہے، کرن نہیں اُبھرتی!

ص ۲: "۔ ۔ ۔ ۔ ممبران پارلیمنٹ کو بتایا کہ ہند اور پاکستان کے درمیان موجودہ جمود کو توڑنے کے لیئے ہند، کوششی تدابیر پر غور کر رہا ہے۔"

انگریزی کاپی نہیں مل سکی، اس لیئے یہ پتہ نہ چل سکا کہ "کوششی تدابیر" کس کا ترجمہ فرمایا گیا ہے۔ ... contemplating effective measures,

یا اس سے ملتا جلتا کوئی فقرہ ہوگا۔

اُردو میں یہ بات یوں کہی جا سکتی تھی :

"۔ ۔ ۔ ۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو بتایا کہ ہندوستان سنجیدگی سے ایسے اقدامات کے بارے میں غور کر رہا ہے جن سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجودہ جمود کی برف پگھلے گی۔"

ص ۳: ''اخبار لکھتا ہے کہ اب بنگلہ دیش کے انتخابی نتائج سامنے آچکے ہیں۔''
''انتخابی نتائج'' کوئی ترکیب نہیں۔ ''انتخاب کے نتیجے'' یا ''چناؤ کے نتیجے'' ہونا چاہیئے تھا۔

> ''ہند اور پاکستان نے اپنے تعلقات میں پچھلے پچیس برسوں کی ناخوشگوار صورتِ حال پر ہی قناعت کرنا شروع کر دیا ہے۔''

یہ بھی انگریزی سے نہ صرف ترجمہ ہے، بلکہ معلوم بھی ہوتا ہے۔ بائیس لفظوں کے اس ایک جملے میں جو بات کہی گئی ہے، وہ اردو محاورے میں، ریڈیو کے اسلوب میں بھی لکھی جا سکتی تھی۔

> ''چوتھائی صدی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو تعلقات ہیں، وہ بہت خوشگوار اور تسلی بخش نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے دونوں ملک اس معاملے میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگے ہیں۔''

''قناعت کرنا سیکھ لیا ہے'' انگریزی کاپی کا لغوی ترجمہ تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ صحافت، اور خاص طور سے ریڈیو کی صحافت کی زبان نہیں ہے۔

ص ۴: ''ایک قابلِ قبول حل کی جستجو کے عمل میں، ان دونوں مسئلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے۔''

''حل کی جستجو کے عمل میں'' واضح طور سے انگریزی کاپی کی عبارت کا لغوی ترجمہ ہے، جو اردو کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ بڑی آسانی سے یہ بات یوں لکھی/کہی جا سکتی تھی:

> ''قابلِ قبول حل اسی وقت ممکن ہوگا، جب دونوں مسئلوں کو جوڑ دیا جائے۔''

ص ۷: ''اخبار انڈین ایکسپریس نے متصادم سیاست کے عنوان سے راولپنڈی سے راجندر سرین کا ایک خط شائع کیا ہے۔''

اردو سروس چونکہ دوسرے ملکوں کے لیئے بھی ہے، اس لیئے روزنامہ ''انڈین ایکسپرس'' لکھنا چاہیئے تھا۔ اخبار غلط نہیں ہے، لیکن اپنے ملک کے سامعین کے لیئے یہ مناسب ہے۔ ''متصادم سیاست'' غلط ترجمہ ہے۔ ''ٹکراؤ کی سیاست'' سے بات سمجھ میں آتی ہے۔
تیسری اہم بات یہ ہے کہ اخبار نویسی کی اصطلاح میں ''خط'' اُسے کہتے ہیں، جو قاری ''ایڈیٹر'' کے نام لکھتے ہیں اور ان کے لیئے کالم مخصوص ہوتا ہے۔ انگریزی میں ''لٹر فرام راولپنڈی'' نامہ نگار کا اسپیشل ڈسپیچ یا خاص رپورٹ کہلاتی ہے۔ اُنیس لفظوں کے اس جملے کے بجائے، ریڈیو کے اسلوب میں یہ لکھا جا سکتا تھا:

"روزنامہ انڈین ایکسپریس نے راولپنڈی سے ایک خاص رپورٹ چھاپی ہے۔ یہ رپورٹ راجندر سرین نے بھیجی ہے، اور اس کا عنوان ہے "ٹکراؤ کی سیاست۔"

ص ۷، "کسی نظام کی کایا پلٹ سے جو متزلزل قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے، اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔"

"متزلزل قسم کی صورتِ حال" بھی لغت کی مدد سے کیا ہوا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ رواں اور کانوں کو بھلا لگنے والا جملہ نہیں ہے۔ یہ بات یوں بھی لکھی جا سکتی تھی:

"نظام بدلتا ہے تو غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔"

ص ۹: "اخبار ٹائمز آف انڈیا نے آج لاہور میں مقیم اپنے خصوصی نامہ نگار دلیپ مکرجی کی ایک خبر شائع کی ہے۔"

دلیپ مکرجی کی بھیجی ہوئی خبر، دلیپ مکرجی کی خبر نہیں ہو سکتی، کیونکہ خبر مسٹر بھٹو کے رویے کے بارے میں ہے۔ یہ بات یوں لکھی جاتی تو عیب سے پاک ہوتی:

"۔۔۔۔ ٹائمز آف انڈیا نے ایک خبر چھاپی ہے۔ یہ خبر راولپنڈی میں اس کے نمائندے دلیپ مکرجی نے بھیجی ہے۔"

ص ۱۱ "اس محبِ وطن کو برٹش سرکار نے آج سے بائیس سال قبل ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ کو حب الوطنی کی پاداش میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔"

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ سے ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ تک بائیس[۲۲] برس نہیں، بیالیس[۴۲] برس ہوتے ہیں۔ اس فاش غلطی کے علاوہ، ۲۶ لفظوں کے اس ایک جملے کو چھوٹے جملوں میں توڑا جا سکتا تھا:

"وطن کی آزادی کے لیے آزادی کے جن متوالوں نے جان دی، اُن میں آپ بھی تھے۔ بیالیس برس پہلے، آج ہی کے دن برٹش سرکار نے انھیں پھانسی دی۔"

"پنجاب کی مقامی حکومت کے اسٹیٹ اور جیل منسٹر، مسٹر جوگندر پال پانڈے نے بھگت سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے مضمون

میں لکھا ہے۔ . . . ."

مقامی کا استعمال غلط ہوا ہے۔ پنجاب میں دو حکومتیں، مقامی اور غیر مقامی نہیں ہیں۔ اتنی لمبی عبارت ایک جملہ ہے۔۔یوں بھی لکھا جا سکتا تھا:

"مسٹر جوگندر پانڈے پنجاب میں جیل کے محکمے کے وزیر ہیں۔ ایک مضمون میں انھوں نے بھگت سنگھ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ . . . ."

تبصرہ: تاریخ: ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء

ص ۲: " پاکستان کا ہند میں موجود اپنے نوّے ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی کو سب سے زیادہ اوّلیت دینا قابلِ فہم ہے۔"

جملہ پیچیدہ، اور لمبا ہے۔ انگریزی کے پیچیدہ جملے کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میڈیم کے لحاظ سے بغیر ٹاپ امپارٹنس' کا ترجمہ 'سب سے زیادہ اوّلیت' کیا گیا ہے، جو درست بھی نہیں ہے۔ یہ بات یوں لکھی جا سکتی تھی،

"پاکستان کے نوّے ہزار جنگی قیدی ہندوستان میں ہیں۔ ان کی رہائی کو پہلی ترجیح دینا، حکومتِ پاکستان کے لئے قدرتی بات ہے۔"

سرگرمیاں: تاریخ ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء

" ہندوستان ارتھ موورس لمٹیڈ نامی ادارے نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے۔ . . ."

نامی ادارے حشو و زوائد میں سے ہے۔ اس سے عبارت کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی وجہ سے یہ جملہ روزمرّہ بول چال کے اسلوب سے دور چلا جاتا ہے۔ یہ پولیس روزنامچے کی زبان ہے، براڈکاسٹ کی نہیں۔

جہاں نما: تاریخ: ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء

ص ۱: "انھوں نے پاکستان کے ساتھ نارمل تعلقات قائم کرنے سے متعلق ہند کی آرزو کا اعادہ کیا ہے۔"

اعادہ بہت گاڑھا لفظ ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ اب بھی لکھتے ہیں، لیکن بول چال میں اتنا کم استعمال ہوتا ہے کہ اردو سروس سننے والوں کی اکثریت اس کے معنی نہیں جانتی۔ بول چال کی زبان میں بھی یہ مفہوم ادا کیا جا سکتا تھا:

”ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات نارمل ہوں۔ انھوں نے اس تمنا کا پھر اظہار کیا۔“

پریس ریویو۔ تاریخ، ۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء

”اخبار فری پریس جرنل لکھتا ہے۔ مسٹر سورن سنگھ کا بیان کہ ہند شملہ معاہدے کی توثیق سے متعلق تعطل کو توڑنا چاہتا تھا، ہند کی اس خواہش کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کوتاہی اور عدم پیروی کے باوجود معاہدے سے متعلق تمام شرائط کا ہند برابر پابند ہے۔“

عبارت الجھی ہوئی ہے، اور براڈ کاسٹ کے اسلوب میں نہیں ہے۔ انگریزی کاپی پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ترجمہ بھی درست نہیں ہے۔ ”کوتاہی اور عدم پیروی“ کے مفہوم بہت واضح ہیں، اور روزِ برخارجہ اپنی ہی حکومت پر یہ الزام نہیں لگا سکتے۔ ان کا بیان سیاسی ہوتے ہوئے بھی سفارتی ہے۔ ان نزاکتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

Mr. Swaran Singh's hint of a fresh Indian initiative to end the deadlock over implementation of the Simla agreement testifies to New Delhi's desire to ensure that the promise offered by the agreement is not lost by default.

یہ بات براڈ کاسٹ کے اسلوب میں بھی لکھی جا سکتی تھی:

”شملہ معاہدے پر عمل کرنے کے سلسلے میں جمود پیدا ہو گیا تھا۔ اسے توڑنے کے لیے مسٹر سورن سنگھ نے اشارہ دیا ہے کہ ہندوستان نئے قدم اٹھائے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شملہ معاہدے سے جو امکانات پیدا ہوئے تھے، حکومتِ ہند اُن کو ضائع نہیں ہونے دے گی۔“

تبصرہ: تاریخ، ۲۹ مارچ ۱۹۷۳ء

”کرنسی کی ان اصلاحات کو پرکھنے کے لیے کون سا پیمانہ استعمال کرنا چاہیے، جو کہ ایک پنپنے والے بین الاقوامی کرنسی نظام کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔“

پرکھ، کسوٹی پر ہوتی ہے، پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ یہ پھر ایک عجیب اتفاق ہے کہ یہ ایک جملہ پر یہ عبارت مشتمل ہے، اور جملہ میں ۲۹ لفظ ہیں۔ انگریزی کاپی میں جملہ یوں ہے:

What should be the yard-stick to adjudge the monetary reforms, which have become necessary to build a viable international monetary system.

تبصرے میں اہمیت انگریزی کاپی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی نہیں ہے۔ موضوع اور مضمون اس سے لینا ہوتا ہے، اور اپنی زبان کے مزاج کے مطابق لکھنا ہوتا ہے، تاکہ سامعین بات فوراً سمجھ لیں۔

"جب ضرورت بدلتی ہے تو نظام میں اصلاح کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ کرنسی کے موجودہ نظام میں تبدیلیاں ضروری ہوگئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کس معیار کے مطابق ہوں؟ یہ طے کرنا ضروری ہے، تاکہ ان کے مطابق کرنسی کا ایک قابل عمل اور معقول بین الاقوامی نظام قائم کیا جاسکے۔"

پولیس پرولو: تاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۷۳ء

پہلا ہی جملہ ہے:

"مسلم اکثریت کے کچھ ملکوں کی بین غازی کانفرنس میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے سلسلے میں جو اس وقت ہندوستان میں زیرِ حراست ہیں، منظور کی گئی قرار داد سے متعلق ہندوستانی اخباروں میں تبصرے کیئے گیئے ہیں۔"

اس ایک جملے میں اڑتیس لفظ ہیں۔ تحریر کے اسلوب میں بھی یہ معیاری نہیں ہے۔ براڈکاسٹ کے لیئے یہ پیچیدہ قطعاً غیر مناسب ہے۔ اصل انگریزی کاپی فراہم نہیں ہے، اس لیئے ترجمے کے حسن و قبح کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ اندازہ ضروری ہوتا ہے کہ اس میں بھی پیچیدہ جملہ ہوگا۔ ذرا سی توجہ سے براڈکاسٹ کے اسلوب میں بھی یہی بات لکھی رکھی جاسکتی تھی، یوں:

"مسلم اکثریت کی آبادی والے کچھ ملکوں نے بین غازی کانفرنس میں شرکت کی۔ پاکستان کے جو جنگی قیدی ہندوستان میں ہیں، ان کے بارے میں

ایک قرارداد پاس کی گئی۔ ہندوستانی اخباروں میں اس قرارداد پر تبصرے
ہوئے ہیں . . . ."

اخباروں کی رائے : تاریخ : ۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء

" بیس اراکین کی کمیٹی نے اس امر پر اتفاق کرلیا ہے کہ مئی کے مہینے میں
وہ جس نئی مالیاتی رجیم کی تجویز رکھے گی، اس کی بنیاد مسٹر جوان کے پیش کردہ
چند اصولوں پر ہوگی۔"

یہ ایک انگریزی اخبار کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ انگریزی پروگرام میں تو مجبوری ہے کہ عبارت وہی نشر ہو، جو اخبار کی ہے۔ لیکن اردو ترجمے میں یہ آزادی ہے کہ براڈ کاسٹ کے اسلوب میں ترجمہ ہو۔ اس آزادی اور سہولت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ رجیم کا لفظ جوں کا توں استعمال کیا گیا۔ ان اصطلاحی معنوں میں یہ اردو سامعین کے لئے، ناقابلِ فہم ہے۔ انگریزی عبارت یہ ہے :

Already the Committee of Twenty has agreed that the new monetary regime, which it may finally propose in May, will be based on some of the principles he has enunciated.

ترجمے میں اسلوب کی آزادی ہوتی ہے۔ مفہوم میں کوئی ہیرا پھیری نہیں کی جاسکتی۔ براڈ کاسٹ کے لیئے یہ بات یوں لکھی جاسکتی تھی :

" بیس ممبروں کی کمیٹی مئی میں نیا مالیاتی نظام پیش کرے گی۔
مسٹر جوان کچھ اصولوں کی نشاندھی کرچکے ہیں۔ کمیٹی یہ بات پہلے ہی مان
چکی ہے کہ نئے مالیاتی نظام میں ان اصولوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔"

تبصرہ : ص : ۱ ۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء

" جمعرات کو اپنے ایک نشریے میں صدر بھٹو نے کہا کہ ہند و پاکستان تعلقات
کے موجودہ تعطل کو توڑنا شدید ضروری ہے۔"

'شدید ضروری'، نہ صرف نادرست، بلکہ مضحک بھی۔ شدید درد، شدید بخار، شدید بھوک، شدید پیاس، شدید جھٹکا، شدید ضرورت۔ ـ یہ سب درست۔ ضروری کے ساتھ نہایت،

یا اشد لگاتے ہیں۔ اشد اور لفظوں کے ساتھ ضرورت سے پہلے بھی لگاتے ہیں۔ براڈکاسٹ کے لیے مناسب عبارت یہ ہوتی:

"جمعرات کو ایک براڈکاسٹ میں صدر بھٹو نے یہ بات کہی کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں جو تعطل آگیا ہے اسے توڑنا بہت ضروری ہے۔"

سرگرمیاں: تاریخ: ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء

پہلا ہی جملہ توجہ طلب ہے:

"طبقاتی ترقی اور تعاون سے متعلق محکمے نے پہلی بار کل ہند پیمانے پر مضمون نگاری کے ایک مقابلے کا انتظام کیا ہے۔"

طبقاتی ترقی اور تعاون سے متعلق محکمے سے مراد ہے:

Community Development & Co-operation.

براڈکاسٹنگ کی تاریخ میں یہ ہاؤلر کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا / اور شاید مدتوں اردو میں اس کا جواب پیدا نہیں ہوگا۔ کمیونٹی ڈولپمنٹ اور امداد باہمی سب سمجھتے ہیں۔ لیکن فارسی زدہ عبارت لکھنے کا شوق بھی کیا گل کھلاتا ہے۔ طبقاتی ترقی کا یہاں کوئی موقعہ نہیں۔

کمنٹری تاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء

پہلا جملہ ہے:

"بالآخر ہند نے اس بات کا فیصلہ کرلیا ہے کہ شیر کی نسل کا تحفظ کیا جائے۔"

انگریزی کاپی میں عبارت یہ ہے:

India is finally committed to the conservation of the tiger, the finest of our fauna.

براڈکاسٹ کا آغاز یوں ہوتا، تو بہتر ہوتا:

"شیر ہمارے ملک کے جانوروں میں سب سے زیادہ نفیس ہے۔ حکومت نے اس کی نسل کے تحفظ کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔"

جہاں نما: تاریخ: ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء

ص ۲، "پاکستانی امور کے مبصر، مسٹر دلیپ مکرجی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں

پاکستان کی سیاست کو موضوع بناتے ہوئے اپنے ایک جائزے میں
لکھتے ہیں۔"

دلیپ مکرجی کو پاکستانی امور کا مبصر بنا دیا گیا۔ اس ملک میں پاکستانی امور کے، اس طرح کے، بہت سے مبصر ہیں۔ "پاکستانی سیاست کو موضوع بناتے ہوئے"، فالتو ہے و سیدھی طرح لکھنا چاہیئے تھا:

"ٹائمز آف انڈیا میں دلیپ مکرجی نے پاکستان کے سیاسی حالات کا جائزہ
لیا ہے۔ لکھتے ہیں:"

پروگرام کا تعارف (اناؤنسمنٹ): ۱۳ راپریل ۱۹۷۳ء (۸ بجکر ۵۴ منٹ شام) ۱۴ راپریل ۱۹۷۳ء (صبح پونے آٹھ بجے)

"یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔

بیادِ اقبال

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ اقبال سیمی نار میں پڑھے ہوئے پرچوں کے
اقتباسات کے سلسلے میں آج جناب شیر محمد خاں غوری کے پرچے کے کچھ
حصّے سنیے۔ اس پرچے کا عنوان ہے اقبال کے تصورِ زماں کا ماخذ"

۱۹۷۳ء، آل انڈیا ریڈیو نے اقبال کی ولادت کے جشنِ صد سالہ کے طور پر منایا تھا۔ اس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ کا درست نام بتایا جانا چاہیئے تھا۔ "پرچے" ہلکا لفظ ہے، اور یہ ادبی پروگرام تھا، اس لیئے مقالہ کہنا چاہیئے تھا۔ "منعقدہ اقبال سیمی نار" کوئی زبان نہیں ہے۔ کچھ تعارف شیر محمد خاں غوری کا بھی کرانا تھا۔ پروگرام کا تعارف کچھ اس طرح کرایا جاتا تو مناسب تھا:

"یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اس سال علامہ
اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جناب محمد شیر خاں
غوری کے ایک مضمون سے اقتباسات پیش کیئے جاتے ہیں۔ غوری صاحب
(. . . تعارف، مختصر طور سے . . . .) مقالے کا عنوان ہے "اقبال کے
تصورِ زماں کے ماخذ"۔ غوری صاحب نے یہ مقالہ ایک سیمی نار میں . . . .
کو پڑھا تھا جس کا اہتمام مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے کیا تھا۔ تو لیجیے، سنیئے:"

اخباروں کی رائے۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۷۳ء براڈکاسٹ کا وقت صبح آٹھ بجکر بیس منٹ۔

ص ۱: "اصل مسودہ آئین میں آخر وقت کئی ترمیمات کی گئیں۔ اگرچہ ان ترمیمات کا
اب تک علم نہ ہو سکا، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ معمولی نوعیت کی ترمیمات
نہ ہوں گی۔ ورنہ شاید حزب اختلاف اسمبلی میں واپس آکر رائے شماری میں
حکمران پارٹی کا ساتھ نہ دیتا۔"

۱۔ جب ترمیموں اور ان کی نوعیت ہی کا علم نہیں، تو اس موضوع پر اخباروں
کی رائے دینے سے فائدہ؟

۲۔ ترمیمات، اور ایسی جمعیں تھانہ کچہری کی زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔
یہ ریڈیو براڈکاسٹ کی زبان نہیں۔

۳۔ رائے شماری کے کشمیر کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان میں ایک
خاص معنی ہیں۔ استصواب رائے،
پلبی سٹ اور ریفرینڈم کے معنوں میں یہ اصطلاح رائج ہے۔ اسمبلی
میں ووٹ شمار کئے جاتے ہیں رائے شماری نہیں ہوتی۔

پریس ریویو: تاریخ: ۱۴ر اپریل ۱۹۷۳ء

ص ۲: "۔۔۔ حالانکہ مارشل کے بھائی، بریگیڈیر جنرل لون نول کی اختلافی
شخصیت نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے، پھر بھی حکومت میں
کوئی استحکام نہیں پیدا ہو سکا۔"

'اختلافی شخصیت' حوالے کے لائق محاورہ ہے۔ متنازعہ شخصیت ہونا چاہیے تھا۔ ترجمہ
بھی درست نہیں ہے۔ انگریزی کاپی:

Though the Marshal's controversial brother, Brig. General Lon Lol, has resigned his post in the Interior Ministry, there has not been an improvement in the stability of the government.

ریڈیو کے اسلوب میں یوں لکھا جاسکتا تھا:

"مارشل کے بھائی، بریگیڈیر جنرل لون نول بڑی نزاعی شخصیت بن گئے تھے
اگرچہ بریگیڈیر جنرل لون نول نے وزارتِ داخلہ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا، لیکن اس سے بھی حکومت میں کوئی بہتری اور استحکام کی صورت نہیں پیدا ہوئی۔"

اسی پریس ریویو میں یہ بھی ہے:

"... فام فین میں عمل میں آنے والی گرفتاریاں، اور شہر کا عملی طور پر باقی ملک، اور باقی دنیا سے کٹ کر رہ جانا، ایسے واقعات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لون نول کی حکومت کسی وقت بھی ڈھیر ہو سکتی ہے۔"

"عمل میں آنے والی گرفتاریاں" بول چال کی زبان نہیں۔ "ڈھیر ہو سکتی ہے" سنجیدہ پریس ریویو کے لیے مناسب زبان نہیں۔ سادہ زبان میں بھی تبصرہ ہو سکتا تھا:

"فام فین میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی ہیں۔ شہر باقی ملک، اور دوسرے ملکوں سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ آثار ایسے ہیں کہ لون نول کی حکومت کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔"

تبصرہ: تاریخ ۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء

"یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کو ماضی میں عالمی تجارت میں ان کا واجبی حصّہ نہیں مل سکتا۔"

آخر میں "مل سکتا" شاید قلم کی لغزش کی وجہ سے ہے۔ "مل سکا" ہونا چاہیے تھا لیکن مسوّدہ میں چونکہ درست نہیں کیا گیا، اس لیے یہ نتیجہ نکالنا نادرست نہ ہوگا کہ براڈ کاسٹر نے مائکروفون پر جانے سے پہلے ریہرسل کی زحمت نہیں کی، اور مسوّدہ نگار نے بھی اس پر نظرِ ثانی نہیں کی۔ کوئی کام جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ حقیقت جانی بوجھی نہیں، جانی مانی ہوتی ہے۔ براڈکاسٹ کے لیے یہ عبارت اس طرح لکھی جاتی تو بہتر تھا:

"ترقی پذیر ملکوں کو عالمی تجارت میں، ان کے جائز حصّے سے محروم رکھا گیا۔ یہ ایک جانی مانی حقیقت ہے۔"

اسی تبصرے میں یہ بھی ہے:

"اس کی قدرتی وجہ کے طور پر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تجارتی عدم توازن

پیدا ہو گیا۔"
اصل انگریزی کاپی یہ ہے :

This has naturally created a trade imbalance between the developed and developing countries.

ترجمہ نادرست ہے۔ اس طرح کیا جانا چاہیئے تھا :
"اس نے قدرتی طور پر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تجارت میں عدم توازن پیدا کر دیا۔"

یہ بھی اسی تبصرے میں ہے :
"اس کے علاوہ چونکہ ترقی پزیر ملک، ترقی یافتہ مغربی ملکوں کو خام مال فراہم کرنے، اور اُن کا تیار مال خریدنے کی اس صورتِ حال نے اُن کے قیمتی قدرتی وسائل ختم کرنے کے علاوہ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں اُن کے لیئے مخالف تجارتی توازن بھی پیدا کر دیا۔"

ساری عبارت، باون لفظوں کا ایک جملہ ہے۔ نحوی غلطی بھی ہے۔ لکھی ہوئی عبارت بھی کئی بار پڑھنے پر بھی سمجھ میں نہ آئے۔ ایک بار سنکر تو سمجھنے کا سوال ہی نہیں۔ ریڈیو کے اسلوب میں یوں لکھنا تھا۔

"مغرب کے ترقی یافتہ ملک، خام مال ترقی پزیر ملکوں سے خریدتے ہیں۔ اور اس کی قیمت کم ہوتی ہے۔ اسی خام مال سے مصنوعات تیار کرکے، انہی ترقی پزیر ملکوں کو بیچتے ہیں۔ ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح تجارت میں توازن نہیں رہتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ترقی پذیر ملکوں کے حق میں نقصان دہ ہے کہ وہ اپنا خام مال برآمد کر دیتے ہیں، اور اس سے اپنے یہاں صنعتوں کو ترقی دینے سے محروم رہ جاتے ہیں۔"

سرگرمیاں : تاریخ : ۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء

ص ۱۔ "اُنھیں اس کی یقین دہانی کرانا چاہیئے کہ پورے سماج کو ترقی سے استفادہ ہوسکے۔"
استفادہ کا یہ استعمال درست نہیں ہے۔ ریڈیو براڈکاسٹ کے لیئے کچھ اس طرح لکھنا چاہیئے تھا :

"انھیں یہ بات باور کرانا چاہیے کہ ترقی کے جو کام ہو رہے ہیں اُن سے سارے
سماج کو راحت ملے گی، سماج کے ہر طبقے کو فائدہ ہوگا، خاص طور سے
کمزور طبقوں کو۔"

۲۔ "انھوں نے کہا کہ بھاری صنعتوں کے برخلاف، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں
میں مزدوروں اور کارکنوں کی بھاری تعداد کو کھپایا جاسکتا ہے۔"

پچیس لفظوں کے اس ایک جملے میں زبان کی کئی خامیاں ہیں۔ بہ نسبت کی جگہ برخلاف لکھا گیا ہے۔ کارکنوں کی جگہ کاریگروں ہونا چاہیئے تھا۔ "کھپایا جاسکتا ہے" نامناسب ہے۔ یوں لکھتے تو بہتر تھا:

"انھوں نے کہا کہ چھوٹی صنعتوں میں روزگار کے زیادہ مواقع ہیں، اور
ان میں بھاری تعداد میں مزدوروں اور کاریگروں کو روزگار مل سکتا ہے
اتنی بھاری تعداد میں روزگار کے مواقع بڑی اور بھاری صنعتوں میں نہیں۔"

ص ۵: "یونانی علاج کے دو ہندوستانی ماہرین گذشتہ ہفتے طہران بھیجے گئے ہیں،
جو کہ دیہی علاقوں میں حکمت، یعنی یونانی نظام کو بطور علاج اپنانے کیلئے
ایران سرکار کو صلاح مشورہ دیں گے۔"

ماہر، اردو میں واحد اور جمع، دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ماہرین لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حکمت، یعنی طبِ یونانی تو درست ہے، کیونکہ حکیم فلسفی کے بجائے۔ یونانی طریقۂ علاج کے لیے رائج ہے۔ لیکن "حکمت یعنی یونانی نظام" درست نہیں۔ ریڈیو کے اسلوب میں یوں لکھا جانا چاہیئے تھا:

"یونانی طریقۂ علاج ہندوستان میں رائج ہے، اور اس کی تعلیم اور تحقیق
کے ادارے بھی ہمارے یہاں کام کر رہے ہیں۔ حکومتِ ایران کی دعوت
پر طبِ یونانی کے دو ماہر تہران گئے ہیں۔ ایران کے دیہاتوں میں یونانی
طریقۂ علاج سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس کے بارے میں
یہ ماہر ایران سرکار کو صلاح دیں گے۔"

تبصرہ: تاریخ: ۴؍ اپریل ۱۹۷۳ء

"انڈونیشیا کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر آدم ملک نے ہند کے اس نظریے کی

مکمل تائید کی ہے کہ برصغیر کو درپیش مسئلوں کو حل کرنے میں پاکستان کی جانب سے بنگلہ دیش کو بحیثیت ایک خود مختار اور آزاد ملک کے تسلیم کرنے کے اقدام کو بنیادی رول حاصل ہے۔"

ریڈیو براڈ کاسٹ کے لیئے یہ عبارت قطعی طور پر نامناسب ہے۔ بہت ہی پیچیدہ جملہ ہے۔ تحریر کو کئی بار پڑھیں تب بھی الجھن باقی رہتی ہے، کیونکہ انگریزی کاپی سے لفظ بلفظ ترجمہ کیا گیا ہے، اور وہ بھی درست نہیں ہے۔ انگریزی کاپی ہے :

The Indonesian Foreign Minister, Dr. Adam Malik has fully endorsed the Indian view that Pakistan's recognition of Bangladesh as a sovereign independent nation held the key to resolving the problems facing the Indian sub-continent.

اُردو میں براڈ کاسٹ کے لیئے یہ بات یوں لکھی جا سکتی تھی :

"انڈونیشیا کے وزیرِ خارجہ، ڈاکٹر ادم ملک نے ہندوستان کے اس نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق کیا ہے کہ پاکستان، بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور خود مختار ملک تسلیم کر لے۔ برصغیر کو جن مسئلوں کا سامنا ہے، ان کے حل کیلئے یہ ضروری ہے۔"

انگریزی کاپی میں "انڈین سب کانٹی ننٹ" ہے۔ اگرچہ ترجمے میں یہ آزادی نہیں لی جا سکتی کہ سیاسی زاویے میں کوئی ردّ و بدل کیا جائے، لیکن یہاں اُردو کے تبصرہ نگار کے لیئے یہ ضروری تھا کہ وہ سینئر افسر کو توجہ دلاتا، اور وضاحت چاہتا کہ "برصغیرِ ہند" کہنے سے ہندوستان پر ہوسِ ملک گیری اور توسیع پسندی کا الزام دوسرے ملک کے سامعین کے ذہن میں ابھرتا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد "برصغیرِ ہند و پاکستان و بنگلہ دیش" کہنا مناسب ہوتا۔ لیکن یہ طویل فقرہ ہے، مخفف، صرف "برصغیر" کافی ہے، اور اس سے کسی سیاسی یا سفارتی مصلحت کو ٹھیس بھی نہیں لگتی۔ انگریزی کاپی نگار نے غلط تفہیم کی وجہ سے، یا بے سوچے سمجھے "انڈین سب کانٹی ننٹ" لکھا، اس کا امکان زیادہ ہے، اور اس نازک مسئلے کی طرف متعلقہ افسر کا دھیان نہیں گیا۔

پریس ریویو : تاریخ : ۳ر اپریل ۱۹۷۳ء

"بہت سے اخبارات نے برصغیر کے حالات کی تازہ ترین پیش رفت کے بارے میں تبصرے شائع کیے ہیں۔"

پریس ریویو کا یہ پہلا جملہ ہے۔ انگریزی کاپی میں یہ عبارت ہے:

Several newspapers have commented on the latest developments in the sub-continent.

'بہت سے' مفہوم تو ادا کرتا ہے، لیکن 'کئی' زیادہ مناسب لفظ تھا۔ 'حالات کی تازہ ترین پیش رفت' براڈ کاسٹ کی زبان نہیں ہے، خاص طور سے صحافت، ریڈیو صحافت کے پروگرام کے لیے۔ یہ بات یوں لکھنا چاہیے تھی:

"کئی اخباروں نے حالات میں تازہ ترین تبدیلیوں پر تبصرے کیے ہیں۔"

اور "بزم خواتین" سے مکالمہ:

ناہید: محسوس یہ ہو رہا ہے شمیم کہ آج کل زندگی کے ہر شعبے میں، ہر گوشے میں تضادات کی بھرمار ہو گئی ہے۔ نئی اور پرانی قدریں، کچھ اس انداز میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہو رہا ہے کہ معاشرے کی سمتوں کا تعین کون کرے۔

شمیم: یہ تو ہے ناہید بہن۔ پر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ صورت حال ہے بڑی دلچسپ۔ کوئی ایک مفہوم لے لیجیے۔ مختلف لوگوں سے اس پر بات کیجیے، اور دیکھیے کیا مزے مزے کے نظریاتی انکشافات سامنے آتے ہیں۔

کیا لوگ زندگی میں اس طرح بات کرتے ہیں، اور کیا یہ ریڈیو کمپیئرنگ کے لیے مناسب زبان ہے، اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

پانچواں باب

اردو خبروں کی زبان کا تجربہ

اُردو پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ حکومتِ پاکستان کا سارا کام اُردو میں ہو۔ ابھی تک سارا کام، وزارتوں اور محکموں کی اعلیٰ سطح پر انگریزی ہی میں ہو رہا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس ملک میں کثیرالاشاعت اخبار اردو کے ہیں۔ پاکستان نے اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لیے اصطلاحات اور دوسری مشکلوں کے حل کے لیے ایک ادارہ "مقتدرہ" بھی قائم کیا ہے۔ اُردو کے کثیرالاشاعت اخباروں کی زبان ظاہر ہے، بول چال کی زبان ہے، اور اس کا اثر وہاں کی ادبی زبان پر بھی پڑا ہے۔ ادبی نثر کی زبان، عام بول چال کی زبان سے مختلف تھی۔ چونکہ روزناموں میں کہانیاں اور شعری تخلیقات بھی شامل ہوتی ہیں، اور ان کی زبان، اخبار کی زبان سے مختلف نہیں ہوتی، اس لیے خالص ادبی رسائل کی مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ جو ادبی رسائل باقی ہیں، اُن کی اشاعت قابلِ ذکر نہیں ہے۔ البتہ ڈائجسٹ بہت مقبول ہو رہے ہیں، کیونکہ ان کا اسلوب وہی ہوتا ہے، جو روزناموں کے ادبی میگزین سیکشن کے مضامین کا ہوتا ہے۔

بول چال کی زبان ہی ریڈیو کا اسلوب ہے، اور یہ اسلوب ریڈیو پاکستان کے پروگراموں اور خبروں کی زبان کا ہے۔ ان لوگوں نے کوئی نئی روایت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زبان کے سلسلے میں جو نظریہ فیلڈن کا تھا، اور جس پر احمد شاہ بخاری (پطرس) اور ذوالفقار بخاری چلے، وہ تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان نے جاری رکھا۔ ہمارے یہاں ہندوستانی زبان دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ پی سی چٹرجی لکھتے ہیں[1]

---

[1] پی سی چٹرجی، براڈکاسٹنگ اِن انڈیا: ص ۴۵۔

Hindustani continued to be used for a short while after independence. on 27 November 1949, AIR's Programme journals substituted the word Hindi for Hindustani. Shortly afterwards Separate newscasts started in Urdu.

ریڈیو پاکستان میں زبان وہی رہی۔ صرف نام ہندوستانی سے اردو ہو گیا۔ نام عام طور سے کاغذی کارروائی تک تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں نہ صرف زبان کا نام ہندوستانی سے ہندی کیا گیا، بلکہ اسے اُردو، یعنی عام بول چال کی ہندوستانی سے الگ کردار دینے کے لیئے وہ نسخہ استعمال کیا گیا، جو للّو لال جی کوی نے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے "پریم ساگر" کی شبداولی کے لیئے استعمال کیا تھا۔ نہ صرف عربی اور فارسی کے لفظوں کی جگہ، بلکہ تدبھو لفظوں کی جگہ بھی تت سم کا استعمال۔ ایسی زبان کے بعد اردو دیس خبروں کا براڈ کاسٹ کیا جانا ضروری ہو گیا۔ شروع شروع میں اردو خبروں کی زبان وہی رہی جو ۲۷ نومبر ۱۹۴۹ء سے پہلے کے ہندوستانی بلیٹنوں کی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو خبریں بھی اپنے راستے سے ہٹنے لگیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو خبروں کی زبان میں بتدریج تبدیلیاں دو وجہوں سے آئیں۔ ایک تو انھوں نے ریڈیو کی خبروں کی زبان کو ادبی زبان کے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی۔ دوسرے مذہبی عصبیت کا جو ماحول پیدا ہو گیا تھا، اس نے اپنی تسکین کے لیئے لسانی عصبیت کی راہ ڈھونڈھی۔ لیکن یہ دونوں قدم صحیح سمت میں نہیں تھے۔ پھر اردو کے کثیرالاشاعت اخبار، ادبی صحافت سے صحافت کی طرف آئے، کیونکہ ان کی کامیابی کا دارومدار براہِ راست خریداروں پر تھا، اور خریدار اپنی زبان میں اخبار پڑھنا چاہتے ہیں۔ ادبی چاشنی مختلف کالموں میں تو رہی، خاص طور سے فکاحیہ کالموں میں، لیکن خبریں ادبی زبان کی زنجیروں سے آزاد ہو گئیں۔ ریڈیو پاکستان کو بھی اسی راستے پر آنا پڑا۔

ہندوستان میں اردو خبروں کی زبان ثقیل دو وجہوں سے ہوئی۔ ایک یہ کہ آزادی کے فوراً بعد، جو ایک رجحان فارسی عربی کے زیادہ لفظ استعمال کرنے کا پاکستان میں آیا تھا، احساسِ کمتری کی وجہ سے آل انڈیا ریڈیو کے اُردو خبروں کے شعبے کے کچھ لوگوں نے اسے درست سمجھا۔ اُردو جس بحران میں آ گئی تھی، یہ احساسِ کمتری اُسی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

یہ خیال اس وقت کے کئی ذمّے دار افسروں نے ظاہر کیا ہے، لیکن نام راز میں رکھے جانے کی شرط پر۔ چونکہ یہ پہلو بہت اہم ہے، اس لیے نام راز میں رکھنے کی شرط پر عمل کیا جارہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو خبروں سے متعلق نچلی سطح کے عملے نے محسوس کیا کہ اگر انھوں نے بتدریج عربی فارسی کے ان لفظوں کا استعمال بڑھانا شروع نہیں کیا، جو پہلے ادب میں رائج تھے، اور اب عوام کی یادداشت سے محو ہوتے جارہے ہیں، تو پھر اردو مرجائے گی۔ یہ خیال درست نہیں تھا، لیکن اس پر سب نے اپنی زبان کے "تحفّظ" کی نیت سے عمل کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اردو خبریں بھی عام لوگوں کے لیئے ناقابلِ فہم ہونے لگیں۔ سنجیدگی سے اس مسئلے پر ماہروں نے غور کیا، اور کچھ نسخے اس بیماری کے علاج کیلئے تجویز کیئے۔ اس سلسلے کی ساری کارروائیاں، تجویزیں، میٹنگوں کی رپورٹیں اور فیصلے جن فائلوں میں تھیں، اُن کی زندگی دس برس ہوتی ہے۔ یہ فائلیں محفوظ نہیں رکھی گئیں۔ البتہ تحقیق کے دوران میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو ملے، ان کو جوڑ کر ایک دھندلی سی تصویر ضرور بنائی جاسکتی ہے۔ خدوخال بہت واضح نہ سہی، خاکہ ضرور واضح ہوجاتا ہے۔

مئی ۱۹۶۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ۹ گھنٹے کے لیئے شروع ہوئی، تو اس میں خبریں بھی تھیں، اور خبروں پر تبصرے بھی۔ اس سروس کی زبان، اور جو اصطلاحیں اس میں استعمال ہوتی تھیں، وہ ہوم سروس کی زبان اور اصطلاحوں سے مختلف تھیں۔ اردو سروس میں وزیرِ خارجہ، وزیرِ داخلہ اور وزیرِ دفاع کی اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں۔ دلّی کی خبریں، جو سرینگر، جمّوں، حیدرآباد اور لکھنؤ وغیرہ سے نشر (ریلے) ہوتی تھیں، اُن میں بدیشی معاملوں کے وزیر، گھریلو معاملوں کے وزیر اور بچاؤ معاملوں کے وزیر کی اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں۔ لمبے عرصے تک براڈکاسٹ ہونے کے باوجود سامعین نے انھیں قبول نہیں کیا، اس لیئے یہ رائج نہ ہوسکیں۔

فدایانِ اردو، جامع مسجد، دلّی کے سکریٹری، حبیب احمد عباسی نے ۱۲ نومبر ۱۹۷۲ء کو ڈائرکٹر جنرل کے نام لکھا: له

I want to bring to your kind notice that your Urdu News

له DG AIR File No. 21 (2)/73-PI Vol.I : Page I

Department is unnecessarily using such Hindi words in Urdu News which have their good equivalents in Urdu and which are quite commonly used and understood among the Urdu speaking community in India and Pakistan. This crude attempt on the part of the staff working in your Urdu News Department to 'Hindi-ise' the Urdu bulletin by using such words like 'Rashtrapati' for President; 'Shri' for Mr.; 'Bharat' for India; 'Bideshi-muamlon-ke-wazir' for Foreign Minister and 'Ghareloo-muamlon-ke-wazir' for Home Minister is enough to injure the feelings and sentiments of the Urdu speaking people. This is being done for the last fifteen years which must be stopped.

۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء ہی کو روز نامہ "ہندوستان ٹائمز" میں سو تھا، بدایوں کے محمد علی کا ایک خط چھپا۔ اس میں اُردو کے ہندی کرن کرنے اور "بڑے وزیر" جیسی اصطلاحوں کا مذاق اڑایا گیا تھا:

In his letter regarding Urdu on AIR, Mr. Aftab Alam Naqvi has most courageously pointed out some very basic errors in its Urdu News broadcasts. For long AIR has been attempting to 'Hindiize' the Urdu language by using inaccurate terminology. If AIR uses the word 'Bare Wazir' for Chief Minister I suggest that a minister of state should be called 'Manjhle Wazir' and a Deputy

---

Unnecessarily

Minister should be called 'Saujhle (Sanjhle) Wazir'.

آفتاب عالم نقوی کے جس خط کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ۱۸ر نومبر کے "ہندوستان ٹائمز" میں چھپا تھا:

I would like to draw the attention of the Ministry of Information and Broadcasting to the Urdu broadcasts of All India Radio.

The language used invariably includes words, phrases and terms from other languages. Sometimes the words used there have Urdu equivalents commonly used both in speaking and writing. For example the word 'Sri' is used although its Urdu equivalent 'Janab' is quite common among the Urdu-knowing people'. Besides, some time the terms used are so common that they sound awkward. For instance the common expression used by AIR for "Chief Minister" is "Bara Wazir". This is wrong. The correct term would be "Wazir-e-Ala" which is used by BBC and Radio Pakistan.

Likewise, All India Radio refers to the "Defence Minister" as "Buchao Muamlon Ke Wazir" although the correct and more frequently used term is "Wazir-e-Difa".

آفتاب عالم نقوی کا یہ خط مولوی ٹولہ بدایوں سے تھا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء کے نیشنل ہیرالڈ (دلی) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استادوں کے کالج کے عرفان احمد کا یہ خط چھپا:

It is indeed surprising that under I.K. Gujral too, the policy of Hindi-ising Urdu news continues unchecked. The words like "Bachao-Muamlon-ke-Wazir". "Bachao-Muamlon", "Ghareluu-muamlon" as well as `Shri', `Rashtrapati' and `Up-Rashtrapati' are clear proof that the future of Urdu is not bright although very tall claims are made to 'safeguard' the interests of this language.

It is high time AIR changed its policy.

اُردو خبروں کے یونٹ کے انچارج سینیئر سب ایڈیٹر نے اپنی ۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء کی رپورٹ میں، جس کا سیریل نمبر ایک ہے، اور جو فائل کا ورق ۵ ہے لکھا ہے (انگریزی سے ترجمہ):

> "اِن اصطلاحوں کے سلسلے میں، عرض ہے کہ زبان کو زیادہ مانوس اور عام فہم بنانے کے لیے، ۱۹۶۱ء سے بہت پہلے کچھ لفظ اور اصطلاحیں ہوم سروس میں استعمال کے لیے وضع کیے گئے، اور انھیں اردو مشاورتی کمیٹی نے منظور کیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں کمیٹی نے ان میں سے کچھ اصطلاحوں پر غور کیا، اور ان میں وہ اصطلاحیں بھی شامل ہیں، جن کا ذکر ان خطوں میں ہے۔ (لیکن کمیٹی نے) انھیں بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔"
>
> اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ تفہیم زیادہ سے زیادہ ہو، ہماری پالیسی ہوم سروس میں سادہ اور بولی جانے والی زبان استعمال کرنے کی ہے، اور اس کے لیے مختلف زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ باہر کے لیے اردو بلیٹن، جن کا رُخ پاکستان کی طرف ہوتا ہے، ان میں فارسی اور عربی کے لفظ، بہ نسبت اندرون کے لیے بلیٹنوں سے زیادہ ہوتے ہیں . . . "

اسی فائل کے نوٹنگ کے حصے میں، ص ۲، پیراگراف ۵ میں ڈپٹی ڈائرکٹر آف نیوز نے لکھا ہے[1]

حاشیہ اگلے صفحہ

In these letters, objection has also been taken to the use of the words like Gharelu-Muamlon Ke Wazir for Home Minister and similar terms for Defence Minister etc. I may point out that this matter has been discussed by the Urdu Advisory Committee on several occasions and the opinion has been in favour of continuance of such use. I would like to quote from the minutes of the Urdu Advisory Committee held in May 1964:

"Dr. Abid Husain pointed out that the expression گھریلو معاملوں کے وزیر for Home Minister has been in vogue in All India Radio for a long time and listeners have now become conversant with it. The alternative, he said, could be وزیر داخلہ which would be a difficult expression to understand. The meeting was of the ganeral opinion that the term گھریلو معاملوں کے وزیر for Home Minister may be continued."

نوٹنگ کے حصے میں ص ۴ پر، ۱۳ دسمبر کو ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل نے "بچاؤ معاملوں کے وزیر" کی اصطلاح کو ناپسند کیا۔[۲]

DG may please see. I do not entirely agree. "Bachao Muamlon ke Wazir" is a literal translation & is bad.

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ
DG AIR File No: 21(2)/73-PI : Vol.I

۲ : ایضاً

۱ : ایضاً

اسی صفحے پر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ڈائرکٹر جنرل نے ان خیالات کا اظہار کیا :[1]

While I do not know enough Urdu to suggest an alternative,

it is a literal translation of "Minister for Defence Affairs" and not "Minister of Defence". To that extent, it is a wrong translation. DNS and his Urdu experts might think of an alternative.

نوٹنگ کے حصے میں صفحہ ۵ پر ڈپٹی چیف پروڈیوسر (اردو) نے اپنے نوٹ میں لکھا :[2]

As pointed out by the DG, "Bachao Muamlon Ke Wazir" is not the correct translation of "Defence Minister". Likewise, "Gharelu Muamlon Ke Wazir" does not go well with the diction of Urdu. Instead of "Home Affairs' at the national plane, the connotation means "Domestic Affairs". Also "Affairs" is not a part of the "Home" portfolio.

اس نوٹ میں ان باتوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے :

۱۔ نیوز ایڈیٹر (ہندی) سے رجوع کیا گیا۔ ہند سماچاروں میں یہ اصطلاحات استعمال کی جا رہی ہیں : ۱۔ ہوم منسٹر کے لیے گریہہ منتری ۲۔ فارن منسٹر کے لیے ودیش منتری، ۳۔ ڈیفنس منسٹر کے لیے رکھشا منتری۔

۲۔ ہندی اور اردو کے بلیٹنوں میں اگر مشترک اصطلاحیں استعمال کی جاتیں تو کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔

۳۔ باوجود اس کے کہ (اردو میں) خاص وضع کی گئی اصطلاحیں برسوں تک استعمال کی گئیں، لیکن وہ مقبول اور رائج نہ ہو سکیں۔ یہ اصطلاحیں بہت آزمائی گئیں،

---

[1] : ایضاً　　[2] : ایضاً

اور یہ کافی ہونا چاہیئے۔

۴۔ مقامی اور علاقائی فرق کے باوجود، اُردو ایک زبان ہے۔ ہوم سروس اور اُردو سروس میں ایک ہی اصطلاحیں استعمال کرنے پر غور کرنا چاہیئے۔

ان نکتوں پر غور کرنے کے لیئے اعلیٰ سطح کی ایک میٹنگ ۱۸ر جنوری ۱۹۷۳ء کو ہوئی اُس کی کارروائی کی روداد صفحہ ۸ پر یہ انکشاف کرتی ہے [1]

> JDNS (Jt. Director, News Services) said that we should stick to the terminology approved by the Urdu Advisory Committee as far as Home Service is concerned. Persons like Prof. M. Mujeeb and Dr. Syed Abid Husain were in favour of Gharelu Muamlon Ke Wazir, Bachao Wazir and Bedeshi Wazir etc.

لیکن بالآخر یہ تینوں اصطلاحیں استعمال ہونا بند ہوگیئں۔ صرف اصطلاحیں ہی اُردو خبروں کا مسئلہ نہیں۔ خبریں ایسی ہوں کہ فوراً سمجھ میں آئیں۔ کوئی نامانوس لفظ نہ ہو۔ جملے چھوٹے ہوں۔ لیکن یہ اسلوب عام طور سے ریڈیو کی خبروں کا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل کاپی انگریزی میں ہوتی ہے۔ اور ترجمے میں ساری توجہ، انگریزی کے اردو مترادف الفاظ کی تلاش پر ہوتی ہے۔ اس مسئلے سے ریڈیو اور اخبار، دونوں دوچار ہیں۔ پہلے اخباروں کے لیئے خبریں لکھی جاتی تھیں۔ اب ترجمہ کی جاتی ہیں، اور زیادہ تر ترجمے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بات ریڈیو خبروں کے بارے میں بھی درست ہے۔

تاریخ : ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء : وقت صبح ۷ بجکر ۱۵ منٹ (اردو سروس)

سرخیاں :

۱۔ امریکی صدر نے پاکستان کو اسلحے کی سپلائی بحال کرنے کی حمایت کی ہے۔ یہ ماضی میں کیئے گیئے وعدے کی ایفا ہے۔

یہ سرخی نہ صرف قواعد کی رو سے غلط ہے، زبان کے اعتبار سے غلط ہے، بلکہ معنی کے لحاظ

---

[1] ایضاً

سے بھی غلط ہے۔ سرخی کچھ اس طرح سے ہونا چاہیئے تھی :

"پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی دوبارہ شروع کرنے کی حمایت میں، امریکی صدر نے کہا ہے، کہ ایسا پچھلے معاہدے پورے کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔"

۲۔ "عرب ملکوں کے اخبارات اور نشریاتی اداروں نے امریکہ کی طرف سے اسرائیل کو مزید جنگی طیارے سپلائی کرنے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔"

"اخبارات" بھی رائج ہے، لیکن اردو طریقے سے جمع 'اخباروں' بہتر ہے۔ عربی، فارسی قاعدوں سے جمع بنانے کا رجحان ثقالت کی طرف لے جاتا ہے، کیونکہ باقی لفظ بھی ایسے ہی استعمال ہونے لگتے ہیں۔ 'نشرگاہوں' کے بجائے 'نشریاتی ادارے' کا استعمال بھی ضروری نہ تھا۔ سرخی اس طرح لکھی جاتی تو بہتر ہوتی :

"اسرائیل کو اور جنگی ہوائی جہاز دینے کے امریکی فیصلے پر عرب ملکوں کے اخباروں اور ریڈیو نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔"

'ہوائی جہاز' سب سمجھتے ہیں۔ طیارے کا لفظ خبروں کے ذخیرۂ الفاظ میں داخل کرنے کی کوشش نقصان دہ ہے۔

۳۔ "پناما کے صدر نے کہا ہے کہ پناما نہر کے علاقے پر امریکی تسلّط کا خاتمہ کیا جائے۔"

یہ سرخی اس طرح ہوتی تو ریڈیو سننے والوں کی سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتی :

"پناما کے صدر نے، پناما نہر کے علاقے پر سے امریکی کنٹرول ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔"

۴۔ "پاکستان میں متحدہ جمہوری محاذ، آئین میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی ایک فہرست صدر بھٹو کو پیش کرے گا۔"

خبر کے مفہوم، اس سرخی سے واضح نہیں ہوتے۔ سرخی کچھ اس طرح لکھی جانا چاہیئے تھی :

"پاکستان میں اپوزیشن پارٹیوں کا جمہوری محاذ، مسودہ آئین میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی تجویز، صدرِ پاکستان کو پیش کرے گا۔"

۵۔ "منی پور کے گورنر، منی پور کی سیاسی صورتِ حال کا موقع پر جائزہ لیں گے۔"

"موقع پر جائزہ لینا" کچھ تھانہ کچہری کی سی زبان ہے۔ سرخی یوں ہو سکتی تھی:
"منی پور کے گورنر امفال پہنچ کر سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیں گے۔"

خبریں:

Item : Nixon AID,

"صدر نکسن نے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی بحال کرنے کی حمایت کی ہے، کہ یہ اقدام راولپنڈی سے بہت پہلے کئے گئے وعدے کی ایفا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اُن کا انتظامیہ پچھلا حساب بے باق کر رہا ہے۔ کل وہائٹ ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ امریکہ کا خیال ہے کہ اس فیصلے سے اس علاقے میں امن کے امکانات بھی کم نہیں ہونگے، اور نہ ہی اس سے ہند کی سلامتی پر کوئی اثر پڑے گا۔ جب ایک نامہ نگار نے سوال کیا کہ پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی، اور دوسری طرف امریکہ کی خواہشِ امن وامان، ان دونوں میں کیا ربط ہے؟ صدر نکسن نے کہا کہ ہم دونوں ہی کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری امداد، جنگ کے بجائے امن کے لیے استعمال ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہند کے لیے اٹھ کروڑ ستر لاکھ ڈالر کی اُس امریکی اقتصادی مدد پر بھی پابندی ہٹائی جا رہی ہے، جسے ۱۹۷۱ کی ہند پاک جنگ کے دوران روک دیا گیا تھا۔ ایوانِ نمائندگان کی بیرونی تعلقات سے متعلق سب کمیٹی کی ایک میٹنگ کے دوران ایشیائی ملکوں کے لیے امداد سے متعلق محکمے کے ایڈمنسٹریٹر میک ڈونلڈ نے اقتصادی امداد کے بارے میں، یہ اعلان الگ سے کیا۔ یہ امداد فارمولہ کے لیے سازوسامان درآمد کرنے پر خرچ کی جائے گی۔ اسی دوران صدرِ پاکستان مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ ہند کو ہتھیاروں کی دوبارہ سپلائی پر احتجاج سے گریز کرنا چاہیئے۔ انھوں نے ہتھیاروں کی سپلائی کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا، کہ پاکستان اور امریکہ ایک دوطرفہ معاہدے کے ممبر ہیں،

جواب بھی ہر طرح سے ایک وجود رکھتا ہے۔"

یہی نیوز آئٹم ۱۶ / مارچ ۱۹۷۳ء کو، ہوم سروس میں، صبح آٹھ بجکر پچاس منٹ پر اسطرح شامل کیا گیا:

"صدر نکسن نے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی بحال کرنے کی یہ کہکر حمایت کی کہ یہ راولپنڈی کے ساتھ پہلے کئے گئے وعدے کی تکمیل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا انتظامیہ پچھلا حساب بے باق کر رہا ہے۔ کل وہائٹ ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ امریکہ کا خیال ہے کہ اس فیصلے سے اس علاقے میں امن کے امکانات کم نہیں ہوں گے، اور نہ اس سے بھارت کی سلامتی پر کوئی اثر پڑے گا۔ جب ایک نامہ نگار نے سوال کیا کہ پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی اور دوسری طرف امریکہ کی قیام امن کی خواہش ان دونوں میں کیا ربط ہے، تو صدر نکسن نے جواب دیا کہ ہم دونوں ملکوں کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری امداد، جنگ کے بجائے امن کے لیے استعمال ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کے لیے آٹھ کروڑ ستر لاکھ ڈالر کی اس امریکی اقتصادی امداد پر سے بھی پابندی ہٹائی جا رہی ہے، جسے ۱۹۷۱ کی بھارت پاک جنگ کے دوران روک دیا گیا تھا۔ ایوانِ نمائندگی کی بیرونی تعلقات سے متعلق سب کمیٹی کی ایک میٹنگ کے دوران ایشیائی ملکوں کے لیے امداد سے متعلق محکمے کے ایڈمنسٹریٹر، شری میک ڈونلڈ نے اقتصادی امداد کے بارے میں یہ اعلان الگ سے کیا۔ یہ امداد فارموں کے لیے سازو سامان درآمد کرنے پر خرچ کی جائے گی۔ اسی دوران صدر پاکستان شری بھٹو نے کہا ہے کہ بھارت کو ہتھیاروں کی دوبارہ سپلائی پر احتجاج کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ انھوں نے ہتھیاروں کی سپلائی کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا کہ پاکستان اور امریکہ ایک دو طرفہ معاہدے کے ممبر ہیں، جواب بھی ہر طرح سے ایک وجود رکھتا ہے۔"

تجزیہ: ذرا سی ردّ و بدل کے ساتھ دونوں عبارتیں ایک سی ہیں۔ لمبے لمبے جملے۔ اردو کے محاروں اور صیغوں تک کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اردو سروس کے بلٹین میں "وعدے کی ایفا" (تذکیر تانیث سے قطع نظر) خبروں کی زبان نہیں ہے۔ ہوم بلٹین میں "وعدے کی تکمیل" بھی خبروں کا اسلوب نہیں ہے۔ "انھوں نے کہا کہ ان کا انتظامیہ" لغت کے حساب سے درست ترجمہ ہے، لیکن ایسا ترجمہ زبان دان یا اہلِ زبان نہیں کرے گا۔ انگریزی میں ان کا ضمیر ٹھیک ہے، لیکن اُردو میں اُن کا کی جگہ میرا ہوتا ہے۔ "پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے" قول نہیں ہے، اس لیے بلٹین کو "خطاب کرتے ہوتے" سے بوجھل بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "پریس کانفرنس میں کہا" سے مطلب پورا ہوتا تھا۔ "امن کے امکانات کم نہیں ہوں گے، اور نہ ہی اس سے ہند/بھارت کی سلامتی پر کوئی اثر پڑے گا" یہ ترجمہ محاورے سے دور جا پڑتا ہے، اور جملہ بھی لمبا ہو جاتا ہے۔ "۔ ۔ ۔ امن پر اور ہندوستان کی سلامتی پر بُرا اثر پڑے گا۔" اثر سے پہلے بُرا کا ہونا ضروری ہے۔ "بہتر تعلقات استوار کرنا" عام آدمی کے لیے نشر ہونے والی خبروں کی زبان ہے۔ تعلقات دونوں سے بہتر بنانا چاہتے ہیں" صاف جملہ ہے، اور مفہوم بھی واضح ہے۔ "ایک دو طرفہ معاہدے کے ممبر ہیں" جواب ہر طرح سے ایک وجود رکھتا ہے" بڑا ملگجا سا جملہ ہے۔ "۔ ۔ ۔ ایک باہمی سمجھوتہ ہوا تھا، جواب بھی باقی ہے" صاف اور واضح طریقے سے مفہوم ادا کرتا ہے۔ یہ خبر اس طرح لکھی جا سکتی تھی:

> "صدر نکسن نے پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی دوبارہ شروع کرنے کی حمایت میں کہا ہے کہ ایسا راولپنڈی کے ساتھ پہلے کے معاہدے پورے کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری حکومت صرف پچھلا حساب صاف کر رہی ہے۔ کل وہائٹ ہاؤس میں مسٹر نکسن نے امریکی سرکار کے اس خیال کو دہرایا کہ اس سے علاقے کے امن پر، اور نہ ہندوستان کی سلامتی پر کوئی برا اثر پڑے گا۔ جب ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا امریکہ کی امن کی خواہش، اور پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی، بے جوڑ، اور ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ تو صدر نکسن نے جواب دیا کہ ہم دونوں ملکوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہتے ہیں،

اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری دی ہوئی امداد امن کے لیے استعمال کی جائے گی، لڑائی کے لیے نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ واشنگٹن ہندوستان کو آٹھ کروڑ ستّر لاکھ ڈالر کی اس اقتصادی امداد پر سے پابندی ہٹا رہا ہے، جو ہندوستان پاکستان کی ۱۹۷۱ کی لڑائی کے وقت روک دی گئی تھی۔ ہندوستان کو اقتصادی امداد کے بارے میں اعلان مسٹر میک ڈونلڈ نے کیا، جو ایشیائی ملکوں کی امداد سے متعلق محکمے کے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ یہ اعلان انھوں نے ایوانِ نمائندگان کی بیرونی تعلقات سے متعلق کمیٹی میں کیا۔ امداد کی یہ رقم زراعت میں کام آنے والی مشینیں اور اوزار درآمد کرنے پر خرچ کی جائے گی۔ ادھر صدر بھٹو نے کہا ہے کہ پاکستان کو ہتھیار ملنے پر ہندوستان کو احتجاج نہیں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے ہتھیاروں کی سپلائی کو اس لیئے جائز بتایا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی سمجھوتہ ہوا تھا، جو اب بھی باقی ہے۔"

۱۶ مارچ کے بلیٹنوں میں ایک اور خبر مشترک ہے۔

Democrat$ in the United States Senate have launched a new challenge to President Nixon's Foreign Military policies by calling for substantial reductions in the six hundred thousand United States' troops stationed around the world.

By an overwhelming vote, they approved a resolution that called for the number of American Forces abroad to be substantially reduced in stages over the next one and a half years.

اردو سروس کی، صبح ۷ بجکر ۱۵ منٹ پر، خبر اس طرح تھی:

"امریکی سینیٹ میں ڈیموکریٹ کی ممبروں نے نکسن انتظامیہ کی بیرونی

فوجی پالیسیوں کے لیے چیلنج پیش کیا ہے، جس کا مقصد دنیا بھر کے مختلف ملکوں میں تعینات چھ لاکھ امریکی فوجوں میں نمایاں کمی کرنا ہے۔ ان نمائندوں نے زبردست اکثریت سے ایک قرار داد منظور کی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ آئندہ ڈیڑھ سال کے دوران غیر ملکوں میں امریکی فوجوں کی تعداد میں مرحلے وار خاصی کمی کرنا ہے۔"

ہوم سروس میں، صبح ۸ بجکر ۵ منٹ کے اردو بلیٹن میں یہ خبر یوں تھی:

"امریکی سینیٹ میں ڈیموکریٹ ممبروں نے امریکہ کی بیرونی فوجی پالیسیوں کو چیلنج کیا ہے۔ اس اقدام کا مقصد دنیا بھر میں تعینات چھ لاکھ امریکی فوجوں کی تعداد میں نمایاں کمی کرانا ہے۔ ان ممبروں نے زبردست اکثریت سے ایک قرارداد منظور کی ہے، جس میں آئندہ ڈیڑھ سال کے دوران غیر ملکوں میں موجود امریکی فوجوں میں مرحلے وار خاصی کمی کرنا ہے۔"

تجزیہ:

اُردو سروس کے بلیٹن میں یہ فقرہ ہے: "دنیا بھر کے مختلف ملکوں میں"۔ "دنیا بھر" زائد ہے۔ "چھ لاکھ امریکی فوجوں میں کمی کرنا ہے"۔ "کمی فوجیوں کی تعداد میں کرنا ہے، اس لیے "فوجوں" کے بجائے "فوجیوں" ہونا چاہیے تھا۔ "غیر ملکوں" غلط نہیں ہے، لیکن "دوسرے ملکوں" بہتر ہے۔

ہوم سروس میں "اس اقدام کا مقصد"، انگریزی کاپی میں کہیں نہیں ہے۔ "دنیا بھر میں تعینات" انگریزی کاپی کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ دنیا بھر میں تعینات کرنے کے لیے چھ لاکھ فوجی ناکافی ہیں۔

یہ خبر اس طرح لکھی جا سکتی تھی:

"دوسرے ملکوں میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے بارے میں صدر نکسن کی پالیسی کو ایک نئے خطرے کا سامنا ہے۔ امریکی سینیٹ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبروں نے اس پالیسی کی سخت مخالفت کی ہے۔ سینیٹ میں بھاری اکثریت سے انھوں نے ایک ریزولیوشن پاس کیا، جس میں مانگ کی گئی ہے کہ مختلف ملکوں میں جو چھ لاکھ امریکی فوجی تعینات ہیں، اُن کی

تعداد میں اگلے ڈیڑھ برسوں میں بھاری کمی مرحلہ وار کی جائے۔"
تاریخ: ۱۷ / نومبر ۱۹۷۶ء ، وقت صبح آٹھ بجے: اردو سروس:

The last known survivor of the Kamagata Maru incident, Giani Kartar Singh, has at long last entered Canada. He is now in Vancouver, off which coast, he was at sea in the ship Kamagata Maru for two months because immigration officials had refused to let him land. In 1914, Kamagata Maru had dropped anchor off Vancouver with 375 passengers, most of them Indians. Giani Kartar Singh, who is now 97, said in an interview that he is not bitter about the Kamagata Maru incident. Earlier this year he was honoured by the Prime Minister, Mrs. Gandhi at a special ceremony.

کاماگاٹامارو: اردو سروس میں انگریزی کاپی کا یہ ترجمہ کیا گیا:

سمندری جہاز کاماگاٹامارو کے سفر کے ایک شریک گیانی کرتار سنگھ جو ۹۷ برس کے ہیں، آخر کار کنیڈا میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس وقت وہ وینکوور میں ہیں، جہاں اس سے پہلے، وہ دو مہینے تک ساحل سے دور، سمندر میں، جہاز کاماگاٹامارو میں ہی مقیم رہے تھے، کیونکہ نقلِ وطن سے متعلق حکام نے انھیں جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ۱۹۱۴ میں جہاز کاماگاٹامارو، وینکوور کے نزدیک لنگر انداز ہوا تھا، اور اس میں ۳۷۵ مسافر تھے، جن میں زیادہ تر ہندوستانی تھے۔

گیانی کرتار سنگھ، جو اب ستانوے برس کے ہیں، ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ کاماگاٹامارو کے واقعے کے سلسلے میں بہت زیادہ تلخ نہیں ہیں۔ پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے اس سال ایک خاص تقریب میں گیانی کرتار سنگھ کو اعزاز بخشا۔

تجزیہ: ترجمہ کرنے والے نے خود کو انگریزی کاپی کا پابند نہیں رکھا۔ اس لیے پہلی غلطی یہ ہوئی کہ اس چھوٹی سی خبر میں گیانی کرتار سنگھ کی عمر دو بار ۹۷ برس بتائی گئی۔ یہ عمر جو دو بار بتائی گئی ہے، تو درمیان میں صرف ۸۶ لفظ ہیں۔ خبروں میں 'ایک منٹ میں کم سے کم ۱۲۰ لفظ پڑھے جاتے ہیں گویا ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں دو بار عمر بتائی گئی۔ بلیٹن میں دو جگہ عمر کا واقع ہونا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ بلیٹن ریہرس نہیں کیا گیا۔ اگر ریہرسل کیا گیا ہوتا، تو تکرار کو نکالا گیا ہوتا۔ نیوز ریڈر/ٹرانسلیٹر نے خبر کو سمجھا ہی نہیں۔ انگریزی کاپی سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ گیانی کرتار سنگھ ۱۹۱۴ کے مسافروں میں سے واحد شخص ہیں، جو بقیدِ حیات ہیں، اور یہ خبر بھی اسی وجہ سے بنی۔ لیکن ان کو 'کاما گاٹا مارو کے سفر کے ایک شریک' بتایا گیا ہے۔ ساری خبر میں اس حقیقت کا ذکر نہیں ہے۔ 'امی گریشن آفیسرز' کا ترجمہ "نقلِ وطن سے متعلق حکام" نہیں کرنا چاہیئے۔ جس طرح 'اسٹیشن ماسٹر' یا 'پائلٹ' یا 'ڈرائیور' وغیرہ کا ترجمہ نہیں کرتے ہیں۔ وینکوور شہر خشکی پر واقع ہے، لیکن خبر سے کچھ اور احساس ہوتا ہے۔ "اس وقت وہ وینکوور میں ہیں، جہاں اس سے پہلے وہ دو مہینے تک ساحل سے دور سمندر میں جہاز کاما گاٹا مارو میں ہی مقیم رہے" یہ جملہ بے معنی ہے۔ اگر لفظ جہاں عبارت میں نہ ہوتا، تو یہ خرابی دور ہو جاتی۔ انگریزی کاپی کہتی ہے کہ کرتار سنگھ نے انٹرویو میں بتایا کہ کاما گاٹا مارو سے دو مہینے تک انھیں جو اترنے نہیں دیا گیا، تو اس واقعے کی وجہ سے اُن کے ذہن میں کوئی تلخی نہیں ہے۔ لیکن اردو کی خبر کہتی ہے کہ وہ "... واقعے کے سلسلے میں بہت زیادہ تلخ نہیں ہیں۔" اس جملے کے معنی مختلف ہیں۔ "پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے اس سال ایک خاص تقریب میں گیانی کرتار سنگھ کو اعزاز بخشا تھا"۔ یہ بیان اس وقت بامعنی ہوتا، جب یہ بھی بتایا جاتا کہ کونسا اعزاز بخشا تھا۔ اعزاز بخشنا، اعزاز سے نوازنا وغیرہ ایسے فقرے ہیں، جس میں سرپرستانہ رویئے کی بو آتی ہے، اور جیسے اعزاز

دیا جاتا ہے، اس کی شخصیت کو گھٹا دیتی ہے۔ ان نزاکتوں کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ اردو سروس کے لیے بلیٹن میں یہ خبر یوں لکھی جا سکتی تھی:

"کرتار سنگھ بالآخر کناڈا کی سرزمین پر پہنچ گئے۔ وہ شاید کاماگاٹامارو' کے تاریخی سفر میں شریک آخری بقید حیات مسافر ہیں۔ کرتار سنگھ اس وقت وینکوور میں ہیں۔ اسی شہر کے ساحل سے ہٹ کر سمندر میں جہاز کاماگاٹامارو دو مہینے تک لنگر ڈالے کھڑا رہا، کیونکہ کناڈا سرکار کے افسروں نے انھیں جہاز سے اتر کر کناڈا کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ۱۹۱۴ میں بھی جہاز کاماگاٹامارو وینکوور سے ہٹ کر سمندر میں ۳۷۵ مسافروں کے ساتھ لنگر انداز ہوا تھا۔ اکثر مسافر ہندوستانی تھے۔

گیانی کرتار سنگھ کی عمر اس وقت ۹۷ برس کی ہے۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ کاماگاٹامارو کے ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے اُن کے ذہن میں کوئی تلخی نہیں ہے۔ اس سال کے شروع میں جب وہ ہندوستان میں تھے، تو ایک خاص تقریب اُن کے اعزاز میں ہوئی تھی۔ اس تقریب میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے انھیں تعظیم پیش کی تھی۔"

تاریخ: ۱۷ ستمبر ۱۹۷۶ء؛ وقت: رات دس بجے؛ اردو سروس

The 5 day International seminar on Himalayan Geology ended in New Delhi today. In his Valedictory address, the Petroleum Minister, Mr. K.D. Malviya said the new ideas and concepts thrown up during the seminar will be useful in our search for oil and minerals. The theory about the origin of Himalayas has not yet

reached any finality, but the new concepts could be put to use. In view of the urgency to find new sources of energy, we should undertake a programme of large scale drilling in the unconventional traps. He was sure money invested on this effort will not prove inflationary.

Speaking at the concluding function several foreign and Indian delegates expressed their satisfaction over the out-come of the seminar.

"آج نئی دہلی میں ہمالیائی ارضیات سے متعلق پانچ روز کا بین الاقوامی سیمی نار ختم ہوگیا۔ اپنے ایڈریس میں پٹرولیم کے وزیر شری کے ڈی مالوی نے کہا کہ سیمی نار کے دوران جن نئے خیالات اور نظریات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا استعمال تیل اور معدنیات کی تلاش میں مفید ہوگا۔ ہمالیہ کی ازلی ہیئت کے بارے میں قطعی طور پر کوئی بات معلوم نہیں ہوئی ہے۔ لیکن نئے نظریات کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ توانائی کے لیئے ذرائع تلاش کرنے کی اشد ضرورت کے پیشِ نظر ہمیں غیر روایتی جگہوں میں بڑے پیمانے پر کھدائی کا پروگرام شروع کردینا چاہیئے۔

اختتامی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کئی بھارتی اور غیر ملکی نمائندوں نے سیمینار کے نتائج پر اطمینان کا اظہار کیا۔

تجزیہ:

عام طور سے انگریزی کاپی سے مطابقت ہے۔ Valedictory. کے معنی اور مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی، اس لیئے اسے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح thrownup کو بھی نہیں سمجھا گیا۔ جب مختلف خیال اور نظریے پیش کیئے جاتے ہیں، اور ان پر بحث ہوتی ہے، تو اس تبادلۂ خیال کے نتیجے میں نئے تصورا ُبھرتے ہیں۔ وزیر کے بیان کا ایک اہم جملہ بالکل چھوڑ دیا گیا، جس میں انھوں نے غیر روایتی جگہوں پر تیل

کی تلاش کے لیے ڈرلنگ کے سلسلے میں کہا تھا کہ اس کام میں جو سرمایہ کاری کی جائے گی، وہ افراطِ زر کا سبب نہیں بنے گی۔

یہ خبر کچھ اس طرح لکھی جانا چاہیئے تھی:

"ہمالہ کی ارضیات پر پانچ دن کا بین اقوامی سیمی نار آج نئی دہلی میں ختم ہوا۔ پٹرولیم کے وزیر، شری کے ڈی مالویہ نے اپنے الوداعی ایڈریس میں کہا، کہ سیمی نار میں جو نئے خیال اور تصورات اُبھرے ہیں، وہ تیل اور معدنیات کی تلاش میں ہمارے کام آئیں گے۔ ابھی تک ہمالہ کے وجود میں آنے کے بارے میں مفروضہ قطعیت تک نہیں پہنچا ہے۔ پھر بھی نئے تصورات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ توانائی کے نئے ذرائع ڈھونڈھنے کی جو فوری ضرورت ہے، اسے سامنے رکھیں تو ایسی جگہوں پر بھی، بڑے پیمانے پر تیل کے کنویں ڈرل کرنے کا پروگرام بڑے پیمانے پر بنانا پڑے گا، جو تیل کے روایتی نقشے میں نہیں ہیں۔ شری مالویہ نے اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ اس کام میں جو سرمایہ لگایا جائے گا، اس سے سکّے کا پھیلاؤ نہیں بڑھے گا۔ اختتامی تقریب میں کئی غیر ملکی اور ہندوستانی ڈیلی گیٹوں نے سیمی نار کے مفید اور تسلّی بخش ہونے کا اظہار کیا۔"

تاریخ: ۱۷ ستمبر ۱۹۷۶ء: وقت: رات ۹ بجکر ۱۵ منٹ: ہوم سروس

The National Dairy Research Institute, Karnal has taken up a project to improve the yield and quality of buffalo milk. The project taken in hand by the Institute in collaboration with Japanese scientists aims at developing a sturdier breed and ensuring uniform calving throughout the year. The Institute is also working on humanizing buffalo milk to make it similar to mother's milk. This involves lowering calcium and fat content in buffalo milk.

"نیشنل ڈیری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کرنال نے بھینسوں کے دودھ کے معیار اور مقدار کو بہتر بنانے کا ایک پروجکٹ شروع کیا ہے جاپانی اشتراک کے ساتھ شروع کیے گئے اس پروجکٹ کا مقصد بھینسوں کی زیادہ مضبوط نسل پیدا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس داں بھینس کے دودھ کو ماں کے دودھ کی مانند بنانے کے لیے اس میں چکناہٹ اور کیلسیم کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

تجزیہ: 'جاپانی اشتراک' درست نہیں۔ یا تو 'جاپان کے اشتراک' ہوتا یا 'جاپانی ماہروں کے اشتراک' ہوتا۔ یہاں سائنسداں بھی مناسب نہیں تھا۔ نسل 'طاقتور' ہوتی ہے۔ 'مضبوط' نادرست ترجمہ ہے۔

افزائش نسل حیوانات کی ایک اصطلاح ہے، اور یہ انگریزی اُردو ڈکشنری میں نہیں ملی ہوگی۔ کسی ماہر سے پوچھنے کے بجائے، اس جملے کو اُردو کاپی سے ہٹا دیا گیا۔ یہ نہایت غیر پیشہ وارانہ بات ہے۔ "بھینس کے دودھ کو ماں کے دودھ کی مانند بنانے کے لیے" سے مفہوم ادا نہیں ہوتا ہے۔ انسان کے بچوں کی ضرورت کا ذکر ہونا تھا۔ ماں تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ آخر میں 'چکناہٹ' کا لفظ بھی غلط ہے۔ ٹرانسلیٹر / نیوز ریڈر چکناہٹ اور چکنائی کے فرق سے بھی واقف نہیں۔ ریڈیو سے اردو میں خبریں براڈ کاسٹ تو ہو رہی ہیں، لیکن پیشہ وارانہ حیثیت سے پست معیار کی ہیں۔

یہ خبر، صحیح طریقے سے یوں براڈ کاسٹ ہو سکتی تھی:

"کرنال کے نیشنل ڈیری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ایک پروجکٹ شروع کیا ہے۔ اس کا مقصد بھینسوں کی دودھ دینے کی صلاحیت، اور اس کی کوالٹی کو بہتر بنانا ہے۔ اس پروجکٹ میں انسٹی ٹیوٹ کو جاپانی ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔ اور اس پروجکٹ کے تحت بھینسوں کی نسل کو زیادہ طاقتور بنانا ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ سارے سال نسل کشی ایک سی ہو۔ انسٹی ٹیوٹ اس پروجکٹ پر کام کر رہا ہے کہ بھینس

کے دودھ کو انسانی دودھ جیسا بنایا جاسکے، تاکہ بچے ماں کے دودھ کی طرح اسے پی سکیں۔ اس کے لیئے بھینسوں کے دودھ میں کیلسیم اور چکنائی کم کرنا ضروری ہے۔"

تاریخ: ۱۷ اور ۱۸ ستمبر ۱۹۷۶ء؛ وقت ۱۱ بجے رات اور صبح ۷ بجکر ۱۵ منٹ (بالترتیب)

In Mozambique, one hundred and fifty miners are feared killed in a coalmine disaster. The accident occurred when a gallery of a mine at Meatize in North eastern part of the country collapsed. The Mozambique Radio which announced the tragic incident today said that the disaster occurred yesterday when the miners were underground.

رات ۱۱ بجے: "موزمبیق میں کوئلہ کان کے ایک حادثے میں ایک سو چالیس کوئلہ مزدوروں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ ملک کے شمالی مشرقی حصے میاٹیز کے مقام پر ایک کوئلہ کان کی گیلری کے گر پڑنے کے نتیجے میں یہ حادثہ پیش آیا۔ موزمبیق ریڈیو نے اس حادثے کی خبر دیتے ہوئے آج کہا کہ یہ حادثہ کل اس وقت پیش آیا، جب کہ کوئلہ مزدور زیر زمین حصے میں کام کر رہے تھے۔"

صبح سوا سات بجے: اندیشہ ہے کہ موزمبیق میں کان کے ایک حادثے میں ایک سو چالیس کان کن ہلاک ہو گئے ہیں۔ موزمبیق ریڈیو نے کل اس حادثے کی خبر دیتے ہوئے بتایا کہ یہ حادثہ جمعرات کو پیش آیا، جب کہ کان کن، کان کے اندر کام کر رہے تھے۔

تجزیہ: "گر پڑنے کے نتیجے میں" نہ تو بول چال کی زبان ہے، اور اس انداز بیان کے لیئے کوئی جواز ہے، کیونکہ یہ انگریزی عبارت کا ترجمہ بھی نہیں ہے۔ اگلی صبح کے بلیٹن میں پوری خبر کے بجائے، اس کا خلاصہ ہے۔ لیکن خالی کان کن شروع میں کہنا مناسب نہیں۔ دونوں بلیٹنوں میں ذرا سی توجہ سے روزمرہ کے مطابق مانوس زبان لکھی جاسکتی تھی، کچھ اس طرح،

"موزمبیق میں کل کوئلے کی ایک کان میں ایک افسوسناک حادثہ ہوا۔ اندیشہ ہے کہ ایک سو چالیس کان کن، جو اس وقت زمین کے نیچے کان میں کام کر رہے تھے، ہلاک ہو گئے۔ یہ سانحہ اُس وقت ہوا، جب موزمبیق کے شمالی مشرقی مقام میاٹیز کی ایک کان میں گیلری ڈھ گئی۔"

About two hundred Indian doctors and para-medical personnel will shortly leave for Libya to take up assignments in hospitals and other medical establishments in that country. Earlier also several Indian doctors had gone to Libya.

تاریخ: ۱۷ ستمبر ۱۹۷۶ء: رات: ۱۱ بجے: اُردو سروس

"بھارت کے تقریباً دو سو ڈاکٹر اور نیم طبی عملے کے افراد جلد ہی لیبیا روانہ ہو جائیں گے، جہاں وہ لیبیا کے اسپتالوں اور دوسرے طبی اداروں میں، اُن کے سپرد کام سنبھالیں گے۔ اس سے پہلے بھی کئی ڈاکٹر لیبیا جا چکے ہیں۔"

تاریخ: ۱۸ ستمبر ۱۹۷۶ء: وقت: صبح سات بجکر ۱۵ منٹ: اردو سروس

"تقریباً دو سو بھارتی ڈاکٹر، اور ڈاکٹری عملے کے دوسرے لوگ، اسپتالوں اور دوسرے ڈاکٹری اداروں میں کام کرنے کی خاطر، جلد ہی لیبیا روانہ ہوں گے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے ڈاکٹر لیبیا جا چکے ہیں۔"

تجزیہ:

para-madica کا ترجمہ ایک بلیٹن میں 'نیم طبی' اور دوسرے میں 'ڈاکٹری عملہ' کیا گیا ہے۔ دونوں ناقص ہیں۔ ڈاکٹری عملے میں خود ڈاکٹر بھی شامل ہوتے ہیں، اور نیم طبی، نیم حکیم کی طرف دھیان لے جاتا ہے۔ 'ان کے سپرد کام سنبھالیں گے'، کا بھی ترجمہ نہیں، اس لیئے اس غلطی کے لیئے کوئی جواز بھی نہیں۔ بہت واضح، اور سادی سی خبر تھی۔ یوں لکھی جا سکتی تھی:

"کوئی دوسو ڈاکٹر اور امدادی طبی عملے کے لوگ جلد ہی لیبیا کے لیئے روانہ ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر، یہ لوگ وہاں کے اسپتالوں اور طبی اداروں میں کام کریں گے۔ ہندوستانی ڈاکٹر پہلے بھی لیبیا جا چکے ہیں۔"

آکاش وانی حیدرآباد سے اردو کا علاقائی اردو بلیٹن ۶ بجکر ۲۵ منٹ سے ۶ بجکر ۳۵ منٹ

۹ جون ۱۹۷۶ء:

The President, Mr. Fakhruddin Ali Ahmad accompanied by Begum Abida Ahmad, paid a visit to Darga (h) Hazrat Yusuf Saheb at Nampally in Hyderabad today. The President was received by Sajjadanashin Mujahid Ali Shah of the Darga (h) besides Mr. Akbar Ali Khan, former Governor of Orissa and member of Darga (h) committee, Mr. K. Rajamallu, State Health Minister. The President, who spent over 25 minutes at the Darga (h), was told that Darga (h) Committee was raising Hazrat Yusuf Shareef memorial ward at Nampally Govt. Hospital. The ward is being constructed by collecting public donations.

"راشٹرپتی نے آج ہی بیگم عابدہ احمد کے ساتھ حیدرآباد میں نامپلی کے مقام پر حضرت یوسف صاحب شریف رح کی درگاہ کی زیارت کی۔ درگاہ شریف کے سجادہ نشین مولانا مجاہد علی شاہ کے علاوہ، اڑیسہ کے سابق گورنر شری اکبر علی خاں، اور پردیش کے صحت کے وزیر، اور درگاہ کمیٹی کے رکن شری کے راجملو نے راشٹرپتی کا خیر مقدم کیا۔ شری فخرالدین علی احمد نے درگاہ میں کوئی پچیس منٹ گذارے۔ انھیں بتایا گیا کہ درگاہ کمیٹی نامپلی دواخانے میں حضرت یوسف شریف میموریل وارڈ قائم کر رہی ہے، اور یہ وارڈ عوامی عطیے جمع کرکے تعمیر کیا جا رہا ہے۔"

تجزیہ:

ترجمہ مناسب ہے۔ سوائے اس کے راشٹرپتی کا نام، جیسا کہ انگریزی کاپی میں ہے، شروع میں لینا چاہیئے تھا۔

Mr. Laxman Das, Panchayat Raj Minister suggested that block development officers who are instrumental in implementing the minimum wages act at the village level should be vested with powers to prosecute those voilating the Act. He was inaugurating a conference of BDOs and others to review the implementation of the Act in Srikakulam district yesterday.

پہلی جولائی ۱۹۷۶ء

"پنچایت راج کے وزیر شری ایل لکشمن داس نے سجھاؤ دیا ہے کہ بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو، جو گاؤں کی سطح پر اقل ترین اجرتوں کے قانون کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں، اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے اختیارات دیئے جانے چاہئیں۔
شری لکشمن داس کل سریکاکلم ضلع میں اس قانون کی عمل آوری کا جائزہ لینے کے لئے منعقدہ بی ڈی اوز اور دوسرے افسروں کی ایک کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے۔"

تجزیہ:

Minimum کے معنی یوں تو 'کم سے کم' ہیں، لیکن یہ ایک اصطلاح بھی ہے، جس کا مفہوم ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں ہے۔ ہندی میں 'ینون تم' ہے۔ حیدرآباد میں اردو سرکاری زبان رہ چکی ہے، اور وہاں اس مفہوم کے لئے 'اقل ترین' کی اصطلاح رائج ہے۔ خبر کے شروع کا حصہ ٹھیک ہے۔ لیکن آخری جملہ ضرورت سے زیادہ لمبا ہے۔ یہ حصہ اس طرح لکھا جا سکتا تھا:
"شری لکشمن کل سریکاکلم میں اس کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے،

جواس قانون پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیئے بلائی گئی تھی۔اس میں بلاک
ڈیولپمنٹ افسروں اور دوسرے متعلقہ لوگوں نے شرکت کی۔
اس میں بھی آخری جملہ غیر ضروری ہے۔اسے حذف کیا جاسکتا ہے۔

The Andhra Pradesh Government has announced certain incentives and disincentives to encourage Government servants to adopt family planning. Speaking to newsmen in Hyderabad today after the cabinet meeting, the Chief Minister Mr. J. Vengala Rao said that two advance increments will be given to those employees who undergo sterilization after three or more child births. Any one of the spouses can get sterilized to claim this incentive.

All kinds of loans and advances will hereafter be given to those who have one or two children and to those who got sterilized after more than two children.

Leave travel concession, travelling allowance, medical reimbursement and educational concession will be withdrawn in respect of third or subsequent children born after the first of September 1977.

Women employees will not be given maternity leave in case of third and subsequent births. Houses constructed by the State Housing Board will not be allotted to anybody who has two or more children unless one undergoes sterilization.

انگریزی کاپی میں آخری جملہ مضحکہ خیز ہے، اور بری ڈرالنگ کی بہترین مثال ہے۔ لکھنا یہ

تھا کہ جن والدین کے دو یا دو سے زیادہ بچے ہوں گے، انھیں اسٹیٹ ہاؤسنگ بورڈ کا مکان اس وقت تک الاٹ نہیں ہوگا جب تک والدین میں سے ایک نس بندی نہ کرائے۔ لیکن انگریزی کاپی سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ جب تک بچوں میں سے ایک کی نس بندی نہ کرائی جائے۔

۱۳ ر اگست ۱۹۷۶ء :

" پردیش سرکار نے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کی حوصلہ افزائی کی غرض سے بعض ترغیبیں دینے اور چند ترغیبات واپس لینے کا اعلان کیا ہے۔ بڑے وزیر، شری جلگم وینگل راؤ نے آج حیدرآباد میں ریاستی کابینہ کی میٹنگ کے بعد اخبار والوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ایک یا دو بچوں کی پیدائش کے بعد جو ملازمین نس بندی آپریشن کروائیں گے، انھیں دو پیشگی اضافے ملیں گے۔ تین یا تین سے زیادہ بچوں کی پیدائش کے بعد نس بندی آپریشن کرانے والا ہر ملازم ایک پیشگی اضافہ حاصل کر سکے گا۔ اس ترغیب کا مطالبہ کرنے کے لیے، بیوی یا شوہر، دونوں میں سے کوئی بھی نس بندی کرا سکتے ہیں۔ آئندہ سے ہر قسم کے قرضے اور پیشگی رقمیں اُن ملازمین کو دی جائیں گی؛ جن کے ایک یا دو بچے ہوں، اور ان کو بھی، جنھوں نے دو سے زیادہ بچوں کے بعد نس بندی آپریشن کرالیا ہو۔ اگلے سال پہلی ستمبر کے بعد پیدا ہونے والے تیسرے یا اُس کے بعد کے بچے کے معاملے میں رخصت پر سفر کی رعایت، ٹریولنگ الاؤنس، طبی اخراجات کی بازادائیگی، اور تعلیمی مراعات واپس لے لی جائیں گی۔ تیسری، یا اس کے بعد کی پیدائشوں کی صورت میں خاتون ملازموں کو زچگی کے دنوں کی رخصت نہیں ملے گی۔ پردیش ہاؤسنگ بورڈ کی طرف سے تعمیر کیے ہوئے مکانات ایسے کسی بھی ملازم کو الاٹ نہیں کیے جائیں گے، جسے دو یا دو سے زیادہ بچے ہوں، تاوقتیکہ وہ نس بندی آپریشن نہ کرالے۔"

تجزیہ:

فیملی پلاننگ کے لیے خاندانی منصوبہ بندی مناسب نہیں ہے۔ اور بات جب صرف ایک جوڑے کی ہو، تو وہ صرف کنبہ تک محدود رہتی ہے۔ پہلے جملہ میں کنبہ بندی اختیارات کرنے کی بات ہونا چاہیے تھی۔ ترغیبیں دینے اور ترغیبیں واپس لینے کی بات بھی غلط ہے۔ رعایتیں دینے اور رعایتیں واپس لے کر بڑے کنبے کی حوصلہ شکنی کی بات ہونا چاہیے تھی۔ ''نیوز مین'' کا لفظی ترجمہ 'اخبار والوں' کیا گیا ہے۔ اخبار نویسوں لکھنا چاہیے تھا۔ دو پیشگی اضافے اور ایک پیشگی اضافہ لغوی ترجمے ہیں۔ دو سالانہ ترقیاں' اور ایک سالانہ ترقی لکھنا چاہیے تھا۔ تنخواہ میں دو سالانہ اضافے یا ایک سالانہ اضافہ بھی لکھا جا سکتا تھا۔ میٹرنٹی لیو کے لیے ''زچگی کے دنوں کی رخصت نہیں ملے گی'' درست نہیں ہے۔ یہ بھی ہاؤلر ہے۔ دفتر میں زچہ خانہ تھوڑی ہو گا۔ مقصد یہ تھا کہ ''زچگی کے دنوں کی خاص رخصت کی سہولت نہیں دی جائے گی۔''

یہ خبر یوں لکھی جا سکتی تھی:

''سرکاری ملازم اپنا کنبہ محدود رکھیں، اس سلسلے میں پرورش حکومت نے کچھ رعایتیں دینے، اور زیادہ بچوں کے والدین سے کچھ رعایتیں واپس لینے کا بھی اعلان کیا ہے۔ کابینہ کی میٹنگ کے بعد بڑے وزیر، شری جے ونگل راؤ نے اعلان کیا کہ جو سرکاری ملازم ایک یا دو بچوں کے بعد نس بندی کرائیں گے، انھیں دو سالانہ ترقیاں دی جائیں گی۔ تین یا زیادہ بچوں کے بعد نس بندی کرانے والوں کو ایک سالانہ ترقی ملے گی۔ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی نس بندی کرائے تو یہ رعایت ملے گی۔

آئندہ سے قرضے اور پیشگیاں صرف انھیں کو ملیں گی، جن کے صرف ایک یا دو بچے ہیں، اور انھیں بھی جنھوں نے دو سے زیادہ بچوں کے بعد نس بندی کرالی۔

ستمبر ۱۹۷۶ء کے بعد تیسرا یا اس کے بعد کا بچہ پیدا ہو گا تو وہ لیو ٹریول، ٹریولنگ الاؤنس علاج پر اخراجات اور تعلیم کے سلسلے میں رعایتیں اس کے سلسلے میں نہیں ملیں گے۔

تیسری اور بعد کی ولادتوں کے سلسلے میں خواتین ملازمین کو میٹرنٹی لیو نہیں ملے گی۔ انھیں معمول کی چھٹیوں کے حساب سے چھٹی مل سکے گی۔ اسٹیٹ ہاؤسنگ بورڈ

کے بنائے ہوئے مکانوں میں سے کسی ایسے شخص کو مکان الاٹ نہیں ہوگا، جس کے دو یا زیادہ بچے ہیں، تاوقتیکہ نس بندی نہ کرائی گئی ہو۔"

چھٹا باب

ریڈیو اور دُوردرشن کے پُروگراموں میں

اردو کا حصّہ

ڈائرکٹوریٹ جنرل، آل انڈیا ریڈیو کے ۹ اگست ۸۹ء کے خط کے مطابق، ملک کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے اردو پروگراموں کا نقشہ یہ ہے:

۱۔ اورنگ آباد - پربھنی	روزانہ	۳۰ منٹ
۲۔ الٰہ آباد	پندرھویں روز	۲۰ منٹ
۳۔ احمد آباد	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۴۔ بمبئی	روزانہ	۳۰ منٹ
۵۔ بھوپال	ہفتے میں دو روز	۳۰ منٹ
۶۔ بنگلور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۷۔ بھدراوتی	بنگلور کا پروگرام ریلے کرتا ہے	
۸۔ بیکانیر	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۹۔ کلکتہ	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۱۰۔ دہلی (اردو مجلس)	روزانہ	۴۰ منٹ
۱۱۔ دربھنگہ	روزانہ	۵۵ منٹ
۱۲۔ دھارواڑ	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۱۳ گورکھپور	ہفتے میں دو بار	۵۰ منٹ
۱۴۔ گلبرگہ	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۱۵۔ حیدرآباد	روزانہ	دو گھنٹے
۱۶۔ اندور	ہفتے میں دو بار	۳۰ منٹ

۱۷۔ جتوں	ہفتہ وار	۱۵ منٹ
۱۸۔ جالندھر	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۱۹۔ جلگاؤں	مہینے میں ایک بار	۳۰ منٹ
۲۰۔ جے پور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۲۱۔ جودھپور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۲۲۔ لکھنؤ	روزانہ	۲۰ منٹ
۲۳۔ لیہہ	ہفتہ وار	۱۰ منٹ
۲۴۔ ناگپور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۲۵۔ رتناگری	مہینے میں ایک بار	۳۰ منٹ
۲۶۔ رامپور	روزانہ	۲۰ منٹ
۲۷۔ رانچی	ہفتہ وار	۱۵ منٹ
۲۸۔ شملہ	مہینے میں ایک بار	۱۴ منٹ
۲۹۔ سرینگر	روزانہ مہینے میں کل	۳۲ گھنٹے
۳۰۔ اودے پور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۳۱۔ وجے واڑہ	ہفتہ وار	۱۴ منٹ
۳۲۔ پٹنہ	روزانہ	۵۵ منٹ
۳۳۔ میسور	ہفتہ وار	۳۰ منٹ
۳۴۔ روہتک	مہینے میں ایک بار	۲۵ منٹ
۳۵۔ اردو سروس	روزانہ سروس	سوا بارہ گھنٹے
۳۶۔ نیشنل چینل	روزانہ	۲۵ منٹ

ہم ان سرکاری اعداد و شمار کو درست مانے لیتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نمبر ۱۱ پر دربھنگہ کا روزانہ ۵۵ منٹ کا پروگرام وہی ہے جو نمبر ۳۲ پر پٹنہ سے براڈ کاسٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح دلّی سے اردو مجلس پروگرام صرف ۳۰ منٹ کے لیئے شام کو سات بج کر ۴۵ منٹ سے آٹھ بج کر ۱۵ منٹ تک نشر ہوتا ہے۔ صبح آٹھ ۴۰ سے آٹھ ۵۰ تک، دس منٹ تک اردو غزلوں یا قوالیوں

کا پروگرام نشر ہوتا ہے، ویسے پروگرام دن اور رات میں مختلف اوقات پر نشر ہوتے ہیں۔ ان کو اگر اردو پروگرام نہیں سمجھا جاتا، تو پھر صبح دس بجے کے پروگرام کو اُردو مجلس کہنا منطقی نہیں ہے۔

ریڈیو پروگرام ہندوستانی میں ہوتے تھے۔ آواز اور لفظوں کا جو رشتہ براڈ کاسٹر اور سامع کے درمیان ہے، لپی یا رسم خط اس میں کوئی عنصر نہیں۔ اس موضوع پر کھوج سے پہلے ایک نظر اردو خبروں پر ڈالنا مفید ہوگا۔ دلّی سے نشر کی جانے والی مرکزی خبریں یہ اسٹیشن ریلے کرتے ہیں:

۱۔ دہلی	صبح آٹھ بجکر ۵۰ منٹ پر	دس منٹ
	دوپہر ایک بجکر ۵۰ منٹ پر	دس منٹ
	رات ۹ بجکر ۱۵ منٹ پر	دس منٹ
۲۔ سرینگر	دلّی کی طرح تینوں بلیٹن	
۳۔ لیہہ	دلّی کی طرح تینوں بلیٹن	
۴۔ حیدرآباد	دلّی کی طرح تینوں بلیٹن	
۵۔ لکھنؤ	صبح آٹھ بجکر ۵۰ منٹ	دس منٹ
	رات ۹ بجکر ۱۵ منٹ	دس منٹ
~~۶۔ الہ آباد~~	~~لکھنؤ کی طرح~~	
۷۔ وارانسی	ایضاً	
۸۔ رامپور	ایضاً	
۹۔ گورکھپور	ایضاً	
۱۰۔ پٹنہ	ایضاً	
۱۱۔ بھاگلپور	ایضاً	
۱۲۔ دربھنگہ	ایضاً	
۱۳۔ جموّں	ایضاً	
۱۴۔ اورنگ آباد	دوپہر ایک بجکر ۵۰ اور رات ۹ بجکر ۱۵	۲۰ منٹ
۱۵۔ پربھنی	اورنگ آباد کی طرح دن اور رات کے ۲ بلیٹن	۲۰ منٹ

۱۶۔ جالندھر	ایضاً	
۱۷۔ شملہ	صبح ۸ بجکر ۵۰ منٹ	دس منٹ
~~۱۸۔ رانچی~~	~~رات ۹ بجکر ۱۵ منٹ~~	دس منٹ
۱۹۔ بھوپال	ایضاً	

وہ اسٹیشن جہاں نیوز یونٹ ہیں اور جو اپنے علاقائی بلیٹن نشر کرتے ہیں:

۱۔ سرینگر	صبح ۹ بجکر ۲۰ منٹ	۵ منٹ
	دوپہر ۱۲ بجکر ۳ منٹ	۵ منٹ
	شام سات بجکر ۴۵ منٹ	دس منٹ
۲۔ لکھنؤ	دوپہر ۲ بجکر ۳۰ منٹ	۵ منٹ
۳۔ حیدرآباد	شام ۵ بجکر ۵۰ منٹ	۱۰ منٹ
۴۔ اورنگ آباد	صبح سات بجکر ۳۰ منٹ	۵ منٹ
۵۔ پٹنہ	سہ پہر ۳ بجکر ۱۵ منٹ	۵ منٹ

Government of India

Directorate General : All India Radio

Akashvani Bhavan : Parliament Street

No.8/3/89-PI

New Delhi, dated the

9th August, 1989.

Shri Kamal Ahmed Siddiqui

Block I/106,

Old Campus,

Jawahar Lal Nehru University,

New Delhi - 110 067.

Sir,

Kindly refer to your letter No. NIL dated NIL regarding information about urdu Programme broadcast by AIR.

The requisite information is enclosed.

Yours faithfully,

(I.P. Mishra)

Section Officer

for Director General

Statement showing Urdu language broadcast from AIR Stations

S.No.	Name Of The Station	Frequency	Duration
1.	Aurangabad	Daily	30 Minutes
2.	Allahabad	Twice a month	20 minutes (each)
3.	Ahmadabad	Weekly	30 minutes
4.	Bombay	Daily	30 minutes
5.	Bhopal	Twice a week	30 minutes (each)
6.	Bangalore	Weekly	30 minutes
7.	Bhadravati	Weekly	30 minutes
8.	Bikaner	Weekly	30 minutes
9.	Calcutta	Weekly	30 minutes
10.	Delhi	Daily	40 minutes
11.	Darbhanga	Daily	55 minutes
12.	Dharwad	Weekly	30 minutes
13.	Gorakhpur	Twice a week	50 minutes
14.	Gulbarga	Weekly	30 minutes
15.	Hyderabad	Daily	2 hours
16.	Indore	Twice a week	30 minutes (each)
17.	Jammu	Weekly	15 minutes

18.	Jallandhar	Weekly	30 minutes
19.	Jalgaon	Monthly	30 minutes
20.	Jaipur	Weekly	30 minutes
21.	Jodhpur	Weekly	30 minutes
22.	Lucknow	Daily	20 minutes
23.	Leh	Weekly	10 minutes
24.	Nagpur	Weekly	30 minutes
25.	Ratnagiri	Monthly	30 minutes
26.	Rampur	Daily	20 minutes
27.	Ranchi	Weekly	15 minutes
28.	Simla	Monthly	14 minutes
29.	Srinagar	Monthly	32 minutes
30.	Udaipur	Weekly	30 minutes
31.	Vijaywada	Weekly	14 minutes
32.	Patna	Daily	55 minutes
33.	Mysore	Weekly	30 minutes
34.	Rohtak	Monthly	25 minutes
35.	Urdu Service	Daily	12 hrs.15 mts.per day
36.	National Channel	Daily	25 minutes

Details of Urdu News Bulletins broadcast from

All India Radio Stations

Stations Relaying Central News Bulletins in Urdu

S.No.	Name of the stations	Time of Relay	Duration
1.	Delhi (originated)	8:50 am, 1:50 pm 9:15 pm	10 mts. each
2.	Lucknow	8:50 am, 9:15 pm	10 mts. each
3.	Allahabad	8:50 am, 9:15 pm	-do-
4.	Varanasi	8:50 am, 9:15 pm	-do-
5.	Rampur	8:50 am, 9:15 pm	-do-
6.	Gorakhpur	8:50 am, 9:15 pm	-do-
7.	Patna	8:50 am, 9:15 pm	-do-
8.	Bhagalpur	8:50 am, 9:15 pm	-do-
9.	Ranchi	9:15 pm	-do-
10.	Darbanga	8:50 am, 9:15 pm	-do-
11.	Bhopal	9:15 pm	-do-
12.	Jalandhar	1:50 pm, 9:15 pm	-do-

13.	Simla	8:50 am	-do-
14.	Srinagar	8:50 am, 1:50 pm, 9:15 pm	-do-
15.	Jammu	8:50 am, 9:15 pm	-do-
16.	Leh	8:50 am, 1.50pm,	-do-
17.	Aurangabad	1:50 pm, 9:15 pm	-do-
18.	Parbhani	1:50 pm, 9:15 pm	-do-
19.	Hyderabad	8:50 am, 1:50 pm, 9:15 pm	-do-

Stations Originating Regional News Bulletins in Urdu

1.	Srinagar	9:20 am, 12:30 pm.	5 mts. each
		7:45 pm	10 mts.
		4:00 pm	30 mts. (slow speed bulletin)
2.	Lucknow	2:30 pm	5 mts.
		5:50 pm	10 mts.
3	Hyderabad	5.50pm	10 mts.
4	Aurangabad	7.30am	15 mts.
5	Patna	3.15pm	5 mts

Stations Relaying Regional News Bulletins in Urdu

1:	Leh	7:45 pm	10 mts. from Srinagar
2.	Jammu	7:45 pm	-do-
3.	Rampur	2:30 pm	5 mts. from Lucknow
4.	Varanasi	2:30 pm	-do-

Details of Urdu News Bulletin Put Out Daily by E.S.D.
(External Service Division)

Timing	Duration
0615 - 0625 hrs.	10 mts.
0930 - 0932 hrs.	02 mts.
1402 - 1407 hrs.	05 mts.
1650 - 1700 hrs.	10 mts.
2000 - 2010 hrs.	10 mts.
2145 - 2155 hrs.	10 mts.
2300 - 2305 hrs.	05 mts.
0000 - 0005 hrs.	05 mts.

وہ اسٹیشن جو علاقائی اُردو نیوز بلیٹن ریلے کرتے ہیں

۱۔	لیہہ	سرینگر سے شام سات بجکر ۴۵ منٹ پر	دس منٹ
۲۔	جموں	ایضاً	
۳۔	رامپور	لکھنؤ سے دوپہر ۲ بجکر ۳۰ منٹ پر	پانچ منٹ
۴۔	وارانسی	ایضاً	

اُردو سروس ایکسٹرنل سروسز ڈویژن سے چار اردو بلیٹن نشر ہوتے ہیں

۱۔	صبح ۶ بجکر ۱۵ منٹ	دس منٹ
۲۔	صبح ۹ بجکر ۳۰ منٹ	دو منٹ
۳۔	دوپہر دو بجکر دو منٹ	پانچ منٹ
۴۔	سہ پہر چار بجکر ۵۰ منٹ	دس منٹ
۵۔	شام آٹھ بجے	دس منٹ
۶۔	رات ۹ بجکر ۴۵ منٹ	دس منٹ
۷۔	رات گیارہ بجے	پانچ منٹ
۸۔	رات بارہ بجے	پانچ منٹ

۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو کے نٹ ورک پر خبروں کے بلیٹنوں کی کیا پوزیشن تھی، اس کے بارے میں ایچ آر لوتھرا لکھتے ہیں [۱]

At the end of March 1939, the timings of the bulletins heard from different stations were as follows:

۱۔ Indian Broadcasting : H.R. Luthra ص ۳۷۰

Newsin English from Delhi and Bombay 8:50 to 9:00 am, 6:00 to 6:05 pm on all days except Sundays and from 9:30 to 9:50 pm, daily. Delhi had also a late evening five-minute bulletin at 11:00 pm. Calcutta at 8:45 to 9:05 pm daily, 11:00 to 11:05 on Sundays only and 7 to 7:15 pm on Fridays only. Madras had only one bulletin at 9:00 to 9:20 pm. Lahore, Lucknow and Peshawar relayed only the 9:30 to 9:50 bulletin from Delhi.

News in Hindustani: Delhi: 9 to 9:10 am and on all days (except Sundays) and 9:15 to 9:30 pm daily.

Bombay: 9:00 to 9:15 pm daily.

News in Bengali: Calcutta: 8:25 to 8:45 daily;

7:15 to 7:30 pm Fridays only.

یہ کھوج چونکہ اردو سے متعلق ہے، اس لیے اس بات پر توجہ رہنا چاہیے کہ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اس وقت نہ صرف اردو اور ہندی کی براڈکاسٹنگ میں دوئی نہ تھی، بلکہ براڈکاسٹنگ کی زبان ہندوستانی تھی، وہ زبان جو آج بھی گھروں اور بازاروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پی سی چٹرجی، جو ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، شروع میں خبروں کی مرکزی تنظیم میں آئے تھے۔ ان کا بیان:

Between 1930 and 1936 AIR's Bombay and Calcutta stations, and Delhi when the station came on the air in 1936, were broadcasting two daily news bulletins in the peak period 2030 to 2130; one bulletin in English, the second in Hindustani from Bombay and Delhi and in Bengali from Calcutta. Each station produced its own bulletins. The stations experimented with the

placing of further daily bulletins but it was not until 1937 when the Central News Organization (CNO) was created that these were established at 1800 in English and 1805 in Hindustani.

Hindustani signifies a mixture of Hindi and Urdu, a language of the streets, in which AIR broadcast news bulletins until 1949. Defending Hindustani as the main language of broadcasting Fielden commented in his report the AIR had 'tentatively adopted it as a language spoken or at least understood in the greater part of Aryan-speaking India'. Recognising the difficulties of achieving maximum intelligibility he went on to say, 'There is, however, a feeling in the country that All India Radio should assist in the evolution and expansion of a common language for India, and in its pursuance of this feeling, no less than for practical considerations, that All India Radio is endeavouring to widen the scope of Hindustani'. Interestingly enough, Gandhiji had advocated Hindustani — written in either the Devanagri script used for Hindi or the Persian script used for Urdu — as the national language of India but he was outvoted by pundits. Hindustani continued to be used for a short while after Independence. On 27 November 1949, AIR's Programme journals substituted the word Hindi for Hindustani. Shortly afterwards separate newscasts started in Urdu. Today, Hindustani is not officially recognised as a language.[10]

---

[10] Broadcasting In India : P.C. Chatterji

بول چال کی ہندی اور بول چال کی اردو لوگ آسانی سے سمجھتے ہیں، ہندی / اردو علاقوں کے باہر بھی، اور اس کا ثبوت فلمیں ہیں۔ لیکن ۱۹۴۹ء سے بہت پہلے سے ریڈیو سے بول چال کی زبان کو "اسٹوڈیو نکالا" دینے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ جون ۱۹۴۷ء، میں جب عبوری حکومت میں وزیرِ اعظم نہیں تھا، بلکہ جواہر لال نہرو اس حکومت کے نائب صدر تھے، اور سردار ولبھ بھائی پٹیل ممبر انفارمیشن براڈکاسٹنگ تھے، تو ریڈیو کی خبروں کی زبان بدلنا شروع ہو گئی تھی۔ روز مرہ سے نت سم کی طرف کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ یہ تبدیلی سب نے محسوس کی۔ شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر "ساقی" نے نگاہِ اولیں کے عنوان سے لکھا :[1]

"پنڈت جی نے ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ تقریر کی تھی، اور ہمیں اُن کے اس یقین سے سو فیصدی اتفاق تھا کہ وہ زبان ہندوستان کے ہر باشندے کے لیے قابلِ فہم، اور لائق تقلید ہے، کیونکہ پنڈت جی کی تقریر میں نہ عربی فارسی الفاظ کی بھرمار تھی، اور نہ سنسکرت شبدوں کی ٹھونس ٹھانس۔ . . . . مگر افسوس ہے سردار پٹیل کی ممبری، اور چودھری صاحب کی ڈائرکٹری کے دور شروع ہوتے ہی، اردو دشمنی کی وہ عمارت نئے سرے سے تیار ہونے لگی، جس کی بنیاد ناگپور میں منعقد ہونے والے ساہتیہ سمیلن میں گاندھی جی مہاراج جیسی بیدار مغز ہستی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ چنانچہ آج کل صبح سے رات تک چاروں وقت کی خبریں سن کر حیرت ہوتی ہے کہ یا الٰہی یہ کون سی نگری کی بھاشا بولی جا رہی ہے . . . ذرا ملاحظہ کیجیے۔ صرف ایک دن کی خبریں سن کر حسبِ ذیل الفاظ کی مختصر سی ترتیب دی گئی ہے :

پرتی ندھی سدھانت ودھان
سواگت ودھایک اُوچِتا انوسار
پربندھ پربندھک پرجامنڈل پردھان سبھاپتی
اُنتی اکھنڈ شانتی بھاشن پرنتو کیول تتھا سمبندھ
ادھیکار ودوان ودیارتھی اتہاس پرستاو آشا آرمبھ اور
گھٹنائیں وغیرہ۔

---

[1] شاہد احمد دہلوی : ماہنامہ ساقی (دہلی)، بابت جون، ۱۹۴۷ء، ص ۳۔

کثرتِ استعمال سے، خاص طور سے سرکاری میڈیا میں تواتر او رتکرار کی وجہ سے ان میں سے آج کوئی شبد اجنبی نہیں محسوس ہوتا۔ اس زمانے میں یہ شبد روزمرّہ میں شامل نہیں تھے۔ نہ دلّی میں اور نہ لکھنؤ میں۔ البتہ سواگت، شانتی، آشا وغیرہ تو گیتوں میں مستعمل تھے۔ سمبندھ بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں تھا اور ودّیارتھی تو گنیش شنکر ودھیارتھی کے نام کا جزو بھی تھا۔ لیکن یہ لفظ صرف پاٹھ شالاؤں میں رائج تھا۔ شاہد احمد دہلوی کے ردّ عمل میں مبالغہ ہوسکتا ہے، لیکن جس رجحان کی طرف انھوں نے توجہ دلائی، وہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان میں شروع ہوچکا تھا، اور یہ وہی ناگپور والا "ہندی، ہندوستانی" والا رجحان تھا۔ یعنی وہ ہندی، جو بعد میں ہندوستانی بنے گی۔

کسی اسٹیشن پر ہندی یا اردو پروگراموں کا کوئی سکشن نہیں تھا۔ انگریزی ٹاکس کی طرح ہندوستانی ٹاکس کا سکشن تھا۔ ڈراموں کے لیئے ہندی اور اردو کی قید نہیں تھی۔ لیکن عبوری حکومت کے بنتے ہی لسانی منظر بدلنے لگا۔ آج ماضی پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ بول چال کی ہندی اور اردو میں فرق نہ ہو، یا معمولی سا ہو، لیکن ادبی ہندی اور ادبی اردو میں یقیناً فرق تھا، اور ادبی حیثیت سے دو مختلف زبانیں تھیں۔ پریم چند جیسی کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی، جو دونوں میں قدر مشترک ہو۔ ہندی اسلوب کی حق تلفی ضرور ہوئی۔ ایچ آر لوتھرا کے الفاظ میں:

Some of the criticism against AIR was quitevalid, but there were many people both within and outside the organisation, who were convinced that simple rather than academic language was more suited to the microphone. A.S. Bukhari, when he succeeded Fielden as the Controller Broadcasting in 1940, was an easier target for criticism against the weightage which Urdu received at some stations, because of his being a well-known Urdu writer himself, and because he was a Muslim. Many of his critics and

those who came into contact with him have conceded though that while he felt more at home in Urdu, he was not anti-Hindi in his policies, and ..... he took several steps to try to correct the linguistic imbalance. In a note to the Secretary of the Department he said that one of the causes of the complaints was many among the people recruited in the early years had Urdu as their main language, and this bias would be rectified in future recruitments[1]

لوتھرا نے توازن قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، اور اس کے لیے احمد شاہ بخاری کی نیک نیتی جواز کے طور پر پیش کی ہے۔ کبھی کبھی توازن قائم کرنے سے حقیقت پر پردہ ڈالنا پڑتا ہے یا پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ فیلڈن پر بڑے چھوٹے، دونوں بخاری حاوی ہو گئے اور آل انڈیا ریڈیو کا عملہ انھوں نے منتخب کیا۔ یہ کہنا شاید آسان نہ ہو کہ ذوالفقار بخاری، جو فیلڈن کے نفسِ ناطقہ تھے، کیونکہ ان کے بڑے بھائی رقیب کے رول کی تیاری میں مصروف تھے، اور فیلڈن کو اس کا احساس تھا۔ اور ذوالفقار علی بخاری کے ذہن میں کیا تھا، وہ ان کی آپ بیتی، سرگزشت میں کسی لگی لپٹی کے بغیر موجود ہے[2]

"سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مختصر ڈرامے لکھے کون؟ ان ڈراموں کو پیش کون کرے۔ ڈراموں میں پارٹ کون کرے؟ یہ ڈرامے لکھے گئے، اور اردو میں لکھے گئے۔ اس لیے لازم آیا کہ وہی لوگ ڈراموں کے متعلق تمام کام کریں، جو اردو زبان کی نوک پلک اور اردو زبان کے ادب سے واقف ہیں۔ وہ اردو ہی کیا جس میں عربی اور فارسی کی چاشنی نہ ہو۔ اردو ادب سے واقفیت صرف ان لوگوں کو ہو سکتی ہے جو عربی اور فارسی میں بھی کچھ دسترس رکھتے ہوں۔ ان تمام ضروریات کو دیکھا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ

---

[1] Indian Broadcasting : H.R. Luthra P.257

[2] سید ذوالفقار علی بخاری : سرگزشت : ص 119

کام مسلمان بہتر کر سکتے ہیں۔ اردو کے ضمن میں فارسی عربی کی شد بد رکھنے والے کچھ
ہوتے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوتے۔
ایک ڈرامے پر کیا موقوف ہے۔
"اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ"
جہاں اردو کا کوئی کام ہو، نظرِ انتخاب عام طور پر مسلمانوں ہی پر پڑتی ہے۔
چنانچہ پروگرام کے کام کے لیے زیادہ تر مسلمان ملازم رکھے گئے۔
محکمے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد میں سرکاری توازن برقرار رکھنے کے
لیے ہم نے انجینیروں کے شعبے میں مسلمانوں کی نسبت ہندو زیادہ بھرتی کیے۔
مختصر یہ کہ پروگراموں کا کام زیادہ تر مسلمانوں کے سپرد ہوا، اور انجینیری کا
کام ہندوؤں کے۔"

ذوالفقار علی بخاری اچھے براڈ کاسٹر تھے لیکن ان کا یہ بیان، اقبالی بیان 'افسوسناک بھی ہے، اور عبرتناک بھی۔ اگر جوگل کشور مہرا، سومناتھ چپ، کرشن سروپ ملک، ہنس راج لوتھرا، ہریش چندر کھنہ، کرتار سنگھ دگل، کرشن چندر، وشوامتر عادل، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی جیسے مایۂ ناز اردو براڈ کاسٹر پہلی پیڑھی میں تھے، تو پھر اردو کو مسلمانوں کے کھاتے میں ڈالنے کی یہ کوشش سراسر لسانی عصبیت نہیں، فرقہ وارانہ عصبیت ہے۔ دورِ اوّل میں اُردو کو مسلمانوں کی اجارہ داری بنانا، اور ہندی ادب کے حقوق پامال کرنا، اُردو کے اُن نادان سرپرستوں کا وہ جرم ہے، جس کی سزا اردو کو آزادی کے بعد نہ صرف اپنے علاقوں میں، بلکہ آل انڈیا ریڈیو میں بھگتنا پڑی۔

زبان کے سلسلے میں ذوالفقار نے جو گل افشانی کی ہے، وہ بھی تکلیف دہ ہے، اور ایک ایسی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے، جس نے اردو کے حق میں صرف کانٹے بوئے:[1]

"پروگراموں میں اردو کے خاص لب ولہجے سے ہندو حضرات بلبلا اُٹھے۔ ہر طرف
سے شور ہوا کہ ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ دہلی ریڈیو کی زبان بڑی سخت
ہے۔ ہندوؤں پر گراں گذرتی ہے۔ اس زبان کو نرم کرنا چاہیے۔ اُردو

---

[1] ایضاً: صفحہ ۱۲

زبان میں نہیں، بلکہ پروگرام ہندوستانی زبان میں پیش کرنے چاہئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب گاندھی جی نے اردو کی جگہ ہندوستانی زبان کا علم بلند کر رکھا تھا۔

اب اگر اس ہندوستانی زبان کی کوئی ڈکشنری ہوتی، ہندوستانی زبان میں کوئی ادب موجود ہوتا، تو ہم بھی کہتے کہ چلو بھائی، ہم ہندوستانی زبان ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس مفروضہ زبان کو ہم کیوں کر اختیار کرتے، جس کا نہ کوئی ادب تھا، نہ کوئی فرہنگ، نہ کوئی باپ تھا، نہ کوئی ماں۔

جو لوگ زبان کو آسان بنانے کے لیے برسوں سے چلا رہے ہیں، اُن کے شعور پر ہنسی آتی ہے، اور اُن کی جہالت پر رحم۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مشکل لفظ وہ ہوتا ہے، جو ہم نہ جانیں، اور جو لفظ ہم جانیں، وہ مشکل نہیں رہتا۔"

اُردو کے لیے "عربی فارسی کی چاشنی" کی شرط ذوالفقار نے رکھی ہے اور داغ کے ایک مصرع کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن اس میں اس چاشنی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ جو شعر موضوع سے متعلق ہے، اور جس کا حوالہ دینا تھا، یہ ہے:

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

وہ الفاظ جو رائج ہیں۔ چاہے بنیادی ذخیرے کے ہوں یا دخیل، اور جس تلفظ اور جن معنوں کے ساتھ رائج ہیں، وہ اردو ہیں۔ عربی فارسی جاننا اچھا ہے، سنسکرت اور دوسری زبانیں جاننا بھی اچھا ہے، لیکن لفظوں کے رائج تلفظ کو دوبارہ اصل تلفظ کی طرف لے جانا، لسانی مراجعت ہے۔ فیلڈن ایک رائج، زندہ اور دھڑکتی ہوئی زبان میں، بولی جانے والی زبان میں براڈکاسٹ کا تصوّر لے کر آتے تھے، ایسی زبان، جس میں لفظ نگینوں کی طرح جڑے گئے ہوں، مرصّع زبان ہوتی ہے۔ یہ بے تکلف، ترسیل کی زبان نہیں ہوتی۔ اور جو زبان ترسیل کی نہ ہو، وہ براڈکاسٹ کی بھی زبان نہیں۔ چھاپے کی زبان ریڈیو کی زبان نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ریڈیو مختلف میڈیم ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ذوالفقار نے اس بنیادی بات کو نہیں سمجھا، اور زبان کو فرقوں سے وابستہ کرنے کی وہی غلطی کی، جو اس سے پہلے سے ہوتی آ رہی تھی۔ یہ بدقسمتی اُردو کی بھی ہے،

اور ریڈیو کی بھی، کہ ابتدائی دنوں میں فیلڈن نے ذوالفقار جیسے افسر پر بھروسہ کیا، جو زبان کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو سامعین کا ایک گروپ نہیں سمجھتا تھا۔ زبان کو آسان بنانے کے سلسلے میں جن لوگوں نے آواز اٹھائی، ان کی جہالت پر ذوالفقار کو رحم آیا۔ رحم ایک اچھا جذبہ ہے، اور اس کے سب سے زیادہ مستحق وہ خود تھے، کیونکہ انھوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں کہ وقت اور میڈیم کے ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، اور زبان پہلے ہے، جس کی تبدیلیوں سے نئی فرہنگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانی فرہنگیں نئے تقاضوں کے ساتھ نہیں دیتیں۔ کئی فرہنگ کی ضرورت یقیناً تھی، اور براڈکاسٹ کے لئے نئی فرہنگ بنائی بھی گئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ذوالفقار کو اس فرہنگ کے وجود کا علم نہیں۔ ذوالفقار نے ایک عجیب بات لکھی ہے:[1]

> "شاعر ہو یا ادیب، بہت ڈھونڈ کر ایسا لفظ لاتا ہے، جو اس کے مفہوم پر حاوی ہو۔ اب یہ اس کے بس کا روگ نہیں کہ اس لفظ کو ہٹا کر کوئی کانگریسی لفظ بھی رکھ دے اور اپنا مطلب بھی ادا کر دے۔"

ابھی تک تو ذوالفقار نے اردو بدنصیب کو ہندو مسلم خانوں میں تقسیم کیا تھا، اب لفظوں کو کانگریسی بھی بنا دیا۔ اب لفظ کانگریسی ہو سکتا ہے، تو مسلم لیگی بھی، آریہ سماجی بھی، اور ہندو مہا سبھائی بھی۔ کیا لفظوں کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ بے شک ذوالفقار نے شوخیِ طبع دکھانے کے لیے 'کانگریسی'، 'سودیشی' کے معنوں میں استعمال کیا ہے، سوال یہ ہے کہ سودیشی سے انھیں اتنی چڑ کیوں؟ جب کہ خود احمد شاہ بخاری نے عبوری حکومت کے بنتے ہی سودیشی کپڑوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ اس باب کے موضوع سے الگ ہے۔ بات وہی ہے کہ زبان کے سلسلے میں ریڈیو کے دورِ اوّل میں اردو کے نادان بہی خواہوں نے جو تریاق اس کے حلق میں انڈیلا، وہ زہر ثابت ہوا۔ ذوالفقار کی ایک اور گل افشانی:[2]

> "ریڈیو کے ڈراموں کی زبان کو آسان بنانے کے لیے کرشن چندر اور

---

[1] ایضاً: ص ۱۲۰

[2] ایضاً: ص ۱۲۱

اوپندر ناتھ اشک کا تعاون حاصل کرنا آسان تھا، مگر غزلوں کی زبان کو کیا کرتے۔ ایسا مائی کا لال شاعر کہاں سے آتا، جس کے خیالات تو غالب کے ہوں، مگر زبان راجندر سنگھ بیدی کی۔ کانگریسی ہندوستانی زبان کے حامیوں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو غزل کو فارخطی دے دو، اور غزل کے بجائے گیت نشر کرو۔

انھوں نے یہ کہہ تو دیا کہ گیت نشر کرو، مگر یہ نہ فرمایا کہ گیت لکھے کون؟ اس تمام برِ صغیر میں حفیظ جالندھری کے سوا کون تھا، جس کے گیت میں موسیقی بھی ہو، اور شاعری بھی! "

گیت کار کی حیثیت سے حفیظؔ جالندھری کے بارے میں ذوالفقار کا فیصلہ کتنا غلط تھا، وقت نے ثابت کر دیا ہے۔ خود ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹی وی حفیظؔ کے گیتوں سے نہیں گونجتا، اگرچہ انھوں نے پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کے لیے الفاظ فراہم کیے۔ ذوالفقار کے باقی اندازے یا نظریات بھی اتنے ہی نادرست ہیں۔ دراصل ذوالفقار نے میڈیا کو سبیج بنانے کی کوشش کی، انجانے اور نامحسوس طریقے سے، اور اسے اُن کی کامیابیوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ خیالات کی اہمیت مسلّم، الفاظ کی اہمیت، ان الفاظ کی اہمیت جن سے ترسیل ہو سکے، اتنی ہی ہوتی ہے۔ لیکن ذوالفقار نے عوام کی زبان میں نہیں، اپنی پسند کی زبان میں پروگرام چاہے!

اور اب سیّد ذوالفقار علی بخاری کی خود نوشت سے آخری اقتباس:

"۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں نے یہ رٹ لگا رکھی ہے کہ آسان زبان لکھو۔ خود تو یہ حضرات نئے لفظ سیکھتے نہیں، البتہ اہلِ قلم سے کہتے ہیں کہ جو لفظ تم نے سیکھ رکھے ہیں، ان کو بھول جاؤ۔ یہ حضرات مہینہ بھر میں ایک نیا لفظ بھی سیکھ لیتے تو آج نو سو نئے الفاظ جانتے، اور انھیں یہ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ آسان زبان لکھو۔"[1]

یہ گاڑی کو بیلوں کے آگے لگانے کی بات ہے۔ براڈکاسٹ کا پہلا اصول ہے کہ اس زبان میں ہو، جو سامع لفظ بہ لفظ سمجھتا جائے۔ اتنا وقت کہاں کہ وہ کاپی پر ہر نہ سمجھ میں آنے والا لفظ نوٹ کرے، اور لغت میں اس کے معنی دیکھے۔ ایک لفظ پر سوچنے کے معنی ہیں کہ کئی جملے بغیر سُنے نکل جائیں گے، اور براڈکاسٹ نہ پُن کا رہے گا اور نہ پاپ کا۔ براڈکاسٹر ہی اگر روز ایک

---

[1] ایضاً: ص ۱۲۰۔

لفظ رائج سمجھ لے تو سال بھر میں اس لائق ہو سکتا ہے کہ عوام سے گفتگو کر سکے۔ اگر یار کی زبان ترکی ہو، اور آپ ترکی نہ جانتے ہوں، تو یار کو اپنی زبان سکھانے والے اسکول میں داخل کرنے کے بجائے، خود ترکی سیکھنا زیادہ دانشمندی ہے، اگر یار سے براہ راست گفتگو کی تمنا ہے۔ زبان کے سلسلے میں یہ ہے براڈ کاسٹ کا پہلا اصول۔

فیلڈن اور بخاری کے عہدوں میں اردو کے یادگار تاریخی پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے۔ سکشن ہندوستانی کے بھے، لیکن ہندی اسلوب کو اس کا جائز حصہ نہیں ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو غاصب زبان سمجھا جانے لگا، اور عبوری حکومت بنتے ہی ہندی پروگراموں کی تعداد دن دونی رات چوگنی ہونے لگی، اور ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس ملتے ہی اردو کو "ریڈیو نکالا" مل گیا۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد اسٹیشن نظام کے تھے۔ کچھ روز وہاں اردو کے پروگرام ہوتے رہے، لیکن آزادی کے اگلے برس، پولیس ایکشن کے ساتھ ہی، اورنگ آباد اسٹیشن بند کر دیا گیا، اور حیدرآباد سے اردو پروگراموں کی تعداد گھٹا دی گئی۔

ہندوستان کا آئین ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ ہوا۔ اس کی رو سے ہندی سرکاری زبان اور انگریزی پندرہ برسوں کے لیے متبادل سرکاری زبان پائی۔ آٹھویں شیڈول میں اور زبانوں کے علاوہ اُردو کو بھی، کچھ ابوالکلام آزاد کی موجودگی کی شرم، اور کچھ جواہر لال نہرو کے اصرار کی وجہ سے، منجملہ اور علاقائی زبانوں کے، قومی زبانوں کی فہرست میں شامل کیا گیا، لیکن اس کو کوئی علاقہ نہیں دیا گیا۔ اردو ریاستِ جموں و کشمیر کی سرکاری زبان تھی، اور یہیں کے دونوں ریڈیو اسٹیشنوں (جموں اور سرینگر) سے اردو میں پروگرام ہوتے رہے۔ جالندھر سے بھی ایک روزانہ پروگرام، ۳۰ منٹ کا اردو میں ہوتا رہا۔ کچھ "بغضِ معاویہ" میں کہ سرحد پار کے پنجاب میں سُنا جا سکے، اور کچھ اس وجہ سے کہ مشرقی پنجاب کی تہذیبی زبان، ہندوؤں اور سکھوں کی، اُردو تھی، اور آج بھی ہندوستان میں اردو کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر ہی سے نکلتا ہے۔

آئین تو ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ ہوا۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو نے عملی طور سے ایک برس پہلے ہندوستانی خبروں کو، ہندی خبروں سے بدل دیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایک سابق ڈائرکٹر جنرل، پی سی چٹرجی کے مطابق، ۲۷ رنومبر ۱۹۴۹ء کے پروگرام جرنلوں میں ہندوستانی میں خبروں کے بجائے ہندی میں خبریں چھپیں[1]

ملک کا جو لسانی منظر نامہ تھا، اس کا عکس ریڈیو پر پڑنا ناگزیر تھا۔ فیلڈن کی نیک اور سنجیدہ کوششوں کے باوجود ہندوستانی کا تجربہ کامیاب نہیں ہوا، اور ہندی اردو تنازعہ، ہندوستانی پر چھا گیا۔ ذوالفقار علی بخاری کے نظریئے سے بحث کی جا چکی ہے۔ اُن کے، دلّی سے ہٹا کر بمبئی بھیجے جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ اُن کے دلّی سے ہٹنے کے بعد اردو کو بتدریج ہندوستانی کی طرف لانے کی کوشش شروع ہوئی۔ ہندی حلقے تو خیر مطمئن تھے ہی نہیں، لیکن جب ہندوستانی بلیٹنوں میں بتدریج ہندی الفاظ بھی رکھے جانے لگے، تو اردو حلقوں میں سخت بے چینی پھیلی۔ اخبار شہباز لاہور، اور اخبار انقلاب لاہور نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا، خواجہ حسن نظامی کے اخبار منادی نے نمبر ۹، یکم نومبر ۱۹۳۹ء[1] کے شمارے میں ص ۶ پر "ریڈیو کی زبان کی داستان" کے جلی عنوان کے تحت نقل کیا؛ یہی نہیں، بلکہ عنوان کے داہنے اور بائیں باکس میں کچھ اور بھی لکھا:

منادی دہلی یکم ماہ عسکری ۱۳۴۸ فاطمی جلد ۵۵

> **ریڈیو سننے والے**
>
> دفتر منادی دہلی کو فوراً خطوط لکھیں کہ ان کو ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشنوں کے پروگرام میں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ ایڈیٹر

نمبر ۹ یکم نومبر ۱۹۳۹ء

> **اخبار ہماری زبان دہلی**
>
> انجمن ترقی اردو کا آرگن ہے اور وہ ریڈیو کی غلط زبان کی نسبت ہر ہفتہ بہت دلچسپ نوٹ شائع کرتا ہے ناظرین یہ اخبار خرید لیں۔ ایڈیٹر

۱؎ Broadcasting in India: P.C. Chatterji. P47

۲؎ اخبار ''منادی'' دلّی

ریڈیو کی زبان کی داستان

آل انڈیا ریڈیو کی زبان

ہندی اتھوا ہندوستانی کے خواب کی تعبیر

آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی نشرگاہ سے۔ جس عجیب و غریب زبان میں خبریں نشر کی جا رہی ہیں۔ اس سے قارئین "شہباز" بے خبر نہیں اس سے پہلے ہندی ساہتیہ سمیلن۔ ہندو سبھا اور کانگرس ہی اُردو کی تباہی کے درپے تھیں۔ اور ان کا سب سے بڑا حربہ صرف قلم اور اخبارات تھے۔ لیکن اب آل انڈیا ریڈیو بھی ان معاونین اردو کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔

اگر فلم ساز کمپنیوں کی طرح ریڈیو کی عنان بھی بمبئی اور کلکتہ کے چند متمول سیٹھوں کے ہاتھ میں ہوتی۔ جو قدیم ویدک تصورات کو ہر دماغ میں ٹھونس دینا چاہتے ہیں۔ تو ہم خاموش ہو رہتے اگر ریڈیو محض صوبائی محکمہ ہوتا۔ اور اس کے ذریعے کانگریسی حکومتیں سنسکرت آمیز ہندی کو رواج دینے کی کوشش کرتیں۔ جب بھی ہمیں تعجب نہ ہوتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ تخریب زبان کی یہ کوششیں آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے ہو رہی ہیں۔ جو براہ راست حکومت ہند کے ماتحت ہے۔ اگر اردو زبان خود حکومت ہند کے سایہ میں بھی معاونین کے حملوں سے محفوظ نہیں۔ تو اس کے لئے ہندوستان بھر میں اور کون سا امن باقی رہ جاتا ہے ہمیں یاد ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کانگرس نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ ایک نئی زبان کو۔ جو ہندی اور اردو کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتی ہو۔ اور گاندھی جی نے "ہندی اتھوا ہندوستانی کا۔ جو معیار قرار دیا ہے اس پر پوری اترے۔ ہندوستانی کا رواج دیا جائے۔ اس غرض کے لئے کانگرس نے ایک کمیٹی بھی مقرر کی تھی۔ لیکن بعض دوسرے اہم سیاسی مسائل کے باعث اس کام کو جاری نہ رکھا جا سکا کانگرس کو خوش ہونا چاہیے کہ عرصہ دراز کی کدوکاوش کے باد۔ جو وہ جس کام کو مکمل نہ کر سکی۔ اسے آل انڈیا ریڈیو نے صرف دو تین مترجموں کے توسط سے جن کی قابلیت کی سب سے بڑی سند غالباً یہ ہے کہ وہ یو پی کے کسی ہندی روزنامہ میں تھوڑی مدت تک کام کر چکے ہیں۔

پورا کر دیا۔

اوّل تو ہندی۔ اُردو اور انگریزی کو آپس میں ترکیب دے کے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہی بیحد مضحک ہے۔ اور اگر واقعی آل انڈیا ریڈیو اخبارات کی موجودہ زبان سے زیادہ آسان زبان کو رائج کرنا چاہتا تھا، تو اس معاملہ میں رائے دینے کے بجائے اسے ایسے اہلِ علم سے رجوع کرنا چاہیئے تھا۔ جو اس معاملہ میں رائے دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں خبروں کے شعبہ کے نگراں مسٹر بارنس ہیں۔ جو اردو یا ہندی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ان کے نائب مسٹر بھنوٹ صرف انگریزی لکھ سکتے ہیں۔ اور ممکن ہے ہندی ہی جانتے ہوں۔ لیکن اردو سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ جو لوگ ان دونوں کی نگرانی میں ترجمہ کا کام کر رہے ہیں اور جو کام کر رہے ہیں وہ اُردو اور ہندی قابلیت کا ایک ناتمام مرقع ہے۔ جو ایک نئی زبان ایجاد فرماکے اُسے سارے ہندوستان میں پھیلا دینا چاہتے ہیں۔

ہندی کے حامی اس نئی زبان کی ایجاد پر مضطرب نہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نئی زبان بھی آخر ہندی کی ہی ایک صورت ہے۔ اس کے علاوہ ہندی کے حامیوں کے لئے یہی غنیمت ہی بس کرتی ہے۔ کہ اُردو زبان کو مٹا دیا جائے۔ کیونکہ موجودہ ہندی ایک مصنوعی زبان ہے جسے ان لوگوں نے جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی کسی یادگار سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ خواہ مخواہ اردو کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ اس زبان کی حدود غیر معین ہیں۔ برج بھاشا کی ہر مسخ شدہ صورت کو جس میں عربی فارسی کے الفاظ نہ ہوں۔ ہندی یا گاندھی جی کی زبان میں ہندی اتھوا ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے یکم اکتوبر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً تامل، پشتو،، گجراتی وغیرہ میں خبریں نشر کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ جہاں اتنی مختلف زبانوں میں خبر نشر کی جا سکتی ہے وہاں اس بات کا انتظام کر دینا کیا مشکل ہے۔ کہ ہندی اردو میں الگ الگ خبر نشر کی جائے اس طرح دنیا کم از کم ایک جناتی زبان سننے سے تو بچ جائےگی ریڈیو سننے والوں کی سماعت تو مجروح نہ ہوگی۔ اور اگر آل انڈیا ریڈیو کے نزدیک مختلف زبانوں کے امتزاج سے نئی زبانیں پیدا کرنا اور انہیں رواج دینے کی کوشش کرنا کوئی اچھا مشغلہ ہے تو اس "مشق ناز" کے لئے صرف اردو کو ہی کیوں منتخب کیا گیا ہے دوسری زبانوں پر اسی قسم کا عمل جراحی کیوں نہیں کیا جاتا! مرہٹی اور گجراتی ایک ہی صوبہ کی دو زبانیں ہیں ان کے امتزاج سے بھی ایک نئی زبان پیدا کی جا سکتی ہے۔ مرہٹی اور ہندی میں بھی

گہرا تعلق ہے ان دونوں کی آمیزش سے بھی ایک عجیب و غریب زبان کی تخلیق ہوسکتی ہے ریڈیو والوں کے ترکش میں سیکڑوں تیر ہیں۔ انھیں ان کے لئے بہت سے نشانے منتخب کرلینا چاہئے صرف بیچاری اردو پر ترکش کے ترکش خالی کئے جا رہے ہیں۔

ہم انتظار میں ہیں کہ ریڈیو کا محکمہ خود بخود اپنے طرز عمل میں اصلاح کرلے ورنہ ہمیں احتجاج کے اور بھی بہت سے موثر طریقے معلوم ہیں اور ہم کو ان کے استعمال کرنے کا بھی سلیقہ حاصل ہے۔ ہم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ جو زبان کی اس سعیٔ تخریب کے ذمہ دار ہیں اور ان قوتوں سے بھی باخبر ہیں۔ جو پس پردہ بیٹھ کے ڈور ہلا رہی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ریڈیو کے ذمہ دار افسر خود اپنے فرض کو محسوس کریں اور ہمیں زیادہ تلخ انداز میں نکتہ چینی کرنے کا موقعہ نہ دیں۔

(روزنامہ اخبار شہباز لاہور)[1]

آل انڈیا ریڈیو اور اردو

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آل انڈیا ریڈیو (دہلی) کی طرف سے جو خبریں روزانہ براڈکاسٹ کی جاتی ہیں ان میں تدریجاً ہندی الفاظ داخل کرنے کا کیوں اہتمام کیا جاتا ہے یہ بالکل درست ہے کہ خبروں کی زبان بہت سادہ اور عام فہم ہونی چاہیئے۔ تاکہ سب لوگ انھیں سمجھ سکیں۔ لیکن عام فہم متداول اردو الفاظ کو چھوڑ کر غیر متداول ہندی الفاظ کا داخلہ زبان کو عام فہم بنانے کا موجب نہیں ہوسکتا بلکہ لازماً غیر عام فہم بنا رہا ہے۔ یہاں ہم صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ایک مدت سے آل انڈیا ریڈیو کی خبروں میں استقبال یا پیشوائی کی جگہ "سواگت" کا لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ حالانکہ استقبال اور پیشوائی کے الفاظ "سواگت" کے بجائے زیادہ عام فہم اور بول چال میں زیادہ مروج ہیں۔ اب کچھ مدت سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کے بجائے ہندی الفاظ یعنی۔ اتر۔ دکھن وغیرہ استعمال ہونے لگے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کا کوئی شخص ایسا نہیں جو اتر دکھن کے بجائے شمال جنوب کے مفہوم سے زیادہ روشناس نہ ہو کمال یہ ہے کہ کل خبروں میں "جنوبی فریقہ" کا ذکر آیا تھا اُسے

---

[1] روزنامہ "شہباز" لاہور۔

آل انڈیا ریڈیو سے پہلے "دکھنی افریقہ" کہا گیا۔ پھر مسلسل "ساوتھ افریقہ" کہا جاتا رہا۔ خدا جانے جنوبی افریقہ میں کون سی برائی تھی کہ اس سے احتراز کیا گیا۔

طالب علم ایک عام لفظ ہے۔ اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی باشندہ ہو۔ جو اس لفظ کو نہ سمجھتا ہو یا نہ بولتا ہو لیکن کل کی خبروں میں اس کی جگہ "ودیارتھی" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جس متداول، مروج اور عام فہم زبان پر سب محبان اردو کو اصرار ہے اس میں "ودیارتھی" کے سمجھنے والے شاید پانچ دس فیصدی بھی بمشکل نکلیں گے لیکن طالب علم کا لفظ سب سمجھتے اور بولتے ہیں۔

ہمیں اس بات سے اختلاف نہیں کہ خبروں کی زبان زیادہ سے زیادہ عام فہم ہونی چاہیئے۔ لیکن عام فہم بنانے کا یہ کوئی طریقہ نہیں کہ متداول و مروج اردو الفاظ کو چھوڑ کر غیر مروج اور غیر عام فہم ہندی الفاظ کا استعمال کیا جائے "جنوبی افریقہ" سے سب آگاہ ہیں۔ لیکن "دکھنی افریقہ" کو چند آدمی بھی نہیں جانتے۔ "طالب علم" کے معنے سب کو معلوم ہیں۔ لیکن "ودیارتھی" کے معنے ہندی جاننے والوں کے سوا شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آل انڈیا ریڈیو مشکل عربی یا فارسی الفاظ استعمال کرے۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ متداول اور عام فہم الفاظ کو محض اس وجہ سے نہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ کہ ان کی اصل عربی ہے۔ اور ان کی جگہ ہندی الفاظ نہیں لانے چاہئیں۔ "بحر" یا "سمندر" کے معنے کون نہیں سمجھتا! لیکن پرسوں آل انڈیا ریڈیو کی خبروں میں دقیانوس کو بحر یا سمندر کہنے کے بجائے غالباً "مہا ساگر" کہا گیا تھا۔ یہ زبان کو عام فہم بنانا نہیں۔ بلکہ مشکل بنانا ہے یا اُردو کو آہستہ آہستہ ہندی کا جامہ پہنانے کی کوشش ہے۔ (انقلاب لاہور)[1]

درمیان کا راستہ 'دو انتہاؤں کے بیچ کا راستہ ہوتا ہے۔ ایک علاقے کی زبانوں میں درمیان کا راستہ بنانا نہیں پڑتا، پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ تت سم سنسکرت اور غیر مستعمل عربی اور فارسی کے الفاظ مساوی تعداد میں ملائے جائیں تو یہ ترکیبی زبان ہوگی، رائج زبان نہیں۔ رائج زبان، بول چال کی زبان ـــــ اشرافیہ کی نہیں، گلی کوچوں بازاروں، ریل کے اسٹیشنوں اور میلوں میں بولی جانے والی زبان بیچ کی زبان ہے۔

---

[1] روزنامہ "انقلاب" لاہور

یہی اسپوکن ورڈ ہے۔ بولا ہوا لفظ۔ یہی ریڈیو کی زبان ہونا چاہیئے، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ سواگت تک کے استعمال سے جذبات مشتعل ہونے لگے، اور کہا جانے لگا کہ خوش آمدید نہیں کہنا چاہتے، نہ کہو۔ ہم آؤ بھگت سے آگے بڑھ کر سواگت کا استقبال نہ کریں گے۔

پہلی دسمبر ۱۹۳۹ء کے "منادی" میں ص ۱۱:

اُردو کلب

ریڈیو کی ہندوستانی ؎

جناب راجہ افضل احمد خاں صاحب شیدا دہلوی نے اردو مجلس میں پڑھا

لیہر ریڈیو اسٹیشن جو زبان اپنی روزمرہ کی بول چال میں استعمال کر رہا ہے اور جس کو وہ بخیال خود ہندوستانی کہتا ہے اس کے متعلق بارہا کہا گیا ہے کہ یہ زبان ہندوستانی نہیں بلکہ یہ تو کسی زبان کی پیداوار کے لیئے تخم ریزی کی تیاری ہے جس کے سازگار فضا کا انتظار ہے ورنہ جو زبان آج سے سو پچاس سال پہلے بولی جاتی تھی اور جس کو شہری ہندو مسلمان سب سمجھتے تھے اس کو اس زبان سے جو اب ریڈیو پر بولی جا رہی ہے کوئی نسبت نہیں وہی اُردو ہندوستانی تھی اور اسی ملک کا بڑا حصّہ سمجھتا تھا۔ اس نے جس طرح اب انگریزی کے الفاظ کو اپنے میں اس طرح ملا لیا کہ گویا وہ قدیم سے اس کا کوئی جز تھے اسی طرح اس نے زمانہ قدیم میں بھی اور پرتگیزی الفاظ کمرہ الماری سنترہ گرجا نیلام وغیرہ ہیں کو آج کروڑوں ہندوستانی بولتے اور سمجھتے ہیں اس طرح اپنے میں جذب کر لیا کہ آج بہت کم حضرات ان الفاظ کی اصل نسل سے واقف ہوں گے۔ یہاں یہ بات بیان کرنی ضروری ہے کہ پرتگیزی اثر اس ملک میں بہت تھوڑے عرصہ رہا اور وہ بھی بمبئی کے آس پاس کے علاقہ میں اس پر بھی اس زبان نے پرتگیزی الفاظ کو اپنے ہاں جگہ دینے سے دریغ نہ کیا۔ اُردو زبان میں پچاس فی صدی سے زیادہ الفاظ برج بھاشا کے ہیں کوئی بیس بائیس فی صدی فارسی کے

؎ افضل احمد خاں شیدا۔ ریڈیو کی ہندوستانی (منادی) یکم دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۱۱

دس فی صدی عربی کے باقی اور زبانوں کے پس ایسی غریب حلیم اور بے نفس ہر ایک سے بہت جلد گھل مل جانے والی زبان کو نہایت بے دردی سے پامال کیا جارہا ہے اور ریڈیو کا محکمہ اس کی بربادی میں سب سے آگے ہے۔ جس طرح غیر مانوس اور نت نئے عربی فارسی الفاظ کو روزمرہ کی بول چال تحریر و تقریر میں استعمال کرنا برابر والوں کو منہ چڑانا اور خواہ مخواہ کی چھیڑ خانی نکالنے کا ایک ناقابل معافی جرم ہے وہاں ریڈیو والوں کا بھلے چنگے سیدھے سادھے الفاظ "آؤ بھگت" کی جگہ سواگت کے لفظ کا استعمال اُردو اور اُردو سے ہمدردوں کا منہ چڑانا نہیں تو کیا ہے۔ ساگر تالاب کو کہتے ہیں لیکن مہاساگر کا لفظ سمندر کے معنوں میں استعمال کرنا ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کے ہم معنے نہیں تو کیا ہے۔ بحر کے معنوں میں مہاساگر کا لفظ شاید ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے بولا جاتا ہو ان کے ہاں تری کی دُنیا تلاؤ میں بند ہو اور جن کو تری کے دوسرے حصوں سے وقت وقتاں میں کبھی واسطہ نہ رہا ہو ان کے ہاں توسیع کا عدم اسم کے عدم کالازمی نتیجہ ہوسکتا ہے قصہ مختصر ریڈیو کیا ہے اُردو زبان کی ٹکسال ہے۔ جو ہر روز نئے نئے الفاظ ڈھال کر کم مایہ ہندوستانی کے حقیر سرمایہ الفاظ میں مضحکہ خیز اضافہ کیا کرتا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں یہ گمان یقین کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے کہ مطلب سعدی دیگر است۔

اردو کے نام سے چڑ ہے حالانکہ بار ہا کہا گیا اور پھر کہا جاتا ہے کہ اس لفظ کے معنی لشکر کے ہیں یہ کوئی ہوّا نہیں اور نہ اس میں چڑنے کی کوئی بات ہے شاید اس نام سے اس بنا پر نفرت ہو کہ لشکر کو ہنسا سے مناسبت ہے اور اپنا عقیدہ اور دوشواش اہنسا پر ہے پس ایسے پاپی گروہ کا نام لیکر اپنی زبان کو کیوں ناپاک کریں خیر۔ یونہی ہوگا قصہ کوتاہ کیجئے اُردو نہ سہی ہندوستانی ہی کہئے مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ نام کے ساتھ کام بھی بدل گیا۔

خود ساختہ ہندوستانی میں سنسکرت کے وہ ثقیل غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں ٹھونسی جارہی ہیں جن کے تصور سے مذاق سلیم ترساں و لرزاں ہے اس پر یہ تاکید کہ دم نہ مارو شکر گزار و مگر شاید اس کی خبر نہیں کہ دبے پیر چیونٹی بھی کاٹتی ہے اور ایسا کاٹتی ہے کہ اپنے سے کروڑ درجہ زیادہ جسامت رکھنے والے وجود کو بلبلا دیتی ہے اس ملک کے وہ باشندے جو اپنے آپ کو بزعم خود یہاں کا ذاتی اجارہ دار سمجھتے ہیں آج سے ہزار آٹھ سو سال

قبل جب ان کے بزرگ یہاں صاحب تاج و تخت تھے اور کسی طرح کا کوئی خارجی داب یا دباؤ اپنے اوپر نہ رکھتے تھے انہوں نے اس وقت غیر زبانوں کے جو الفاظ خواہ صحبت کے اثر سے یا نئی ولایت کا تازہ میوہ سمجھ کر اپنی بھاشا میں شامل کر لئے تھے آج ان کا اخراج اور ان کے بدل کی تلاش چہ معنی دارد پرتھی راج شاکھا کا مصنف پرتھی راج کا درباری شاعر اپنی مشہور تصنیف پرتھی راج شاکھا میں گریب نواج رگنی یعنی غریب نواز اور غنی اور اسی طرح کے اور دوسرے عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں پاتا لیکن آج صدیوں کے بعد ہمارے بھائی بند جن پر پرتھی راج کی چھینٹ بھی پڑ جاتی تو نوازے جاتے باوجود اس غلامی اور محکومی کے ان الفاظ کا استعمال اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور ان کے قائم مقام کی تلاش میں سرگرداں ہیں تو کیا اس کے معنی نہیں کہ جو بات پرتھی راج کے زمانہ میں نصیب نہ تھی اس کے لئے آج تگ و دو کی جا رہی ہے. جو حضرات کے باشد اپنے آپ کو اُردو داں یا اُردو کا ہمدرد بتلا کر اپنی مصلحتوں یا فطری کمزوریوں ، راے کی سلطان ، بنا پر اس قسم کی لغو کوششوں کی ہمت افزائی یہ کہہ کر فرما رہے کہ اب یہ زبان جس کی اشاعت و ترویج کی بسم اللہ ہو رہی ہے آئندہ یہی ملک کی قومی زبان ہو گی وہ نہ صرف اپنے مربیوں کو دھوکہ دے رہے ہیں بلکہ جہاں ملک میں اور صدہا قسم کے ہنگامے برپا ہیں وہاں ایک اور ہنگامہ زبان کے سلسلہ میں برپا کر کے ملکی ایکتا کو غارت کرا رہے ہیں ان کی حالت تو پٹھانوں کے اس بھوکے لشکر سے بھی گئی گزری ہے جس نے بچارے ہیموڈھوسر کو مروایا تھا. مشترکہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان بھی ہونی چاہئے اور جب ایک مشترکہ زبان جو ہندی سے بہت قریب ہے اور در اصل برج بھاشا کی تبدیل شدہ ہیئت فی الحال موجود ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسری کی فکر و تلاش دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو اپنے ان بزرگوں کی کوششوں کو جن کی پیہم سعی و مشقت سے یہ زبان زبان کہلائی. پائے حقارت سے ٹھکرا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دینا ہے یا پھر اپنی ہی زبان کو بلا لحاظ مذہب و قومیت سب سے منوانا ہے لیکن یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہنسی کھیل نہیں. اردو زبان اور اس کے نام سے اگر اس وجہ سے نفرت ہے کہ اسی میں بدیشی بھاشا کے شبد ملے ہوئے ہیں اور بدیشیوں کی امارت اور ریاست کے عہد کی ایک یادگار ہے تو آج کے بدیشی حکمرانوں کی بھاشا کے شبد کیوں زبان پر لاتے ہو اگر بدیشیت قابلِ بیزاری

ہے تو جہاں بھی وہ پائی جائے اس سے پرہیز لازم ہے خواہ اس کا تحقق کہیں ہو اگر یہ بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر کیا یہ عادت جناب کی طبیعت ثانیہ ہو چکی ہے کہ مارتے کے آگے اور بھاگتے کے پیچھے۔

جو انگریز اس ملک میں رس بس گئے ہیں ان کو ہوشیار رہنا چاہیے اگر خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو پھر اہلِ ملک سوانگت کہوائیں گے اور سوگتیں بھروائیں گے اور ایسی گت بنے گی کہ چھٹی کا کھایا یاد آجائے گا۔

صحبت کا اثر مسلّمہ ہے اس میں حاکم محکوم شاہ وگدا قوی اور ضعیف کی کوئی خصوصیت نہیں معمولی حیثیت کے دو آدمی بھی جب ملتے ہیں تو ایک پر دوسرے کی عادت خصلت زبان بیان کا اثر پڑتا ہے اسی طرح دو مختلف قوموں کے باہمی ربط وارتباط کی حالت ہے۔ محکوم بچارے تباہی کے مارے کچھ تو اس حسن کی وجہ سے۔ جو حاکموں میں ہوتا اور جس کی نفی وہ اپنے میں پاتے ہیں اور کچھ اپنی ضرورتوں کی بنا پر حاکموں کے اثرات قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن حاکم بھی اپنے محکوموں کے اثر سے بچ نہیں سکتے۔ انگریزوں نے جیسی کچھ دوری اور مغایرت اس ملک میں اپنے محکوموں کے ساتھ برتی وہ علانیہ ہے لیکن باوجود اس بعد و بیگانگی کے پھر بھی وہ اپنے محکوموں کے اثرات سے بچ نہ سکے اور محکوم مشرق نے حاکم مغرب کو بہت کچھ اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ شیخ عبدالقادر صاحب جو اب آنریبل سر عبدالقادر ہیں ۱۹۰۶ء میں بزمانہ قیام لندن ان کا ایک مضمون رسالہ مخزن لاہور میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "مشرق کا اثر مغرب پر" اس مضمون میں انھوں نے وہ سب تاثرات گنوائے تھے جو حاکم مغرب نے محکوم مشرق کے قبول کئے لیکن بایں کبر و نخوت جاہ و جلال اور وراثت فی الارض کے ادعا کے ذلیل محکوموں کے تاثرات کی قبولی پر زنوان کے ہاں کوئی لے دے ہوئی اور نہ اس کو انھوں نے اپنی توہین سمجھا۔ انگریزوں نے اس ملک کو مسلمانوں کی طرح اپنا وطن نہیں بنایا اس وجہ سے زبان کے سلسلہ میں ان کی جانب سے کوئی خاص سعی و مشقت ظاہر نہیں ہوئی پھر بھی صاحب بہادر کی انگریزی نما ہندوستانی اور بہرے خانساماؤں کی ہندوستانی نما انگریزی کا تماشہ اگر دیکھنا ہو تو ذرا شاگرد پیشہ طبقہ میں چل بیٹھئے۔ انگریزی اور ہندوستانی زبان کے میل جول کا دلچسپ نظارہ آپ وہاں بخوبی دیکھ سکیں گے۔ مسلمانوں نے ایران توران میں درفش کاویانی کو سرنگوں کرنے کے بعد۔

فتح و نصرت کے پھر یرے ہوائے اقبال میں ہندوستان کی طرف کھولے۔ یہاں پہونچنے پر خاک ہند ایسی دامنگیر ہوئی کہ یہیں خاک بسر ہو کر رہ گئے ملک گیری کے بعد جب ملک داری کی نوبت آئی تو یہاں کی ہر چیز کو اپنایت کے رنگ میں رنگا علاوہ اور دوسری باتوں کے جو اہل ہند کی انھوں نے اختیار کیں۔ یہاں کی زبان میں بھی وہ مہارت پیدا کی کہ اہل زبان نے قبولیت کی سند عطا کی۔ سنسکرت کا تو مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے یہاں خاتمہ ہو چکا تھا اس وقت علمی زبان بھاشا تھی اور اسی میں تصنیف و تالیف شعر شاعری کا رواج تھا۔ مسلمانوں نے ترجمے کے علاوہ بھاشا میں صدہا کتابیں تصنیف کیں اور بھاشا کی شاعری میں حد درجہ کا کمال پیدا کیا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ بھاشا میں سب سے پہلے حضرت امیر خسروؒ دہلوی نے شاعری کی ابتدا کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کا پتہ آگے تک چلتا ہے مسعود سعد سلمان دولت غزنویہ کا مشہور شاعر حضرت امیر خسروؒ سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا اس کی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی میں بھی اس کا ایک دیوان تھا چنانچہ تذکرہ مجمع الفصحا میں مرقوم ہے "الحاصل ولے راسہ دیوان بود تازی ہندی فارسی" زاں بعد صدہا مسلمان ایسے گزرے جنھوں نے بھاشا میں اپنے دیوان یادگار۔ دانستہ مضمون کا ناتمام تراشہ پیش کیا گیا ہے۔ صاحب مضمون کو لسانی پہلو سے زیادہ اُمت کے کارناموں سے دلچسپی ہے۔ فرقہ واریت جب لسانیات کے دائرے میں ورود مسعود فرماتی ہے، تو نتائج وہی برآمد ہوتے ہیں، جو اردو غریب بھگت رہی ہے۔

منشی پریم چند۔ بول چال کی زبان لکھتے تھے۔ مولوی عبدالحق بھی بول چال کی زبان لکھتے تھے۔ لیکن ایسے حضرات کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اردو خبریں تو جاری کی گئیں، لیکن اُردو کے پروگراموں پر ریڈیو کے دروازے کبھی کبھی کھولے جاتے۔ اردو اور ہندی پروگرام پہلے ہندستانی ٹاکس سکشن دیکھتا تھا۔ جب اس سکشن کو ہندی ٹاکس سکشن میں بدل دیا گیا، تو اردو پروگرام، ہندی پروگراموں کے حصے کے طور پر ہونے لگے۔ دلّی راجدھانی تھی۔ یہاں مہینے میں دو بار پروگرام عطا کیا گیا۔ لکھنؤ میں بھی مہینے میں دو پروگرام عنایت کئے گئے۔ باقی اسٹیشنوں پر بھی گاہے ماہے اردو پروگرام ہو جاتے تھے۔ زبان وہ جادو ہے، جو سر چڑھ کر نہیں، زبان ہی پر چڑھ کر بولتا ہے۔ پروگراموں میں اُردو زندہ رہی، اور وہ اس طرح:

۱۔ فلمی گانوں کے بغیر وقت کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ خاص طور سے دوپہر کی مجلس سبھا میں ڈاکٹر کیکر فلمی موسیقی کے کٹر مخالفوں میں سے تھے۔ کچھ نیت میں یہ "سلامتی" بھی تھی کہ فلمی سنگیت سے اردو کو بڑھاوا ملتا ہے۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو نے اپنے سگم سنگیت کے ریکارڈ تیار کئے۔ لیکن یہ چلے نہیں۔ تین منٹ کے ایک فلمی گانے پر جو خرچ آتا تھا، وہ آل انڈیا ریڈیو کے ایک اسٹیشن کا سال بھر کا بجٹ ہوتا تھا۔ ننگی کے نہانے اور نچوڑنے کی بات تھی۔

۲۔ ڈراموں میں کردار مصنّف کی نہیں، اپنی زبان بولتے ہیں، اس لئے ڈراموں اور جھلکیوں میں وہی زبان رائج رہی، جو ہندی / ہندوستانی فلموں کی تھی اور ہے۔

۳۔ تت سم لدی تقریریں کیا مقبول ہوتیں، جب بول چال کی زبان کی تقریروں کو سننے والے میسّر نہیں۔ ہاں ہلکی پھلکی (فکاہیہ) ٹاکس سنی جاتی تھیں، اور وہ تت سم لدی زبان میں ہو نہیں سکتی تھیں۔ اس لئے مرزا محمود بیگ جیسے براڈکاسٹروں کو الہ آباد، بمبئی، دلّی، لکھنؤ اور دوسرے اسٹیشن بھی "بُک" کرتے تھے۔ الہ آباد اسٹیشن کے ہندی ٹاکس سکشن نے ان کی تقریر ریکارڈ کرا کے سرینگر سے منگائی تھی، جہاں وہ ان دنوں کشمیر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ تقریر کا عنوان تھا "ریڈیو پر بولنا کوئی آسان کام نہیں"۔ یہ تقریر الہ آباد سے ۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو شام ۸ بجے نشر ہوئی تھی۔ اس بات چیت کے پہلے ورق کا فوٹو اسٹیٹ اسی مقالے کے ایک اور باب میں شامل ہے۔

۴۔ ایک نہایت اہم فیکٹر جس نے اُردو کے لئے آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں گنجائش پیدا کی، وہ پروگراموں کے وقت میں اضافہ، اور حکومت کی کنجوسی رہی۔ پروگرام بڑھ گئے، لیکن اسٹوڈیوز میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ پہلے کبھی کبھار او بی (آؤٹ سائڈ براڈکاسٹ) پروگرام ہوتے تھے۔ اب زیادہ سے زیادہ باہر کی ریکارڈنگ پر دار و مدار کیا جانے لگا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ پروگراموں میں جان آئی، اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مصنوعی زبان سے نجات ملی، کیونکہ اسٹوڈیو کے باہر لوگوں نے اپنی زبان بولنا چھوڑا نہیں تھا۔ زندہ زبان، اسٹوڈیوز کے باہر ریکارڈ کئے جانے والے پروگراموں کی وجہ سے ریڈیو پر اگر چھا نہ سکی، تو کچھ پروگراموں پر ضرور چھا گئی۔ جیسے دلّی کا پروگرام "آج صبح"۔

۵۔ یووانی سروس میں نوجوانوں کو غزل اور اس کی زبان میں جاذبیت نظر آئی کیونکہ تت سم زدہ زبان سے وہ عاجز آچکے تھے، ہندی اردو کے علاقوں میں۔ ہر مضمون کی اصطلاحوں کے رٹنے میں اتنا وقت لگتا تھا کہ مضمون پڑھنے کے لئے وقت ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ یہ مقولہ کچھ ایسا نادرست نہیں کہ جو چیز نصاب میں داخل ہو جاتی ہے، اُس سے چڑ ہو جاتی ہے۔ یووانی پروگراموں کا ذکر ذرا وقت سے پہلے آگیا ہے کیونکہ ۲۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو یہ سروس دلّی سے شروع ہوئی[1] حالانکہ سرینگر سے نوجوانوں کے لئے پروگرام اس سے پانچ برس پہلے سے ہو رہے تھے۔

فلمی گانوں کو ریڈیو بدر کرنے کے لئے ریڈیو اور اطلاعات کے وزیر مملکت، ڈاکٹر بی وی کیسکر نے جو احکامات جاری کئے، اس کی وجہ سے آل انڈیا ریڈیو کے سامعین کی تعداد دن بہ دن گھٹتی رہی، اور ریڈیو سیلون کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ پی سی چٹرجی کے الفاظ میں:[2]

> Dr. (B.V.) Keskar, who was Minister of State for Information and Broadcasting or nearly a decade beginning in 1951, virtually banned the broadcast of film music on the ground that it is vulgar in form and content. But the policy had to be modified because it had cost the broadcasting organisation too much in popularity. Today, film music dominates commercial channels of AIR and the influence of films on music, drama and the whole conception of entertainment in Radio and T.V. is a major factor to reckon with.
>
> Evolution of Broadcasting

---

[1] پی سی چٹرجی: براڈکاسٹنگ ان انڈیا: ص ۵۰
[2] ایضاً ص ۳۶۔

Instructions were issued to stations to screen both the text of lyrics and music and to approve for broadcast only such records which were in conformity with good taste. This offended the Film Producers' Association, and many of them terminated their contracts with AIR. Very little film music was broadcast and this militated against the popularity of AIR. Meanwhile, Radio Ceylon in its Commercial Service started beaming programmes to various parts of India consisting mainly of Indian film hits. This made Radio Ceylon very popular and it drew away a large number of listeners in the country. In order to combat this competition AIR introduced a new service in 1957 which was known as Vividh Bharti or the All India Variety Programme (AIVP) channel. Originally programme on Vividh Bharti were radiated on two high-power short wave transmitters at Bombay and Madras. After 1960, the programme has been made progressively available on low-power ..: medium wave transmitters.

ریڈیو سیلون کی کمرشل سروس، اردو سروس تھی، اور امین سیانی کا بنا کا گیت مالا ہندوستان میں سب سے مقبول پروگرام بن گیا۔ دوردھ بھارتی، اس اردو سروس کا توڑ کرنے کے لئے وجود میں آئی، اور اسی لئے اسے بھی وہی زبان استعمال کرنا پڑی، جو ریڈیو سیلون کی کمرشل سروس کی زبان تھی۔ یہ بات اگرچہ سرکاری طور پر آل انڈیا ریڈیو نے تسلیم نہیں کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آکاش وانی کا پنچ رنگی پروگرام 'دوردھ بھارتی' وہ پروگرام تھا، جس نے اردو کا نام لئے بغیر اُردو کو ہوا کی لہروں پر زندہ رکھا۔ پھر یہی پنچ رنگی پروگرام کمرشل چینل میں بدلا۔ اور اشتہار ظاہر ہے تت سم لدی زبان میں نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے اشتہاروں کی زبان بھی عام طور سے اردو رہی۔ اس چینل کے ۸۵[1] فیصدی پروگرام موسیقی کے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر فلمی سنگیت اس کے علاوہ لائٹ میوزک، علاقائی سنگیت، لوک سنگیت۔ باقی ۱۵ فیصدی میں شامل ہیں ہندی سماچار، جھلکیاں اور مختصر فیچر۔ اب گیتوں بھری کہانی، یا فلموں کے ساونڈ ٹریک کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔ ایک زمانے میں یہ دونوں مقبول پروگراموں میں سے تھے۔ اب ٹیلی ویژن کی وجہ سے "غیر بصری" ڈراموں کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ "ہوا محل" مقبول ترین پروگرام تھا، اور یہ فلمی زبان میں ہوتا تھا، جو اردو ہندوستانی ہے — ہندی ہندوستانی نہیں!

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہمارے ملک میں صرف دوردرشن سرینگر سے قابلِ ذکر تناسب اُردو پروگراموں کا ہے۔ چالیس فیصدی کشمیری، چالیس فیصدی اُردو اور بیس فیصدی دوسری زبانوں میں۔ حیدرآباد سے چار فیصدی، اور دلّی سے دو فیصدی اُردو پروگرام ہوتے ہیں۔ لیکن اگر فیچر فلموں، غزلوں کے پروگراموں، ٹی وی سیریلوں کو، اور کمرشل اشتہاروں کو بھی ترسیلی سمجھیں، جو سمجھنا چاہیئے، تو اوسط کہیں زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر نیشنل چینل پر اردو میں بھی خبریں ہونے لگیں تو ٹی وی پر اردو پروگراموں کے نہ ہونے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔ لیکن یہ شاید اس مقالے کے موضوع کی سرحد پر ہے!

---

[1] ایضاً: ص ۴۹

ساتواں باب

اہم اردو پروگراموں کے مسوّدے اور ریکارڈ

آل انڈیا ریڈیو اور دُور درشن میں

کچھ بہت ہی تاریخی اور ادبی اہمیت کے مسوّدے اور ریکارڈ ریڈیو اور دور درشن کے پاس ہیں۔ ریڈیو اور دور درشن، دونوں مرکزی دفتریا صدر دفتر کے ساتھ آرکائوز ہیں۔ ان کے علاوہ ریڈیو اسٹیشنوں اور دور درشن کے سنٹروں کی اپنی لائبریریاں ہیں۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے ایک آرکائول پروجکٹ ۱۹۸۵ء میں شروع کیا۔ خاص اپنے لئے ریکارڈنگز کرنے کے ساتھ، وہ اہم ٹیپ ریکارڈنگز اور ویڈیوٹیپ کی کاپیاں بھی حاصل کی گئیں، جو ریڈیو اور دور درشن کے پاس تھیں۔

دور درشن میں، ویڈیو ٹیپ کے رائج ہونے سے پہلے فلم پر (سولہ ملی میٹر پر) سلسلہ پروگرام سفید اور سیاہ میں شوٹ کئے جاتے تھے۔ یہ بہت ہی قیمتی اور اہم پروگرام تھے، لیکن ان کو محفوظ نہیں رکھا گیا۔ بہت سا قیمتی مٹیریل برآمدوں میں، فہرست بنائے بغیر پڑا تھا۔ ماس کمیونی کیشن ریسرچ سنٹر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دلّی کے چیئرمین، انور جمال قدوائی، خدابخش لائبریری کے لئے آرکائول پروجکٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ وزارت (ریڈیو اور اطلاعات) کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ انھیں توجہ دلائی گئی، تو انھوں نے دور درشن کو تجویز پیش کی کہ یہ ساری فلمیں ماس کمیونی کیشن ریسرچ سنٹر کو دے دی جائیں، تو وہ ان کی درجہ بندی کرکے، ان کو محفوظ کرا دے گا۔ لیکن دور درشن نے اس تجویز کا رسمی جواب بھی نہیں دیا۔

اس وقت سب سے اہم اردو کا صوتی ذخیرہ اردو سروس، اردو مجلس اور ریڈیو کشمیر سرینگر کے پاس ہے۔ کچھ ذخیرہ آکاش وانی بھون میں پروگرام اکسچینج یونٹ کے پاس ہے،

جو اُر کائوز کا ذخیرہ بھی ہے۔

پروگرام اکسچینج یونٹ چھٹے دہے کے شروع کے برسوں میں قائم ہوا۔ جب جگدیش چندر ماتھر ڈائرکٹر جنرل، پی ایم لاڈ سکریٹری انفارمیشن براڈکاسٹنگ اور رگوپال داس پروگرام اکسچینج کے ڈائرکٹر تھے، تو بڑی سنجیدگی اور تن دہی سے کام ہوا۔ پہلے جب اسٹیشنوں کی تعداد کم تھی، تو آپس میں اچھے پروگراموں کا لین دین ہو جاتا تھا۔ لیکن جب اسٹیشنوں کی تعداد زیادہ ہوئی، تو محسوس کیا گیا کہ اسٹیشن اپنے اچھے پروگراموں کے ریکارڈ، اسکرپٹ مع ہندی ترجمے کے اس یونٹ کو بھیجا کریں۔ ان سب پر سنکر اور پڑھ کر فیصلہ کیا جاتا تھا کہ اعلیٰ ترین معیار کے کون سے پروگرام ہیں۔ انھیں ضروری تفصیل کے ساتھ ایک بلیٹن میں شامل کیا جاتا تھا، جو ہر تیسرے مہینے تمام اسٹیشنوں کو بھیجا جاتا تھا۔ ڈائرکٹر جنرل اور ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل (پروگرام) اس میں خاص طور سے دلچسپی لیتے تھے، اس لیے اسٹیشنوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کے زیادہ سے زیادہ پروگرام چنے جائیں۔ اردو کے سب سے زیادہ پروگرام جو چنے گئے، ریڈیو کشمیر سرینگر کے تھے۔ بلیٹن سے چن کر دوسرے اسٹیشن یہ پروگرام اکسچینج سے منگاتے تھے۔

رفتہ رفتہ بلیٹن کم ہوتے گئے، اور اب آکاش وانی بھون کا پروگرام اکسچینج برائے نام باقی ہے۔ اس کا زیادہ وقت وزیر اعظم، راشٹرپتی اور اُپ راشٹرپتی کی براڈکاسٹ اور پبلک تقریروں کے ریکارڈوں کی کاپیاں بنانے، اور اُن کے ٹرانسکرپٹ تیار ہونے پر صرف ہوتا ہے۔

اُردو کی جو اہم ریکارڈنگز آل انڈیا ریڈیو کے پاس ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جگر مرادآبادی سے ایک ملاقات: یہ واحد ریکارڈنگ ہے، جو ریڈیو کشمیر سرینگر نے ۱۹۵۵ء میں کی تھی۔ اس کے علاوہ جگر کی کوئی اور گفتگو برصغیر میں یا کہیں اور نہیں ہے۔ پندرہ منٹ کی اس گفتگو میں انھوں نے اپنی شاعری کے ارتقاء اور اپنے نظریات کے بارے میں گفتگو کی ہے، اور وہ شعر بھی سناتے ہیں، جنھیں وہ اہم سمجھتے تھے۔

اس ریکارڈنگ کی ڈبنگ ریڈیو کشمیر سرینگر، پروگرام اکسچینج یونٹ، آکاش وانی بھون کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ہے۔

۲۔ جگر مراد آبادی کی غزل، جس کا مطلع ہے :

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گذرے

جب تک جگر مراد آبادی کا منفرد لحن سلامت تھا، کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ جب ان پر فالج کا حملہ ہوا، تو انھیں ریکارڈ کیا گیا، اور انھوں نے تحت میں کلام ریکارڈ کرایا۔ لیکن یہ غزل اس وقت ریکارڈ کی گئی تھی جب جگر کا شاعرانہ ترنم اپنے عہد کی ایک روایت تھا۔ ساڑھے تیرہ منٹ کی یہ ریکارڈنگ سری نگر میں کی گئی تھی۔ سری نگر کے علاوہ 'اردو مجلس (دلی)' اور پروگرام اکسچینج یونٹ میں بھی اس کا ریکارڈ ہے۔ اس کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی اس کی ایک ڈبنگ محفوظ ہے۔

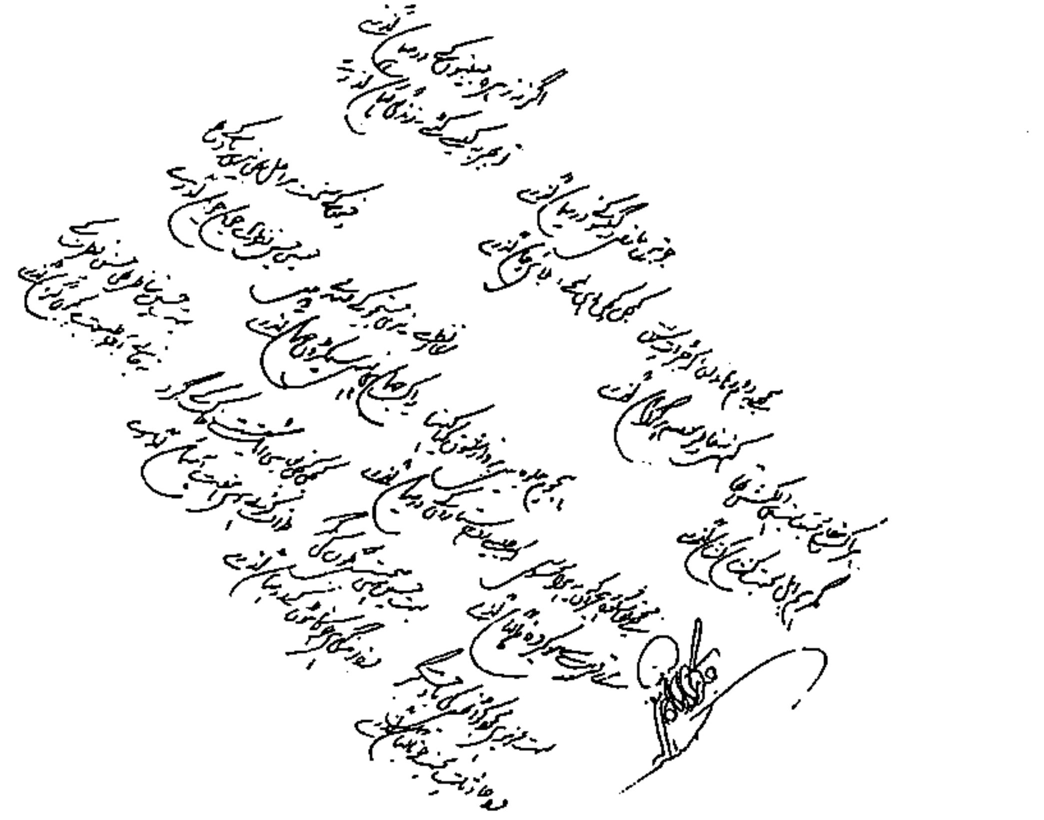
اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے

۳۔ فراقؔ گورکھپوری سے ایک گفتگو: کوئی سترہ منٹ کی یہ ریکارڈنگ ہے۔ فراقؔ نے اپنے منتخب اشعار بھی سنائے ہیں۔

گفتگو کے فن میں بھی فراقؔ کا جواب نہیں تھا۔ ذرا سا عالم سرخوشی ہوتا، تو ان کی گفتگو کے جوہر اور کھلتے۔ ایسے ہی عالم میں اُن سے یہ گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ سوچے سمجھے سوال نہیں تھے۔ بات سے بات نکلتی رہی، اور کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی بیان کے عواقب سے پریشان ہو گئے۔ ایسی بے تکلف گفتگو اور کوئی انھوں نے ریکارڈ نہیں کی۔ پروگرام ایکسچینج یونٹ، اُردو مجلس (دلّی) کے علاوہ یہ ریکارڈنگ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی ہے۔

یہ پروگرام سری نگر میں ریکارڈ ہوا تھا۔ لیکن اب ریڈیو کشمیر کی آرکائوز میں یہ ریکارڈنگ نہیں ہے۔

۴۔ فراقؔ گورکھپوری: عمرِ رفتہ پر ایک نظر: مائکروفون فراقؔ کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ اور ایک گھنٹہ تک، جو باتیں انھیں یاد آتی رہیں، ریکارڈ کرتے رہے۔ یہ پروگرام لکھنؤ اور الٰہ آباد اسٹیشنوں نے تال میل سے ریکارڈ کیا تھا۔ یہ ریکارڈنگ آکاش وانی بھون کے پروگرام ایکسچینج یونٹ کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر کی آرکائوز میں بھی ہے۔

۵۔ فیض احمد فیضؔ اور سید سجاد ظہیر: دونوں کی یہ گفتگو اردو سروس نے ریکارڈ کی تھی۔ ایک کاپی اُن کے پاس اور ایک ڈبنگ سری نگر میں ہے۔

۶۔ فیض احمد فیضؔ؛ کلام شاعر: اردو سروس کے پاس اچھا ذخیرہ ہے۔

۷۔ اسرار الحق مجازؔ؛ مجازؔ کی ایک نظم اور ایک غزل: یہ پروگرام سرینگر میں ریکارڈ ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ اسٹیشن کی آرکائوز کی اس اہم ریکارڈنگ پر کوئی اور معمول کا پروگرام ریکارڈ کر دیا گیا، اس لئے یہ ضائع ہو گیا۔ یہ پروگرام جب ۱۹۵۵ء میں نشر ہوا تھا، تو ریڈیو براڈکاسٹ سے ڈب کر لیا گیا تھا اور یہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

۸۔ مخدوم محی الدین: ریڈیو کشمیر سرینگر نے ان کی دو نظمیں ریکارڈ کی تھیں:

۱۔ اک چنبیلی کے منڈوے تلے اور ۲۔ مارٹن لوتھر کنگ۔ ان میں سے پہلی نظم کی ایک ڈبنگ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔ کچھ ریکارڈنگ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے پاس ہونے کا بھی قوی امکان ہے۔

۹۔ کرشن چندر؛ پندرہ منٹ کی ایک گفتگو، جس میں انھوں نے اپنے فن اور کشمیر کے تعلق پر کچھ خیالات پیش کئے ہیں۔ یہ گفتگو سرینگر سے نشر ہوئی تھی۔ اس کی ڈبنگز آکاش وانی بھون کی آرکائوز کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی ہے۔

۱۰۔ کرشن چندر کے ساتھ ایک شام (ریڈیو کشمیر سرینگر کے ہال میں) انھوں نے اپنی ایک کہانی سنائی، زندگی اور فن کے رشتے پر اپنا نظریہ پیش کیا، اور سامعین کے سوالوں کے جواب دیئے۔ ایک گھنٹے کی یہ ریکارڈنگ سرینگر اور آکاش وانی کی لائبریریوں کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی ہے۔

۱۱۔ رامانند ساگر سے ایک ملاقات: یہ پروگرام اس زمانے میں ریکارڈ کیا گیا تھا جب فلم ساز ہونے کے باوجود، اردو والوں کے لئے رامانند ساگر کی پہچان کہانی کار اور ناول نگار کی تھی۔ انھوں نے فلم اور ادب کے رشتے پر بھی بات کی، اور اس بات پر بھی کہ وقت کے ساتھ فلم دیکھنے والوں کے ذہنوں اور فلمکسز پسند اور ناپسند میں کیا تغیر ہوتا ہے۔ یہ ریکارڈنگ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ہے۔

۱۲۔ محی الدین قادری زور مرحوم کی ایک غزل ان کی آواز میں۔ سرینگر میں ہے۔

۱۳۔ سراجؔ لکھنوی: کلام شاعر: دو غزلوں کی ریکارڈنگ سرینگر میں ہے۔

۱۴۔ ہری چند اخترؔ؛ کلام شاعر: دو غزلوں کی ریکارڈنگ سرینگر میں ہے۔

۱۵۔ روشن صدیقی: کلام شاعر: یہ ریکارڈنگ اردو سروس کے پاس ہے۔
۱۶۔ ساغر نظامی: آدھے گھنٹے کی ریکارڈنگ (کلام شاعر) اردو مجلس اور اردو سروس کے پاس ہے۔
۱۷۔ فکرِ اقبال: اقبال کی ولادت کے جشنِ صد سالہ کے سلسلے میں دو دستاویزی فیچر نیشنل پروگرام میں ریڈیو پر ہوئے۔ آرکائوز میں اس کے ٹیپ ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ، سید سعید مسعودی، شہاب مالیر کوٹلوی اور آل احمد سرور نے اقبال کو نزدیک اور دور سے دیکھنے کے بعد جو تاثرات اُن کے ذہن پر مرتب ہوئے تھے، وہ بیان کیے۔
۱۸۔ خواجہ احمد عباس، ایک ملاقات: اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف اَدوار کے بارے میں بتایا۔ طالب علمی کا زمانہ، صحافت، فلم سازی، ناول نگاری، سب پر کچھ اہم باتیں ہوئیں۔ اور بات چیت آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے ۱۹۸۵ء میں ریکارڈ کی تھی، اور اسی کے لائبریری میں ہے۔
۱۹۔ معین احسن جذبی: کلام شاعر: ریکارڈنگ ریڈیو کشمیر، سرینگر کے پاس ہے۔
۲۰۔ جمیل مظہری: کچھ یاد داشتیں: یہ بات چیت آل انڈیا ریڈیو کلکتہ نے ریکارڈ کی اور وہیں ہے۔
۲۱۔ امتیاز علی خاں عرشی: آل انڈیا ریڈیو رام پور نے آدھے گھنٹے کی یاد داشتیں ریکارڈ کی تھیں۔ ریکارڈنگ آکاش وانی بھون کی آرکائوز میں ہے۔
۲۲۔ پریم چند کا فن: آدھے گھنٹے کے اس مباحثے میں پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر رام کمار درما اور شمیم احمد شمیم نے حصّہ لیا۔ ریکارڈنگ سرینگر اسٹیشن کے پاس ہے۔
۲۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین: آکاش وانی آرکائوز میں اُن کی وہ فی البدیہہ تقریر ہے، جو انھوں نے اردو میں جواہر لال نہرو کے انتقال پر کی تھی۔ صدر ہونے کے بعد جو تقریر انھوں نے کی تھی وہ راشٹر بھاشا میں تھی۔

ویڈیو ٹیپ

۱۔ سیریل " ہم لوگ " کی سو سے زیادہ کڑیاں۔ سرکاری طور سے اس کی زبان

"ہندی" ہے، لیکن حقیقتاً یہ بول چال کی زبان میں ہے۔ کرداروں نے اپنی زبان بولی ہے، اور حقیقتاً وہ اُردو ہے۔

۲۔ سیریل "خاندان" کی باون قسطیں۔ یہ بھی بول چال کی وہی زبان ہے، جو ہندی فلموں کی ہوتی ہے۔ یہ حقیقتاً بول چال کی اُردو ہے۔

۳۔ سیریل "بنیاد" کی سو کے قریب کڑیاں۔ ان کی زبان بھی اُردو ہے، اگرچہ سرکاری طور پر اس سیریل کو ہندی بتایا گیا ہے۔

۴۔ محفلِ موسیقی، جس میں بیگم اختر نے غزلیں پیش کی ہیں۔

۵۔ محفلِ موسیقی جس میں نازیہ حسن اور اس کے بھائی نے حصّہ لیا۔

۶۔ ملکۂ ترنّم نور جہاں کا پروگرام۔

۷۔ اقبال بانو کا پروگرام۔

۸۔ ملکہ پکھراج کا پروگرام۔

۹۔ رونا لیلیٰ کا پروگرام، جس میں اردو کی غزلیں بھی شامل تھیں۔

۱۰۔ مہدی حسن کا پروگرام۔

۱۱۔ غلام علی کے پروگرام

۱۲۔ ریشما کا پروگرام جس میں اُردو کی غزلیں بھی گائیں

۱۳۔ فیض احمد فیضؔ کے ساتھ انٹرویو

۱۴۔ فیض احمد فیضؔ کے انتقال پر پروگرام، جس میں عصمت چغتائی، سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کی ڈبنگ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے پاس بھی ہے۔

۱۵۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں" فیض احمد فیضؔ کے کلام پر مبنی شیلا بھاٹیہ کا لکھا ہوا، اور پیش کیا ہوا فیچر پروگرام

۱۶۔ "اور بھی غم ہیں زمانے میں" ریوتی سرن شرما کے لکھے ہوئے سیریل کی بارہ قسطیں۔[۱]

---

[۱] ریوتی سرن شرما کے سیریل کی بارہ قسطیں اردو میں، کتابی صورت میں چھپ گئی ہیں۔

بقیہ اگلے صفحہ پر

۱۷۔ آل احمد سرور پر ایک پروگرام : دوردرشن سرینگر کی پیش کش
۱۸۔ سیریل "اسداللہ خاں غالب" کے پروگرام : دوردرشن بمبئی کی پیش کش
۱۹۔ فیض احمد فیض پر دلّی دوردرشن کا پیش کیا ہوا پروگرام

بقیہ پچھلے صفحہ کا

پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے، "نچلے طبقے کے کردار عموماً جاندار اور بامحاورہ زبان بولتے ہیں۔ اُن کا زندگی اور دھرتی سے سیدھا رشتہ ہوتا ہے، اس لئے وہ دھرتی کی زبان بولتے ہیں۔ اور اُن کی زبان پر دھرتی کی، اور روزمرّہ کی، گہری چھاپ ہوتی ہے۔ مجھے اپنی مرحوم والدہ سے اس سلسلے میں بہت مدد ملی۔ میری والدہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں، لیکن میرٹھ ضلع کی بامحاورہ زبان اُن کے خون میں رچی بسی تھی۔ ہر موقع کے لیے اُن کے پاس ایک محاورہ تھا۔"

براڈکاسٹنگ پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اُردو میں جو پروگرام نشر ہوئے ہیں، ان کا اشاریہ مرتب کرنا تو دور کی بات، ان پروگراموں کا اشاریہ بنانا بھی ممکن نہیں جن کے مسوّدے اسٹیشنوں کی اسکرپٹ لائبریریوں میں ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں:

۱۔ ان مسودوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

۲۔ مسودوں کو قرینے اور ترتیب سے نہیں رکھا گیا۔ اس لئے نہیں کہ ریڈیو کے افسروں کو ان مسوّدوں کی اہمیت کا احساس نہیں تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ عملے کی بھی کمی تھی اور جگہ کی بھی۔ مسودوں کو "حفاظت" سے رکھنے کے لیئے ہاری باری دو طریقے اپنائے گئے۔ ایک یہ کہ براڈکاسٹ کے اگلے روز متعلقہ سیکشن اپنے اپنے مسوّدے لیکر فائل کرلیں۔ جب ان کی تعداد اتنی ہوگئی کہ سیکشن کی الماریاں بھر گئیں تو ان کو اسٹور میں پہنچا دیا گیا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ پروگرام مٹیریل فائل ہی میں ان کو رکھا گیا، اور مقررہ وقفے کے بعد وہ اسٹور میں داخل ہوگئیں۔ دونوں فائلیں بے ترتیبی سے رکھی گئیں، اور بالآخر ردّی کا ڈھیر بن گئیں۔

۳۔ پرانی لاگ بکیں بھی فراہم نہیں ہیں، جن سے پروگراموں کی فہرست تیار کی جاسکے، اور پھر براڈکاسٹروں یا اُن کے لواحقین سے رجوع کیا جاسکے۔ جن لوگوں کی یاد داشتوں میں کچھ پروگرام ہیں، ان کی مدد سے۔ براڈکاسٹروں سے رابطہ قائم کیا گیا تو اکثر کے پاس ان کے مسوّدے نہیں تھے۔ لیکن اس کے باد جود اتنے مسوّدوں کی نشاندہی ہوئی کہ سب کا اشاریہ تیار کرنا پھر بھی ایک فرد کے لئے ممکن نہیں۔ ادارے بے شک یہ کام کرسکتے ہیں۔

لاگ بکیں ہر اسٹیشن میں موجود ہیں، اور اُن سے براڈکاسٹ ہونے والے پروگراموں کا اشاریہ مرتب کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ریکارڈنگ یا مسوّدے محفوظ ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ واحد اسٹیشن ہے، جس نے زیادہ سے زیادہ اردو براڈکاسٹ کے

مسودے تلف ہونے سے بچاتے اور وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کو پیش کر دیئے۔ وہاں نہ صرف یہ محفوظ ہیں، بلکہ ان کے انڈکس بھی رجسٹروں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ یہ کام جس نے بھی کیا ہے، مفید کام کیا ہے، حالانکہ براڈ کاسٹ ہونے والے اردو مسودوں کی طرف سے نہ صرف بے پروائی برتی گئی ہے، بلکہ ان کی تفصیلات بتانے کے سلسلے میں جو رویہ اپنایا گیا ہے، وہ فراخ دلی کا یقیناً نہیں ہے۔ پھر بھی آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام جرنل "آواز" میں شائع ہونے والے اسکرپٹوں سے، محدود پیمانے پر ایک فہرست تیار کی گئی ہے۔ صرف "آواز" کا اشاریہ تیار کرنا ایک بڑا تحقیقی کام ہوگا۔

اُردو سروس

۱۔ کلچر اور قومیت	بات چیت	ڈاکٹر انیس الرحمٰن
۲۔ سعادت حسن منٹو	بات چیت	دھرم ویر
۳۔ راجہ کی واپسی	کہانی	شہناز ہاشمی
۴۔ نوجوانوں کی عدالت	جھلکی	مجتبیٰ حسین
۵۔ ادب تہذیب اور روایت	بات چیت	خلیق انجم
۶۔ ہندوستانی فلمیں (ولن)	بات چیت	برجیشور مدان
۷۔ اقبال کی نثر	بات چیت	جگن ناتھ آزاد
۸۔ آندھرا پردیش شادی بیاہ کے رسم و رواج	بات چیت	سید انور فاطمہ
۹۔ اُردو ناولوں میں شعور کی رو	بات چیت	سید محمد عقیل
۱۰۔ ہاکی	بات چیت	رئیس صدیقی
۱۱۔ دھرتی کرناٹک کی	بات چیت	اکرم فاروقی
۱۲۔ دھرتی کیریلا کی	بات چیت	اکرم فاروقی
۱۳۔ رمولا (فلم ہیروئن)	بات چیت	کلدیپ اختر
۱۴۔ ہم خاموش رہے پڑوسن کے سامنے	کہانی / فکاہیہ	صغرا مہدی

۱۵۔ گم شدہ اُجالے	کہانی	سیّد احمد قادری
۱۶۔ یہ بھی ایک فن ہے (مہمان بننا)	فکاہیہ بات چیت	شفیقہ فرحت
۱۷۔ کے ایل سہگل	بات چیت	سرور یوسف
۱۸۔ کاش کے سوچا ہوتا شادی کرانے سے پہلے	فکاہیہ بات چیت	ناہید جمال
۱۹۔ حادثہ	کہانی	ظفر اوگانوی
۲۰۔ تحریکِ آزادی کے اہم موڑ	بات چیت	خورشید مصطفیٰ رضوی
۲۱۔ کاش پوچھو کر	کہانی	تحسین اسد شاہ
۲۲۔ نیا سائنسی شعور	بات چیت	مرزا سعید الظفر چغتائی
۲۳۔ یہ بندھن شوہر بیوی کا	بات چیت	ماجدہ اسد
۲۴۔ چراغ تلے اندھیرا	کہانی	ناہید جمال
۲۵۔ تلاش	ڈرامہ	سراج انور
۲۶۔ صرف ایک کتاب	بات چیت	کمال عبدالناصر
۲۷۔ اندرسبھا : امانت	بات چیت	محمد شاہد حسین
۲۸۔ میں نے بھی کیا کیا شادی کرا بیٹھی	فکاہیہ بات چیت	شفیقہ فرحت
۲۹۔ ہماری فلمیں	بات چیت	حمید الدین محمود
۳۰۔ چھوٹی آپا	کہانی	ابنِ کنول
۳۱۔ لسانیات کے فائدے	بات چیت	آنند پرکاش مصرا
۳۲۔ عادت بنالی ہے مانگنے کی	فکاہیہ بات چیت	سید اعجاز الدین پاپولر
۳۳۔ مورے ونش کا زوال	کہانی	قمر احسن
۳۴۔ حرفِ تابندہ	بات چیت	خواجہ مہدی نظامی
۳۵۔ راکھ تلے	کہانی	بدر ایچ خان
۳۶۔ جودھپور کی کہانی	بات چیت	وید پرکاش گرگ
۳۷۔ بھول جاتیے ادھار لے کر	فکاہیہ بات چیت	شفیقہ فرحت
۳۸۔ فلمی دیوانہ	ڈرامہ	وی ایم آنند
۳۹۔ اتنی سی بات	کہانی	انور عظیم

۴۰۔ بلگرام	بات چیت	نثار احمد فاروقی
۴۱۔ یاد آیا ہے	بات چیت	مرزا محمود بیگ
۴۲۔ یاد آیا ہے	بات چیت	کنھیا لال کپور
۴۳۔ یاد آیا ہے	بات چیت	آل احمد سرور
۴۴۔ اردو میں نثری نظم	بات چیت	محمد حسن
۴۵۔ میرے بھی استاد	فکاہیہ بات چیت	احمد جمال پاشا
۴۶۔ منظور ہے	فکاہیہ بات چیت	شفیقہ فرحت
۴۷۔ نیا فرمان	کہانی	انور خان
۴۸۔ تاریخِ ادب میں اردو کا تعین	بات چیت	آل احمد سرور
۴۹۔ بوجھ	کہانی	ہیرانند سوز
۵۰۔ ن م راشد	بات چیت	قرۃ العین حیدر
۵۱۔ یاد محفلوں کی	بات چیت	گوپال متل
۵۲۔ منشی پریم چند اور اردو ادب	بات چیت	فضلِ امام
۵۳۔ پریم چند ہمارے معاصر کی حیثیت سے	بات چیت	شمیم حنفی
۵۴۔ عورتوں کے مصنفین	بات چیت	عصمت چغتائی
۵۵۔ نئی تصویر، عورت کی شاعری میں	بات چیت	زاہدہ زیدی
۵۶۔ حضرت امیر خسرو	بات چیت	ڈاکٹر سلامت اللہ
۵۷۔ آگ کا دریا	بات چیت	شمیم حنفی
۵۸۔ علیگڑھ ماضی کے آئینے میں	بات چیت	اختر الواسع

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

۱۔	اتر پردیش کے ادی واسی اور بدلتی قدریں	بات چیت	امیر حسن
۲۔	غالب	کہانی	قاضی عبدالستار
۳۔	چچا نے سرکس دیکھا	کہانی	ہاشم عظیم آبادی
۴۔	جلتی بجھتی آنکھیں	کہانی	بشیشر پردیپ
۵۔	نئے سماجی نظریے کی ضرورت	بات چیت	سلطان علی شیدا
۶۔	اقبال	بات چیت	نورالحسن ہاشمی
۷۔	سفر کا نیا سلیقہ	بات چیت	امینہ لقمان حسین
۸۔	افواہ	ڈرامہ	مدرا راکشس
۹۔	ہندوستان اور مغربی ایشیا نئے اور پرانے روابط	بات چیت	عشرت علی صدیقی
۱۰۔	لہو کا رنگ ایک ہے	بات چیت	محمد رضا حسین
۱۱۔	خاندانی کتبہ	کہانی	سرور جہاں
۱۲۔	دلے بخیر گزشت بسفر میں	فکاہیہ بات چیت	عبدالمجید سہالوی
۱۳۔	مسدّس اور مثنوی	بات چیت	گیان چند
۱۴۔	اقبال: نئی نسل کا رہبر	بات چیت	مصطفےٰ فطرت
۱۵۔	ہمارے استاد	بات چیت	نورالحسن ہاشمی
۱۶۔	میرے بچپن کا محرم	بات چیت	پنڈت برجموہن ناتھ
۱۷۔	چکبست اور احترام آدمیت	بات چیت	صبیحہ انور
۱۸۔	اُڑ جا رے پنچھی	کہانی	بشیشر پردیپ
۱۹۔	ایک لمحہ	کہانی	مہناز انور
۲۰۔	مرزا جعفر علی خاں اثر	بات چیت	شبیہ الحسن نونہروی
۲۱۔	دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا	فکاہیہ بات چیت	احمد جمال پاشا

۲۲۔ بزدل	کہانی	سید مسیح الحسن رضوی
۲۳۔ تابوت	کہانی	رام لعل
۲۴۔ کرم ۔ یوگ کا فلسفہ	بات چیت	رگھوپتی سہائے فراق
۲۵۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں	فکاہیہ بات چیت	احمد جمال پاشا
۲۶۔ مرزا محمد ہادی رسوا	بات چیت	مرزا جعفر حسین
۲۷۔ کالونی میں رہنا	فکاہیہ بات چیت	مجتبیٰ حسین

۲۸۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری سے نورالحسن ہاشمی کی بات چیت ۔

۲۹۔ پرام	کہانی	دمینتی رینہ
۳۰۔ انجام	کہانی	رمیش بخشی
۳۱۔ ایٹمی طاقت کے میدان میں ترقی	بات چیت	عثمان غنی
۳۲۔ سب سے چھوٹا غم	کہانی	عابد سہیل
۳۳۔ جنگ آزادی کے اہم مقدمے، علی پور بم کیس	بات چیت	خورشید احمد
۳۴۔ انسانی شناخت اور عقیدہ	بات چیت	نیر مسعود
۳۵۔ نئی روشنی کے آئینے میں شوہر نامدار	فکاہیہ بات چیت	عائشہ صدیقی
۳۶۔ اردو مثنوی میں محبوب کا تصور	بات چیت	سیدہ شان معراج

آل انڈیا ریڈیو، گورکھپور

۱۔ مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی	بات چیت	احمر لاری
۲۔ برات اور براتی	فکاہیہ بات چیت	محمد اکرام الحق
۳۔ وہم یا حقیقت	کہانی	ندیم صدیقی
۴۔ کرشن چندر	بات چیت	احمر لاری
۵۔ لوٹتے قدم	کہانی	عبیدہ بیگم
۶۔ نئی شاعری کے اہم میلانات	بات چیت	محمود الٰہی

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ

۱۔ شب برات	بات چیت	سیّد شاہ فریدالحق عمادی
۲۔ گھریلو مسرت میں اضافے کے لئے	بات چیت	عذرا شبنم
۳۔ سائمن باسکی	کہانی	قاسم خورشید
۴۔ ایک نیا منظر	کہانی	فخرالدین عارفی
۵۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے	فکاہیہ بات چیت	بادشاہ حسین رضوی
۶۔ شیر شاہ کا مقبرہ	بات چیت	حسن نشاط
۷۔ یادِ ماضی	بات چیت	شہاب الدین دسنوی
۸۔ نام و رشتہ	کہانی	ارتضیٰ کریم
۹۔ راتیں مشعلوں کی	کہانی	احمد یوسف
۱۰۔ کیا ارسطو تنقید کا معلم اوّل تھا	بات چیت	محمد حنیف
۱۱۔ عبدالرحیم خان خاناں	بات چیت	قیام الدین احمد
۱۲۔ نقشِ فریادی	کہانی	عشرت ظہیر
۱۳۔ چہلم اور واقعاتِ کربلا	بات چیت	ناصر زیدی
۱۴۔ چند لمحے سکون کے	کہانی	عظیم اقبال
۱۵۔ سونی دھرتی	کہانی	ظفر حبیب
۱۶۔ حصار میں	کہانی	شمیم افزا قمر
۱۷۔ مقناطیس کی خصوصیات	بات چیت	عنوان بے
۱۸۔ گمراہ	کہانی	انجم جمالی
۱۹۔ چرایا ہوا چہرہ	کہانی	ارتضیٰ کریم
۲۰۔ سفرنامے کی ادبی قدر و قیمت	بات چیت	برکت علی
۲۱۔ قدیم تعمیرات سائنسی نقطۂ نظر سے	بات چیت	حفیظ الدین احمد
۲۲۔ داستان ہی داستان	کہانی	فخرالدین عارفی
۲۳۔ ایک سفر رنج شام	کہانی	رفیع حیدر انجم

۲۴. آسمان شرمندہ ہے	کہانی	ش مظفر پوری
۲۵. فاہیان	بات چیت	مہرالنساء
۲۶. ویران شہر کا کتبہ	کہانی	م ق نہان
۲۷. میری کہانی سنو	کہانی	حسین الحق
۲۸. یادوں سے دور	کہانی	افتخار عظیم چاند
۲۹. اُکھڑا ہوا درخت	کہانی	شفق
۳۰. بنتِ حوّا	کہانی	اعجاز بن ضیا اوگانوی
۳۱. ایک پیالی چائے	کہانی	سیّد اشرف قادری
۳۲. شیخ فریدالدین عطّار	بات چیت	سیّدہ نزہت بانو زاہدہ
۳۳. فیضؔ: میرا پسندیدہ شاعر	بات چیت	سیّد نواب کریم
۳۴. سوالیہ نشان سے نیچے کا نقطہ	کہانی	خورشید حیات
۳۵. تلاش	کہانی	مسعود عالم
۳۶. ہمّت کے مسافر	کہانی	ظفر حبیب
۳۷. بچوں کی تعلیم و تربیت اور اساتذہ کی ذمّہ داریاں	بات چیت	اختر عالم
۳۸. ابلاغ و ترسیل کی حقیقت	بات چیت	یوسف خورشیدی
۳۹. خدا بچائے بن بلائے مہمانوں سے	فکاہیہ بات چیت	ذکیہ مشہدی
۴۰. جانے قدموں کی چاپ	کہانی	اختر واصف
۴۱. زرد موسم	کہانی	شمیم افزا قمر
۴۲. جنگل کی رات	کہانی	شفق
۴۳. قاضی عبدالودود	بات چیت	تحریر انجم
۴۴. لمحوں کی بازگشت	کہانی	سیّد احمد قادری
۴۵. لفظوں کی موت	کہانی	خورشید حیات
۴۶. ہندوستان اور ابنِ بطوطہ	بات چیت	حسن نشاط انصاری
۴۷. میں مسیحا ہوں	کہانی	اعجاز ضیاالدین اوگانوی

۴۸. شادی بیاہ کی عجیب وغریب رسمیں	بات چیت	فضلِ رب
۴۹. فنِ طبابت	بات چیت	ایم سلطان آزاد
۵۰. شطرنج	بات چیت	عنایت کریم
۵۱. نوشتۂ دیوار	کہانی	عبدالصمد
۵۲. پہرے	کہانی	اسلم سالا زار
۵۳. بند آنکھوں کی کہانی	کہانی	فخرالدین عارفی
۵۴. یہی سچ ہے	کہانی	رضوان احمد
۵۵. آنگن کا پودا	کہانی	قیصر زاہدی
۵۶. ہر وقت کا شکوہ	کہانی	گیتا پشپا شا
۵۷. سالار جنگ لائبریری	بات چیت	سرتاج عابدی

آل انڈیا ریڈیو، جالندھر

۱. نفسیاتی الجھنیں	بات چیت	دیوراج ورج
۲. تقریر کرنا بھی ایک فن ہے	فکاہیہ بات چیت	رام لال نابھوی
۳. اردو ادب پر مغربی اثرات	بات چیت	راجندر سنگھ درماسوز
۴. زندگی کا درد	کہانی	کیول دھیر
۵. اردو : فرقہ وارانہ اتحاد کی علمبردار	بات چیت	شام داس کھنہ
۶. آم کے آم گٹھلیوں کے دام	فکاہیہ بات چیت	رام لال نابھوی
۷. ڈوبتے منظر کا سفر	کہانی	سلطان انجم
۸. بند ھن کچے دھاگوں کے	کہانی	سلطان انجم
۹. نخلستان	کہانی	آر ڈی شرما
۱۰. اردو سفر نامے	بات چیت	پریتم سینی

آل انڈیا ریڈیو، بمبئی

۱. مراٹھی ادب ــــــ اردو	بات چیت	یونس اگاسکر

۲۔ مراٹھی تہذیب لوک گیتوں کے آئینے میں	بات چیت	خالد اگاسکر
۳۔ خوش مزاجی	بات چیت	خورشید نعمانی
۴۔ اوپر سے گرتا اندھیرا	ڈرامہ	ساجد رشید
۵۔ معین الدین حارث	بات چیت	مجاہد حسین حسینی
۶۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا	ڈرامہ	رفیعہ شبنم عابدی
۷۔ اور آنا گھر میں ٹی وی کا	فکاہیہ بات چیت	پرویز یداللہ مہدی
۸۔ لاپتہ	ڈرامہ	سریندر پرکاش
۹۔ اجنتا اور ایلورا	بات چیت	یونس اگاسکر
۱۰۔ سراب زدہ	کہانی	سلام بن رزاق
۱۱۔ آنندی — اردو کی عظیم کہانی	بات چیت	خلش جعفری
۱۲۔ چہرے اور ترکاریاں	فکاہیہ بات چیت	یوسف ناظم
۱۳۔ محمد طفیل	بات چیت	کرشن چندر
۱۴۔ میرے شب و روز بمبئی میں	بات چیت	خواجہ احمد عباس
۱۵۔ امام الغزالی	بات چیت	ایم رفیع اللہ

آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد

۱۔ صفی اورنگ آبادی	بات چیت	جے پی سعید
۲۔ ناک	فکاہیہ بات چیت	منور جہاں
۳۔ میر تقی میر	بات چیت	اختر ناز
۴۔ بچوں کا ادب	بات چیت	احمد حسین
۵۔ کھانا کھلانا بھی فن ہے	فکاہیہ بات چیت	عصمت فردوس
۶۔ دولت آباد، محمد تغلق کے زمانے میں	بات چیت	سید حامد مغربی
۷۔ محمد قلی قطب شاہ: ایک شاعر ایک بادشاہ	بات چیت	زیڈ ایچ فاروقی

۸۔ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟	فکاہیہ بات چیت	غوث ساجد
۹۔ دولت بھی کیا چیز ہے	بات چیت	یوسف ناظم

آل انڈیا ریڈیو، ناگپور

۱۔ ماں کی گود، بچہ کی پہلی درس گاہ	بات چیت	شمس النساء قمر پٹیل
۲۔ ادھورے سپنے	کہانی	افسر شیخ
۳۔ سائنس کے کرشمے زراعت میں	بات چیت	ایس وائی زیڈ فاروقی
۴۔ آغا حشر کاشمیری	بات چیت	شائستہ اختر
۵۔ مزاج پرسی	انشائیہ	عزیزہ جاوید
۶۔ آغا حشر کاشمیری	بات چیت	خضر حیات

آل انڈیا ریڈیو، دلی

۱۔ سمندر پار سے شبلی کا خط	بات چیت	سید سلیمان ندوی ۲۲ نومبر ۴۱ء
۲۔ فلم میں بے ہودگیاں	بات چیت	خواجہ احمد عباس ۲ دسمبر ۴۰ء
۳۔ گھریلو جھگڑے [1]	بات چیت	فضلِ حق قریشی ۳۰ مئی ۳۶ء
۴۔ بھابی جان نے ریڈیو خریدا [2]	فکاہیہ بات چیت	فضلِ حق قریشی ۲۱ اپریل ۳۶ء
۵۔ جوگی [3]	کہانی	سید انصار ناصری ۲۱ جون ۳۶ء
۶۔ جانوروں میں آدمی	بات چیت	خواجہ حسن ثانی نظامی
۷۔ ہندوستانی کیا ہے [4]	بات چیت	مولوی عبدالحق ۲۱ فروری ۳۹ء
۸۔ تحریکِ آزادی کے اہم موڑ (غدر پارٹی)	بات چیت	امداد صابری
۹۔ کایا پلٹ	کہانی	جوگندر پال

---

[1]، [2] اور [3]: ماہنامہ ساقی میں شائع ہوتے تھے۔

[4] خطباتِ عبدالحق ص ۱۶۵۔

آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ

۱۔ کلکتہ کا مدرسۂ عالیہ	بات چیت	عبدالسبحان
۲۔ ملبے کے محافظ	کہانی	سیدالابرار
۳۔ جاترا کی روایت	بات چیت	شکیل احمد
۴۔ لمحوں کا کرب	کہانی	جاوید نہال
۵۔ آدمی کو دو رخہ نہیں ہونا چاہیئے	بات چیت	فاروق شفق

آل انڈیا ریڈیو، رامپور

۱۔ ڈاکٹر محمد سالم علی (پرندہ شناس)	بات چیت	نفیس صدیقی
۲۔ پینچ سی کاٹ دی ہماری بات	ذکا یہ بات چیت	انور چغتائی بریلوی
۳۔ مرنے کے بعد	جھلکی	اظہر افسر
۴۔ خوشبو	کہانی	ایم تنوجہ
۵۔ ڈاکٹر ہر گوبند کھرانہ	بات چیت	اسرار احمد
۶۔ سوانح نگاری کا فن	بات چیت	طیب بخش بریلوی
۷۔ خود نوشت سوانح نگاری کا فن	بات چیت	سعادت علی صدیقی
۸۔ کوہ پیمائی اور بھارت	بات چیت	شاہد محمود
۹۔ کاروبار	کہانی	رئیس نجمی امروہوی
۱۰۔ بھارت کے دوسرے ملکوں سے تجارتی اور ثقافتی رشتے	بات چیت	نظام صدیقی
۱۱۔ مرنے والوں کا المیہ	کہانی	تبسم نشاط
۱۲۔ خلا میں بھارت کی نئی منزلیں	بات چیت	اخلاق احمد خان
۱۳۔ سن ہجری اور اس کی اہمیت	بات چیت	اسحاق النبی علوی
۱۴۔ چھٹیاں کیسے بتائیں	بات چیت	شیفالی اگروال
۱۵۔ چھٹیاں کیسے بتائیں	بات چیت	سمن شرما
۱۶۔ چھٹیاں کیسے بتائیں	بات چیت	کوثر ریاض

۱۷۔ محمد علی جوہر کی شاعری	بات چیت	فہمیدہ کبیر
۱۸۔ واپسی	ڈرامہ	سنیل کمار سکسینہ
۱۹۔ پرانی تہذیب میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب	بات چیت	امتیاز علی خاں عرشی
۲۰۔ غالب اور رامپور	بات چیت	ظہیر علی صدیقی
۲۱۔ فانی کی شاعری	بات چیت	وسیم بریلوی

آل انڈیا ریڈیو، بنگلور

۱۔ ایک راز کی بات	کہانی	نسرین عزیز
۲۔ ہندوستان میں جمہوریت کا استحکام	بات چیت	صالح نیر
۳۔ اردو میں ولی کا رنگِ تصوف	بات چیت	آمنہ خاتون
۴۔ کونپل سے پتے تک	کہانی	اقبال متین

ریڈیو کشمیر، سری نگر

۱۔ عربی ڈرامہ	بات چیت	محمد اسلم اصلاحی
۲۔ صحافت: تب اور اب	بات چیت	غلام نبی خیال
۳۔ کچھ اقلیتوں کے بارے میں	گفتگو	ہیموتی نندن بہوگنا
۴۔ سماجی زندگی: ہماری لوک روایات اور محاوروں میں	بات چیت	سید رسول پومپر
۵۔ پریم چند کی دین ہندوستانی فلم کو	بات چیت	برج پریمی
۶۔ ایرانی قالین ارتقاء کے آئینے میں	بات چیت	کے ایس پنڈتا
۷۔ کھلا خط فرقہ پرستی کو ہوا دینے والوں کے نام	بات چیت	قرۃ العین
۸۔ روشنی	بات چیت	مرغوب بانہالی
۹۔ شخصیت دلکش کیسے بنائیں	بات چیت	دلشاد ملکہ
۱۰۔ کشمیر میں شادی بیاہ کے گیت	بات چیت	محمد امین اندرابی

۱۱۔ مولانا آزاد	بات چیت	فیاض رفعت
۱۲۔ کچھ اہم ادبی معرکے	بات چیت	اکبر حیدری
۱۳۔ نئی غزل کی نمائندہ آوازیں	بات چیت	آل احمد سرور
۱۴۔ سرینگر شہر سکھ دور میں	بات چیت	محمد اسحٰق خاں
۱۵۔ یادش بخیر ہم بھی جواں تھے	بات چیت	آل احمد سرور
۱۶۔ سوویت روس میں اسلام	بات چیت	محمد امین پنڈت
۱۷۔ عذاب	کہانی	شمس الدین شمیم
۱۸۔ ایک ٹانگ کی گڑیا	کہانی	شمس الدین شمیم
۱۹۔ اونسٹ ہمنگ وے	بات چیت	خواجہ غلام السیدین
۲۰۔ ذکر ہملٹ	بات چیت	جی ایل لابرو
۲۱۔ روشنی	بات چیت	محمد یوسف ٹینگ
۲۲۔ ادب کے نئے تقاضے: دائمی امن کے لئے	بات چیت	پروفیسر محمد مجیب
۲۳۔ کشمیر، برنیئر کی نظر میں	بات چیت	محب الحسن
۲۴۔ کشمیر میں موسیقی کا بدلتا مزاج	بات چیت	دینا ناتھ نادم
۲۵۔ آزادی کے تصور کا ارتقاء	بات چیت	ظہیر مسعود قریشی
۲۶۔ میرا روس کا سفر	سفرنامہ	دینا ناتھ نادم
۲۷۔ کلچر کی درآمد	بات چیت	نکہت نسرین
۲۸۔ ستارے اور سیارے شاعری میں	بات چیت	عبدالقادر سروری
۲۹۔ جدوجہد آزادی میں اردو ادیبوں کا حصہ	بات چیت	عبدالقادر سروری
۳۰۔ غالب: ایک آفاقی شاعر	بات چیت	عبدالقادر سروری
۳۱۔ غالب کی ہمہ گیر شخصیت	بات چیت	کنور محمد اشرف
۳۲۔ کشمیری ادب کے جدید رجحانات	بات چیت	رحمٰن راہی
۳۴۔ ادیب کا رول	بات چیت	رحمٰن راہی
۳۵۔ امیر خسرو	بات چیت	نورالحسن ہاشمی

۳۶. عبدالرحیم خانِ خاناں	بات چیت	مرزا محمود بیگ
۳۷. عصری رجحانات اور ادیب کی انفرادیت	بات چیت	سیّد احتشام حسین
۳۸. آغا حشر کاشمیری ایک شاعر کے روپ میں	بات چیت	سیّد احتشام حسین
۳۹. وارانا سی یا بنارس	بات چیت	سیّد احتشام حسین
۴۰. کرشن اوتار	بات چیت	بی کے مدن
۴۱. فقر گاندھی	بات چیت	پیر افضل مخدومی
۴۲. چند یادیں۔ چند کردار	بات چیت	مرزا سیف الدین احمد
۴۳. اقبال کی آفاقیت	مذاکرہ	عبدالقادر سروری
۴۴. اقبال کی آفاقیت	مذاکرہ	میر غلام رسول نازکی
۴۵. سائبر نٹیکس	بات چیت	امتیاز الدین

ریڈیو کشمیر، لیہہ

۱. نصف صدی کی یاد میں	بات چیت	اکبر لداخی
۲. لداخ کے تہوار	بات چیت	عبدالغنی شیخ

وہ لوگ، جو یادگارِ زمانہ تھے، انھوں نے مختلف اسٹیشنوں سے پروگرام نشر کیے۔ لیکن ان میں سے شاذ و نادر ہی کی آوازیں یا تحریریں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف، سیّد احتشام حسین اور عبدالقادر سروری کے تین اہم براڈ کاسٹوں کے پہلے صفحوں کے عکس یادگار کے طور پر شامل کیے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

غالب کی ہمہ گیر شخصیت

غالب عام طور پر اپنے اردو دیوان کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آج ان کی اردو غزلیں موقعہ بے موقعہ ریڈیو کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں اور جہاں کہیں شعر شاعری کا چرچا ہوتا ہے لوگ ان کے کلام پر سر دھنتے اور بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ جوشِ عقیدت میں ایک خوش مذاق نوجوان نے ایکبار غالب کے دیوان کو وید کا ہم پلّہ اور مقدس قرار دیا تھا مگر خود غالب کو اپنے اُردو کلام پر ناز و نخرہ نہیں ہے نہ وہ اسے ذریعہ عزت سمجھتے ہیں بلکہ میر کو اپنے اوپر فوقیت دیتے ہیں۔ غالب کو اگر اُستادی کا دعویٰ ہے تو اپنے فارسی کلام کی بنا پر اور اس میدان میں وہ اپنا ناتا براہِ راست قدیم اساتذہ سے ملاتے ہیں بلکہ برملا کہتے ہیں کہ

امروز من نظامی و خاقانیم بہ دہر
دہلی ز من بہ گنجہ و شرواں برابر است

سید احتشام حسین - الہ آباد

عصری رجحانات اور ادیب کی انفرادیت

دو حقیقتیں ایسی ہیں کہ جن پر نہ تو کوئی بحث ہو سکتی ہے اور نہ ان کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے : ایک یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی زمانے میں اور کسی نہ کسی سماج میں پیدا ہوتا ہے، بحث اس پر ہو سکتی ہے کہ فرد کا اپنے زمانے اور اپنے سماج سے کیا رشتہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے کیا اثر قبول کرتا ہے یا ادیب عام افراد سے کس حد تک مختلف ہوتا ہے اور وہ اپنے زمانے کی عام زندگی میں کہاں تک شریک اور کہاں تک اس کا مخالف ہوتا ہے۔ فرائڈ کے دلچسپ تصورات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے سب سے زیادہ خوش اور آسودہ رہتا ہے کیونکہ اس کے یہاں کسی قسم کی وہ الجھن جو بیرونی اثرات سے پیدا ہوتی ہے یا خواہشات کی وہ کشمکش جو مختلف حالات میں جنم لیتی ہے وجود ہی نہیں رکھتی، جیسے ہی وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے ہر طرف سے تصادم کا شکار ہو جاتا ہے، کوشش کے باوجود وہ بیرونی اثرات اور جذباتی کشمکش سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو کہ بچہ بطن مادر کے اندر کسی قسم کی کشاکش میں مبتلا نہیں ہوتا لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان کو بہت سے پسندیدہ اور ناپسندیدہ عناصر سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن میں سے کچھ کو وہ بخوشی یا مجبوراً قبول کر لیتا ہے اور کچھ سے علیحدگی اختیار کرنا اس کی زندگی کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ ادیب اس حیثیت سے عام لوگوں سے مختلف نہیں ہوتا بس فرق یہ ہے کہ وہ تخلیقی قوت اور اظہار کا مالک ہونے کی وجہ سے اپنی پسند اور اختلاف کو برابر ظاہر بھی کرتا رہتا ہے اور اس دنیا کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جسے اس نے اپنے خوابوں میں دیکھا اور خیالوں میں بسایا ہے یا جس کے نہ بسنے کی وجہ سے اس کے دل میں ہیجان اور اضطراب ہے۔

اگر انسان دیوانہ یا مکمل طور سے بے حس نہ ہو تو گردوپیش کے حالات سے اس کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر اثر کے متعلق اس کا رویہ یا ردعمل ایک دوسرے

سے مختلف ہو! بات یہ ہے کہ ہر انسان کو پیدا ہوتے ہی ایک دنیا ملتی ہے جو زبان کی پابند ہے، اس کے گرد و پیش ایک زبان استعمال کی جاتی ہے، رہن سہن کے کچھ طریقے رائج ہوتے ہیں، کچھ عقائد ورثہ میں ملتے ہیں، کچھ تہذیبی روایات سے واسطہ پڑتا ہے، ایسے اداروں میں تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے جو اُس زمانے اور اس سماج میں رائج ہوتے ہیں، اس کے بعد انسان کے اپنے ذاتی تجربے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور جو دنیا اُسے ملی تھی اس کے متعلق اپنے تجربات کی بناء پر نئے سرے سے غور کرتا چیزوں پر نگاہ ڈالتا، پرکھتا، جانچتا اور قبول یا رد کرتا ہے۔ اسی درمیان میں مشاہدہ اور مطالعہ کی مدد سے دوسرے انسانوں کے تجربات اور خیالات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور حالات کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہر نارمل انسان کے ذہنی ارتقا کی یہ عام صورتیں ہیں جن میں انفرادی اثرات اور تجربات، مشاہدہ اور مطالعہ سے تدریجی، اضافی یا بنیادی اختلافات ہو سکتے ہیں، انھیں اختلافات کی بنیاد پر انفرادیت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور شخصیتوں کی الگ الگ تشکیل ہوتی ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
ریڈیو کشمیر سرینگر سے براڈکاسٹ
۷/ جون ۱۹۶۹ء

غالب — ایک آفاقی شاعر

غالب کی شاعری کی اپیل عالمی ہے۔ اِس کی بنیاد محض یہ خیال نہیں کہ اُن کی صد سالہ برسی کے
سلسلے میں علم و ادب کی آفاقی قدروں سے دلچسپی رکھنے والی دنیا کی ساری قوموں نے، اُن کی شاعری کو
اپنا اپنا سمجھا اور یورپ اور امریکہ کے علمی اور ادبی حلقوں میں ادبی محفلیں ہوئیں، جو غالب کی یاد
منانے کے لیے منعقد ہوئی تھیں۔ جب اُن کا کلام ترجمے کی صورت میں پڑھا گیا، تو اپنی اپنی شاعری کے
مختلف انداز، اپنی فکر کے مخصوص رجحان اور فن کے بارے میں اپنے معین تصورات رکھنے والے
مختلف ملکوں کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں نے بقدرِ ذوق اُس سے اثر لیا اور غالب کی فکر و فن میں
اپنے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو اُن کی توجہ کا باعث ہیں۔ مثلاً [illegible] یونیورسٹی میں منعقدہ ایک محفل میں
یہ بھی اعتراف کیا گیا کہ غالب کے کلام کا ترجمہ کرنے کے اسلوب اور نئے سانچوں کے متعدد [illegible]
امریکی شاعروں کو اُس میں نئی روشنی نظر آئی اور اِن میں سے بعض کو امریکی زندگی سے متعلق
[illegible] کے لیے نئے زاویے مل گئے۔

غالب کی شاعری کی حقیقی اپیل دراصل، خود اُن کی فکر و فن کے عناصر میں موجود ہے۔
[illegible] کا مطالعہ؟ غزل کی شاعری کے منکر نقادوں کے لیے بھی کچھ بات [illegible] ہو سکتا ہے کہ
غزل کی انفرادی غزلیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس میں حیات و کائنات کے مسائل
کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے لیے غالب کی شاعری کا تاثر، خیالات، وضعِ اظہار
[illegible] سب میں موجود رہے۔ لیکن دوسری زبان والوں کے لیے غالب کے فکری عناصر
[illegible] کے ساتھ اُن کی زبان میں پیش کیے جا سکیں، اور اُن کے اسالیب، نئے منظر
[illegible] اور طبیعت کا ایک کرشمہ ہے کہ غزل کی

آٹھواں باب

اختتامیہ

برصغیر میں پیشہ ورانہ براڈکاسٹنگ لائنل فیلڈن کے آنے کے ساتھ شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء
کے وسط میں بی بی سی کے سیمابی ذہن والے فیلڈن کو ہندوستان میں براڈکاسٹنگ سروس
منظم کرنے کے لئے چنا گیا۔ بی بی سی میں انھوں نے اپنے تجربے کو کافی نہیں سمجھا۔ یورپ کے
مختلف ملکوں میں جاکر براڈکاسٹنگ کے نظام دیکھے۔ انھوں نے سنجیدگی سے اپنی ذمہ داریاں
نبھانے کے لیے، خود کو برصغیر اور اپنے کام سے متعلق مسئلوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔
اپنی خود نوشت[1] میں خاصی تفصیل کے ساتھ انھوں نے اپنی ذہنی کیفیات کے بارے میں لکھا
ہے۔ سفر حضر میں تین بھیانک خواب ہر لمحہ ان کے ذہن پر مسلّط رہے۔ ایک، ہندوستانی
قواعد، دو، ۱۹۳۵ کا حکومتِ ہند کا قانون، اور تین، براڈکاسٹنگ انجینئرنگ۔

> In hospital I had waded labouriously through two volumes of grammar, and spattered much paper with my gawky Urdu script; that engaging old bluffer, Sir Denison Ross, had provided me with a teacher
>
> (English) who omitted to tell me that his accent was deplorable, and to learn the printed script was a waste of time. Nor did I realize the immense gulf between European and Oriental languages.

---

[1] The Natural Bent : Lionel Fielden

ص ۱۵۲ پر فیلڈن پھر ہندوستان، تراعد اور ۱۹۳۵ کے ایک ایکٹ کی طرف واپس آتے ہیں۔ وہ اشیم شپ پر سفر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے منزل ہندوستان ہے۔ ان کا ہمزاد اُن سے کہتا ہے:

"اور پھر سوچو تو۔ تمہیں تو ٹھیک سے زبان تک نہیں آتی!"

فیلڈن کی خود کلامی کا یہ انداز ہے:

"چپ رہو! مجھے ہندوستانی قواعد پر عبور حاصل کرنا ہے۔ اور ۱۹۳۵ء کا ایکٹ ایک بار اور..."

یہ ۱۷؍ اگست ۱۹۳۵ء کی یادداشت ہے، جو سنیچر وار تھا، اور جہاز کا نام تھا "پلونہ"۔ اور ۲۷؍ اگست، یعنی منگل کو ایک ہم سفر کورنیلیا سہراب جی نے فیلڈن کی اُردو کا امتحان لیا۔ اس امتحان کے بارے میں فیلڈن نے لکھا ہے کہ گویا ایک یونانی، ایک فرانسیسی کو پرکھے!

لسانی اعتبار سے، بول چال کی اُردو ہی ہندوستانی ہے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے چل رہے تھے، وہ علمی نہیں، سیاسی نوعیت کے تھے، اور براڈکاسٹنگ کے سربراہ کے لئے بہت بامعنی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سیکھنے کے لیے فیلڈن نے اُردو پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی۔ اس لئے بھی فورٹ ولیم میں، بول چال کی زبان اور کتابوں میں زیادہ تھی، اور فورٹ ولیم کی ہندی للولال جی کی "پریم ساگر" میں تھی —— اور اس حقیقت سے یورپ کا ہر مستشرق واقف ہوتا ہے کہ تت سم لدی زبان، بول چال کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان آنے سے پہلے انھوں نے یہاں کی لنگوافرانکا کی شدبد ضرور حاصل کر لی تھی۔ قواعد کی کون سی کتاب انھوں نے پڑھی، اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ ہو سکتا ہے ان ہی میں سے کوئی قواعد ہو، جن کا ذکر اسی مقالے کے ایک باب میں کیا گیا ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ لندن سے روانگی کے وقت تک وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولنے اور سمجھنے ضرور لگے تھے، ورنہ کورنیلیا سہراب جی کے امتحان لینے کا واقعہ پیش نہ آتا۔ ایک ہی سانس میں ہندوستانی قواعد اور اُردو کے ذکر سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ فیلڈن نے ولیم جونز، گریرسن اور گلکرسٹ کے نظریات کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی ہوگی۔ اس بات کا غالب امکان اس لیے ہے کہ انھوں نے ایک پیشہ ور براڈکاسٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض کو ایک چیلنج کی طرح قبول کیا۔

وہ اپنے حساب سے بہت کچھ تیاری کر کے آئے تھے، لیکن ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی، اُن کے ذہن کو پہلا جھٹکا لگا۔ یہ حقیقت ان پر واضح ہوئی کہ زبان اور بولی

جانے والی زبان میں کبھی کبھی ایک ناقابلِ عبور خلیج بھی حائل ہو جاتی ہے۔ تھوڑا بہت فرق تو تحریر اور تقریر کی زبان میں ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ فرق اتنا زیادہ ہو کہ ترسیل اور ابلاغ مشکل ہو جائے تو مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مختلف علاقوں میں نہ صرف بولیاں الگ ہیں بلکہ ہندستانی کے روپ بھی مختلف ہیں۔ یہ اختلاف ہندوستانیوں کے لئے مسئلہ نہیں، لیکن ایک غیر ملکی کے لئے یقیناً ہیں، جس نے قواعد پڑھ کر کتابی زبان سیکھی ہو۔ بمبئی کی اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے نووارد فیلڈن کے تاثرات :

The language of those parts was presumably I thought, Gujrati; I didn't understand a syllable. In England I had plodded through a whole Hindustani grammar, and knew by heart every exercise in it: how much is it, I should like a bath now, bring me some tea, how is your grandfather? More, indeed much more, I had learnt to read and write the printed Urdu script. But here in Bombay area, all this meant nothing at all.

لندن میں قواعد کی مدد سے سیکھی ہوئی اردو، جو بول چال کی اُردو ہوتے ہوئے بھی کتابی تھی، پہلے ہی مرحلے میں بے مصرف ثابت ہوئی۔ یہ یقیناً ترسیل کا المیہ ہے۔ ایسا ہی، اور اسی کے متوازی ایک اور المیہ ہے۔ فیلڈن نے ایک ہندوستانی کردار گوگ سے، جو انگریزی خواں تھا، انگریزی میں گفتگو کرنا چاہی، تو خاصے مزاحیہ نتائج برآمد ہوئے[1] گوگ موقع کا معائنہ کرا رہا تھا۔ اس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ، وہاں سے شروع ہوتا ہے، وہ بڑا درخت ہے، وہاں سے — وہ لال —" فیلڈن نے درخت کو پہچان لیا، اور پوچھا :

'No, nothing.' I said quickly.

'Isn't that hibiscus?'

'Hi what's?' said Gog, put out by this.

له ایضاً: ص ۱۶۴، ۱۶۵ -

ٹه ایضاً: ص ۱۶۴

انگریزی میں گفتگو کا ایسا ہی تجربہ فیلڈن کو پہلے بھی ہو چکا تھا۔[1]

Next came Chakraverty, the 'Director of Indian Programmes'. The trouble about Chakraverty, as far as I was concerned, was that his English was so thick and strange as to be almost unintelligible; and had I been able to converse fluently in Hindustani it would have availed me nothing since he came from Gujrat.

یہاں شاید فیلڈن سے اندازے کی غلطی ہوئی ہے، یا ڈرامہ پیدا کرنے کے لیے براڈ کاسٹر کا ہتھکنڈا دکھایا ہے۔ گجراتی، اور وہ بھی تعلیم یافتہ گجراتی ہندوستانی ضرور سمجھ لیتا ہے، بلکہ ٹوٹی پھوٹی خود بھی بول سکتا ہے۔ ہاں، ایک پہلو اور بھی ہے۔ فیلڈن کا انگریزی لہجہ اگر چکرورتی کے لیے ناقابل فہم رہا ہو، تو فیلڈن کی ہندوستانی یقیناً زیادہ ناقابلِ فہم ہو گی۔ پھر انھوں نے روزمرّہ کی محدود ضرورتوں والی زبان سیکھی تھی، تبادلۂ خیال والی زبان نہیں۔ لیکن قطع نظر ان باتوں سے یہاں فیلڈن کا بیان یہ دکھانے کے لیے نقل کیا گیا ہے کہ اہلِ زبان اور زبان داں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جس کی مادری زبان مختلف ہو، زبان کا وہ طالب علم کتابوں سے بڑی حد تک ماضی کی زبان سیکھتا ہے، ماضی بعید کی یا ماضی قریب کی۔ ماضی قریب کی وہ زبان جو حال کے ادب میں بھی رائج سکّے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا لہجہ اجنبی ہوتا ہے، اور الفاظ بوجھل اور گاڑھے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وہ روزمرّے کے بجائے تحریری اسلوب کے مطابق ہوتے ہیں۔ فیلڈن کا بیان اس وجہ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ آج ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں کی، خاص طور سے خبروں اور لکھے ہوئے پروگراموں کی زبان کے سلسلے میں بھی اس کی معنویت باقی ہے۔ خبروں اور پروگراموں کی زبان کے تجزیے کے باب میں اس موضوع سے متعلق تفصیلی بحث آئے گی۔

---

[1] ایضاً: ص ۱۶۱

اس موضوع پر مزید حقائق بیان کرنے اور چھان بین سے پہلے، یہ بات توجہ طلب ہے کہ فیلڈن نے ہندوستانی قواعد اور اُردو رسم خط کی بات کی ہے۔ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہونا منطقی بات معلوم ہوتی ہے۔ قوم اور زبان کا نام، ملک کے نام سے جڑا ہوتا ہے۔ ہالینڈ جیسی استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر، قوم کے نام کی نسبت ملک کے نام سے ہوتی ہے، اور قوم کا نام وہی ہوتا ہے، جو زبان کا ہوتا ہے۔ اور یہ بات استثنائی صورت، ہالینڈ کے لئے بھی صحیح ہے۔ ڈچ نام قوم کا بھی ہے، اور زبان کا بھی۔ جن ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانیں ہیں، وہاں تو میتیں بھی زبان کے نام ہی سے موسوم ہیں۔ یہ تو نہیں کہ ہندوستانی لفظ زبان کے لیے بالکل غیر معروف ہے۔ ہندی اردو ہندوستانی پر تفصیلی بحث اسی مقالے کے ایک باب میں ہے۔ زبان کے لیے ابتدا میں ہندوستانی نام اہلِ ہند میں سے کسی نے نہیں رکھا۔ خود ہند، ہندوستان ہندی، ہندوی اور ہندو نام بھی باہر کی زبانوں کے لفظ ہیں، جو دوسرے ہزاروں دخیل لفظوں کی طرح ہم نے اپنالیے ہیں۔ جب مغربی اقوام کے تاجر یہاں آئے، تو ہندوستان اس ملک کا معروف نام تھا۔ وہی تلفظ میں ذرا سی تبدیلی کی وجہ سے انڈیا ہوا۔ انگریز نے ہندوستان کی نسبت سے شمالی ہند میں رائج بولی کو ہندوستانی کہا۔ ملا وجہی کی سب رس میں زبانِ ہندوستان[1] سے وہ زبان مراد ہے، جو دکنی علاقوں کی زبان سے قدرے مختلف ہے۔ وندھیاچل کے اوپر کے علاقوں کی مشترک زبان، یعنی لنگوا فرانکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لسانی فرق کی وجہ سے، جو آریائی اور دراوڑی زبانوں میں ہے، ہندوستان کا علاقہ اس صدی میں بھی وندھیاچل تک سمجھا جاتا تھا۔ یہ فرق موسیقی کی دنیا میں آج بھی ہندوستانی سنگیت اور کرناٹک سنگیت کی اصطلاحوں کی صورت میں موجود ہے۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی کمیٹی بہار کے لیے جو خطبہ ابوالکلام آزاد نے لکھا، اس میں بتایا:[2]

"ہندوستان میں اس قدر زبانیں موجود ہیں کہ شمار کیا جائے تو وہ زبانیں جو معاشرتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں، ان کی تعداد ۱۲۷ تک پہنچتی ہے۔"

---

[1] ملا وجہی، سب رس (نسیم بکڈپو لکھنؤ: ۱۹۷۸ء ایڈیشن) ص ۱۴: "آغازِ داستان زبانِ ہندوستان"

[2] ابوالکلام آزاد: خطباتِ آزاد (ساہتیہ اکادیمی) ص ۲۵۶ - ۲۵۷۔

یہ کثرت پریشان کن ہے۔ اسی خطبے میں ابوالکلام کہتے ہیں [۱]

"... یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سترھویں صدی کے اواخر میں ایک زبان ایسی تھی،
جس سے تمام ملک آشنا ہو گیا تھا۔ اور وہ یہی زبان (ہے) جسے آج ہم اُردو
کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔"

ایسے ملک میں جہاں خواندگی دس فیصدی بھی نہ ہو، بولا ہوا لفظ، لکھے ہوئے لفظ سے زیادہ کام کرتا ہے، اگر وہ نشر ہو سکے۔

[۲]...surely, in this immense, sprawling, illiterate country, broadcasting could educate, unify, and direct as no other medium could. The spoken word could run like fire once again through India.

تحریر اور بول چال کی زبان میں کوئی فرق ہونا تو نہیں چاہیئے۔ لیکن ہوتا ہے۔ اور یہ کچھ آج کی بات نہیں ہے۔ تحریر نے زبان کو ان معنوں میں وسعت اور پائنداری دی کہ بولے ہوئے فقرے اور جملے، جب زبانوں سے ہوتے ہوئے دوسروں تک پہنچتے ہیں، تو ان میں تحریف بھی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی سب سے پرانی کتاب رگ وید کے ساتھ ایسا ہوا۔ قرآن مجید کی آیات کے ساتھ ایسا ہوا، اور اسی لیے قرآن کی تدوین کی گئی۔ تحریر سے متن کے درست ہونے کی ضمانت یقینی ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تحریر کا اسلوب عبارت آرائی کی وجہ سے، بول چال کی زبان سے دور جا پڑتا ہے۔ نثر میں بھی ایسا ہوتا ہے، اور نظم میں بھی۔ رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کی زبان اور غالب کے ان اشعار کی زبان، جو ان کے بیدلی رنگ کے بتائے جاتے ہیں، اس رجحان کی واضح مثالیں ہیں۔

لائنل فیلڈن یہ تصور لے کر ہندوستان آئے تھے کہ بولی جانے والی زبان ہی براڈکاسٹنگ کے اسلوب کی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بول چال کی زبان کی بحالی اردو نثر میں ریڈیو کی وجہ سے ہوئی، اور اردو ادب کو ایک اسلوب دیا۔ فیلڈن کے خیال کو عملی جامہ پہنانے

۱۔ ایضاً: ص ۲۶۷۔

۲۔ Lionel Fielden, The Natural Bent: ص ۱۴۴۔

والوں میں، دو نام سب سے زیادہ اہم ہیں۔ سیّد احمد شاہ بخاری، جو اُردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور پطرس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ فیلڈن کے اسٹیشن ڈائرکٹر، اور پھر نائب (ڈپٹی کنٹرولر، براڈ کاسٹنگ) رہے، اور فیلڈن کے واپس جانے کے بعد، ان کے جانشین ہوئے، اور بعد میں جب یہ عہدہ ڈائرکٹر جنرل، آل انڈیا ریڈیو کا کیا گیا، تو وہ اس پر فائز ہوئے۔ پطرس، یعنی بڑے بخاری زیادہ تر انتظامی معاملات میں اُلجھے رہے، اس لئے وہ پروگرام کے سلسلے میں بہت زیادہ عملی رول ادا نہ کرسکے۔ سوائے پالیسی بنانے اور اس پر عمل آوری پہ نظر رکھنے کے۔ لیکن ان کے چھوٹے بھائی، ذوالفقار علی بخاری نے زبان کے سلسلے میں، اور پروگراموں کی پیشکش کے سلسلے میں تاریخی رول ادا کیا۔

انصار ناصری پیشے سے وکیل تھے، اور ادب کا نہایت صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ماہنامہ "ساقی" کے جوائنٹ ایڈیٹر بھی تھے۔ لیکن براڈ کاسٹنگ نے کچھ اس طرح انھیں اپنی طرف کھینچا کہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ آل انڈیا ریڈیو دلّی کے قیام کے ابتدائی دنوں کی یادیں انصار ناصری نے تازہ کی ہیں۔[1]

"یہ تاریخی حقیقت ہے کہ برِّ صغیر میں نشریات کی داغ بیل ڈالنے، اور اسے پروان چڑھانے کا سہرا پشاور کے بخاری برادران کے ہی سر ہے۔ ذوالفقار بخاری تو اوائل ہی سے، یعنی جب ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن کی آزمائشی نشریات کا آغاز ہوا، اس نئے میڈیم میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی، پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) مرحوم، دہلی اسٹیشن کے قیام کے بعد ۳۷-۱۹۳۶ء میں اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد، جب محکمے کا باقاعدہ ہیڈ کوارٹر قائم ہوا۔ تو لائنل فیلڈن کنٹرولر کے ساتھ، اس کے ڈپٹی کنٹرولر کی حیثیت سے صدر دفتر میں کام کرتے رہے بعد ازاں لائنل فیلڈن کے سبکدوش ہونے کے بعد سے وہ خود آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مقرر ہوئے اور تقسیم ہند سے کچھ دن پہلے تک، دتی اس عہدے پر فائز رہے۔ ان ہی کے عہد میں آل انڈیا ریڈیو کی اتنی توسیع ہوئی کہ لاہور، لکھنؤ"

---

[1] انصار ناصری: سیّد ذوالفقار علی بخاری؛ مضمون مشمولہ جریدہ (موسم بہار ۱۹۸۶) پشاور ص: ۱۹۴ تا ۲۰۶۔

پشاور، بمبئی، کلکتہ، مدراس، ترچناپلی میں یکے بعد دیگرے مختلف اسٹیشن قائم ہوتے رہے، اور ہندوستان میں نشریات کا جال سا بچھ گیا۔ اس حیثیت سے احمد شاہ بخاری کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ . . بلیہ . . . نشری پروگراموں میں براہِ راست عملی طور پر شرکت کرنے کا انھیں کم ہی موقع ملتا تھا۔ شاید ایک آدھ بار کسی رسمی موقع پر کوئی تقریر وغیرہ کر دینے کے (علاوہ) انھوں نے کسی ریڈیو پروگرام میں عملاً کبھی شرکت نہیں کی۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ اپنے اعلیٰ منصب، ذاتی لیاقت و وجاہت کا بڑھا ہوا احساس بھی انھیں پروڈیوسروں اور فنکاروں کے ساتھ گھلنے ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا . . . . وہ ہم میں سے ہر ایک کو نام بنام جانتے پہچانتے تھے، لیکن از خود بھلا کب کسی کو اپنے پاس بلاتے تھے . . . . . .

ذوالفقار بخاری مرحوم کئی لحاظ سے اپنے بڑے بھائی کی بالکل ضد تھے، اور نشری پروگراموں کی تو جان، بلکہ روح رواں تھے۔ اُن کا شعر و ادب کا رچا ہوا ذوق، فنونِ لطیفہ اور جمالیات سے گہرا شغف، پروگراموں سے جنون کی حد تک بڑھا ہوا ذوق و شوق، پروڈکشن اور پیش کش کی لگن اور تڑپ، دفتری کاروبار سے کہیں زیادہ انھیں سٹوڈیوز میں سرگرداں رکھتی تھی۔ ان کی تخلیقی اُپج، پروگراموں کا نہایت پاکیزہ و شستہ سلیقہ قرینہ، بے چین و حساس طبیعت، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے، اور کر گذرنے پر اُکساتی رہتی تھی . . . . . جب دیکھو شاعروں ادیبوں کے جھرمٹ میں گھرے بیٹھے ہیں۔ شعر پر شعر، اور فقرہ پر فقرہ چست ہو رہا ہے۔ یا پروڈیوسروں، صدا کاروں کے ساتھ سر جوڑے بیٹھے

ل Indian Broadcasting میں ایچ۔ آر۔ لوتھرا نے Landmark in Broadcasting History, کے باب میں ص ۴۹۶ اور ۴۹۷ پر یہ اندراج کئے ہیں:

۱۔ جولائی ۱۹۴۰ء: اے ایس بخاری نے کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کا عہدہ سنبھالا۔

۲۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء: اے ایس حامد، آئی سی ایس، ڈپٹی کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ مقرر ہوئے۔

۳۔ فروری ۱۹۴۳ء: آل انڈیا ریڈیو کا صدر دفتر، براڈ کاسٹنگ ہاؤس، پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی میں منتقل ہوا۔ سروس کے سربراہ کا عہدہ، ڈائرکٹر جنرل، آل انڈیا ریڈیو کے نام سے موسوم ہوا۔

ہیں۔ کوئی نیا پروگرام مرتب کر رہے ہیں، دہرسلیں کرا رہے ہیں۔ ہر مکالمہ مختلف انداز سے خود بول بول کر دوسروں کو سکھا رہے ہیں۔ کبھی شرطیں لگا لگا کر، انعام دے دے کر، ان کے حوصلے بڑھا رہے ہیں۔ کبھی ان کی مجہول آوازوں اور غلط تلفظ کی مضحکہ خیز نقلیں اتار اتار کر انھیں شرمندہ کر رہے ہیں۔ کبھی موسیقاروں اور سازندوں کے ساتھ غزلوں کی نئی نئی دھنیں بنا رہے ہیں۔ مائکروفون پر سازوں کا توازن (بیلنس) درست کرنا بتا رہے ہیں۔ کبھی اناؤنسر کے تلفظ ٹھیک کر رہے ہیں۔ انھیں آواز کے صحیح مخارج بتا رہے ہیں۔ خبریں پڑھنے والوں کو سکھا رہے ہیں کہ خبروں میں غیر جانبداری کا تاثر قائم رکھنے کے لیے کس حد تک، شدومد اور زیر و بم روا رکھا جا سکتا ہے، اور کس حد تک سپاٹ انداز اختیار کرنا ضروری ہے۔ ڈراما میں صداکاروں کے مائکروفون سے فاصلے درست کر رہے ہیں، اور سمجھا رہے ہیں کہ مختلف کرداروں کا مختلف فاصلوں سے بولنا منظر کو کس طرح دلکش بنا دیتا ہے۔ مکالموں اور صوتی اثرات کا ربط اور ہم آہنگی کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔ کچھ دانشوروں کو ریڈیو پر بولنے کے فن کے رموز و نکات سمجھا رہے ہیں۔ ریڈیو "ٹاک" (جو ان دنوں بات چیت کہلاتی تھی) کیا شے ہوتی ہے، اور یہ لیکچر یا اسٹیج سے کی جانے والی تقریر سے کتنی مختلف ہوتی ہے، اور کیوں؟ — بات چیت کرنے والے کے لئے کیوں ضروری ہے کہ اس طرح بولے (یعنی اپنی پہلے سے لکھی ہوئی تقریر کو بولنے کے انداز میں اس طرح پڑھے — جو بجائے خود آسان نہیں ہے) کہ گویا ایک شخص واحد سے باتیں کر رہا ہے، چاہے اس کے سننے والے ہزاروں، لاکھوں ہی ہوں، لیکن مخاطب کا انداز مجمع سے نہیں ایک فرد سے ہونا چاہیے۔ (اب ریڈیو پاکستان نے 'بات چیت' کے بجائے 'ٹاک' کو پھر 'تقریر' کا نام دے کر اس کی ساری معنویت ہی ختم کر ڈالی ہے۔ اسی سبب سے تقریریں اب فی الواقع تقریریں ہی بن کر رہ گئی ہیں، جن کا سننا دو بھر ہو گیا ہے!)[لہ] . . . .

لہ ۱۹۸۱ء میں ڈائرکٹوریٹ جنرل آل انڈیا ریڈیو سے اسٹیشنوں کو ہدایات جاری ہوئیں کہ اردو پروگراموں میں ٹاک کو بات چیت کہا جائے، تقریر نہیں۔ رتناگیری اسٹیشن نے ان ہدایات پر

بقیہ صفحہ ۴۴۰

آل انڈیا ریڈیو کا دہلی سٹیشن جنوری ۱۹۳۶ء میں باضابطہ طور پر جاری ہو گیا۔ برصغیر میں یہ پہلا باقاعدہ اور سرکاری ریڈیو سٹیشن تھا۔ مشرقی ہندوستان، وسطی ہندوستان، یوپی، بہار وغیرہ میں دور دور تک سُنا جا سکتا تھا۔ دلی کے علاوہ لاہور، امرتسر، جالندھر، آگرہ، بھوپال علی گڑھ، جے پور، گوالیار، پٹیالہ، الور، سہارنپور، مراد آباد، لکھنؤ، پٹنہ وغیرہ کے اکثر دانشور، ادیب و شاعر، فنکار، موسیقی داں، سب ہی کھنچے چلے آتے تھے۔

ذوالفقار بخاری، چند دن بعد ہی اس اسٹیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذوالفقار بخاری نے ہی اس وقت کے نامور ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور فنکاروں کو نشریات سے روشناس کرایا۔ اور لکھنے پڑھنے والوں کو مروجہ "لکھنے کی زبان" کی بجائے "بولنے کی زبان" کی اہمیت سے آگاہ کیا، اور اسی زبان میں نشریات کے مسوّدات مرتب کرنے پر آمادہ کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ نشریات کی ایجاد، زبان کو از سرِ نو زندگی کی تازگی اور حرارت دے کر، اُسے اپنے اصل مرتبے پر فائز کرے گی۔ زبان جو اصلاً انسانی اصوات کا مجموعہ ہوتی ہے، اس کا اصل مقصد بھی ایک دوسرے سے ہمکلامی ہی تھا۔ جب تک زبان صرف بولنے تک محدود رہی، اس میں تازگی، بشاشتی اور زندگی کی حرارت و ملائمیت بھی رہی، گویا زبان اس اعتبار سے زندہ و تابندہ رہی۔ لکھنے کی ایجاد نے گو زبان کی اشاعت کو وسعت بخشی، اور وہ دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ لیکن اس کا انسانی عنصر زائل ہوتا گیا تا آنکہ زبان چند حروف اور اعتباری قسم کے نشانات میں محدود اور مقید ہو کر رہ گئی، اور زبان بولے جانے میں جو دلآویزی، کشش اور شیرینی و نمکینی ہوتی ہے، اور صدا کے اُتار چڑھاؤ، مبتدا کی روانی کے بعد خبر بننے کی شدومد، انسانی صوت و صدا کی جو نرمی، گرمی اور مخارج کے زیر و بم کے ذریعے جذبات و احساسات کی جیسی بھرپور ترجمانی ہوتی تھی۔ اور قیام و وقوف کی جو لطافتیں اور خوبصورتیاں ہوتی

بقیہ پچھلے صفحہ کا

نظرثانی کرنے کے لیے لکھا، اور ڈائرکٹر جنرل کرشن چند شرما (بھکو) کے حکم سے یہ ہدایات واپس لے لی گئیں۔

تھیں، تحریریں وہ سب کی سب ختم ہو کر رہ گئیں۔ گویا زبان فی الجملہ جامد و ساکن اور مردہ ہو کر رہ گئی۔ اُس پر تحریر کے ضوابط اور املا و انشا کے روز افزوں لوازم، مثلاً کاما، کولن، سیمی کولن، فل اسٹاپ، ڈیش، واوین، خطوط واحدنی وغیرہ وغیرہ کی اعتباری علامات نے اس کا رہا سہا حسن اور بھی غارت کر کے رکھ دیا گویا جو زبان جو محض بولنے اور سننے کی چیز ہوا کرتی تھی، دیکھنے اور پڑھنے کی چیز بن کر رہ گئی۔ ..... ذوالفقار بخاری کہتے تھے کہ نشریات کا سب سے بڑا کمال رہے کہ لکھی ہوئی زبان کو پھر سے انسانی آواز کا روپ دے کر، اُسے جیتی جاگتی، نرم و گرم، چہکتی، چہچہاتی زبان میں تبدیل کر دے ...... صداکاری، جیسا کہ اس لفظ سے بجا ظاہر ہے، صدا کو آرٹسٹک طریقے سے استعمال کرنے کا فن ہے۔ صدا، کیسی ہی کیوں نہ ہو، بجنسہٖ بری نہیں ہوتی، اور نشریات میں، تو ضرورت کے اعتبار سے، بری سے بری صدا کی بھی کھپت ہو سکتی ہے۔ لیکن بالعموم ایسے پروگراموں میں، جن میں محض آوازوں کے ذریعے، واقعات کے تسلسل کے ساتھ جذبات کی صحیح ترجمانی اور قلبی کیفیات، یعنی کسی واقعہ یا مکالمے کا عمل اور ردِّ عمل بھرپور طریقے سے پیش کرنا مقصود ہو۔ جیسے کہ ڈراما وغیرہ، اس کے لئے صداکاری درکار ہوتی ہے۔ صداکار، اپنی منجھی ہوئی، منضبط، پُر تاثیر اور جچی تلی آوازوں، دلنشیں لب و لہجے، اور آواز کے زیر و بم سے مطلوبہ جذبہ و کیفیت کو تاثیر بھرے انداز میں ادا کر کے، پوری کہانی کو، اس کی باریکیوں سمیت، سننے والوں کے لئے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ یہی نشری ڈرامے، اور اس ڈرامے کو پیش کرنے والے صداکاروں کا کمال ہے کہ نظر کچھ بھی نہیں آ رہا ہوتا، محض ایک حس، یعنی قوتِ سمع کو اس طرح اپیل کرتے ہیں کہ بعض دکھائی دیئے جانے والے ڈرامے بھی اتنے دلچسپ اور پُر کیف ثابت نہیں ہوتے، جتنے کہ ریڈیو پر محض سننے کے ڈرامے۔" ..

سیّد ذوالفقار علی بخاری ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے براڈکاسٹنگ کے فن کے لئے سانچے بنائے۔ ان کی خود نوشت ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ ذوالفقار براڈکاسٹنگ کی روایات کے خالق ہی نہیں، بلکہ خود بھی ایک روایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک فنکارانہ نظر

نہیں ہو سکتا، اور ذوالفقار تنگ نظر تھے بھی نہیں۔ لیکن اس خود نوشت "سرگزشت" میں ان کے قلم سے ایسے جملے بھی نکلے ہیں، جو فرقے واریت میں اس حد تک رنگے ہوتے ہیں کہ جمالیاتی حس کو استفراغ ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد شاہ بخاری (پطرس) ڈائرکٹر جنرل، اور ذوالفقار بخاری کے ساتھ انصاف نہیں کیا، لیکن اس کا جواب یہ نہیں تھا کہ ذوالفقار اپنی کتاب میں عصبیت کا زہر اس حد تک بھر دیتے کہ کہیں کہیں معروضی حقیقتیں ماند پڑ جاتیں۔ اس کمی کے باوجود "سرگزشت" سے کئی اہم گوشے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔

شروع میں جب ریڈیو کے لیے ڈرامے نہیں لکھے گئے تھے، تو اسٹیج کے لئے جو ڈرامے فراہم تھے، ان میں ریڈیو کی ضروریات کا لحاظ نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر پارسی تھیٹر کے ڈرامے، خاص طور سے آغا حشر کے لکھے ہوئے "یہودی کی لڑکی" یا شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجمے یا پھر یونانی ڈراموں کے ترجمے نشر ہونے لگے۔ اس کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ ریڈیو کا میڈیم صرف صوت و صدا کا میڈیم ہے، اور سننے والے اپنے تصوّر میں منظر تخلیق کرتے ہیں، اس لیے آواز اور اس کے اتار چڑھاؤ کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اب یہ ڈرامے نہ صرف تین تین چار چار گھنٹوں کے ہوتے تھے، بلکہ ان میں شعروں اور گانوں کی بھی بھرمار ہوتی تھی شعروں کی اس لئے کہ صداکار عام طور سے پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے۔ شعر اپنے آہنگ اور قافیوں کی وجہ سے جلد یاد ہو جاتے تھے۔ اسٹیج ڈرامہ قسطوں میں نہیں ہوتا تھا، اس لئے ہر ایکٹر کو سارا ڈرامہ، اپنے مکالموں کی حد تک 'منہ زبانی' یاد کرنا پڑتا تھا۔

ذوالفقار شملے میں اسٹیج ڈرامے کرتے تھے، اور اسی وجہ سے فیلڈن نے انھیں ریڈیو کے لئے منتخب کیا۔ اس انتخاب، اور دوسروں کی ایک دوسرے سے دانت کاٹی روٹی کی وجہ، دونوں کے کرداروں میں کچھ مشترک رجحان بھی بتائے جاتے ہیں، لیکن موضوع حاضر کے لئے وہ اہم نہیں ہیں۔ ذوالفقار اسٹیج ڈراموں کے ماہر ہونے کے باوجود، اسٹیج ڈراموں کی تکنیک کو ریڈیو سے الگ رکھ کر، جدید ریڈیو ڈراموں کے موجد دینے۔ اردو میں ریڈیو کی اس صنف میں پہل کرنے کا نام انھیں کا رہے گا۔ "سرگزشت" میں وہ لکھتے ہیں [1]

---

[1] سید ذوالفقار علی بخاری ؛ سرگزشت ؛ ص ۱۱۷ — ۱۱۸

" میں نے کہا کہ اردو میں تین گھنٹے کے ڈرامے غلط بات ہے۔ ریڈیو پر اتنے لمبے ڈرامے نہیں ہونے چاہئیں، اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر ڈرامے میں گانوں کی بھرمار ہو۔ اسٹیج پر تو یہ گانوں کی بھرمار چل جاتی ہے، لیکن ریڈیو پر نہیں۔ ریڈیو کے ڈرامے آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے ہونے چاہئیں۔ اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔

جب یہ مختصر ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے تو ایک طوفان آگیا۔ اخبارات نے بہ یک زبان ہو کر کہا کہ ڈرامہ بغیر موسیقی کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر یہ بھی کہا کہ وہ ڈرامہ ہی کیا جو ڈھائی تین گھنٹے کا نہ ہو۔ مگر ہم اپنی بات پر اڑے رہے۔ اب کیا بتاؤں کہ ہماری ہٹ دھرمی تھی، یا وفاداری بشرطِ استواری، بہرحال ہم اپنی منوا کر رہے۔ اسی ہٹ دھرمی کا نتیجہ کہئے یا کچھ اور، کہ آج کا ریڈیو ڈرامہ مختصر ہوتا ہے، اور وہ بھی بغیر گانوں کے۔

اردو ڈرامے کی ابتدا امانت کے "اندر سبھا" سے ہوئی، جس میں گانے ہی گانے تھے۔ اندر سبھا کے بعد جو ڈرامے لکھے گئے اُن میں بھی گانوں کی یہ روایت بہت حد تک برقرار رکھی گئی۔ یہاں تک کہ آج ہماری فلمیں بھی بغیر گانوں کے بنتی نہیں۔ کہتے تو ہیں کہ ہندوستان میں ایک فلم ایسی بنی ہے، جس میں کوئی گانا نہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فلم کامیاب رہی . . . . .

موسیقی کی جاذبیت سے مجھے انکار نہیں۔ میں تو موسیقی کا والہانہ حد تک دلدادہ ہوں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ فلم کے گانے فلم کی کہانی کے خرام میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ جہاں کہانی نے زور پکڑا، وہیں کھٹ گانا آگیا، اور بےچاری کہانی بیچ ہی میں دب دبا کر رہ گئی . . . . . .

ڈرامے میں گانے کا مقام کچھ ایسا ہی ہے، جیسا کہ پرانی نثر میں اشعار کا مقام ہوا کرتا تھا۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک بات یاد آتی ہے۔ ایک دن اپنی کتاب کا ذکر کرنے لگے، فرمایا کہ میری اس کتاب کی طرزِ نگارش، باقی کتابوں سے مختلف ہوگی۔ مولانا آزاد اور مختلف طرزِ نگارش! بات سمجھ میں نہ آئی، تو میں نے کہا اس مختلف طرزِ نگارش سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا پہلی کتابوں کا تو یہ حال ہے کہ جہاں لکھتے لکھتے کوئی موزوں نظر آیا جھٹ کوئی موزوں شعر لکھ کر جان چھڑائی، مگر جس کتاب کا میں تذکرہ کر رہا ہوں، اس میں شعر نہیں ہوں گے۔"

ریڈیو پروگراموں کی تشکیل میں ذوالفقار بخاری کا بہت اہم رول ہے۔ اس کے باوجود ان کا یہ بیان کہ ریڈیو کو مختصر ڈرامہ ان کی دین ہے، مشکل ہی سے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں طالب علم مختصر ڈرامے ہی اسٹیج کرتے تھے۔ اردو، ہندی کے پاس، پارسی تھیٹر کے بعد پیشہ ورانہ تھیٹر نہیں تھا۔ خاموش فلمیں پارسی تھیٹر پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں، لیکن ٹاکی نے اردو/ ہندی کے اس تھیٹر کو ضرور کھالیا، جو لوک تھیٹر نہیں تھا۔ پھر بھی صنف کی حیثیت سے ایک ایکٹ کا ڈرامہ اردو اور ہندی میں آچکا تھا۔ خود منشی پریم چند نے حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر ایک ڈرامہ لکھا تھا، اور ان کو اس بات کا گلہ تھا کہ یہ اسٹیج نہیں کیا گیا۔ یہ بات انھیں منطقی نہیں معلوم ہوتی کہ سانحۂ کربلا کے کردار اسٹیج پر کیوں نہیں پیش کیے جا سکتے۔

دلی کے ریڈیو اسٹیشن نے یکم جنوری ۱۹۳۶ء سے براڈ کاسٹ شروع کیے۔ اپریل ۱۹۳۶ء کے "ساقی" میں سید انصار ناصری کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "شادی کی اونچ نیچ" شائع ہوا ہے۔ اس پر "ساقی" کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے[1]

> اردو میں "ڈرامہ" جس پستی میں ہے اُسے یہاں بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے، آغا حشر مرحوم نے اس صنف ادب کو فروغ دیا تھا، مگر ان کے ساتھ اُردو ڈرامہ نگاری نے بھی دم توڑ دیا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اب چند نوجوانوں نے "ڈرامہ" کو اپنا خاص موضوع بنالیا ہے اور ان ہی میں سے ایک سید انصار ناصری صاحب ہیں جنھیں اچھے ڈرامے لکھنے کی دُھن ہے، نجمہ نوری نے جو شہرت پائی محتاج بیان نہیں، ذیل میں جو ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے کردار نگاری کی اعتبار سے اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اور حضرات اُسے نمونہ بنا کر کچھ لکھیں تاکہ ہماری زبان میں "ڈرامہ" بھی "افسانہ" کی طرح اپنے عروج پر پہنچ جائے۔ "شاھد"

نجمہ نوری کی شہرت اور چند نوجوانوں کے ڈرامہ کو اپنا خاص موضوع بنانے کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ مختصر کہانی کی طرح، مختصر ڈرامہ، صنف کی حیثیت سے وجود میں آچکا تھا، لیکن اسٹیج کے لیے۔

---

[1] ماہنامہ "ساقی" اپریل ۱۹۳۶ء: ص ۵۰۔

ایک ایکٹ کی کامیڈی

سیّد انصار ناصری بی اے، دہلوی

شادی کی اونچ نیچ!

افراد

حشمت آرا بیگم . . . . وحشی کی خوش دامن ٭
لیاقت بیگم . . . . حشمت آرا کی بھانجی ٭
انجمن آرا . . . . حشمت آرا کی بیٹی، وحشی کی بیوی ٭
وحشی . . . . نوجوان شاعر ٭

نئی دہلی کی ایک خوشنما کوٹھی کا ایک کمرہ، دائیں طرف ایک دروازہ، بائیں طرف دو دروازے، ایک ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے، دوسرا برابر والے کمرے میں۔ دروازوں پر آسمانی رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سامنے کے رُخ ایک کھڑکی جو بند ہے، اس کی سِل پر ٹیلیفون رکھا ہے، کمرے میں ضرورت سے زیادہ فرنیچر اور دیگر سامان بھرا ہوا ہے، وسط میں ایک میز ہے، جس پر لکھنے کا سامان اور کچھ کتابیں پڑی ہیں۔

لیاقت بیگم، حشمت آرا کی خوبصورت، ہنس مکھ نوجوان بھانجی ایک ہاتھ میں بیگ، اور دوسرے میں ایک موٹی سی نوٹ بک لئے ہیں۔

حشمت آرا، سانولا رنگ، موٹی ناک، خضاب زدہ بال، دبدبا اور شان کی مجسّم تصویر ہیں۔ گو فی الحال نزلے کی تحریک کے سبب ذرا ناک میں بولتی ہیں۔ اور موقع بے موقع خوفناک قسم کی چھینکیں بھی لیتی رہتی ہیں ٭

لیاقت بیگم:۔ گھبرانے کی کیا بات ہے خالہ جان! سب ٹھیک ہے . . . .

حشمت آرا:۔ تو نہیں جانتی بچی —— جب —— آچھین ل ل! —— جب معاملہ وکیلوں تک پہنچ جائے تو —— ہائے میں کیا کروں . . . .

لیاقت:۔ کیا واقعی وکیلوں تک نوبت پہنچ گئی —— اوہ —— تب تو واقعی افسوس ہے —— مجھے وحشی صاحب اور انجمن آرا۔ کی طرف سے اتنی ذلالت کی توقع ہرگز نہ تھی۔

حشمت:۔ کیا بتاؤں بچی! —— ان دونوں کا دُنیا جہان سے نرالا جوڑا ہے۔ آخر ہماری بھی شادی ہوئی تھی —— ہم میاں بیوی بھی لڑتے تھے۔ لیکن آج کل کی لڑائیاں تو بس —— آچھین ل ل!!

لیاقت:۔ جی ہاں خالہ جان!! آج کل تو ذرا ذرا سی بات پر طلاقاً طلاقی ہوتی ہے —— میں کہتی ہوں کہ پھر شادی آخر کی ہی کیوں جائے۔ جب میاں بیوی پیار محبت سے نہیں رہ سکتے تو پھر شادی کی کیا ضرورر . . . .

حشمت:۔ بچی تو کیا جانے ان باتوں کو۔

لیاقت:۔ مگر میں سیکھ رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ سب کچھ آجائے گا۔

حشمت:۔ کبھی نہیں آسکتا۔ شادی تو ایسا علم ہے جو سیکھا یا پڑھا نہیں جا سکتا، صرف برتنے اور تجربے سے آسکتا ہے —— مگر خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں —— ہائے میں کیا کروں —— ان دونوں نے تو لٹیا ڈبو دی . . . .

لیاقت:۔ مگر خالہ جان۔ آج کوئی نئی بات تو ہے نہیں —— انجمن آرا۔ تو ہمیشہ لڑتی ہی رہتی ہیں۔ گذشتہ مہینے جب قطب کی سیر کو گئے تھے تو وہاں بھی ان دونوں نے چین نہ لینے دیا صبح سے شام تک لڑتے ہی رہے —— مگر میرا بہت فائدہ ہوا۔ میری کتاب "شادی کی اونچ نیچ" کے لئے خوب مسالہ ہاتھ لگا . . . .

حشمت:۔ تو بڑی سنگدل ہے —— لیاقت —— میں کہتی ہوں کہ —— آچھین ل ل!!

لیاقت:۔ آپ کچھ ہی کہیئے خالہ جان —— مجھے تو انجمن آرا سے اب ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔

حشمت:۔ ہاں ٹھیک ہے —— مگر میں تو اس کی ماں ہوں —— ماں کے دل سے پوچھ —— میرے دل سے، اُس کی آواز میں کیسا درد تھا۔ حالانکہ ٹیلیفون میں سے آرہی تھی، مگر ہچکیوں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی —— ہائے رے میں کیا کروں...

لیاقت:۔ مگر پچھلی دفعہ کا واقعہ کیا آپ بھول گئیں —— دونوں کے دونوں خوب لڑے،

۔ اور جب ہم ملاپ کروانے آئے تو خود ہی گھل مل گئے اور الٹا ہمیں ڈانٹ کر تم لڑائی ڈلواتے ہو۔

حشمت :۔ ہاں ہاں۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید میں ہی غلطی پر تھی۔

لیاقت :۔ آپ غلطی پر؟ ــــ وہ کیسے ؟؟

حشمت :۔ آچھین ں ں !!

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ لیاقت ٹیلیفون اٹھاتی ہے)

لیاقت :۔ ہاں ــ ہاں ــ جی ہاں ــ ہیں ــ موجود ہیں۔ میں ابھی بلاتی ہوں۔ آپ ذرا توقف . . . .

انجمن آرا :۔ (حسین نازک اندام۔ سولہ سنگھار سے آراستہ) کون ہے؟

لیاقت :۔ ہم لوگ۔ تمہاری اماں جان ــ کوئی ٹیلیفون پر بلاتا ہے۔

انجمن آرا :۔ او ہو ــ اماں جان ــ آپ آگئیں ــــ

حشمت :۔ بچی !!! (انجمن آرا کو گلے سے لگاتی ہے)۔

لیاقت :۔ ارے جلدی کرو ــــ ٹیلیفون !!!

انجمن آرا :۔ (ٹیلیفون پر جاکر) ہیلو ــ ہاں۔ ہاں ــ بہن کیسے بتاؤں ــ نہیں اس مرتبہ قطعی فیصلہ ہو کر رہے گا ــ ہاں ــ نہیں ــ میرے عزیز معاملات طے کرنے یہاں آچکے ہیں ــ میں ضرور علیحدگی اختیار کرکے رہوں گی ــ قطعی طے ہے اور کیا ــ تم پھر ٹیلیفون کرنا ــ کچھ دیر بعد ــ خدا حافظ۔

حشمت :۔ انجمن کچھ تو بتا ــ میرا دل بیٹھا جاتا ہے ــ آخر ہوا کیا؟

انجمن آرا :۔ (تیزی سے) اماجان ــ کیا مجھے دِق ہے؟

حشمت :۔ کیا ؟؟

انجمن آرا :۔ کیا میں بیمار ہوں؟ کیا مجھے ہسٹیریا ہے؟۔ کیا میں سوتے میں خراٹے لیتی ہوں؟۔ کیا مجھے ڈکاریں بہت آتی ہیں؟۔ کیا میری ناک بہتی رہتی ہے ــــ

حشمت :۔ انجمن !!!

انجمن آرا :۔ کیا میں لالچی ہوں۔ فاقہ زدہ ہوں۔ چٹوری ہوں جل ککڑی ہوں۔ جھاڑ کا کانٹا ہوں ــ پیر جلی بلی ہوں ــــ

حشمت :۔ نہیں نہیں۔ میری . . . .

انجمن آرا :۔ کیا میں فضول خرچ ہوں۔ کیا میں بسورتی صورت ہوں۔ کیا میری آنکھیں چندی ہیں۔
کیا میرے بال گر رہے ہیں۔ کیا میں گنجی ہو رہی ہوں ـ
حشمت :۔ نہیں نہیں۔ خدانخوا . . . . . .
انجمن آرا :۔ کیا میں ہر وقت دردِ سر میں مُبتلا رہتی ہوں۔ کیا مجھے ہر وقت حرارت رہتی ہے۔ کیا مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کیا مجھے نزلے کی شکایت . . . .
حشمت :۔ اُچھیں ں ں !!
انجمن آرا :۔ کیا مجھ میں اس قسم کا کوئی بھی عیب ہے ؟
حشمت :۔ ہرگز نہیں۔
انجمن :۔ کیوں لیاقت ــــ ہے ؟؟
لیاقت :۔ بالکل نہیں ـــــــ
انجمن :۔ تو پھر کیوں وہ مجھ پر یہ سارے الزام لگاتے ہیں ـــــــ
حشمت :۔ بالکل بُہتان ہے۔
لیاقت :۔ سراسر جھوٹ ہے۔
انجمن :۔ پھر، کیا میں ان کی خدمت نہیں کرتی ؟ کیا میں ان کی ٹائی نہیں باندھتی۔ کیا ان کے قلم میں سیاہی نہیں بھرتی۔ کیا اُن کے بدبودار رومالوں پر اپنی سینٹ کی شیشیاں نہیں انڈیل دیتی ؟
حشمت :۔ کیوں نہیں !
انجمن :۔ کیوں لیاقت ؟
لیاقت :۔ بے شک !!
انجمن :۔ تو پھر اس سوال کا جواب دیجئے کہ وہ کیوں میرے ساتھ بُری طرح پیش آتے ہیں ؟
حشمت :۔ اس کا کمینہ پن ہے۔
لیاقت :۔ وحشی صاحب آدمیت سے خارج معلوم ہوتے ہیں۔
انجمن :۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہ شاعر ہیں۔ وہ آسمانوں پر رہتے ہیں۔ ہوا میں اُڑتے ہیں، پرندوں کے ساتھ گاتے ہیں۔ فرشتے ان سے باتیں کرتے ہیں مگر خدارا، تو بتاؤ کہ کیا وہ بہرے

آدمی ہی نہیں رہے۔ کیا انھیں بیوی کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہئے۔

حشمت :۔ آچھیں ل ل !!

لیاقت :۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ انجمن۔ اس میں تمہارا قصور بھی ہے تم شاید شادی کی زندگی کو نعمت خیال کرتی ہو . . . .

انجمن :۔ یہ کون گدھا کہتا ہے۔ میں تو اسے مصیبت کی انتہا سمجھتی ہوں۔ رومان کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اماجان سے پوچھو، میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں شادی کی زندگی کو سخت ترین قید سمجھتی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اس سے زیادہ خشک اور اداس چیز کوئی نہیں۔ مگر یہ تو میں نے اب جانا کہ یہ کمبخت حد سے زیادہ ناقابل برداشت بھی ہے ـــــ (لیاقت جلدی جلدی اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتی ہے)

حشمت :۔ یہ کیا لکھ رہی ہو لیاقت۔

لیاقت :۔ اپنی کتاب " شادی کی اونچ نیچ " میں محترمہ انجمن آرا کا نظریہ درج کیا ہے۔

انجمن :۔ اوہ! تمہاری منحوس کتاب ـــــ بھاڑ میں جائے۔

حشمت :۔ لیکن انجمن۔ آخر بات کیا ہے ـــــــ

انجمن :۔ اماں جان! یقین جانئے میں ہر طرح برداشت کرتی رہی، مگر اب حد ہو چکی۔ میں نے آج تک کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ہمیشہ ان کے دوستوں کو عمدہ چائے پلائی، کبھی اُن کے سامنے گانے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کی ذلیل نظموں کو ہزاروں مرتبہ صبر کے ساتھ سنا۔ لمبی چوڑی داد دی مگر پھر بھی ـــــ

لیاقت :۔ ہمیں افسوس ہے کہ وحشی صاحب نے اتنے کمینہ پن کا اظہار کیا لیکن آخر یہ تو بتاؤ کہ وہ تازہ واردات کیا ہے ؟

حشمت :۔ ہاں لڑائی کس بات پر ـــــــــ

انجمن :۔ کیا کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ خوبصورت ہیں ؟

لیاقت :۔ ہرگز نہیں ـــــــ

انجمن :۔ (جل کر) خیر۔ مجھے تمہاری رائے کی ضرورت نہیں ـــــ اماں جان آپ بتائیے کیا وہ کسی طرح بھی آدمی کہلائے جاسکتے ہیں۔

حشمت :۔ (بےچارگی کے عالم میں) ہاں ـــ نہیں ـــ مگر خیر۔

انجمن :۔ تو پھر بتائیے کہ وہ کیا ہیں ؟

حشمت :۔ کیا ہیں ؟ واقعی غور طلب سوال ہے ـــــ مگر میرا خیال ہے کہ انجمن، اگر تو صاف صاف بتا دے کہ آخر لڑائی کس بات پر ہوئی تو شاید میں کچھ کر سکوں۔

انجمن :۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا سوائے وکیل کے۔

حشمت :۔ تو کیا سچ مچ تو وکیل کے پاس گئی تھی۔

انجمن :۔ نہیں کل صبح جاؤں گی ـــــ لیکن فیصلہ تو ہو ہی چکا ہے میں اس جنجال سے اپنا پنڈ چھڑا کر رہوں گی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ انجمن آرا ریسیور اٹھاتی ہے)

ہلو ـــــ ہاں ۔ ہاں۔ نہیں۔ میں آج شام کو نہیں مل سکتی ـــــ مفصل پھر بتاؤں گی۔ کل ـــــ خدا حافظ۔

حشمت :۔ لیکن لڑکی تو نے اس کے انجام پر بھی غور کیا ؟

انجمن :۔ انجام کیا۔ میں آپ کے ہاں آکر رہوں گی۔

حشمت :۔ (پریشان ہوکر) ہاں ۔ ار ۔ ار۔ ضرور۔ بڑی خوشی سے، مگر تم جانتی ہو کہ تمہارے والے کمرے میں اب لڑکے پڑھتے ہیں۔ مجھے ان کا کہیں اور انتظام کرنا پڑے گا ـــــ اور پھر تمہاری بہن تو سخت ناراض ہوں گی۔

انجمن :۔ اوہ ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔

حشمت :۔ مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آخر ہوا کیا۔

انجمن :۔ ہوا یہ کہ ـــــــــــ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے انجمن ٹیلیفون اٹھاتی ہے) ہاں۔ ہاں۔ نہیں۔ یہ امپیریل بلڈ ہو نہیں ہے ـــــ معاف کیجئے (ریسیور زور سے رکھ دیتی ہے۔

(وحشی طویل القامت بالو نما انسان داخل ہوتا ہے)

وحشی :۔ او ہو۔ آداب عرض ہے اماں جان۔

لیاقت :۔ آداب عرض وحشی صاحب۔

وحشی :۔ تم بھی ہو لیاقت۔ وعلیکم السلام۔

انجمن :۔ (تیزی سے) میرے کمرے میں چلئے اماں جان۔

(حشمت آرا اور انجمن آرا بائیں طرف کے دروازے سے جاتی ہیں)۔

وحشی :۔ سُناؤ لیاقت ۔ کیا حال چال ہیں ۔

لیاقت :۔ پھر وہی مصیبت !!

وحشی :۔ پھر !! ۔ پھر سے کیا مطلب ہے ۔ ہم دونوں علیحدہ ہونا چاہتے ہیں بس ۔ پھر کیا ؟؟

لیاقت :۔ آخر کس وجہ سے ؟

وحشی :۔ ٹیلیفون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ، اس وجہ سے !

لیاقت :۔ کیا ؟؟

وحشی :۔ ٹیلیفون !!

لیاقت :۔ کیا واقعی ؟

وحشی :۔ دیکھو لیاقت میں بنتا نہیں ہوں مگر کیا تمہیں اس میں کچھ شبہ ہے کہ میں شاعر ہوں ۔

لیاقت :۔ میں مانتی ہوں کہ آپ شاعر ہیں ۔

وحشی :۔ ثبوت کے لئے یہ دیکھ لو کہ ملک کے مقتدر رسالوں میں میری نظمیں چھپتی رہتی ہیں ۔ ابھی ''دورِ جدید'' میں میری ایک نظم ''چشمے کا ترانہ'' آب وتاب سے شائع ہوئی ، تم نے بھی دیکھی ہوگی ۔

لیاقت :۔ ہاں ۔ ہاں مگر . . . .

وحشی :۔ اس کے علاوہ یہ بھی جان لو کہ میں نے تھوڑے سے بہت قدر دان بھی پیدا کرلئے ہیں ـــــ یہ دیکھو بالکل اجنبی لوگ ایسے ایسے خط مجھے لکھتے ہیں (خط جیب سے نکال کر پڑھتا ہے)

''مکرمی ۔ تسلیم ۔ میں نے آپ کا مجموعہ نظم دیکھا ، واللہ آپ نے ہندوستان کی لاج رکھ لی ، آپ کا تخیل ۔ بندش الفاظ ، زورِ بیان ، روانی ، تسلسل ۔ محاورات کا استعمال چست قافیے . . . . ''

لیاقت :۔ ہاں ہاں میں سمجھ گئی ۔

وحشی :۔ غرض اب تم دیکھ لو کہ میں نے خاصی مقبولیت حاصل کرلی ہے ۔ اب ذرا تم ہی

انصاف سے کہو کہ اگر میں لکھتے وقت اپنے کمرے میں سکون اور خاموشی چاہوں تو کیا گناہ ہے — اب یہ منحوس ٹیلیفون (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) — دیکھا تم نے — (ٹیلیفون اُٹھاتے ہوئے) ہاں، ہاں، یہی ۲۹۲۷ ہے، نہیں یہ بسکٹ کمپنی نہیں ہے (ریسیور رکھ دیتا ہے) دن بھر یہی ہوتا رہتا ہے۔

لیاقت :- ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں رکھوا دیتے آپ اسے،

وحشی :- انجم کہتی ہیں ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ میرا ہی کمرہ موزوں ترین جگہ ہے — چنانچہ یہاں میں بیٹھتا ہوں اور یہیں وہ منحوس رکھا رہتا ہے، صبح سے شام تک ٹن ٹن ٹن ٹن !!

لیاقت :- کیا آپ کو ٹیلیفون کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی ؟

وحشی :- بالکل نہیں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں جو میں نے کبھی بھی اپنے لئے اسے ہاتھ لگایا ہو۔ انجم کے ہزاروں دوست ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی صاحب یا صاحبہ ٹیلیفون کرتی ہیں، کیسی طبیعت ہے کیا کر رہی ہو۔ آجاؤ۔ چار ہمارے ہاں پیو۔ سینما چلو، سرکس دیکھو وغیرہ وغیرہ — مجھے اُٹھنا پڑتا ہے اور انجم کو اطلاع دینی پڑتی ہے۔ وہ آتی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں کھلکھلا کر ہنستی ہیں اور میں اپنی قسمت پر آنسو بہاتا ہوں۔

لیاقت :- تو آپ اسے بند کیوں نہیں کروا دیتے۔

وحشی :- ارے یہی تو رونا ہے، روز اسی بات پر لڑائی ہوتی ہے۔ چھ مہینے سے یہی ہماری زندگی ہے — ہائے۔ ہائے تم نہیں جانتیں لیاقت — مگر دیکھو ہمارا کہا مانو — کبھی شادی نہ کرنا۔ شادی عذاب ہے۔ خدا کا قہر ہے۔ انسان کی انفرادیت کو تباہ کر دیتی ہے۔

لیاقت :- (جلدی جلدی لکھتے ہوئے) اور — اور ——

وحشی :- یہ کیا کر رہی ہو،

لیاقت :- اپنی کتاب ''شادی کی اونچ نیچ'' میں آپ کی رائے لکھ رہی ہوں۔

وحشی :- کیا ابھی تک یہ کتاب شائع نہیں کی ؟

لیاقت :- نہیں ابھی پوری نہیں ہوئی۔

وحشی :- لیکن مسالہ تو کافی فراہم ہو گیا ہوگا۔

لیاقت:۔ ہاں ہاں مگر ابھی "اونچ" کا حصہ ذرا کمزور ہے۔ "نیچ" کیلئے تو کافی مواد ہاتھ لگ چکا ہے۔

وحشی:۔ خیر۔۔۔ کیا بتاؤں لیاقت۔ بعض دفعہ تو ایسا دم۔ بولاتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنا گلا گھونٹ ڈالوں۔ چند سیکنڈ کا بھی سکون مجھے میسّر نہیں۔۔۔ کیسا کیسا میں تڑپتا ہوں ایک چھوٹے سے پُرسکون جھونپڑے کے لئے جو کسی سنسان جنگل میں۔۔۔ (ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے) اوہ! دم غضب میں ہے۔ کون ہے۔ بولو۔ ہاں۔ بولتے کیوں نہیں۔۔۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔۔۔ اُلو پٹھے۔۔۔ بات تیری کی۔۔۔ (زور سے رسیور پٹختا ہے) دیکھا تم نے؟ کیا میں نے جھوٹ کہا تھا۔۔۔ لیاقت سچ سچ بتاؤ۔ کیا میں خبطی ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں۔ کیا میں اپنے حواس کھو چکا ہوں؟

لیاقت:۔ نہیں نہیں!

وحشی:۔ نہیں۔ میں پاگل ہوں۔ لیاقت سچ سچ میرے حواس بجا نہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے انجم کو خوش رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان کے ہر حکم کو بہ تسلیم بجالایا۔۔۔ ہر کام ان کی مرضی کے موافق ہوتا تھا۔ میرا کمرہ تک ان ہی کے مذاق کے مطابق سجایا گیا۔۔۔ میں اس میز کو کھڑکی کے قریب رکھنا چاہتا تھا تاکہ ذرا ہوا آتی رہے۔ مگر انجم یہاں بیچ میں رکھنا چاہتی تھیں میں سبز رنگ کے پردے چاہتا تھا۔ وہ آسمانی رنگ کے میں چاہتا تھا کہ یہ صوفہ اُدھر ہو مگر نہیں حکم ہوا کہ یہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہے۔ مجھے گلدستہ والے کشن ایک آنکھ نہیں بھاتے مگر۔ یہ دیکھو۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں ایک ٹیبل فین رکھا رہے مگر ان کا حکم نہیں ہوا، اس لئے اب میں پسینے میں نہاتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھا کہ مجھے اِس ستیاناسی کی جھنکاڑوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔۔۔

لیاقت:۔ یہ تو ٹھیک ہے وحشی صاحب۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود شادی کی کچھ نعمتیں بھی ہیں۔ چند ایسی برکتیں۔۔۔

وحشی:۔ برکتیں!! میں ہرگز نہیں مان سکتا۔

لیاقت:۔ سُنیئے۔ (اپنی کتاب میں سے پڑھتی ہے) چند "اونچیں" ملاحظہ ہوں۔

(۱) عیش و آرام دُکھ درد کا ایک مستقل ساتھی ملجاتا ہے۔

(۲) مصروفیتیں اس درجہ بڑھ جاتی ہیں کہ فضولیات میں پڑنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔
(۳) انسان کو . . . .

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وحشی جھنجلا کر اٹھتا ہے)

وحشی :۔ نمبر تین۔ انسان کو ٹیلیفون جیسی نعمت غیر مترقبہ ملتی ہے۔ جی۔ ہاں۔ میرا ہی نام وحشی ہے۔ اچھا۔ اچھا۔ بیگم رفیق ہیں۔ جی ہاں انجمن یہیں ہیں۔ نہیں وہ ٹیلیفون پر نہیں آسکتیں۔ جی ہاں۔ ہم جلدی ہی علیحدگی اختیار کریں گے۔ اچھا ہو گا نا؟

(زور سے ریسیور رکھتا ہے، انجمن داخل ہوتی ہے)

انجمن :۔ میرا خیال ہے میں نے ٹیلیفون کی آواز سنی تھی۔

وحشی :۔ ہرگز نہیں۔

انجمن :۔ لیاقت، کیا ابھی گھنٹی نہیں بجی تھی ________

وحشی :۔ کہاں بجی تھی لیاقت؟

لیاقت :۔ نہیں، نہیں بجی!

انجمن :۔ خیر۔ اب اگر بجے تو مہربانی فرما کر مجھے بلا لیجئے گا۔ بیگم رفیق ضرور ٹیلیفون پر بلائینگی (لیاقت کی طرف گھورتی ہوئی جاتی ہے)

وحشی :۔ جو حکم ـــ معلوم ہوتا ہے انجم نے سب سے کہدیا۔ کتنی ذلیل بات ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑے غیروں تک پہونچیں۔ میں نے سوائے ناز صاحب۔ مجنوں صاحب اور بہروش صاحب کے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ . . . . (حشمت داخل ہوتی ہے)

حشمت :۔ میاں وحشی! کیا تم کسی طرح بھی مصالحت پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

وحشی :۔ نہیں اماں جان۔ جب تک کہ یہ ٹیلیفون یہاں سے نہ ہٹایا جائے میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کروں گا۔

حشمت :۔ اس کو تو انجمن کبھی منظور نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں وہ کہتی ہے کہ چونکہ بہت سے لوگوں کو بتا چکی ہے۔ اس لئے اب کسی طرح بھی اس ارادے سے باز نہیں رہ سکتی۔ لوگ اسے جھوٹا ـــــ آچھیں ں ں ں!!

وحشی :۔ لیاقت تم ہی کچھ سوچو۔ کوئی عمدہ تدبیر نکالو۔

لیاقت :۔ آہ ! تدبیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حشمت :۔ اللہ ! کیسا زمانہ آگیا مجھے تو یہ خیال کھائے جاتا ہے کہ تُو افیمن کیا کیا نہ کہیں گی ـــــ جاؤں پھر اُس ضدّن سے مغز ماروں (جاتی ہے)

(چند سیکنڈ خاموشی)

لیاقت :۔ وحشی صاحب ایک ترکیب ہے ۔

وحشی :۔ خدا تمہاری عمر میں برکت دے ۔ بتاؤ جلدی کیا تدبیر ہے ۔

لیاقت :۔ آپ جانتے ہیں کہ انجمن میں حسد کا مادّہ بہت ہے ۔

وحشی :۔ ہاں ہاں لیکن مگر ـــــ تمہارا مطلب ؟

لیاقت :۔ دیکھئے تدبیر یہ ہے ۔ شاید تیر نشانے پر بیٹھے ۔ آپ اس کمرے کے فرنیچر کو اپنی مرضی کے مطابق لگا لیجئے ـــــ

وحشی :۔ پھر اس سے فائدہ ؟

لیاقت :۔ فائدہ یہ کہ انجمن یہ دیکھکر جل ہی تو جائے گی اور ممکن ہے وہ دوبارہ اسے اپنی مرضی کے مطابق آراستہ کرنے کے لئے ٹھیر جائے ۔

وحشی :۔ ہوں ! شاید ۔

لیاقت :۔ تو پھر جلدی کیجئے ـــــ آئیے ـــــ

(دونوں فرنیچر کی الٹ پلٹ میں تن دہی سے مصروف ہو جاتے ہیں)

وحشی :۔ میز یہاں کھڑکی کے پاس رہے گی ۔ ٹھیک ہے نا ۔

لیاقت :۔ اور اس ٹیلیفون کو یہاں رکھئے بند کرکے ۔ وہ اگر پوچھے تو کہہ دیجئے گا کہ اب ہمیشہ کے لئے یہ یہیں رہے گا ۔

وحشی :۔ انجم کیا کر رہی ہیں ؟

لیاقت :۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس وقت تک اس کمرے میں نہیں آؤں گی جب تک آپ چلے نہ جائیں گے ۔

وحشی :۔ یہ صوفہ یہاں رہے گا ۔

لیاقت :۔ آئینہ کا یہاں کیا تُک ہے ؟

وحشی :۔ پھینکو اسے ۔ اور یہ چپل ـــــ یہ موزے ـــــ چھتری سب انجم کے کمرے میں پھینک آؤ ۔

لیاقت :۔ یہ تصویریں بھی مینٹل پیس پر نہیں رہنی چاہئیں۔

وحشی :۔ اگر انجم جانتیں کہ شاعر کسے کہتے ہیں۔ لیاقت، کیا میں نے تمہیں اپنی نئی غزل نہیں سُنائی ــــــــــ

حشمت :۔ (داخل ہوکر) آچھیں ل ل ل !!

لیاقت :۔ بس اب ٹھیک ہوگیا۔ خالہ جان۔ اب چلئے انجمن آرام جیسے ہی اس کمرے میں آجائے ہم چھلدیں گے ــــــــ

حشمت :۔ مگر ــــــــ

لیاقت :۔ آپ مانیئے تو میں نے تدبیر بڑی اچھی سوچی ہے۔

حشمت :۔ سچ !!؟

لیاقت :۔ (انجمن کو آواز دیتی ہے) انجمن !! اب ہم جا رہے ہیں۔

انجمن :۔ (داخل ہوتے ہوئے) او ہو ــــ یہ کیا ــــ؟؟

لیاقت :۔ وحشی صاحب نے اس کمرے کو اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک کیا ہے۔

وحشی :۔ اب یہ کمرہ ایسا ہی رہے گا۔

انجمن :۔ ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب ہے آپ مجھے جلد سے جلد یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔

وحشی :۔ میں مطلب وطلب کچھ نہیں جانتا، میرا گھر ہے چاہے جس طرح رکھوں۔

انجمن :۔ خیر مجھے کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاعر لوگ اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ مگر ــــــــ

وحشی :۔ مذاق !! تم کیا جانو مذاق کسے کہتے ہیں ــــ تم تو یہ بھی نہیں جانتیں کہ شاعر کسے کہتے ہیں۔

انجمن :۔ میں اس داستان کو ہزاروں مرتبہ سُن چکی ہوں۔

حشمت :۔ آچھیں ل ل !!

وحشی :۔ جب وہ منحوس ٹیلیفون یہاں نہ ہوگا تو میں کیسے سکون کے ساتھ . . . .

انجمن :۔ ٹیلیفون !! اوہ خوب یاد آیا مجھے بیگم رفیق کو ٹیلیفون کرنا ہے ــــ ارے۔ کہاں گیا؟

وحشی :۔ جہنم میں۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اس الماری میں بند رہے گا۔

انجمن :۔ خیر، کوئی مضائقہ نہیں ——مجھے کیا۔ میں جا رہی ہوں —میں جاتی ہوں ——
ابھی (کھٹ پٹ کرتی ہوئی اپنے کمرے میں جاتی ہے)۔

حشمت :۔ آہ! ——!!

لیاقت :۔ چلئے خالہ جان!

انجمن کی آواز :۔ میرا خیال تھا کہ آپ پشیمانی کا اظہار کر کے مجھے مجبور کر دیں گے کہ میں اپنے ارادہ سے باز رہوں۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ بات زیادہ نہ بڑھے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ آپ تو میرے جانے سے خوش ہیں۔ اتنے خوش کہ کمرے کو کباڑیئے کی دوکان بنا رہے ہیں اور خود ایک کمینے پیشہ ور کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر مجھے کیا ضرورت میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ خوشامد کروں ——میری چھتری کہاں ہے (بکسوں اور ٹرنکوں کی کھڑ بڑ کی آوازیں آتی ہیں)۔ میں ایک منٹ کو بھی اس ناپاک گھر میں نہیں رہنا چاہتی ——شاعر بنے پھرتے ہیں صاحب ——تمیز نہیں ——میرا ہی دم تھا کہ اتنے دن ساتھ گذار دیئے اور کوئی سی ہوتی تو . . . .

وحشی :۔ خدا کے واسطے چپ رہو۔ میں اس بکواس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

حشمت :۔ ہائے رے میرا دل ——لیاق ——

لیاقت :۔ اوہو خالہ جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ ایسی بات نہیں سن سکتیں۔ ہم جاتے ہیں وحشی صاحب۔ خدا حافظ۔

انجمن کی آواز :۔ خوب پھل پایا، میں نے شادی کر کے۔ اگر یہ خبر ہوتی کہ ایک وحشی شاعر کے پالے پڑوں گی تو ——

وحشی :۔ خدا حافظ لیاقت ——کیوں اماں جان کیسی طبیعت ہے؟۔

حشمت :۔ بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے غش آنے والا ہے ——چل بچی ——خدا تمہیں نیکی کی ہدایت دے۔

لیاقت :۔ میں پھر آؤں گی وحشی صاحب ——آداب ——

(دونوں جاتی ہیں۔ وحشی چپ چاپ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے، ایک منٹ تک مستقل خاموشی رہتی ہے۔ انجمن نئی ساری باندھے۔ چھتری ہاتھ میں لئے آہستگی سے داخل ہوتی ہے)

انجمن:۔ (نرم لہجے میں) اوہ! آپ بالکل اکیلی ہیں۔ وہ لوگ کہاں گئے۔
وحشی:۔ گئے۔
انجمن:۔ گئے!! انہیں کم از کم میرا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔
وحشی:۔ انجم! کیا تم اپنا ارادہ نہیں بدلو گی۔
انجمن:۔ کس شرط پر؟ بتایئے؟؟
وحشی:۔ ٹیلیفون ڈرائنگ روم میں رکھا جائے گا۔
انجمن:۔ ہرگز نہیں!
وحشی:۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں (صوفے پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ انجمن دروازے تک جاتی ہے۔ دروازے کے باہر اپنی چپل دیکھ کر اُسے اُٹھاتی ہے۔ زور سے دروازہ بند کرتی ہے اور اپنی چپل کو چُپ چاپ الماری کی دراز میں رکھتی ہے، چاروں طرف متوحش نظروں سے دیکھتی ہے۔ پھر وحشی کے قریب آتی ہے)۔
انجمن:۔ (نہایت میٹھے لہجے میں) خدا حافظ، وحشی صاحب!!
وحشی:۔ (چونک کر) اوہ! میں سمجھا تھا تم چلی گئیں — خدا حافظ۔
انجمن:۔ خدا حافظ (چند سیکنڈ کی خاموشی) یہ لوگ کدھر گئے ہیں؟
وحشی:۔ اماں جان بے ہوش ہونا چاہتی ہیں، لیاقت انہیں گھر لے گئی ہیں۔
انجمن:۔ لیاقت سے زیادہ دخل در معقولات کرنے والا میں نے کسی کو نہ دیکھا۔
وحشی:۔ کیا اس لئے کہ وہ اماں جان کو گھر لے گئی ہیں؟
انجمن:۔ آپ غور کیجئے۔ اس لڑائی کا بیج کس نے بویا — اسی فتنہ پرداز لیاقت اُرائنہ۔
وحشی:۔ کیا واقعی؟
انجمن:۔ اور کیا۔ اُسے لڑائی ڈلوانے میں مزہ آتا ہے — جب یہ لوگ صبح کو آئے تھے تو میں سچ کہتی ہوں۔ میرا لڑنے کا ذرا بھی ارادہ نہیں تھا مگر اُسی سیہ کا کاشا لیاقت نے آگ لگائی۔
وحشی:۔ آخر کیا کہا؟
انجمن:۔ ارے ایک سے ایک بات، کہنے لگی، تمہارے میاں کیا جانیں لکھنا، اِدھر اُدھر کے شعر چرا لیتے ہیں۔

وحشی :۔ (غضبناک ہوکر) بڑی نامعقول ہے وہ۔ میں مزہ چکھادوں گا۔
انجمن :۔ اور کہنے لگی کہ تمہارے میاں ذرا بھی خوبصورت نہیں۔ بہن یہ تمہارا ہی دم ہے جو اُن سے محبت کرتی ہو۔
وحشی :۔ انجم، تمہارا شکریہ ـــ تم واقعی بہت نیک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آخر یہ لوگ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے ـــ اور اماں جان بھی ایسی ہی ہیں۔
انجمن :۔ اماں جان نے کیا کہا؟
وحشی :۔ کہنے لگیں کہ جب تم لوگ پیار محبت سے نہیں رہ سکتے، تو شادی ہی کیوں کرتے ہو۔
انجمن :۔ ضرور ـــ انہوں نے ضرور یہی کہا ہو گا۔
وحشی :۔ میں نے کہا نہیں اماں جان! قصور تو میرا تھا ـــ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ہمارے معاملوں میں دخل نہ دیں۔ تو ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔
انجمن :۔ واقعی۔ مگر یہ لوگ ہمیں خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتے ـــ دیکھ لیجئے نا۔ لیاقت نے آتے ہی لڑائی ڈلوادی۔
وحشی :۔ ہاں۔ مجھے بھی یاد آیا۔ سامان کو الٹ پلٹ کرنے کی صلاح بھی مجھے لیاقت ہی نے دی تھی۔
انجمن :۔ میرا پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ اُسی کی شرارت ہے۔
وحشی :۔ میں نے اس کی خوشامد کی۔ اس سے التجا کی کہ ایسا نہ کرو مگر اُس نے ایک نہ مانی میں نے کہا کہ انجم اس سے بہت ناراض ہوں گی مگر وہ بھلا کیا مانتی تھی۔ خود ہی اُٹھ کر چیزوں کو تتر بتر کرنا شروع کر دیا۔
انجمن :۔ میں کہتی ہوں اُسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اسباب کا کیا ہے، ذرا سی دیر میں پھر اُسی طرح رکھا جا سکتا ہے۔
وحشی :۔ ہاں۔ اور کیا۔
انجمن :۔ (اُٹھتے ہوئے) مثلاً یہ تصویریں پھر مینٹل پیس پر رکھی جا سکتی ہیں،
وحشی :۔ (اُس کی مدد کرتے ہوئے) ضرور!
انجمن :۔ اور یہ صوفہ ذرا سے اشارہ سے پھر یہاں آسکتا ہے۔
وحشی :۔ کیوں نہیں (صوفے کو گھسیٹ کر پہلی جگہ رکھتا ہے)۔

انجمن :- اور یہ میز (دونوں میز پکڑواکر پھر کمرے کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں) گو میں یہاں نہیں رہوں گی۔ لیکن اس خیال سے ذرا سی خوشی حاصل ہوگی کہ آپ نے کمرے کی چیزیں اسی طرح رہنے دی ہیں۔

وحشی :- میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کمرے کو اسی طرح رہنے دوں گا۔

انجمن :- آپ کا شکریہ۔ فی الحقیقت ہم دونوں ایسے بُرے نہیں ہیں یہی لوگ آکر ہمیں لڑوا دیتے ہیں۔

وحشی :- ہاں ان لوگوں کو ذرا بھی تمیز نہیں ______

انجمن :- اور یہ چپل یہاں رکھ دینی چاہیئے تاکہ ہمیشہ آپ کی نظر کے سامنے رہے، اور آپ کے دل میں میری یاد تازہ رہے۔

(وحشی ادب کے ساتھ چپل کو سامنے کی کھڑکی کی سل پر رکھتا ہے)

انجمن :- خواہ مخواہ لیاقت نے بات بڑھوائی۔ میں نے سب سے ذکر کر دیا۔

وحشی :- ہاں، ناحق بات بڑھی۔ اور پھر مزا یہ کہ یہ لوگ پھر بھی الگ کے الگ ہیں۔ انہیں ہمارے دکھ سکھ سے غرض ہی کیا؟

انجمن :- یہی تو رونا ہے۔ " بھس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی " (کشن صوفے پر سلیقے کے ساتھ رکھ کر) میرا خیال ہے کہ اب سب ٹھیک ہو گیا، وعدہ کیجیے کہ آپ اس کمرے کو جوں کا توں رہنے دیں گے۔

وحشی :- میں وعدہ کرتا ہوں۔ پیاری انجم !!

انجمن :- آپ کا بہت سا شکریہ ______ آج کتنی زبردست ٹریجیڈی ہوتی سب کو رنج ہوگا سوائے لیاقت اور اماں جان کے ___ یہ لوگ تو دل ہی دل میں خوش ہونگے۔ ______ دوسروں کو تباہ حال دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں ______ اگر آپ اجازت دیں تو میں ٹیلیفون بھی نکال کر رکھ دوں (الماری میں سے ٹیلیفون نکال کر رکھتے ہوئے) کم از کم تین روز تک تو اسے یہیں رہنے دیجیے گا۔ میری یاد میں۔

وحشی :- (ٹیلیفون کو چومکر) ضرور پیاری انجم ______ انجم ایک بات کہوں۔ ہم آخر ان لوگوں کو ہنسنے کا موقع دیں ہی کیوں؟

انجمن :- ہاں واقعی ______ آخر کیوں ہمارا دل جلا کر ہمیں تباہ کر کے خوش ہوں۔ یہ لوگ

ہرگز خوشس ہونے کے لائق نہیں ہیں۔

وحشی :۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو انجم ——— آؤ ملاپ کرلیں۔ (انجمن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے)۔

انجمن :۔ (خود بخود وحشی کی طرف کھچتے ہوئے) کیا مضائقہ ہے۔ ان دونوں کو اسی طرح سزا دی جا سکتی ہے۔

وحشی :۔ ——— انجم پیاری ——— دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جُدا نہیں کرسکتی۔

انجمن :۔ یقیناً !!

(دونوں گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں۔
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے۔)

وحشی :۔ (تڑپ کر) اُف ——— یہ منحوس پھر !!!

انجمن :۔ (نرمی سے) میں اِسے کل ہی ڈرائنگ رُوم میں رکھوا دوں گی ضرور ٭

انصار ناصری کے اس ڈرامے کو بجا طور سے آج کی ریڈیو جھلکی کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ اسٹیج ڈرامے اور ریڈیو ڈرامے میں ایک بنیادی فرق میڈیم کی وجہ سے یہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے میں کردار زیادہ نہیں ہوسکتے، مخصوص حالتوں کو چھوڑ کر اور مخصوص حالتوں میں بھی خاص کردار چند ہی ہوتے ہیں باقی کردار آتے جاتے رہتے ہیں خاص کرداروں اور پلاٹ کو اجاگر کرنے کے لئے۔

ڈرامے میں کردار اپنی زبان بولتے ہیں، مصنّف کی نہیں۔ مصنّف اپنے کرداروں کو جانتا ہے، اہمیت اس بات کی ہے۔ یہ بالکل بے تعلق اور بے معنی سی بات ہے کہ مصنّف کس فرقے سے ہے۔ اردو کے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں۔ دونوں اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ یہ لسانیات کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ مذہبی گروہ سے تو کیا، نسل سے بھی زبان کا تعلق نہیں ہوتا۔ ذوالفقار ماضی اور حال کے اُردو ادب، اور اردو ادب کی شخصیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ رتن ناتھ سرشار، چکبست، دیا شنکر نسیم، درگا سہائے سرور، پریم چند ——— اور اپنے ہم عصروں میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کے بارے میں

اچھی طرح جانتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے لکھا[1]

"سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مختصر ڈرامے لکھے کون ؟ ان ڈراموں کو پیش کون کرے۔ ڈراموں میں پارٹ کون کرے ؟ یہ ڈرامے لکھے گئے، اور اردو میں لکھے گئے۔ اس لئے لازم آیا کہ وہی لوگ ڈراموں کے متعلق کام کریں جو اردو زبان کی نوک پلک اور اُردو ادب سے واقف ہیں۔

وہ اُردو ہی کیا جس میں عربی اور فارسی کی چاشنی نہ ہو۔ اردو ادب سے واقفیت صرف ان لوگوں کو ہو سکتی ہے جو عربی و فارسی میں بھی کچھ دسترس رکھتے ہوں۔ ان تمام ضروریات کو دیکھا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کام مسلمان نسبتاً بہتر کر سکتے ہیں۔ اردو کے ضمن میں فارسی عربی کی شد بد رکھنے والے کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

جہاں اردو کا کوئی کام ہو، نظرِ انتخاب عام طور پر مسلمانوں ہی پر پڑتی ہے۔ چنانچہ پروگرام کے کام کے لیئے زیادہ تر مسلمان ملازم رکھے گئے۔"

ایک انتہائی قبیح کام کے لیے اتنا ہی قبیح اور ناقابلِ قبول جواز تراشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوالفقار ایسے باشعور اور ذی علم، ہوشمند فنکار سے یقیناً اس کی توقع نہ تھی۔ ذوالفقار اپنے بڑے بھائی احمد شاہ بخاری، اور خود اپنے غلط فیصلوں کی وکالت کی دُھن میں، ڈرامے کے سلسلے میں یہ بنیادی بات بھول گئے کہ ڈرامے میں کردار فارسی اور عربی داں اردو کے ادیب کی زبان نہیں، اپنی زبان بولتے ہیں۔

ہر تحریر یا تقریر کا مقصد یا تو کسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، یا کسی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ ذوالفقار نے بھی ایک حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ ہے ہندوستانی بی بی سی۔ فیلڈن بڑے چاؤ سے بخاری برادران کو ریڈیو میں لایا تھا۔ اور اس کے عوض اسے کیا ملا ؟ خود فیلڈن کے الفاظ میں[2]

---

[1] سرگزشت ؛ ص 119۔

[2] The Natural Bent : Lionel Fielden P.194-95

Impressed by Zulfaqar Bukhari, I had jumped to the conclusion that his brother, the Professor, would be no less valuable. When it became obvious that a Deputy Director was necessary (particularly when I was on tour) I asked for the Professor. Zulfaqar warned me, with perfect good sense, that I was making a great mistake; his brother, he said, was a scholar who would hate the rough-and tumble of broadcasting, and I should run into great trouble by employing two brothers. But I had become dictatorial and I would not listen.

When Ahmed Shah Bokhari arrived, he had made up his mind about me, not quite correctly, he thought that I was a rather silly Englishman, and that he would succeed me, and he was correct on both points; he also thought that I should become a figurehead which he could control, and in this he was wrong. He started out by coming every evening to my house, and reading aloud to me from the English poets. Since I had selected and listened to the best English voices and intonation affected me like a piano out-of-tune. To escape, I ran away to the station and talked over, or listened to, programmes. There Ahmed Shah would

pursue me, and, coming into office or studio, would say to his brother 'Get Out', and would then sit in the chair opposite me and put his feet on the table. Since I had chosen him and he was my Deputy, I could not object. But a cold war developed, and I was no match for this Frrushchev. He was one of the wittiest men I have ever known, a brilliant conversationalist with a wide culture. Gradually I became aware not only that he was damning me with faint praise to all my Indian friends ('Poor Fielden, he means well, but of course he knows so little about India, and he thinks you are a damn fool') but also that he was carrying tales about me to Government of India ('Fielden has just been to see Gandhi; Fielden has had a secret meeting with Nehru; Fielden loathes Viceroy'). When I taxed him with these things, his tears would drip on my blotting-pad, and for a while they convinced me; but soon there was incontrovertible evidence of his attitude. And there arose a Whispering Scandal, which I don't doubt originated from him. It was said that AIR should be rechristened the BBC - the Bokhari Brothers Corporation. This, though only a whisper, was damaging...

اس موضوع پر ذوالفقار لکھتے ہیں [1]

" . . . . فیلڈن کو سخت ندامت ہوئی۔ آخر دوڑ دھوپ کے بعد سیٹھنا کو واپس بمبئی بھیجا، مجھے دہلی کا اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر کیا، اور بھائی صاحب (احمد شاہ بخاری 'پطرس') کو ریڈیو کے صدر دفتر میں ڈپٹی کنٹرولر۔ بھائی صاحب کے اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہونے سے قبل مجھے ترقی دے کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنادیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بھائی اسٹیشن ڈائرکٹر، دوسرا بھائی اسسٹنٹ ڈائرکٹر۔ فیلڈن دونوں کا دوست، پھر کیا تھا۔ بی بی سی کے حروف کو نئے معنی پہنائے گئے، اور آل انڈیا ریڈیو کو بخاری برادرز کارپوریشن کا خطاب دیا گیا۔ اس خطاب کی ایجاد کا سہرا دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست کے سر ہے۔"

یہ بات اہم نہیں ہے کہ دیوان سنگھ مفتون نے خود یہ خطاب وضع کیا تھا، یا اس کے پیچھے ویسا ہی کوئی اشارہ بخاری برادران کا تھا، جیسا آل انڈیا ریڈیو کا نام رکھنے میں فیلڈن کا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ براڈ کاسٹنگ کے لیے بخاری برادران کی خدمات یاد رکھنے کے لائق ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کو پروگرام کاڈر کے دروازے غیر پنجابیوں کے لیے بند کر دیئے۔ شاہد احمد دہلوی، ایڈیٹر ساقی نے "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے" کے عنوان سے کئی مضامین اس سلسلے میں لکھے۔ محمد حسین آزاد کے پوتے آغا اشرف ایک منجھے ہوئے براڈ کاسٹر تھے۔ اسرار الحق مجاز بھی براڈ کاسٹنگ کے آغاز سے، بخاری برادران کے ورود سے پہلے ریڈیو میں تھے، اور فیلڈن سے قربت رکھتے تھے۔ بخاری برادران نے ان دونوں کا پتہ بھی صاف کرا دیا۔ ذوالفقار کا یہ کہنا کہ مسلمان ہی اردو ڈرامے لکھ سکتے تھے، قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ راجندر سنگھ بیدی کے "سات کھیل" ریڈیو کے آغاز کے زمانے کے ہیں۔ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک بھی سعادت حسن منٹو کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو دلّی کے عملے میں تھے۔ شروع ہی کے زمانے میں ہنس راج لوتھرا اور کرتار سنگھ دُگل بھی پروگرام اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ بخاری برادران نے عملے کے انتخاب میں پہلی ترجیح احمد شاہ بخاری کے شاگردوں کو

---

[1] سید ذوالفقار علی بخاری، سرگزشت، ص ۲۲۔

دوسری ترجیح اہلِ پنجاب کو دی۔ تیسری ترجیح کے لئے ضرورت ہی کم پیش آتی تھی۔

اُردو فارسی اور عربی کے رشتے کے بارے میں ذوالفقار بخاری نے پاکستان میں اپنے قارئین کے لئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہم صرفِ نظر کریں گے، کیونکہ واضح طور سے ان کا نظریہ نادرست ہے، اور پاکستان میں بھی اہلِ نظر اس سے بدحظ ہوں گے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ذوالفقار نے اردو کو ریڈیو ڈرامے کی صنف دی، اور آج اس کا اُردو ادب میں ایک اہم مقام ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس صنف پر گذرا، اور یہ آج بھی نہ صرف باقی ہے، بلکہ اس میں گوناگوں تجربے ہوئے۔ صرف ریڈیو ڈرامے کے موضوع پر لکھا جاتے تو دفتر درکار ہوں۔ صرف چند سنگ میل:

راجندر سنگھ بیدی:[1]

یہ سات ڈرامے اس میں شامل ہیں:

۱۔ چانکیہ ۲۔ تلچھٹ ۳۔ نقلِ مکانی ۴۔ دستک
۵۔ آج ۶۔ رخشندہ اور ۷۔ خواجہ سرا۔

راجندر سنگھ بیدی نے شروع میں یہ اعتراف بھی کیا ہے:

"اس مجموعے کے بیشتر کھیل مصنّف نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں لکھے ہیں۔ اس لئے انھیں کتابی صورت میں لاتے ہوئے، مصنّف اس ادارے کی اداب نوازی کا سپاس گذار ہے۔"

"تلچھٹ" کا مرکزِ خیال Pavalenko کی ایک کہانی سے لیا گیا ہے۔ ماحول اور کردار مقامی ہیں۔

کھیل "چانکیہ"، ماضی کے ایک تاریخی عہد کے کرداروں کو، اپنے ماحول میں پیش کرتا ہے۔ اس کی زبان، آج کی رائج زبان سے کچھ مختلف ہے، اور یہ ضروری ہے، ورنہ وہ تأثر پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا، جو مقصود تھا۔ پران تیاگ دیئے، سویرے، سمراٹ، جنسی، سندر، منشیہ، نیتی، اتہاس جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان الفاظ کے باوجود یہ

---

[1] راجندر سنگھ بیدی؛ سات کھیل (مکتبہ اردو لاہور) ۱۹۴۶ء۔

اردو کا کھیل ہے، کیونکہ اردو کا سلسلہ ویدک زبان تک ہے، اور تاثر پیدا کرنے کے لیے کسی خاص عہد کے ان الفاظ کا استعمال ضروری ہے، جو اس عہد میں رائج تھے، اور اُج متروک ہیں ۔

آخر میں چھپن لفظ، اور اُن کے ترجمے دیئے گئے ہیں

رسالوں میں بھی ریڈیو ڈرامے شائع ہوتے ہیں، اور مجموعوں کی صورت میں بھی۔ ایک عجیب بات ہے کہ ان میں ریڈیو کی ہدایت کے اشارے کم، اور منظر زیادہ بیان کئے گئے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ریڈیو ڈراموں کو جب کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے ادیب ناشروں کے پاس لے گئے، تو انھوں نے یہ شرط لگائی کہ اس میں اسٹیج کے لیے ہدایات بھی ہوں، تاکہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی انھیں کھیلا جا سکے۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو کی دو کتابیں ایسی ہیں، جو خالص ریڈیو کے اسلوب کی دین ہیں، اور ان کا شمار ادب میں ہوتا ہے۔ ریڈیو کے لئے مختصر ایک ایکٹ کے ڈرامے "اسکٹ" کہلاتے ہیں۔ "آؤ"[1] اردو میں اسکٹوں کا پہلا سیریل ہے۔

اس سیریل میں تین مستقل کردار ہیں۔ لاجونتی، کشور اور نرائن۔ باقی کردار، سچویشن کے مطابق آتے ہیں۔

ان ڈراموں کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے:

> "یہ ڈرامے روٹی کے اس مسئلے کی پیداوار ہیں، جو ہندوستان میں ہر اردو ادیب کے سامنے اس وقت تک موجود رہتا ہے، جب تک وہ مکمل طور پر ذہنی اپاہج نہ ہو جائے۔ میں بھوکا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ڈرامے لکھے۔ داد اس بات کی چاہتا ہوں کہ میرے دماغ نے پیٹ میں گھس کر یہ چند مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں، جو دوسروں کو ہنساتے ہیں، مگر میرے ہونٹوں پر ایک پتلی سی مسکراہٹ بھی پیدا نہ ہو سکی۔"

---

[1] سعادت حسن منٹو: آؤ : ۱۹۴۰ء

اس سیریل کی کڑیاں ہیں :

۱۔ آؤ سنو ۲۔ آؤ کہانی لکھیں ۳۔ آؤ تاش کھیلیں ۴۔ آؤ خط سنو
۵۔ آؤ کھوج لگائیں ۶۔ آؤ ریڈیو سنیں ۷۔ آؤ بحث کریں ۸۔ آؤ اخبار پڑھیں
۹۔ آؤ چوری کریں اور ۱۰۔ آؤ جھوٹ بولیں۔

زندگی کے عام کردار، اور زندگی کے عام مسائل، ان کے چھوٹے چھوٹے المیئے، اسلئے کہ بڑے المیے صرف بڑے آدمیوں کے ہوتے ہیں ـــــ اور انسان کتنا ظالم ہے کہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہنستا ہے، جس طرح کیلے کے چھلکے پر پاؤں پڑ کر پھسلنے سے کوئی گرتا ہے، تو دیکھنے والے ہنستے ہیں۔ منٹو نے المیہ کرداروں کی بپتا پیش کی ہے۔ اگر ہمیں ہنسی آتی ہے، تو ہمیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیئے۔

منٹو نے کچھ معروف ہستیوں کے آخری وقت کی کچھ جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ ریڈیو فیچر کا اسلوب انہی سے وجود میں آیا ہے[۱]۔ یہ بھی ایک سیریل ہے، اور اسے ہم ریڈیو فیچروں کا سیریل کہہ سکتے ہیں، جیسے "آؤ" ریڈیو جھلکیوں کا سیریل ہے۔ ظاہر ہے "جنازے" میں کردار ہر کڑی میں مختلف ہیں :

جنازے کے دیباچے میں منٹو نے لکھا ہے :

> "زندگی موت کا دیباچہ ہے۔ اس مجموعے کے مضامین، جنھیں ریڈیو کی اصطلاح میں فیچر کہتے ہیں، چند دیباچوں کی اختتامی سطور ہیں۔ کیا عجب ان کو پڑھ کر آپ کو مرنے کا سلیقہ آجائے۔"

جن کی موت کے بارے میں یہ فیچر ہیں، وہ ہیں :

۱۔ چنگیز خاں ۲۔ تیمور ۳۔ قلوپطرہ ۴۔ نیپولین ۵۔ بابر ۶۔ شاہجہاں
۷۔ ٹیپو شہید اور ۸۔ راسپوٹین

ریڈیو کے دورِ اوّل کے ڈرامہ لکھنے والوں میں رفیع پیرزادہ، جو رفیع پیر کے نام سے مشہور تھے، سیّد امتیاز علی تاج، سیّد عابد علی عابد، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، میرزا ادیب، سیّد انصار ناصری، فضلِ حق

---

[۱] سعادت حسن منٹو : جنازے

قریشی وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر[1] اور ہریش چند کھنہ[2] نے اپنی کتابوں میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہریش چند کھنہ آل انڈیا ریڈیو کے دورِ اوّل میں کنٹرول آرٹسٹ کی حیثیت سے آئے، پھر پروگرام اسسٹنٹ رہے، آئی اے ایس میں آئے، وزارت میں ڈپٹی سکریٹری رہے، اور کچھ اور عہدوں سے ہوتے ہوئے دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔ اخلاق اثر ادیب ہیں، اور بھوپال میں ریڈیو سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

میرزا ادیب نے پرانی یادیں یوں تازہ کی ہیں:[3]

"سید امتیاز علی تاج کا کھیل قرطبہ کا قاضی پیش ہوا، اور ہر جگہ اس کی دھوم مچ گئی۔ برصغیر کے گوشے گوشے سے اس کی فرمائشیں آنے لگیں۔ سید عابد علی عابد نے دو فیچر لکھے۔ دلی کا قتلِ عام اور روپ متی باز بہادر۔ سننے والوں نے انتہائی مسرت سے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان فیچروں میں امیر خاں اور پنڈت وینا ناتھ زتشی کی آواز نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ ان تخلیقات کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہر روز انھیں بار بار (نشر) کرنے کی فرمائش خطوں کے ذریعے کی جاتی تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب رفیع پیرزادہ نے اپنا پنجابی میں لکھا ہوا کھیل اکھیاں آوازوں میں منتقل کیا تو قبولیتِ عام کے کم و بیش تمام پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ جب یہ کھیل پہلی مرتبہ نشر ہوا تو اس میں غالباً رفیع پیر کے ساتھ شمشاد بیگم، اور اقبال شیخ نے پارٹ ادا کئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریڈیو سے رفیع پیر کا ایک اور بڑا مقبول کھیل نشر ہوا تھا، جس کا نام تھا عقاب یہ دوسری جنگِ عظیم کے ایک خاص واقعے کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔"

رفیع پیر کے جو اور ڈرامے مقبول ہوئے، ان میں "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار" اور "ورجینیا" ہیں۔[4]

---

[1] اخلاق اثر: ریڈیو ڈرامے کا فن، اور، ریڈیو ڈرامے کی اصناف

[2] ہریش چند کھنہ: ریڈیو ناٹک (آتمارام اینڈ سنز)۔

[3] میرزا ادیب: پیر جی (مشمولہ "جریدہ" پشاور ۱۹۸۶) ص ۱۷۰۔

[4] ڈرامہ نمبر "آج کل" بابت جنوری ۱۹۵۹۔

شروع میں آغا حشر کے ڈراموں کے ریڈیو روپ تیار کیے گئے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کے علاوہ یونانی ڈرامے، جن کے ترجمے انگریزی میں فراہم تھے، ان کے ترجمے کیے گئے۔ فضل حق قریشی کا ڈرامہ "ممتا" ایک ہسپانوی کہانی پر مبنی ہے۔ ان کا ایک کھیل "نرگس اور اقرار" اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا۔ قمر جمالی نے شیکسپیر کے "مرچنٹ آف وینس" کا اور اویس احمد ادیب نے "فسانۂ آزاد" کے ایک حصے کو ریڈیو ناٹک کا روپ دیا۔

ریڈیو ڈراموں کی دنیا میں ایک بہت اہم نام شوکت تھانوی کا ہے۔ وہ بے ضرر قسم کا طنز و مزاح لکھتے تھے۔ ان کی طویل کہانی یا ناولٹ "سودیشی ریل" نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت پائی۔ سوتیا چاہ، بُر بس اور خانم خاں جیسے ناول بھی بہت مقبول ہوئے۔ شوکت تھانوی لفظوں کے ہیر پھیر سے نہیں، بلکہ سچویشن سے مزاح پیدا کرتے تھے۔ جب لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو وہ عملے میں لیے گئے، اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے۔ بچوں کے لئے لکھنا شاید سب سے بڑا مشکل فن ہے۔ ہر شخص کو بچہ ہونے کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے، پھر بھی وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کبھی بچہ تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ ہر بچہ اپنے کسی نہ کسی بزرگ کی نقل کرتا ہے۔ شوکت تھانوی نہ صرف بچوں کے پروگرام کے لئے لکھتے تھے، بلکہ اس پروگرام میں بدھو کا کردار بھی ادا کرتے تھے، اور یہ کردار اس پروگرام کی سب سے بڑی جاذبیت تھا۔ یہ نہایت مشکل رول تھا، کیونکہ وہ لوگ بھی، جو عملی زندگی میں واقعی بدھو ہیں شعوری طور پر بدھو بننا ہو تو بقراط بن جاتے ہیں۔ بدھو کے رول سے ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے منشی جی کا کردار تراشا، جو بے حد مقبول ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد جب وہ پاکستان گئے تو ریڈیو پاکستان کے قاضی جی ہو گئے۔ یوں بھی ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد، منشی پاکستان میں قاضی جی ہو گئے۔ بظاہر شوکت تھانوی بے ضرر قسم کا مزاح لکھتے تھے، لیکن حقیقتاً کوئی نہ کوئی سماجی مسئلہ اُن کی تحریر کا محرک ہوتا تھا۔ ریڈیو کے لیے لکھے گئے ان سیریلوں کا مقام، شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ناولوں سے کم ادبی حیثیت کا نہیں ہے۔ ان سیریلوں نے اردو ادب کو ایک جاندار صنف بھی دی۔

کرشن چندر، ریڈیو کے عملے میں شامل ہونے سے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہی نہیں، مقبول بھی ہو چکے تھے۔ ادب کی دنیا سے جو لوگ ریڈیو میں آئے،

ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ن م راشد، سید انصار ناصری اور اوپندر ناتھ اشک وغیرہ تھے۔ راشد نے ادبی شخصیت کو ریڈیو سے الجھنے نہیں دیا۔ منٹو نے ریڈیو کو بہت کچھ دیا، لیکن محسوس کیا کہ ان کی ادبی شخصیت رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی، اس لیے وہ اس دنیا سے الگ ہو گئے۔ انصار ناصری سے اردو فکشن کو جو توقعات تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں، کیونکہ وہ "فنا فی الریڈیو" ہو گئے۔ اشک بہت سمجھدار تھے، اور ریڈیو میں ایسے بلند پایہ سمجھدار کی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کی سمجھداری کی وجہ سے منٹو ہی کو نہیں، خود انھیں بھی ریڈیو سے الگ ہونا پڑا۔ کرشن چندر ادب کو قدرِ اوّل سمجھتے تھے۔ انھوں نے بس ریڈیو میں اپنے دن پورے کیے، اور جب محسوس کیا کہ یہ ان کو نگل جائے گا، ان معنوں میں کہ اُن کے قلم کو آزادی اور بے باکی تیاگ دینا ہوگی، تو انھوں نے بھی ریڈیو سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کرشن چندر نے ریڈیو کے لیے، بلازمت کے دوران بھی لکھا، اور ریڈیو سے باہر آنے کے بعد بھی۔ لیکن انھوں نے بہت گمبھیر دھیان ریڈیو کے لئے تحریروں پر نہیں دیا۔ وہ کرشن چندر جس کے شاعرانہ نثری اسلوب میں اردو افسانے کو ایک نیا رنگ ملا تھا، اس کے پہلے دور کے ریڈیائی ڈرامے حجامت اور نیل کنٹھ کچھ ایسے قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ اُن کا ڈرامہ سرائے کے باہر بہت مشہور ہوا۔

ریوتی سرن شرما، جو ریڈیائی ڈرامہ کے فن پر عبور رکھتے ہیں، اور ان کی رائے کو مستند ہونا چاہیے، کہتے ہیں "سرائے کے باہر ڈرامے میں ان کی ادبی شخصیت کی چھاپ نے اس ڈرامے کو ریڈیو ڈرامائی ادب کا ایک نادر نمونہ بنایا۔ اس میں اُن کا شاعرانہ اندازِ بیان، ان کا سماجی شعور، اور اُن کا سیاسی رجحان ابھر کر آیا ہے۔ اور یہ ڈرامہ سماجی استحصال اور (دل میں) سلگتی بغاوت کا آئینہ دار ہے۔ اس کا کردار شاعر، کرشن چندر کا کردار ہے۔"[1]

ریوتی کے تاثر سے اتفاق کرنے میں کچھ تردد ہے۔ سرائے کے باہر پڑھیں تو یہی تاثر ہوتا ہے، لیکن ریڈیو ڈرامہ بنیادی طور سے سننے کے لئے ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کو سنتے وقت ذہن کو جھٹکے لگتے ہیں کہ وہ کردار بھی نفیس لکھنوی اردو بولتے ہیں، جنھیں نہیں بولنا چاہیے۔ انشائیے والی تحریری زبان کا یہ اچھا نمونہ بے شک ہے، لیکن کرداروں کی زبان کا،

---

[1] ریوتی سرن شرما: ایک خط میں کچھ تاثرات۔

بولی جانے والی زبان کا یہ نمونہ مثالی نہیں۔

کرشن چندر کے ایک اور ڈرامے قاہرہ کی ایک شام نے بھی بڑی شہرت پائی۔ یہ رومانی ماحول کا ڈرامہ ہے، اور کرشن چندر کی شاعرانہ نثر نے وہی جادو کا اثر پیدا کیا ہے، جو ان کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ ریڈیو کے شروع کے دور کا ڈرامہ ہے۔ اور یہ کچھ اس دور کا ایک طرح سے لازمہ ہو گیا تھا کہ ڈراموں کے لئے مصنفوں کو ذہنی طور سے خود کو دوسرے ملکوں میں لے جانا پڑتا تھا۔ آس پاس کی تلخ حقیقتوں میں رومانی فضا پیدا کرنا مشکل تھا، اسی لیئے ان حقیقتوں سے فرار کی صورت یہ نکالی گئی۔ ترکی، روم اور اسپین میں امتیاز علی تاج، رفیع پیر اور دوسروں کے لئے وہی جاذبیت اور کشش رکھتے تھے، جو رومانوی دور میں برطانوی ادیبوں کو، بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے بھی ادیبوں کو الف لیلےٰ خیام اور حافظ کے کلام میں محسوس ہوئی۔

ریڈیو کے لیئے کرشن چندر نے ایک اور ڈرامہ "دروازہ" لکھا، جس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ یہ کرشن چندر نے لکھا۔ ورنہ اسے کوئی غیر معمولی تخلیق نہیں کہا جا سکتا۔

"شکست کے بعد" ایک امریکی ناول Moon is Down نے کرشن چندر کو اتنا متأثر کیا کہ انھوں نے اس پر مبنی ایک اسٹیج ڈرامہ "شکست کے بعد لکھا" جو معمولی ایڈیٹنگ کے بعد ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔

۱۹۶۵ء میں کرشن چندر نے پھر سنجیدگی سے ریڈیو ڈرامے کی طرف توجہ دی، اور رہیلا باٹلی والا کا کردار تخلیق کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک سیریل لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کردار کے ساتھ انھوں نے صرف دو ڈرامے لکھے۔ ایک روپیہ، ایک پھول اور سکے کی موت۔ سماجی طنز کی یہ اچھی مثالیں ہیں۔ ایسے کردار بمبئی میں اب بھی موجود ہیں اور کرشن چندر نے ماحول ہی سے لیئے ہوں گے۔ کتاب کا کفن بھی اسی زمانے کا ڈرامہ ہے۔

ڈرامے میں کردار اپنی زبان بولتے ہیں (اچھے ڈرامے کے لیئے یہ بنیادی شرطوں میں سے ہے) اس لئے ہندی اور اردو ڈراموں کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی، اور کھینچنا بھی نہیں چاہیئے۔ لپی، رسم خط کوئی حدِ فاصل ریڈیو کے لئے نہیں، کیونکہ صوت و صدا ریڈیو کا میڈیم ہے۔ ریڈیو ناٹک کے ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے ہریش چندر کھنہ لکھتے ہیں[1]

---

[1] ہریش چندر کھنہ: ریڈیو ناٹک (ہندی): آتما رام اینڈ سنز، دلّی۔

११. हिन्दी और उर्दू—हिन्दी के प्रायः सब नये-पुराने नाटककार किसी न किसी समय पर रेडियो के लिये लिखते रहे हैं। मित्रों के आग्रह पर, या केवल कुछ रुपया कमाने के लिये, या केवल एक नये माध्यम को आज़माने के उद्देश्य से। यह देखा गया है कि अगर एक बार किसी नाटककार ने इसमें सही दिलचस्पी ली तो उसने इस प्रयोग को नहीं छोड़ा। बल्कि इस नये माध्यम के प्रति उसकी आसक्ति बढ़ती गई। और बहुत सी हालतों में तो वह उसी का हो रहा। यह इस क्रान्तिकारी रचना-माध्यम के प्रभाव का सबसे अधिक पुष्ट प्रमाण है।

अनेक विषयों को लेकर विविध प्रकार के रेडियो-नाटकों का सृजन हुआ है। पौराणिक विषयों पर उदयशंकर भट्ट, लक्ष्मीनारायण मिश्र, (अहिल्या, अशोकवन), गोविन्ददास (कर्ण); कैलाशचन्द्र देव बृहस्पति; विपिन चन्द्र बन्धु (ऋष्यशृंग) और ऐतिहासिक विषयों पर रामकुमार वर्मा, जगदीशचन्द्र माथुर (भोर का तारा; विजय की वेला; कोणार्क); लक्ष्मीनारायण लाल (ताजमहल के आँसू; शाहजहाँ की आख़िरी रात); देवेन्द्रनाथ शर्मा (आचार्य द्रोण; शाहजहाँ के आँसू और शेरशाह); देवराज दिनेश (रावण; तपोवन; मानव-प्रताप); आर. एन. नागर (विद्रोही सिराजुद्दौला); रामवृक्ष बेनीपुरी (अम्बपाली); प्रशान्त पांडे (कीचकवध); और नरेन्द्र शर्मा (उपगुप्त) आदि ने सफल नाटक लिखे हैं। दिनेश के ऐतिहासिक नाटक ओजपूर्ण संवाद और कुशल चरित्र-निरूपण के कारण अत्यन्त सफल रहे हैं। कुछ नाटकों में ऐतिहासिक पात्रों की मौलिक व्याख्या का प्रयास भी किया है।

सुप्रसिद्ध कवि और प्रौढ़ नाटककार उदयशंकर भट्ट ने विविध प्रकार के नाटक तथा रूपक लिखे हैं। उनके अनेक नाटक, विशेषकर पद्य-नाटक, (मदन दहन; विक्रमो-

गं ...प्रसारण में सफल रहे हैं। उनके श्रेष्ठ प्रयोगात्मक नाटकों में से 'आदिम' युग ... जवानी — एक प्रतीक (यद्यपि वह प्रतीक नहीं बल्कि ऐलीगरी है) और 'अन्धकार और प्रकाश' (मनोवैज्ञानिक नाटक) अधिक प्रसिद्ध हैं। उन्होंने रूपक भी लिखे हैं। ...में 'एकला चलो' और 'महाकवि कालिदास' महत्त्वपूर्ण रेडियो-रचनाएँ हैं। ऐतिहासिक नाटकों में 'शक-विजय' और पौराणिक में 'भीष्म' उल्लेखनीय हैं।

रामकुमार वर्मा ने सामाजिक नाटकों की अपेक्षा ऐतिहासिक नाटकों के क्षेत्र अधिक सफलता प्राप्त की है। वैसे जब लिखने पर आते हैं तो कौनसा विषय है ...से उनकी कल्पना तथा कलाचातुर्य एक सुन्दर और उत्कृष्ट रचना का रूप नहीं देता। हास्य में 'फ़ैल्ट हैट' दर्जनों बार प्रसारित हो चुकने के पश्चात् भी आकर्षक ... कल्पना-प्रधान समस्यामूलक नाटकों में 'उत्सर्ग' एक उच्चकोटि का रेडियो-नाटक ...। ऐतिहासिक नाटकों में 'चारुमित्रा' और 'औरंगज़ेब की आखिरी रात' और 'कौमुदी महोत्सव' अच्छे हैं। लेकिन रेडियो-शिल्प की दृष्टि से उनकी पिछले चार-पाँच वर्षों की रचनाएँ अपेक्षाकृत श्रव्योचित और अधिक प्रभावशाली हैं। कारण यह कि वे रचनाएँ मुख्य रूप से श्रव्य-प्रसारण के लिये लिखी गई हैं। इन नाटकों की दृश्य-निर्माण-योजना प्रकाशित नाटकों से भिन्न है। इनमें ध्वन्यात्मक मूल्यों का विशेष ध्यान रखा गया है और शैली अधिक सरल, प्रभावात्मक और संकेतात्मक बनती चली गई है।

प्रयोग की दृष्टि से विष्णु प्रभाकर का दाय रेडियो-नाटक के लिये विशेष महत्त्व रखता है। उन्होंने १९४७ और १९५२ के अर्से में रेडियो-नाट्य के प्रायः प्रत्येक रूप को आजमाया है। उन्होंने नाटक, रूपक, रेडियो-रूपान्तर, एकपात्र नाटक, प्रति-कल्पना, रिपोर्ताज लिखे हैं। पर जितनी सफलता उन्हें सामाजिक और मनोवैज्ञानिक नाटकों में मिली है उतनी अन्य प्रकारों में नहीं मिली। विष्णु के नाटकों में रेडियो-शिल्प का क्रमशः विकास स्पष्ट रूप से देखा जा सकता है। जैसे कलाकार नये माध्यम के भेद समझने और उसके रचना-कौशल में निपुणता प्राप्त करने की कोशिश कर रहा हो। समय के साथ उनकी नाट्य-कला मँजती गई है। विष्णु में ऊपर कही एक बात का प्रमाण भी मिलता है। उनकी नाट्य-कला के विकास में जितना हाथ रेडियो का है उतना किसी और प्रभाव का नहीं। नाटककार विष्णु का विकास उसी काल में हुआ जिसमें कि लेखक का रेडियो से सम्पर्क बना। विष्णु के नाटकों में मौलिक स्थितियाँ, सरल मार्मिक संवाद और मानवीयता के गुण प्रशंसनीय हैं। निर्माण-व्यवस्था भी किसी-किसी नाटक में बहुत अच्छी है। 'उपचेतना का छल,' 'जहाँ दया पाप है', 'धरोहर', 'धुआँ', 'दरिन्दा' उनके सफल रेडियो-नाटकों में से हैं। रूपकों का शुमार नहीं, फिर भी 'सर्वोदय' अत्युत्तम रचना है।

सामाजिक नाटक के क्षेत्र में रेवतीशरण शर्मा का स्थान अद्वितीय है। इसका सबसे बड़ा कारण यह है कि रेवती केवल रेडियो के लिये लिखते हैं। इसलिये उनका

निशाना कभी नहीं चूकता। उनकी नाट्य-कला का प्रमुख गुण स्वाभाविकता और लोकगीत का-सा सारल्य है। उनके नाटक एक विशेष प्रकार की आत्मीयता से ओत-प्रोत रहते हैं। उनकी सफलता का रहस्य यह है कि कहानी का स्तर सदा मानवीय और यथार्थनिष्ठ रहता है। उसमें घटनाएँ कम और व्यवहार का विश्लेषण अधिक होता है। रचना का प्रधान उद्देश्य विस्तार न होकर प्रगाढ़ता है। अतः प्रभाव की एकाग्रता का बना रहना प्रायः निश्चित हो जाता है। उनकी शैली बड़े लेखकों की-सी कृत्रिम साजसज्जा से पूर्णतया मुक्त है। प्रारम्भिक काल के नाटकों में जो अति-रंजना की हल्की-सी झलक दिखाई देती थी, उसके स्थान पर अब संयत भावना प्रदर्शित होती है। 'नरमे की मौत' और 'आंसू' की अतिरंजना और भावुकता के स्थान पर बाद के नाटकों में संयत मानवीय भावना मिलती है। एक दोष है जिसे लेखक का दूर करना है। वह है बहुत से नाटकों में एक ही विषय और स्थिति की आवृत्ति। इसके अतिरिक्त कभी-कभी रेवती का कथानक नाटक का रूप त्याग, कहानी बनकर चलने लगता है। इससे नाटक के बल और क्रिया के वेग पर बुरा प्रभाव पड़ता है। किन्तु यह दोष भी भावसिक्त और हृदयस्पर्शी संवादों के बल और आकर्षण के नीचे छिप-सा जाता है। 'क्रिसमस की एक शाम', 'अमावस का अन्धकार', 'पत्थर और आंसू', 'उतार-चढ़ाव', 'अंधेरा-उजाला' और 'दुश मन' उनके सफल और लोकप्रिय नाटक हैं। उन्हों अति कल्पना नाटक भी लिखे हैं। 'कल' में एटमी युद्ध के परिणामों की ओर संकेत किया गया है। काफी सफल रहा है।

सामाजिक नाटक की चर्चा करते हुए भगवतीचरण वर्मा (राख और चिन-गारी); हंसकुमारी तिवारी (पुकार, झूठे सपने); राधाकृष्ण प्रसाद (आवरण); प्रफुल्ल-चन्द्र ओझा 'मुक्त', (चट्टानें); शिवसागर मिश्र, मोहनलाल महतो (चूड़ियाँ); विश्वम्भर 'मानव' (जीवन-साथी); सत्येंद्र शरत् (आवारा, तार के खम्भे); और भृंग (दस का नोट) का उल्लेख किया जा सकता है। संवादों की सरलता के लिये सत्येंद्र शरत् के नाटक अच्छे नमूने हैं।

उपेन्द्रनाथ अश्क पुराने और सिद्धहस्त नाटककार हैं। उनकी रेडियो-रचनाएँ उस समय भी उत्सुकता, चाव और आदर से सुनी जाती थीं जबकि ताज और रफ़ी पीर की धाक थी। वे रचनाएँ आज भी आदर्श रेडियो-कृतियाँ हैं क्योंकि वे मुख्य रूप से श्रव्य माध्यम के लिये रची गईं। अश्क के नाटक केन्द्रीय स्थिति की मौलिकता, संवादों की निश्चेष्टता और तीक्ष्णता और कथानक के वेगपूर्ण तथा निश्चित विकास के गुणों के कारण श्रेष्ठ और प्रशंसनीय हैं। चरित्र वैविध्य का निरूपण, जीवन का सूक्ष्म अध्ययन, हास्य और व्यंग्य का चतुर सम्मिश्रण, अश्क के नाटकों की विशेषताएँ

हैं। हास्य और व्यंग्य ऐसे के सम्मिश्रण का जोड़ कृष्णचन्द्र को छोड़ अन्य किसी हिन्दी या उर्दू नाटककार में नहीं मिलता। गम्भीर, सामाजिक तथा मनोवैज्ञानिक नाटकों में 'शिकारी', 'अजली रास्ते', 'लक्ष्मी का स्वागत', 'छठा बेटा', 'जीवनकारा' और हास्य-प्रधान नाटकों में 'सुबह-शाम', 'लीडर', 'तकल्लुफ़', 'बतसिया', 'काले साहब' और 'पर्दा उठाओ, पर्दा गिराओ' उल्लेखनीय हैं।

हिन्दी में हास्य और व्यंग्य बहुत ही कम है। इसलिये जो है उसका विशेष महत्व है। हास्य और व्यंग्य लिखने वालों में प्रभाकर माचवे, अमृतलाल नागर, जयनाथ नलिन, शौकत थानवी, सत्यप्रकाश किरण, पद्मकांत त्रिपाठी और आवारा की रेडियो-रचनाएँ उल्लेख और सराहना के योग्य हैं। प्रभाकर माचवे ने हास्य-रूपक के एक नये प्रकार, परिहास-क्रम (Comic sequence) को बड़ी कुशलता से प्रयुक्त किया है। 'वधू चाहिये', 'क़वायदवादी' उनके श्रेष्ठ परिहास तथा व्यंग्य-क्रम हैं। नाटकों में 'राम भरोसे', 'पुराने चावल' और 'अधकचरे' सफलतापूर्वक प्रसारित हुए हैं। ये नाटक अति आधुनिक समाज की कृत्रिमता पर तीखी चोटें हैं। माचवे एक बुद्धिवादी हैं। उनकी दृष्टि से समाज की कोई भी असांगतिकता नहीं बच सकती। उनके हास्य-प्रधान नाटकों में रावले-ऐसे खुले क़हक़हे भी मिलते हैं, और ऐडिसिन-ऐसी हल्की मुस्कराहटें भी। परिहास में बिलकुल बर्नार्ड शॉ का रंग है। उनकी हास्यात्मक कल्पना क़वायदवादी (Regimentation) ऐसे शुष्क और नीरस विषय को भी रोचक बना देती है। इस चमत्कार का रहस्य उनकी भाषा में है। अनेक विचित्र संयोजनाओं में ढलकर साधारण से साधारण शब्द भी विविध रूप की अनेक मौलिक अर्थछटाएँ प्रस्तुत करते हैं। माचवे के शब्द हँसते हैं, छेड़छाड़ करते हैं और तरह-तरह के सूक्ष्म भाव व्यक्त करते हैं। इस प्रकार भाषा अभिव्यक्ति बन जाती है। और यही रेडियो-शैली का प्रधान गुण है।

अमृतलाल नागर का 'बाँकेलाल' बहुत बार प्रसारित हुआ है। जयनाथ नलिन का परिहासक्रम 'नबाबी सनक' पुस्तक रूप में छपा था, मुख्य रूप से पढ़ने के लिये। किन्तु जब वह रेडियो से प्रसारित हुआ तो 'वर्ष का सर्वश्रेष्ठ ब्रॉडकास्ट' माना गया। कारण यह कि नलिन के हास्यात्मक प्रभावों का आधार भी शब्द-प्रधान नाट्य-शैली है। स्थिति का भाव घटनाओं की अपेक्षा चर्चा में व्यक्त होता है। उनकी एक और उत्कृष्ट रचना 'संवेदना सदन' एक मनोरंजक हास्यात्मक प्रतिकल्पना है, जिसमें विचार की मौलिकता संवाद-शैली की परिपक्वता की पुट पाकर और निखर उठी है। धर्मवीर भारती (कलाकार) ने भी अनेक सफल और मनोरंजक परिहास-क्रम लिखे हैं। पुराने लिखने वालों में के एस० मलिक परवेज़ का स्थान बहुत ऊँचा है। आपके लिखे हुए रंगारंग प्रोग्राम और नाटक (निज़ाम सक़ा) अनेकों बार प्रसारित हो चुके हैं।

—

रेडियो-नाटक

व्यंग्य की चर्चा करते हुए राजेन्द्रसिंह बेदी और कृष्णचन्द्र का नाम सामने आता है, यद्यपि दोनों ने व्यंग्य के अतिरिक्त अन्य प्रकार के नाटक भी लिखे हैं। कृष्णचन्द्र के रोमानी नाटकों में 'आंधी' और 'क़ाहिरा की एक शाम' बहुत प्रसिद्ध हुए। व्यंग्य में 'सराय के बाहर' अत्यन्त मार्मिक और हृदयस्पर्शी है। इस रचना में व्यंग्य और दुखान्त तत्वों का सम्मिश्रण अद्भुत है, और शेक्सपीयर के 'किंगलियर' की याद दिलाता है। 'एक रुपया एक फूल' जिसे दिल्ली रेडियो के १९४८ के नाटकोत्सव का सर्वोत्तम नाटक माना गया था एक दूसरी श्रेणी में आता है। 'सराय के बाहर' में रुलाकर सोचने पर मजबूर किया गया था, 'एक रुपया एक फूल' में हँसाकर सोचने की प्रेरणा दी गई है। इसमें मोलियर का रंग झलकता है। एक अत्यन्त सफल व्यंग्य होने के साथ-साथ यह नाटक रेडियो-नाट्य-शिल्प का एक उत्कृष्ट नमूना भी है।

राजेन्द्रसिंह बेदी ने कम लिखा है पर जो कुछ भी लिखा है 'ए वन'। यह कथन कहानी की अपेक्षा नाटक के विषय में अधिक सत्य है। 'कार की शादी', 'पाँव की मोच', 'ख्वाजा सरा' उनके सफल व्यंग्य हैं। 'रुख़सिदा' और 'क़ैदी' प्रतीक नाटक हैं। बेदी की नाट्यकला की विशेषता है विषय की आत्मा को एक ही केन्द्रीय स्थिति में प्रकट करना, और चरित्र के आवरणों को एक जर्राह की तरह धीरे-धीरे उतारते जाना, यहाँ तक कि चरित्र का सत्य अपने आप श्रोता पर प्रकट हो जाय। उनके चरित्र अपने वैचित्र्य को शारीरिक हाव-भाव की अपेक्षा संवादों में कुछ अधिक प्रकट करते हैं। इसी कारण उनके नाटक माइक्रोफ़ोन के लिए अत्युपयुक्त होते हैं।

इसी समूह का एक और रत्न विशेष उल्लेख पायेगा। रेडियो-नाटक का इतिहास उसकी चर्चा के बिना अधूरा रहेगा। सआदतहसन मंटो ने रेडियो के लिये ही लिखा और खूब लिखा। मंटो एक ऐसी विचित्र और बहुमुखी प्रतिभा हैं कि उनके लिये कोई लेबल उचित नहीं। आपने अनेक प्रकार के नाटक रचे जिनकी सामान्य और प्रमुख विशेषता एक शक्तिमान स्थिति, और कथानक का वेगपूर्ण उत्थान है। गम्भीर नाटकों में 'जेबकतरा' और 'कबूतरी'; हास्य में 'रंधीर पहलवान' और 'कमरा नम्बर नौ'; व्यंग्य में 'हतक', ख्याति प्राप्त रचनाएँ हैं। मनोवैज्ञानिक नाटकों में 'इंतज़ार' और 'इंतज़ार का दूसरा रुख' प्रसिद्ध हैं। ऐतिहासिक विषयों को लेकर भी मंटो ने अत्यन्त प्रभावपूर्ण नाटकों की रचना की। 'नैपोलियन की मौत', 'तैमूर की मौत', पुराने ज़माने की सफल रचनाएँ हैं यद्यपि आज उनमें इतना आकर्षण नहीं रहा, क्योंकि वर्तमान श्रोता प्रकट से सूक्ष्म को अधिक चाहता है।

रेडियो द्वारा पद्य-रूपक और गीतिनाट्य की दिशा में प्रशंसनीय प्रगति हुई है। कवियों और नाटककारों ने अनेक सफल प्रयोग किये हैं। सुमित्रानन्दन पंत का 'फूलों का देश', 'रजत-शिखर' और 'ध्वंसशेष'; उदयशंकर भट्ट का 'विश्वामित्र'; भगवती

वग्गा वर्मा का 'कर्ण'; गोविन्ददास का 'स्नेह और स्वर्ग'; चिरंजीत का 'देव और मानव' तथा 'छाया': एम० एन० चौबे का 'उद्धव सन्देश' और 'विद्यापति'; नरेशकुमार मेहता का 'अग्निदेवता'; त्रिलोकचन्द कौसर का 'हयाते नौ' सलाम मछलीशहरी का 'अनारकली'; मजबूर जालंधरी का 'लालारुख'; रामगोपाल शर्मा 'रुद्र' का भागीरथी और विध्यांचल प्रसाद गुप्त का 'चांद और चांदनी' उल्लेखनीय रचनायें हैं उदय-शंकर भट्ट और गिरिजाकुमार माथुर ने कालिदास की अमर रचनाओं का पद्य में रेडियो-रूपान्तर करने का सफल प्रयास किया है। गिरिजाकुमार माथुर का 'शकुन्तला' और उदयशंकर भट्ट का 'विक्रमोर्वशी' और 'मेघदूत' सफलतापूर्वक प्रसारित हो चुके हैं। चिरंजीत की बहुमुखी प्रतिभा अन्य प्रकार में भी चमकी है, किन्तु गीति नाट्य के क्षेत्र में वह अधिक दीप्ति से विद्यमान हुई है। उनके ओपेरा सुगठित कथानक सरल संवाद और संरचना में संगीतात्मक मूल्यों के समावेश के लिये प्रसिद्ध हैं।

रेडियो-नाट्य का यह प्रकार रंग-नाटक की परम्परा से आविर्भूत है। अन्तर है तो अवधि और विस्तार में, अन्यथा निर्माण-योजना में कोई भेद नहीं। लेकिन इनमें बहुत वास्तविक अर्थ में गीति-नाट्य हैं। उनमें काव्यात्मकता और गीतात्मकता के साथ-साथ नाटकत्व भी है। ऐसी रचनाओं का बड़ा अभाव है। गीति-नाट्य एक ऐसा प्रकार है जिसे रेडियो के माध्यम द्वारा बड़ी सफलता से प्रस्तुत किया जा सकता है क्योंकि रेडियो के पास ध्वनि, शब्द और संगीत के कलात्मक सामंजस्य के अनेक उपकरण और साधन उपलब्ध हैं। इसके अतिरिक्त, क्योंकि गीति-नाट्य की अपील दृष्टि की अपेक्षा कान, और वस्तु संवेद (Sense of the concrete) की अपेक्षा सूक्ष्म संवेद (Sense of the abstract) की ओर लक्षित होती है इसलिये श्रव्य माध्यम गीति-नाट्य के अभिनय के लिये अत्युपयुक्त पाया गया है। लेकिन प्राय: देखने में आया है कि रेडियो-गीति-नाट्य रोचक नहीं बन पाता। इसका यह अर्थ नहीं कि गीति-नाट्य के लिये भी हम उतने श्रोताओं की अपेक्षा करते हैं जितने कि रेडियो-नाट्य के अन्य हल्के-फुल्के (Light) प्रकारों, उदाहरणार्थ हास्य-रूपक, सामाजिक नाटक, ऐतिहासिक नाटक के लिये करते हैं। गीति-नाट्य विशिष्ट श्रोताओं के लिये है। फिर भी हम आशा रख सकते हैं कि गम्भीर और कलात्मक होने के साथ-साथ गीति-नाट्य रोचक भी हो। दुर्भाग्यवश बहुत कम लेखक ऐसे हैं जो श्रोता को आकर्षित कर सकते हैं। इस असफलता के मुख्य और विशेषरूप से विचारणीय कारण हैं···एक सबल केन्द्रीय विचार की अनुपस्थिति, भाषा की क्लिष्टता, विचारों की ग्रन्थिपूर्णता और पुनरावृत्ति और संगीत तथा अभिनय-कला से अनभिज्ञता। प्राय: भ्रांतिवश कविता-संयोजन को ही गीति-नाट्य समझ लिया गया है। एक और कारण भी विचारणीय है। पद्य में नाट्य-क्रिया के प्रधान गुणों, स्फूर्ति, वेग आदि का लाना

कठिन होता है, जब तक कि नाटककार विविध प्रकार के छन्दों, पंक्तियोजनाओं से पूर्णतया परिचित न हो। और गायक अभिनेताओं के अभाव में सफल से सफल रचना को भी मनोरंजक ढंग से प्रस्तुत नहीं किया जा सकता। फिर भी यही एक क्षेत्र है जहाँ इन सब बातों के रहते भी अनेक प्रयोगों तथा प्रयासों की सम्भावना है।

मनोवैज्ञानिक नाटक भी रेडियो के लिये अत्युपयुक्त पाया गया है, क्योंकि वह घटनाप्रधान न होकर विचार-प्रधान तथा अनुभूतिप्रधान होता है। मनोवैज्ञानिक नाटक जिन नाटकीय उपकरणों का उपयोग करता है वे श्रव्य-माध्यम के पूर्णतया अनुकूल हैं। स्वगत भाषण, अरूप ध्वनि तथा संकेतात्मक शब्द, विगताख्यान (Flashback) आदि उपकरण रेडियो-शिल्प के प्रमुख सूत्र हैं। लेकिन आजकल के लेखक को एक मर्ज-सा हो गया है। वह प्रत्येक रचना पर 'मनोवैज्ञानिक' का लेबल चिपकाकर पेश करना ही अपना परम कर्तव्य समझता है। सामान्य दृष्टि से हरएक नाटक मनोवैज्ञानिक है क्योंकि उसमें मनोवैज्ञानिकता का तत्त्व उपस्थित है। पर यदि इस लेबल को सस्ता न बनाया जाय तो सबकी सेहत के लिये अच्छा रहेगा। विष्णु प्रभाकर और उपेन्द्रनाथ अश्क की चर्चा ऊपर की जा चुकी है। मेरे निकट अश्क का नाटक 'भँवर' एक आदर्श मनोवैज्ञानिक नाटक है। उसका मुख्य उद्देश्य कहानी सुनाना न होकर एक विचित्र चरित्र का विश्लेषण, एक मनस्थिति का अनेक दृष्टिकोणों से प्रेक्षण है। 'भँवर' एक जीवन से ऊबी और चिढ़ी हुई (Jaded) नारी का चित्र है जिसके रोम-रोम में अशान्ति, एक सर्वांगीण पीड़ा की भाँति व्याप्त है। उस नाटक की सारी घटनाएं इस चरित्र के प्रकटीकरण के लिये संचालित की गई हैं। सारे पात्र इसलिये घुमाये-फिराये गये हैं ताकि श्रोता मुख्य पात्री की व्यावहारिक प्रतिक्रियाओं के प्रेक्षण द्वारा प्रस्तुत मनःस्थिति से आत्मसात् हो सके। इन दो नाटककारों के अतिरिक्त जगदीशचन्द्र माथुर (खण्डहर); अमृतलाल नागर (चक्करदार सीढ़ियाँ और अन्धेरा), मुहम्मद हसन (महलसरा, फूल और परछाईं); नरेशकुमार मेहता (नीलदिशायें, साँझ के स्वर, सनोबर के फूल); भारत भूषण अग्रवाल (नींद की पाटियाँ); और के० के० श्रीवास्तव (धुंधले चित्र) के नाम भी उल्लेखनीय हैं। नरेश ने अपने मनोवैज्ञानिक नाटकों में अभिव्यंजनात्मक motifs का प्रयोग भी सफलतापूर्वक किया है। जैसे कि 'नील-दिशायें' में नीलरंजित अन्धकार का। मुहम्मद हसन ने ह्रासोन्मुख नवाबी समाज का भागांश (Cross-section) प्रस्तुत करते हुए उस वेदनास्पद संघर्ष को व्यक्त किया है जो तरुण हृदयों में पुरातन से टकराकर उठता है। भारतभूषण अग्रवाल ने काल्पनिक परिपार्श्व की पृष्ठभूमि पर सफल मनोवैज्ञानिक नाटक 'महाभारत की साँझ' का निर्माण करके एक नयी दिशा का निर्देश किया है। इन पंक्तियों के लेखक की नाट्य-रचना का मुख्य विषय भी मनोवैज्ञानिक नाटक है।

रेडियो-नाटक की प्रगति

[illegible] द्वारा असाधारण के तत्व की अपरोक्ष साधारणता को प्रत्यक्ष करने का प्रयास किया जाता है। चरित्र को एक ऐसी विस्फोटात्मक और द्वन्द्वात्मक स्थिति में केन्द्रित किया जाता है जिसमें उसके स्पष्ट व्यवहार के पीछे काम करने वाली अस्पष्ट मनोवृत्तियाँ [illegible] में अपने आप विद्यमान हो उठें। 'अपमान', 'मुक्ति के पथ पर', 'मांस और मांसल', '[illegible] और कलियाँ', 'कायर' और 'मुर्दे जागते हैं' उल्लेखनीय रचनायें हैं। 'अडिप्स' का विषय है मनोविश्लेषण द्वारा मानसिक विकृतियों और रोगों की चिकित्सा। इनमें से कुछ रेडियो-नाटक अन्य प्रादेशिक भाषाओं में अनूदित होकर प्रसारित हो चुके हैं।

रहस्यमय और जासूसी नाटक लिखने वालों में रफ़ीपीर (मारेआस्ती); इशरत रहमानी (भूतों वाला बँगला); चिरंजीत (महाश्वेता नाटक का अन्त); एस० एन० चौबे (तीसरी चाल मात); अमृतलाल नागर (हीरे की अँगूठी) के नाम उल्लेखनीय हैं। रहस्यमूलक रेडियो-नाटकों की सफलता का आधार है एक प्रभावशाली स्थिति, चातुर्य से निर्मित कथानक जो अन्त तक संभ्रम (Suspense) बनाये रखे। लोकप्रियता की दृष्टि से ये रचनाएँ बहुत अपील रखती हैं। कुतूहलपूर्ण कथानक और सरल संवाद की दृष्टि से चिरंजीत की रचनाएँ बहुत सुन्दर हैं।

अतिकल्पना लिखने वालों में गिरिजाकुमार माथुर, सिद्धनाथ कुमार (लौह-देवता; सृष्टि की साँझ) और रामचन्द्र तिवारी विख्यात हैं। माथुर के नाटक 'शान्तिर्विश्वेदेवः' में वर्तमान युग की सबसे महान् आध्यात्मक और सांस्कृतिक समस्या मशीनी प्रगति और उसके कल्पित परिणामों को प्रभावपूर्ण ढंग से प्रस्तुत किया गया है। तिवारी जी की रेडियो-रचना का क्षेत्र उनके विस्तृत ज्ञान की भाँति विशाल है और उनकी बहुमुखी प्रतिभा शैली-वैविध्य में प्रतिबिम्बित होती है। पर अतिकल्पना उनका विशेष विषय है। 'बन्दिनी' में धन की समस्या पर प्रकाश डालते हुए सत्ता और आचार के महत्वपूर्ण प्रश्नों का विश्लेषण किया गया है। 'नवप्रभात' एक हास्य-रस की रचना है जिसमें हार्मोन चिकित्सा और उससे उत्पन्न होनेवाली विचित्र स्थिति को प्रस्तुत किया गया है। तिवारी जी के प्रयोग एच. जी. वेल्ज की वैज्ञानिक अतिकल्पनाओं ऐसे हैं। सिद्धनाथ कुमार का नाटक 'लौहदेवता' भी मशीनों द्वारा मानव के दमन; और 'सृष्टि की साँझ', ऐटमी युद्ध के विषय पर आधारित है।

स० ही० वात्सायन ने तीन-चार रेडियो-नाटक लिखे हैं। 'बसन्त', 'नान्यःपंथा', 'नम्बर दस' और 'जयदोल'। इनमें से 'जयदोल' सर्वश्रेष्ठ है। यह रचना संक्षेप और प्रभाव की प्रगाढ़ तीव्रता का सर्वोत्कृष्ट उदाहरण है। 'जयदोल' एक अतिकल्पना है जिसे ऐतिहासिक सामग्री को आधार मानकर नाटक की रचना की गई है। इस तीस मिनट के नाटक में अहोम जाति की जनप्रिय रानी जयमती और अत्याचारी नायक चूलिकफा सजीव हो उठे हैं।

ہربنس کھنہ نے نوجوانی کے زمانے میں، پانچ روپے روز پر ریڈیو میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے اردو میں کئی قابلِ ذکر ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے۔ سیفو، طوفان کے بعد، مردے جاگتے ہیں، سو نمبر، شیر کا شکار، فرار (تمثیلیہ)، راکھ اور کلیاں، ٹیڑھی تکون، کچھ اہم ڈرامے ہیں۔ ہربنس کھنہ واقعہ اور کردار اپنے ہی عہد کی سچویشنوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ طوفان کے بعد کا ماحول دیسی نہیں ہے، کیونکہ سچویشن جرمنی کی ہے۔ جنگ کے زمانے میں، نازی جرمنی میں یہودیوں پر جو مظالم ہوئے، ان کے پس منظر میں شروع ہی سے ڈرامہ کی فضا تیار ہو جاتی ہے۔ ایک یہودی عورت ہلڈا، ایک جرمن کے یہاں پناہ لیتی ہے۔ وہ حاملہ ہے۔ بچہ کی ولادت انسانی قدروں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس طرح کہ سپاہی کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔

مردے جاگتے ہیں، دلوں کو چھونے والی، تقسیم کے ان اثرات کی ایک کہانی ہے، جو کنبے کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں۔ ایک شرنارتھی عورت، اس یقین کے بعد کہ اس کا شوہر اب زندہ نہیں ہے، دوسری شادی کر لیتی ہے۔ اور بعد میں شوہر بھی ہندوستان پہنچ جاتا ہے۔

سو نمبر کا موضوع یہ ہے کہ مستقبل میں اگر کوئی کامل انسان ہوگا، وہ گم نام ہوگا۔

شیر کا شکار ایک آئی اے ایس افسر کے لیے پریشان موضوع ہو سکتا تھا، کیونکہ اس وقت ہربنس ریڈیو سے انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس میں آچکے تھے، اور شاید کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھیں ایک وکیل کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ انتہائی ایماندار ہونے کی شہرت رکھتا ہے، لیکن مقدموں کے دونوں فریقوں سے، ان کے حق میں فیصلہ کرانے کا وعدہ کر کے رقمیں لے لیتا ہے۔ جو فریق جیت جاتے ہیں اُن کی رقم رکھ لیتا ہے، اور ہارنے والوں کو "ایمانداری" سے ان کے روپے واپس کر دیتا ہے۔ اس کھیل کا تانا بانا بڑی چابکدستی سے بنا گیا ہے، اور سید رفیق حسین کی کہانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ اسے کسی حد تک علامتی ڈرامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

ریوتی سرن شرما اس سلسلے میں منفرد ہیں کہ انھوں نے صرف ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے، اور بعد میں ٹی وی کے لیے بھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے سماجی موضوعات کو جذباتی سطح پر برتا ہے، اور اس حد تک کہ ٹی وی سیریل "اور بھی غم ہیں" میں کچھ میڈیم کے تقاضوں کی وجہ سے، اور بڑی حد تک سیریل منظور کرنے والوں کے مطالبوں کی وجہ سے

ان کے یہاں خارجی حقیقتیں بھی آئی ہیں، لیکن ان کے اِن کرداروں میں وہ جذباتی اتار چڑھاؤ نہیں ہیں، جو ان کے ریڈیو ڈراموں کا خاصہ ہیں۔

سماجی ڈراموں کے سلسلے میں ہریش نے راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، اور محمد حسن کا ذکر کیا ہے۔ منٹو کے سنجیدہ ڈراموں میں وہ جیب کترا اور کبوتری کو، اور فکاہیہ ڈراموں میں زندھیر پہلوان اور کمرہ نمبر 9 کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ منٹو نے نفسیاتی ڈرامے بھی لکھے، اور ہریش نے انتظار اور انتظار کا دوسرا رخ کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی ڈراموں کے تحت انھوں نے نپولین کی موت اور تیمور کی موت کا حوالہ دیا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے انھیں فیچر کہنا شاید زیادہ مناسب ہے۔ تفصیل سے جنازے، آؤ، وغیرہ کا ذکر اس تحقیق میں کیا جا چکا ہے۔

ریڈیو ڈراموں کے سلسلے میں محمد حسن ایک اہم نام ہے۔ ان کے ریڈیو ڈراموں کے دو مجموعے ــــ پیسہ اور پرچھائیں اور مور پنکھی شائع ہو چکے ہیں، اور راجندر سنگھ بیدی کے سات رنگ کی طرح، اس دور کے تخلیقی ادب کا اہم حصہ ہیں۔ محمد حسن کے موضوعات کا دائرہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ وسیع ہے، اور ان کی مکالمہ نگاری پر آسکر وائلڈ اور مارک ٹوین کے انداز نگارش کا گہرا اثر ہے۔ وہ مزاح نگار نہیں ہیں، لیکن جملے کی کاٹ تلخی کی وجہ سے ہوتی ہے، جو سنجیدگی کی اہمیت کو مزاح کی چٹکی میں اڑانے کے بجائے دوچند کر دیتی ہے۔
محمد حسن کے ایک ڈرامے تماشا اور تماشائی کا خاص طور پر ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ بیدی اور کرشن چندر کے ریڈیو ڈراموں کی طرح تماشا اور تماشائی بھی کتابی صورت میں چھپا تو اس میں بھی اسٹیج کے لیے ہدایتیں ہیں۔ یہ ڈرامہ اسٹیج کے لیے ہے ہی نہیں، تاوقتیکہ، مرزا اور غالب کے کردار، ہم شکل جڑواں بھائی ادا نہ کریں۔ ٹی وی کے لیے یہ البتہ گوناگوں Gadgets کی وجہ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف ریڈیو کی تکنیک کے تقاضے پورا کرتا ہے، اور اس حیثیت سے اسے مثالی ریڈیو ڈرامہ بھی کہا جا سکتا ہے، جو بصری نہیں، بلکہ کان جو سنتے ہیں اس کی وجہ سے منظر نامہ ذہن میں مرتب ہوتا ہے، اور ہر سامع اپنے تصور اور تجربے کی بنا پر یہ منظر اپنے ذہن میں مرتب کرتا ہے، اس لئے اس ڈرامہ کا ایک حصہ اس مقالے میں شامل کیا جا رہا ہے۔

محمد حسن

تماشہ اور تماشائی

(غالب کی غزلوں کے مختلف ٹکڑے گاتے ہوئے مختلف لوگ اسٹیج سے گزرتے ہیں ان میں کوئی ٹکڑا کتھک کے رقص کا ہے تو کوئی فلمی موسیقی کا۔ کوئی قوالی کا ہے تو کوئی کسی ڈرامے کا)۔

(دروازے پر دستک۔ غالب دروازے کے قریب جاتے ہیں۔ غالب دروازہ کھولنے لگتے ہیں)۔

مرزا:۔ (اسٹیج کے بازو سے آواز دیتے ہیں نظر نہیں آتے) دروازہ مت کھولو۔

غالب:۔ آخر کیوں؟ دیکھتا ہوں کون لوگ ہیں؟

مرزا:۔ (آواز) مجھے معلوم ہے۔ (دستک پھر ہوتی ہے۔)

غالب:۔ تو بتاتے کیوں نہیں؟ یہ سلسلہ کیا ہے؟

مرزا:۔ (آواز) یہ لوگ برسی منا رہے ہیں۔

غالب:۔ (پھر دروازے کی طرف بڑھتا ہے) تو پھر کیا حرج ہے؟

مرزا:۔ (Entry) (پھر ٹوک لیتے ہیں) پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ لوگ کس کی برسی منا رہے ہیں۔ میری یا تمہاری؟

غالب:۔ ظاہر ہے برسی غالب کی منائی جا رہی ہے شاعر غالب کی۔

مرزا:۔ نہیں۔ برسی مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کی ہے ۱۰۵ سال پہلے میری موت ہوئی تھی۔

غالب:۔ تم سے کسی کو کیا دلچسپی ہے۔ تم تو محض ایک امیر زادے تھے۔

مرزا:۔ اور تم؟

غالب:۔ میں شاعر غالب۔ میرا ایک ایک شعر آج بھی زندہ ہے۔

مرزا:۔ کس کی بدولت؟ میری اور صرف میری۔

غالب:۔ یہ جھوٹ ہے۔ شاعر امیر زادے کے محتاج نہیں۔ تم فقط میرا جسم تھے میری روح میری

شاعری تھی۔

مرزا:۔ مت بھولو، میں نے تمہیں نام دیا، ہستی دی، ہنستے ہوئے ہونٹ، روتی ہوئی آنکھیں دیں۔ ترستا ہوا دل اور آسمانوں سے بھی زیادہ بلند پرواز کرنے والا دماغ دیا۔

غالب:۔ سارے امیرزادے بڑے بڑے بول بولا کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مرزا نوشہ مرے تم تھے زندگی بھر مرے، کبھی کسی کو مار رکھا، کبھی خود مر گئے۔

مرزا:۔ تمہاری قسمت میں موت کہاں؟

غالب:۔ میں بے چارا اپنا آپ تماشائی تھا، لے دے کے زندگی میں کوئی آرزو کی بھی تو صرف اتنی کہ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مرزا:۔ تو گویا میرے بغیر تمہاری ہستی، تمہاری حسرتیں اور ارمان تمہاری شاعری باقی رہتی؟!

غالب:۔ نہیں۔ لیکن تمہارے گناہ میرے نام کیوں لکھے جائیں۔

مرزا:۔ ٹھیک کہتے ہو، لوگ آج کل میرے پیچھے پڑے ہیں۔ مرزا نوشہ کہاں پیدا ہوا اس نے اپنے سالے کی موت پر خوشی کا کیوں اظہار کیا، اس نے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا قصیدہ کیوں لکھا۔ انگریزوں کی مدح سرائی کیوں کی اس نے اپنے دوست صدرالدین آزردہ کی بیوی کی پنشن رکوا کر نواب رام پور سے اپنے لئے پنشن حاصل کرنے کی کوشش کیوں کی؟

غالب:۔ یہی نہیں اور سنو۔ مولوی ذکاءاللہ نے لکھا:۔

" غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو دیکھ نہ سکتا۔ تنگ دل ایسا کہ سارے بھائی بندوں کا حق مارنے میں اس کو عار نہ تھا۔ ذوق مرگیا تو خوش ہو کر کہتا تھا آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرا۔ شرابی ایسا کہ کہا کرتا تھا صہبائی شعر کہنا کیا جانے، نہ اس نے شراب پی، نہ معشوق کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا۔ لالچی ایسا کہ ایک ایسا قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا۔

مرزا:۔ (دروازے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دستک ہونے پر بھی غالب کو

دروازہ کھولنے نہیں دیتا) نہیں دروازہ مت کھولو۔ پہلے یہ طے ہوجائے کہ وہ کس کی برسی منانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرزا نوشہ خود غرض تھا۔ لالچی تھا تنگ دل تھا۔

غالب:۔ کیا غلط کہتے ہیں۔

مرزا:۔ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے۔ ع
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب:۔ گھر، میرا کوئی گھر نہیں۔

مرزا:۔ نہیں، غالب بھولتے ہو۔ غالب کے نام سے پہچانے جانے سے پہلے صرف میں تھا مرزا اسد اللہ بیگ اور میں نے آگرے میں آنکھیں کھولی ہیں ۱۷۹۸ کا آگرہ۔ یہاں نظیر اکبر آبادی کے 'شہر آشوب' کا آگرہ۔ جہاں میری خاندانی حویلی تھی اور دیوان خانے میں راجہ بنسی دھر کے ساتھ شطرنج کی بازی جمتی تھی۔

Flash Back I

بنسی:۔ چال چلو مرزا۔

مرزا:۔ چلتا ہوں بنسی دھر۔

بنسی:۔ جی ہاں شطرنج ہے، بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

مرزا:۔ ہمارے لئے تو بچوں کا کھیل ہی ہے۔ لیجئے فرزیں تو گیا۔

بنسی:۔ میاں صاحبزادے ہو ابھی، کچھ خاندان کی پرانی رسم و راہ کا پاس کرتا ہوں۔ ورنہ مات پلا پلاکر نوشیرواں بنا دیتا۔ سوچتا ہوں تمہارے نانا ہمارے نانا ایک ساتھ فوج میں نوکر ہوئے۔ ایک ساتھ نوکری چھوڑی، ایک ساتھ زندگی گزاری۔ اگر دو چار مات پلا دی تو کہوگے کہ پشتوں پرانی دوستی کا پاس نہ کیا۔

مرزا:۔ واہ — واہ — میاں بنسی دھر کیا کہنے ہیں عمر میں مجھ سے دو ایک برس بڑے یا چھوٹے ہی ہوگے باتیں کرتے ہو تو نانا دادا سے کم نوالہ نہیں توڑتے

بنسی:۔ خیر جی مرزا۔ یہ بازی تمہیں اٹھالو۔ مات ہمیں مانے لیتے ہیں اچھا چلو دوسرے بازی لگاتے ہیں۔

مرزا:۔ بس جناب۔ دوسری بازی نہیں۔ آج بلوان سنگھ سے پتنگ کے پیچ لڑانے ہیں۔

بنسی:۔ کون ؟ راجہ بلوان سنگھ وہی گڈر۔ یوں کے کٹڑے والا وہ بھی عمر بھر بچہ رہے گا اور تمہارا بھی یہی حال ہے۔

مرزا:۔ جی بس شطرنج کے سوا تو سارے کھیل گویا لڑکپن ٹھہرے تم بھی ذرا پیچ لڑاؤ تو جانیں۔

بنسی:۔ اماں تو بہ کرو۔ میری سنو تو لعنت بھیجو پتنگ بازی پر۔ راجہ بلاس والے کی حویلی میں مشاعرہ ہے چلے چلتے ہیں۔ بھئی میری تو جان جاتی ہے ان مشاعروں پر۔ اکبر آباد کے شاعر ایران کے شاعروں کو شرماتے ہیں۔ اور اپنے میاں نظیر کا کلام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

مرزا:۔ کہو گے خود ستائی کر رہا ہے۔ بخدا دو چار شعر تو ریختے میں ہم نے بھی کہنے شروع کر دیئے ہیں۔

بنسی:۔ سچ۔

مرزا:۔ پتنگ پر ایک قطعہ لکھا ہے۔ بخدا داد دینے میں کنجوسی نہ کرنا۔ عرض کیا ہے

ایک مثل دن پتنگ کا غذی لے کے دل سر رشتہ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دل براں
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
دل پرستی کر کانپ کر کہا پیچ وتاب
غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

(شعر کے بیچ ہی میں بول اٹھتے ہیں)

غالب:۔ یہی لمحہ میری پیدائش کا تھا مرزا نوشہ سے غالب بننے کا لمحہ جب پہلی بار شاعر بیدار ہوا تھا۔

مرزا:۔ مگر اس لمحے کی سالگرہ کوئی نہیں مناتا۔ میری برسی سب مناتے ہیں۔

غالب:۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ شمع روشنی دیتی ہے اور جل بجھتی ہے اس کی سالگرہ کون مناتا ہے۔

مرزا:۔ احسان فراموش ہو۔
غالب:۔ میں۔
مرزا:۔ ہاں تم، میرا احسان نہیں مانتے کہ غالب کے لئے مرزا نوشہ نے کیا کیا نہیں کیا، ذلتیں سہیں، ہر کس و ناکس کے آگے دامن پسارا، خوشامدیں کیں دست طلب دراز کیا، اپنوں کو اپنا نہیں سمجھا، تاکہ شاعر غالب کو فرصت کا ایک سانس میسّر آجائے، تم فکر سخن کے لئے ذرا سی آسودگی پا سکو،
غالب:۔ آسودگی اور رچین اور تم سے؟ تم نے مجھے زندگی بھر بے قرار رکھا۔ وہ دن یاد نہیں تمہیں۔
مرزا:۔ کونسا دن۔
غالب:۔ جب مدتوں بعد میرے بچپن کا یار بنسی دھر گلی قاسم جان کے چوراہے پر پتہ پوچھتے، پوچھتے میرے گھر پہنچا تھا۔

Flash Back II

(گلی قاسم جان کے قریب ایک چوراہا، رات کا وقت مشعلیں روشن ہیں، بنسی دھر کی عمر اب ۳۵ ۔ ۳۰ برس کی ہے۔ غالب ان سے پانچ سات سال بڑے ہیں۔ داستان گو داستان سنا رہا ہے۔)

داستان گو:۔ جب شہر کے دروازے پر آیا ایک نعرہ لگایا قفل کو تبر سے توڑا اور نگہبانوں کو ڈپٹ کر للکارا کہ اپنے خاوند کو جاکر کہو کہ بہزاد خاں ملکہ مہر نگار اور شہزادہ کامگار کو جو تمہارا داماد ہے، ہانکے پکارے لئے جاتا ہے اگر مردمی کا کچھ نشہ ہے تو با ہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو۔ یہ نہ کہیو کہ چپ چاپ لے گیا نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔

(چاوش اور چوب دار اور کچھ سپاہی آگے آگے دوڑے آتے ہیں۔ برقندازوں کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں "ہٹو بچو۔ دور باش فرنگی ریزیڈنٹ بہادر کی سواری آتی ہے۔" کئی آواز۔ بن لگاتے ہیں۔ بگھی گزرنے کی آواز آتی ہے۔ داستان

کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے)

مجمع میں سے ایک مولانا:۔ صاحبو ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ فرنگی نے جو شعلہ اٹھایا ہے اور اقلیم میں جو غضب ڈھایا ہے آپ حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دن رات نہ جانے کتنے ہندو مسلمان بے دین ہو رہے ہیں۔ مدرسے تباہ، خانقاہیں ویران، دہلی کالج میں علم دین کی جگہ گٹ پٹ سکھائی جارہی ہے۔

بنسی:۔ (ایک تماشائی سے) مجھے نواب اسداللہ بیگ کا مکان پوچھنا ہے۔

ایک اور تماشائی:۔ اماں یہ اسعداللہ بیگ کون ہوئے۔

داستان گو:۔ اماں وہی، مرزا الٰہی بخش معروف کے داماد اسداللہ خاں۔ گلی میں سیدھے جاکر الٹے ہاتھ کو مڑ جانا، وہیں سب پتہ و نشان معلوم ہو جائیگا۔

۔ موضوع بہت سنجیدہ ہے، اور چونکہ مکالموں کا بڑا حصّہ غالب کے خطوط پر مبنی ہے، اس لئے یہ دستاویزی ڈرامہ ہے۔ فلیش بیک میں تو مرزا اور غالب، دونوں کے کردار الگ نہیں کئے جاسکتے۔ یہ ڈرامہ کسی طرح بھی اسٹیج کیلئے موزوں نہیں۔ لیکن جس طرح راجندر سنگھ بیدی کے "سات کھیل" اور کرشن چندر کے "قاہرہ کی ایک شام"، "سرائے کے باہر" اور بیلا باٹلی والا کے کردار والے تینوں کھیل، جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، جب شائع ہوئے تو ان میں بھی اسٹیج کیلئے ہدائتیں ہیں۔ اسٹیج کے لئے ہدائتیں، جیسا کہ ریوتی سرن شرما نے ایک ملاقات میں بتایا، کتاب کے ناشروں کی فرمائش پر لکھی جاتی تھیں، تاکہ تعلیمی ادارے کتاب خریدنے پر آمادہ کئے جاسکیں۔ اور ان ہدائتوں کی وجہ سے کچھ ڈرامے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیج بھی کئے گئے۔ کرشن چندر کے ڈرامے "کتاب کا کفن" اور "شکست کے بعد" بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ریڈیو نے صنف کی حیثیت سے فکاہیہ بات چیت ہی نہیں دی، بلکہ اردو ادب کو خاکے، جھلکیاں اور مزاحیہ ڈرامے بھی دیئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی کے ساتھیوں میں سے سیّد آلِ عبا بھی تھے، جو ریڈیو سے بھی وابستہ رہے، اور ریڈیو ہی میں نہیں، اپنے عہد کے ادب میں حضرت آوارہ

کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ریڈیو کے لئے انھوں نے بہت لکھا۔ خاکوں اور انشائیوں کے تین مجموعے بھی شائع ہوئے [1]۔ یہاں نمونے کے طور پر ان کے ایک مزاحیہ ڈرامے کا ایک حصّہ پیش کیا جا رہا ہے، جو رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ زبان، اسلوب اور کرداروں کے اعتبار سے [2]۔

کوّا چلا ہنس کی چال — آوارہ

بنّن : حضور، نواب اختر مرزا آتے ہیں۔

(آتے ہوئے)

عجائب خان : بڑے گنوار ہو، یوں نہیں کہتے کہ تشریف لائے ہیں۔ یا ٹھہرو۔ یوں کہو۔ نواب اختر مرزا بہادر قدم رنجہ فرمانا چاہتے ہیں۔ چاہلو شہر کے رئیسوں کے آگے میری آبرو لینا چاہتے ہو۔

بنّن : بہت اچھا۔ اب تو وہ آ ہی چکے ہیں۔

عجائب خان : ہائے ہائے۔ لاکھوں طوطے کو پڑھایا . . . پڑھایا . . . آگے کیا ہے، یاد نہیں آتا۔

ریڈیو پروگراموں کے تین بنیادی مقاصد تھے، اور آج بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہی بات ٹیلی ویژن کے لیے بھی درست ہے۔ یہ تین مقاصد ہیں، اور شروع میں بھی تھے: ۱۔ تفریح طبع فراہم کرنا ۲۔ اطلاعات فراہم کرنا اور ۳۔ سامعین کی تعلیم۔ بہت اطلاعات کے لیے خبریں اور خبروں پر تبصرے، خبرنامے وغیرہ۔ تعلیمی پروگراموں کا ایک سلسلہ، جو ابھی تک ہے، اور حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا رول بہت اہم ہے۔ لیکن اس تحقیق کے دائرے سے یہ باہر ہے۔ سماجی تعلیم اور اطلاعات کے نام پر جس طرح میڈیا کو حکمرانوں نے استعمال کیا، اس کا ناجائز استعمال کیا،

---

[1] آوارہ : ۱۔ بے پرکی ۲۔ میرا فرمایا ہوا ۳۔ اپنی موج میں

[2] آوارہ : کوّا چلا ہنس کی چال۔

یہ بھی اس تحقیق کے دائرے میں نہیں، لیکن یہ بات یقیناً موضوع سے تعلق رکھتی ہے کہ میڈیا نے اردو ادب اور صحافت کو کیا اصناف دیں، کیا اسلوب دیئے۔

ڈرامے کے بعد سب سے زیادہ مقبول صنف، جو ریڈیو میں پروان چڑھی، اور جس نے اردو ادب کو بھی مالا مال کیا وہ ہلکی پھلکی بات چیت ہے۔ ریڈیو کی اصطلاح میں یہ Light Talk کہلاتی ہے۔ اس صنف میں خاکے، جھلکی، انشائیے Rambling Essay کا امتزاج ہوتا ہے، لیکن اجزائے ترکیبی کی مقدار مقرر نہیں ہوتی۔ یہ کھری تقریر نہیں بلکہ چٹکیوں سے بھری ہوئی، خود پر ہنسنے اور دوسروں پر ہنسنے، سنجیدہ موقعوں پر مزاحیہ کرداروں اور مضحکہ خیز سچویشنوں میں سنجیدہ کرداروں کا بیان ہوتی ہے۔ اس کے لئے مناسب اصطلاح فکاہیہ بات چیت یا فکاہیہ گفتگو ہے۔ لیکن یہ اصطلاح اسے دی نہیں گئی۔

یہ صنف ریڈیو کی وجہ سے مقبول ہوئی، لیکن یہ ریڈیو کی اختراع نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ منشی سجاد حسین، اور اُن کے "اودھ پنچ" تک پہنچتا ہے۔ سنجیدہ مزاح سے لے کر ٹھٹھول تک، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" سجاد حیدر یلدرم کا ایک مضمون ہے، جو ۱۹۰۰ء میں لہ معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہوا تھا۔

> "ایک صاحب ہیں، جو مجھ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: میاں صاحب عرصے سے میرا دل چاہتا ہے، تمہاری دعوت کروں، مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں، وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں، جب میں جواب دیتا ہوں، تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے، یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں، یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو جب آتے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں، میری نہیں سنتے۔
>
> یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا

لہ سجاد حیدر یلدرم: مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

ہوں:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا!

شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، محسوس یا غیر محسوس طریقے سے سجاد حیدر یلدرم کا یہ مضمون نہ صرف اُردو کے ریڈیو پروگراموں کا ایک اسلوب بن گیا، بلکہ اس اسلوب کے لیئے عنوان بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا اسٹیشن ہو جہاں سے اُردو پروگرام ہوتے ہوں، اور فکاہیہ بات چیت نہ ہوتی ہو۔ اور شاید ہی کوئی اسٹیشن ہو جہاں سے اس عنوان سے سلسلہ وار تقریریں نہ ہوئی ہوں "مجھے بچاؤ"۔ ا۔ میرے دوستوں سے ۲۔ بیوی سے ۳۔ ساس سے ۔ ۴۔ قرض مانگنے والوں سے ۴۔ مشورہ دینے والوں سے ۵۔ افسروں سے ۶۔ ماتحتوں سے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ادھر فکاہیہ بات چیت کا چلن کچھ کم ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ مزاح لکھنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سماج میں اکثریت المیہ کرداروں کی ہے، اور المیہ کرداروں کا مذاق اڑانا معیوب ہے۔ جن کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے، اُن کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں۔ پھر بھی فکاہیہ بات چیت ریڈیو کے لئے لکھی جاتی ہے، براڈ کاسٹ ہوتی ہے، اور براڈ کاسٹ کے ساتھ اس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ رسائل میں بھی یہ چھپتی ہے، اور بڑے فخر سے، صاحب طرز انشاپرداز صرف فکاہیہ بات چیت کے مجموعے بھی شائع کرتے تھے، اور کرتے ہیں۔

پہلے چند نمونے

"پطرس کے مضامین" واحد کتاب ہے، جس کے مصنف کا منصب ایک عظیم مزاح نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں مقرر ہوگیا۔ پطرس، یعنی احمد شاہ بخاری، جب لائنل فیلڈن کے نائب، یعنی ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ تھے، تو انھوں نے آل انڈیا ریڈیو دلّی سے ایک بات چیت نشر کی۔ "کیا معنی رکھتا ہے" سلسلے کی یہ بات چیت تھی، اور موضوع تھا "براڈ کاسٹر ہونا"۔ اس کی ادبی قدر و قیمت یہ تھی کہ "ساقی" کے سالنامے میں، جنوری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں یہ شائع ہوئی۔ ہلہ (حاشیہ اگلے صفحہ)

"براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے"

"کچھ عرصے کا ذکر ہے۔ میں ایک دن اپنے دفتر میں فائل کھولے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے موضع مریدپور کے ایک صاحب کا خط تھا، جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مریدپور میں بھی فوراً دس کیلوواٹ کا ایک ریڈیو اسٹیشن کھولا جائے، ورنہ مریدپور کے ڈیڑھ سو باشندے سب کے سب ریڈیو کا بائیکاٹ کر دینگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جواب میں کیا کہوں، جس سے اس مجاہد کا جوش ٹھنڈا ہو جائے، اور ریڈیو کا محکمہ اس حادثۂ عظیم سے بچ جائے، جس کی وہ دھمکی دے رہے ہیں۔ میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک میرے کمرے میں دلّی کے اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب، مسٹر لکشمانن مع اپنی مونچھوں کے داخل ہوئے۔ میں سہم گیا۔ میں طبعاً بہت ڈرپوک ہوں، اور اسٹیشن ڈائرکٹروں سے تو میں بہت ہی ڈرتا ہوں، کیونکہ یہ اصحاب جب ہمارے پاس آتے ہیں، ہزارہا سننے والوں کے وکیل بن کر آتے ہیں، اور جب کوئی نئی تجویز پیش کرتے ہیں اس کی تمہید یہی ہوتی ہے کہ ہمارے ہزارہا سننے والے، جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمے کی بہبود کا انحصار ہے، یہ چاہتے ہیں کہ یوں ہو، اور یوں نہ ہو۔ اس لئے جب بھی کوئی اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا ساٹھ ہزار ریڈیو کے شائقین مجھ پر دھاوا بولنے والے ہیں — اور پھر میں مسٹر لکشمانن سے تو بہت خوف کھاتا ہوں، کیونکہ وہ ہر وقت بغل میں ایک چھوٹی سی چھڑی دبائے پھرتے ہیں، جو مختصر، مگر ہر لحاظ سے کارآمد معلوم ہوتی ہے۔

لے پطرس: سالنامہ ساقی، جنوری ۱۹۳۹ء: طبعِ ثانی "روشنی"۔ میرٹھ مارچ ۱۹۷۵ء: ص ۱۰ - ۱۳۔

ان کی شکل دیکھتے ہی میں نے کہا: کہیئے حضرت، ہمارے ہزارہا سننے والے، جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمے کی بہبود کا انحصار ہے، آج کیا چاہتے ہیں؟ مسٹر لکشمانن خلافِ توقع ہنس دیئے، جس سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ کہنے لگے: اب کے جو تجویز میں لے کر آیا ہوں، اُس میں سننے والوں کی مرضی کو کچھ دخل نہیں۔ جو تجویز میں آج لے کر آیا ہوں، وہ میری اپنی تجویز ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھ سے ایک حماقت ہوگئی ہے، جس کا خمیازہ اب آپ کو بھگتنا ہوگا۔ ہم نے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے، جس میں باری باری مختلف لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ہونا کیا معنیٰ رکھتا ہے، وہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا مجھے تو یہ کچھ بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن خیر! فرمائیے۔ کڑک کر بولے: تو آپ اکیلے کی رائے ہمارے ہزارہا سننے والوں کے مقابلے میں، جن کی خوشنودی پر —— خیر۔ تو بہرحال، تقریروں کے اس سلسلے میں اب کے براڈ کاسٹر کی باری ہے۔ اس لیئے آپ اس مضمون (موضوع) پر ایک تقریر کر دیجئے کہ براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔!

میں نے کہا: جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں، آپ کے ہزارہا سننے والے، جن کی خوشنودی پر محکمے کی بہبود کا وغیرہ وغیرہ ہے، وہ تو براڈ کاسٹر کو ایک (بے) معنی سا انسان سمجھتے ہیں، تو براڈ کاسٹر کا معنی رکھنا کیا معنی؟ اس پر وہ اس قدر بپھرے کہ غصّے کے مارے زبان میں لکنت آگئی۔ کہنے لگے: بس صاحب میں اپنے سننے والوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں۔ ورنہ میں بھی آپ کو ایسی کھری کھری سناؤں گا کہ آپ سن ہو کر رہ جائیں گے۔ میں نے کہا: اگر آپ حکیم کے مشورے سے مجبور ہیں تو ایسی تقدیر (تقریر) کے لئے مجھ سے کسی بڑے افسر کو انتخاب کرنا چاہیئے —— جن کا کلام سند ہو، اور جو تمام حالات پر ایک بلند نقطۂ نظر سے روشنی ڈال سکیں۔ کہنے لگے: تقریر ہندوستانی میں ہوگی اس لئے کسی بڑے افسر کو تکلیف دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا[1] میں نے کہا: تو پھر جو ہونہار نوجوان ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے ہیں، اُنھیں یہ تقریر کرنی چاہیئے۔ وہ،

---

[1] واضح طور سے یہ طنز لائنل فیلڈن، کنٹرولر براڈ کاسٹنگ پر ہے۔ فیلڈن نیچرل ہنٹ میں لکھتے ہیں 'بخاری کی نظر ان کی کرسی پر تھی' اور وہ فیلڈن کی تحقیر سلیقے سے کرتے تھے۔

براڈکاسٹنگ کی مشکلات کو بھی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، اور اس کی مسرتوں کو بھی۔ میں تو یہاں دفتر میں بیٹھا ہوں۔ فائلوں کی تلاوت میں مشغول رہتا ہوں۔ یہاں نہ مائکروفون ہے، نہ لاؤڈ اسپیکر۔ نہ یہاں اہلِ علم کے قافلے آتے ہیں، نہ اہلِ فن کے طائفے۔ اصل کشتی کے ملاح تو آپ لوگ ہیں، جو رات دن پروگرام وضع کرتے رہتے ہیں۔ میں تو یہاں کنارے پر بیٹھا ہوں۔ میری تقریر میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے، جو آپ لوگوں کی تقریر میں ہو گی۔ اس پر لکشمانن بولے: ہم لوگوں کو آپ نے بے کار سمجھ رکھا ہے، جو ہم تقریریں کرتے پھریں۔ ہمیں ضروری کاموں ہی سے فرصت کہاں ہے؟ — یقین مانیے، اس سے مجھے بے انتہا ندامت ہوئی، لیکن اسے میری طبیعت کی پستی کہہ لیجیے۔ یہ گوارا نہ ہوا، کہ اپنی بے کاری کا اعتراف کر کے تقریر کی حامی بھر لوں۔ چنانچہ میں نے پھر انکار کر دیا۔ — مسٹر لکشمانن یک لخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھا، اور اپنی چھڑی آسمان کی طرف اُٹھا کر بولے: اگر آپ یہ تقریر اپنے ذمّہ نہ لیں گے تو میں — تو میں! — اس کے بعد وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے، اور پھر دانت پیس کر بولے: اگر آپ یہ تقریر اپنے ذمّہ نہ لیں گے تو میں اپنی مونچھیں منڈا لوں گا۔ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور میں پھر موضوع مرید پور کی بڑھتی ہوئی بے چینی پر غور کرنے لگا۔ ———— دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں — مسٹر لکشمانن کی مونچھیں سچ مچ ندارد ہیں۔ وہ مونچھیں جن پر ٹرانسٹر (ٹرانسمٹر) کے کھمبوں کا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ مونچھیں جو دہلی کے مشہور اور

قابلِ دید مقامات میں شمار ہوتی تھیں ...... مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے سوچا، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ مثل ہے، گئی مونچھ پھر ہاتھ آتی نہیں، اور ایک اور مثل ہے کہ اب پچھتائے (پچھتاوے) کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں مونچھ۔ لیکن اب بھی میں تقریر کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو کم از کم اُن سے آنکھیں ملانے کے قابل تو ہو جاؤں گا۔ ورنہ جب مسٹر لکشمانن کے باحمیت چہرے پر نظر پڑے گی، دل چاہے گا جنگل میں دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے ٹیلیفون پر ان سے کہا کہ حضرت میں تقریر کرنے کو تیار ہوں، اور پھر جھٹ ٹیلیفون بند کر دیا۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ مونچھیں منڈوانے کا میری تقریر سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مسٹر لکشمانن کی بیگم صاحبہ نے پہلے ہی سے حکم دے رکھا تھا کہ مونچھیں صاف کرا دی جائیں۔

تو بہر حال یہ وہ حالات ہیں جن کے ماتحت میں بن بلائے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اس لیے میں آپ کی سمع خراشی کے لیے تہہِ دل سے معافی مانگتا ہوں۔ میں اس صاحب ذوق سے معافی مانگتا ہوں، جو مس ٹھمری بائی یا استاد خیال خاں کی آس میں ریڈیو کھولے بیٹھے تھے، اور جن کے لیے میری تقریر سوہانِ روح ہو رہی ہے۔ اُن ہوٹل والوں سے معافی مانگتا ہوں، جن کے خریدار میری تقریر کی وجہ سے ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے ہیں۔ اُن اہلِ زبان حضرات سے معافی مانگتا ہوں جن کو میرا لہجہ ناگوار معلوم ہو رہا ہے، اور جو میری زبان کی غلطیوں پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں[1]۔ ان زبان داں حضرات سے معافی مانگتا ہوں، جو

---

[1] ہر علاقے کا محاورہ اور لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ اہلِ پنجاب نے اردو کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ بعض تنگ نظر "اہلِ زبان" نے اہلِ پنجاب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ مورچہ لینے کے لیے "زندہ دلانِ پنجاب" وجود میں آئی۔ پطرس بھی اس میں شامل تھے، اور کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ایک بار رشید احمد صدیقی

جو ہندوستانی نہیں جانتے، یا کم از کم میری زبان کو ہندوستانی نہیں سمجھتے۔ اس (اُن) میاں بیوی سے معافی مانگتا ہوں جن کی باہمی اخلاص کی گفتگو میں میں مخل ہو رہا ہوں۔ اس اخبار نویس دوست سے بھی معافی مانگتا ہوں کہ جس کے فرض کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اخبار میں میری تقریر کی دھجیاں اڑا دے، لیکن جس کی طبعی شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ میری کوتاہیوں کو نظرانداز کر دے۔ اُس دل جلے سے معافی مانگتا ہوں (ان دل جلوں سے معافی مانگتا ہوں) جنھوں نے ریڈیو لائسنس تک نہیں لیا اور جن کا گناہ اس وقت میری تقریر کی وجہ سے گناہِ بے لذت ہو رہا ہے۔ اور آخر میں ان غائب حضرات سے معافی مانگتا ہوں، جنھوں نے ریڈیو بند کر رکھا ہے اور گھڑی پر نظر جمائے بیٹھے ہیں کہ کب میری تقریر ختم ہو، اور وہ ریڈیو کھولیں۔ تو اب میں کیا کہوں کہ ریڈیو والوں پر کیا گذرتی ہے۔ یا بقول اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کے براڈ کاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن کو اشارہ کافی ہوتا ہے، تو جو کچھ میں اب تک عرض کر چکا ہوں، اس سے آپ اندازہ لگا چکے ہونگے کہ خدا کے ان حقیر بندوں کو، جو آپ کے کانوں کی ضیافت کا سامان مہیا کرنے پر مقرر ہیں، کس رکھ رکھاؤ کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے دو ایک باتیں، جو مجھے اور کہنی ہیں، سوچتا ہوں، کیونکر کہوں، اور کس زبان میں کہوں کہ آپ کی سماعت پر گراں نہ گزرے (گزریں) ریڈیو والوں کو تو آپ نے حکم دے رکھا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھو۔

یہ بھی لطیفہ

جب تقریر نشر کر چکے تو پطرس اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر اندر گئے، رشید صاحب کو واجبات پیش کرنے کے بعد چائے کے لیے اپنے کمرے میں لے گئے وہاں فیض، تاثیر، اور حفیظ جالندھری کو بلا رکھا تھا۔ حفیظ سے ملایا "آپ ہیں جناب حفیظ جالندری"۔ رشید صاحب نے تپاک سے مصافحہ کرتے وقت پوچھا "اچھا آپ جالندھر کے رہنے والے ہیں!"

چنانچہ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ نہ ہو کہ عمرِ عزیز پھونکیں مارنے میں ہی ختم ہو جائے، اور قدم اٹھانے کی نوبت بھی نہ آئے۔ مثال کے طور پر یہی دیکھ لیجیے کہ میں براڈکاسٹر کا حال بیان کر رہا ہوں، لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ کو براڈکاسٹر کا لفظ ہی بیہودہ اور ثقیل معلوم ہوگا۔ لیکن اس میں ہمارا کیا قصور۔ میں اس سے بہتر لفظ کہاں سے لاؤں؟ ریڈیو کے قدردانوں نے، یوں تو ریڈیو والوں کے لیے، وقتاً فوقتاً بڑے بڑے جذباتی نام تجویز کیے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہیں کہ آپ کے سامنے دہراؤں تو آپ ہی کہیں گے کہ وہ دیکھو ریڈیو والوں کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے۔ لہٰذا مجبور ہوں کہ میں بے ہودہ اور ثقیل لفظ استعمال کروں۔ اگر براڈکاسٹر کے بجائے آپ اپنے کو ریڈیو والے کہیں تو لوگ فوراً پوچھنے لگتے ہیں کہ آپ کی دکان کہاں ہے؟ ایک دوست سے میں نے یہ تکلیف بیان کی، تو کہنے لگے: تو کیوں نہیں سوچ ساچ کر کوئی اچھا سا نام اپنے لئے تجویز کر لیتے؟ میں نے کہا: آپ ہی فرمائیے۔ بولے: یہ ریڈیو کا دھندا تو ہوا کا کھیل ہے۔ تم چوکیدار، نمبردار کے وزن پر اپنا نام ہوادار کیوں نہیں رکھ لیتے؟ میں نے کہا: یہ لفظ تو مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ بولے: ذرا غور تو کرو۔ نیا لفظ تو ہمیشہ غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہوا کی مناسبت سے تم ہوادار کا لفظ اختیار کر لو، تو زبان کی کئی اور دقتیں رفع ہو جائیں گی۔ جو لوگ تم لوگوں سے ہمیشہ اپنی تقریریں کرانا چاہتے ہیں، وہ ہوا خواہ کہلائیں گے، اور جو لوگ ریڈیو کی خواہ مخواہ مخالفت کرتے ہیں، وہ گویا ہوا سے لڑتے ہیں۔ اور چاہو تو ان باتوں کو بادِ مخالف کہہ لو۔ جو ہدیہ یا نذرانہ تم اہلِ فن کی خدمت میں پیش کرتے ہو، وہ ہوائی رزق کہلائے گا۔ اور جو شخص گھر میں ریڈیو لگاتا ہے، مگر لائسنس کی فیس ادا نہیں کرتا، وہ جوتی چور کے وزن پر ہوا چور کہلائے گا، یا آدم خور کے وزن پر ہوا خور، اور اس کا یہ جرم عدالتوں میں ہوا خوری کے نام سے مشہور ہوگا۔

میں نے کہا: حضرت، ہم نئے لفظ وضع کرنے سے باز آئے۔ براڈکاسٹر ثقیل اور بے ہودہ سہی، لیکن اس پر سرپھٹول تو نہ ہوگی۔ پہلے ٹرانسمیشن کا لفظ بھی اسی طرح بے ہودہ اور ثقیل معلوم ہوتا تھا۔ جب اس کے بجائے محفل یا مجلس کا لفظ استعمال کرنے لگے تو کسی نے تمغہ تو نہ بھیجا۔ البتہ ایک دیندار بزرگ پیچھے پڑ گئے کہ کیوں صاحب کہاں محفلِ میلاد، اور مجلسِ عزا، اور کہاں ریڈیو والوں کی دھماچوکڑی؟ آپ کو محفل یا مجلس کا لفظ استعمال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ اور بعض حضرات نے کہا کہ کیوں صاحب مجلس کسے کہتے ہیں؟ یہ لفظ تو آج تک ہم نے نہیں سنا، اور نہ ہم جانتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ کوئی آسان سا لفظ استعمال کیجئے۔ اس پر مجلس کی جگہ سبھا کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس پر بھی کسی نے تمغہ نہ بھیجا۔ البتہ چند مہربانوں نے نہایت ملائمت سے یہ ضرور سمجھایا کہ اگر یہ لفظ بدلا نہ گیا تو ہم ریڈیو اسٹیشن کو آگ لگا دیں گے۔ اور کم از کم ایک اسٹیشن ڈائرکٹر یا اس کے بدلے میں دو پروگرام اسٹیشنوں (اسسٹنٹوں) کو قتل کر ڈالیں گے۔ بات پریاں زبان کٹتی ہے۔ ساٹھ ہزار سننے والے ہیں، اور یوں سمجھئے کہ ہر سننے والے نے ریڈیو والوں کے پاؤں میں ایک زنجیر ڈال رکھی ہے، جس کو، وہ، خدا جانے کیا خدشہ محسوس کرکے، وقتاً فوقتاً کھینچتا رہتا ہے گویا ریل والوں کی اس نصیحت پر عمل کرتا ہے کہ اگر اپنی حفاظت چاہتے ہو تو کھینچو زنجیر کو۔ چنانچہ اب خیال آتا ہے کہ ٹرانسمیشن کا لفظ ہی رہنے دیتے تو اچھا تھا۔

میرے دوست یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ میں بھی چپ ہو رہا۔ لیکن میری زبان خاموش تھی۔ دل خاموش نہ تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ کیا سچ مچ ٹرانسمیشن کا لفظ ہی رہنے دیتے تو بہتر ہوتا۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں براڈکاسٹر کی سب سے بڑی آرزو یہ ہونی چاہیئے کہ یہاں کے ریڈیو کو خدا ہندوستان کا ہی رنگ و روغن نصیب کرے۔ کیا یہ محض لاف زنی تھی، یا کیا اس آرزو میں

اتنی قوت نہیں کہ مشکلات کا مقابلہ کر سکے ـــــ دل کے اس
سوال نے مجھے لا جواب کر دیا، اور اب، جب صرف دو تین منٹ
باقی رہ گئے ہیں، میں چاہتا ہوں آپ سے مشورہ کر لوں کہ اس
آرزو کو پورا کرنے کی کیا ترکیب ہے، جس سے اس مشین میں جو
سمندر پار سے یہاں آئی ہے، اور جو ریڈیو کہلاتی ہے، ہندوستانی
دل کی سی دھڑکن پیدا ہو جائے۔ وہ کیا ترکیب ہے، جس سے یہ بات
پیدا ہو جائے کہ جب ساٹھ ہزار یا لاکھ، دس لاکھ یا دس کروڑ
گھروں کے اندر ریڈیو کے لاؤڈ اسپیکر ایک آواز ہو کر بولیں تو آپ
کا کان پہچانے، اور دل گواہی دے کہ یہ ہندوستان کی آواز ہے۔ جو
تہذیب اور فن اس مشین کے ذریعے سے کانوں کے رستے دلوں میں
سرایت کرے، وہ ہندوستان کی بہترین تہذیب، اور ہندوستان
کا بہترین فن ہو، جس سے دلوں میں امنگیں پیدا ہوں اور دماغوں
میں اجالا ہو جائے۔ یہ بات ہو تو براڈ کاسٹر صحیح معنوں میں آپ کا
ہوادار کہلانے کا مستحق ہو گا، ورنہ یہ سب ہوائی باتیں ہیں۔ لیکن
اگر ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے رہے، تو ریڈیو
پر صرف زخمی تہذیب اور سسکتے ہوئے فن کی چیخیں سنائی دیا کریں گی۔
اس لئے بہتر ہے کہ ہم سننے والے، اور بولنے والے، دونوں ایک دوسرے
کے گلے سے اپنا ہاتھ ہٹالیں۔ اپنی کہیں، اور دوسرے کی سنیں۔ کچھ
عرصہ کا ذکر ہے، دلی سے ایک جوشیلا اخبار نکلا کرتا تھا، جس کا نام
تھا "سنادی"۔[1]

اس سے آپ کو بھی انکار نہ ہو گا کہ اس نام میں ایک خوشدلی
(خوش دلی)، اور خوش طبعی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہر شخص
کا اصول یہی ہو کہ "سنادی"، تو تہذیب کو بچانے کے لئے چند ایسے

---

[1] در پردہ، لیکن واضح اشارہ حسن نظامی کے رسالے "منادی" کی طرف ہے۔

لوگوں کو تلاش کرنا پڑے گا، جن کا اصول یہ ہوگا کہ کبھی کبھی سُن بھی لی۔
اگر یہ نہ ہوا تو حق اور راستی، اور خوش مذاقی اور تہذیب یہ سب
خوبیاں گونگی ہو کر رہ جائیں گی۔ اور ریڈیو کی حالت اس بزدل
خوشامدی کی ہو جائے گی، جس کا جھوٹ بھی جھوٹ ہوتا ہے، اور
سچ بھی جھوٹ ہوتا ہے[1] دنیا میں باتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔
ایک تو خدا لگتی بات، اور دوسری وہ بات، جو زمانہ سازی کی غرض
سے، زمانے کی ہوا کو دیکھ کر کی جائے گی۔ گویا ہوا لگتی بات۔ میں سمجھتا
ہوں وہ دن ریڈیو کے لیے موت کا دن ہو گا، جب اس پر ہمارے
ہزار ہا سننے والے، جن کی خوشنودی پر ہمارے محکمے کی بہبود کا انحصار
(ہے) صرف ہوا لگتی بات سننا چاہیں گے، اور خدا لگتی بات سننا گوارا
نہ کریں گے۔ میں نے آج آپ سے خدا لگتی اور ہوا لگتی، دونوں قسم
کی باتیں کی ہیں۔ نہ معلوم آپ کو کون سی باتیں پسند آئیں۔ شاید
دونوں بری معلوم ہوئیں۔ بہر حال بے ہودہ سے بے ہودہ کلام
بھی آخر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب میں بھی اس کلام کو ختم کرتا ہوں۔
مقطع، افسوس ہے، میں نے نہیں لکھا۔"

پطرس بخاری نے ہنسی ہنسی میں، ہلکے پھلکے انداز میں، سننے والوں کے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر، ریڈیو کے رول اور براڈ کاسٹنگ کے بارے میں اہم باتیں بتادیں۔
اسی سلسلے کی ایک اور بات چیت صاحب طرز انشا پرداز، رشید احمد صدیقی نے براڈ کاسٹ کی۔ "شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟"[2]

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ گو معنی نہ رکھنا بھی بعضوں کے نزدیک بڑی پُر معنی بات ہے۔ ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے۔

---

[1] کیا صداقت آفریں جملہ ہے۔
[2] رشید احمد صدیقی: خنداں (مکتبہ جامعہ ۱۹۸۸) ص ۱۹۱ — ۱۹۶۔

لیکن اُن میں مجھ میں فاصلہ اتنا ہے کہ خوامخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔
شاعری کی تقسیم بڑی مشکل ہے۔ اس کو جنس کے اعتبار سے نہیں
تقسیم کر سکتے۔ اس لیے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے۔ جوان،
بوڑھے کے اعتبار سے بھی تقسیم نہیں کر سکتے، کیونکہ آج کل شاعر
منہ زور ہونے کے اعتبار سے، جوان خیالات کے اعتبار سے، بوڑھا اور
اعمال کے اعتبار سے، کچھ غیر جانب دار سا ہوتا ہے، اور یہ حالات ایسے
نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے، آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش
کی جاتے۔ ۔ ایک تقسیم جُثّے اور حلیے کے اعتبار سے کی جا سکتی ہے،
لیکن اس میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کو ہر جُثّے اور حلیے کے
شاعر ملیں گے۔ ایسے شاعر بھی پائے گئے ہیں، جن میں عرض و طول ہے،
حجم نہیں، اور ایسے بھی جن میں حجم ہی حجم ہے، طول و عرض کا گزر نہیں۔
معلوم نہیں آپ آئن اسٹائن کے مشہور نظریۂ اضافیت سے واقف
ہیں یا نہیں۔ یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں۔
آپ بھی واقف نہ ہوں تو بڑی سہولت ہوگی۔ یعنی نظریہ تو رہا ایک جگہ،
ہم آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے ـــ آئن اسٹائن
کے نظریۂ کے ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلے اور رفتار کے
اعتبار سے طول و عرض کا تصوّر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعض
ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے، جو اپنے اشعار کچھ اس دھن سے
پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے صحیح رقبے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے
ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی
عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ B × 1.1 انچوں (؟)
اچھا، آئیے، ذرا سنجیدگی
پر دانت پیسنے کے ہیں۔
سے اس مضمون کی تقطیع کر ڈالیں۔ یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے،
بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو، اور تقطیع دوسروں کی۔ دنیا میں ہر شخص
کھلونے کھیلتا ہے۔ کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں۔ شاعر الفاظ

سے کھیلتا ہے۔ مصوّر رنگ اور خط سے۔ مجسمہ تراش پتھر سے، رقاص حرکت سے، سیاست داں اقوام سے، لیڈر جہلا سے، یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے، تعلیم یافتہ بے کاری سے، بے کاری انقلاب سے، انقلاب زندہ باد سے! خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے۔ الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ تعزیراتِ ہند اور نقشِ سلیمانی، دونوں کا مدار اسی پر ہے۔ قانون اور تعویذ سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ تعزیراتِ ہند کی رو سے سزا ملتی ہے، نقشِ سلیمانی سے محبوب۔ الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے؟ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہے، اور ہم آپ اس سے نت نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔۔ شاعر کا سارا کھیل الفاظ کا ہے۔ اس کھیل کو ہمارے شعرا نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو کبھی معنی میں نہیں تھیں پہلے معنی کے لیے الفاظ کی تلاش تھی۔ اب الفاظ تلاش کر لیجیے، معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ کبھی معنی کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ بڑی ریاضت، بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی، اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔ ان کو ادھر اُدھر کرتے رہیے، ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے، اور جو بچ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔۔ آج کل بیشتر شاعروں کو صرف الفاظ یاد ہیں، جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں، ترتیب دیتے ہیں۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں، جب بحروں اور ترکیبوں کے چرخ پر خود بخود الفاظ آ جاتے ہیں، جن کو لانے میں شاعر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ معنی سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر لیتی ہے۔ سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے، جس کا ایک تخلص ہو یا ایک خاص طرح کا حلیہ، یا مشتبہ قسم کی صحت، بلکہ وہ شعریت ہے، جو سننے والے میں موجود

ہوتی ہے۔ حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل ودماغ کے تاثرات کو بھی اپنے جذبات یا تخیلات کا جزو بنا لیتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر کسی دوا ساز، یا شاعر میں فرق کیا رہ جاتا ہے، جو ہمیشہ چند ادویات ملا کر، عرق، سفوف۔ یا معجون تیار کرتا ہے۔ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے، جو شاعر نہیں، صرف دوا ساز ہوتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں، بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے۔ ان کے اشعار ملکۂ شعر سازی کے اتفاقی یا میکانکی نتائج ہوتے ہیں۔ اب تصور کیجئے ایسے شاعر کا، جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اور مصرعِ طرح یہ ہے۔ فرض کر لیجئے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے، جس کو تیسرے درجے کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر مصرعِ طرح پر زور لگانا شروع کر دے گا۔ اس درمیان میں اس کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کے لیئے پیٹ بھرنے کو روزی (روٹی) اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسّر ہے یا نہیں، نہ دن کو دن سمجھے گا، نہ رات کو رات۔ بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں۔ دوست دشمن سب سے بے نیاز۔ تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھتا پاتال میں اترتا رہے گا۔

شفق سے عبیر، سپیدۂ سحر سے کافور اڑاتا، چاند سورج سے رخسارِ محبوب کی سیر کرتا، ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا، زہرہ کی تان اڑاتا، مریخ سے گھبراتا، قاضیِ فلک سے گلچھپ کرتا، فرشتوں سے آنکھ ملاتا، حوروں کو ورغلاتا، رضوان سے لڑتا، مالک سے کتراتا، قلم سے لکھتا، لوح کو پڑھتا، طوبیٰ وسدرہ پر جھولتا، کوثر وتسنیم میں ڈبکیاں لگاتا، جبرئیل کو صیدِ زبوں بناتا، اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا، میکائیل سے دانہ بدلتا، عزرائیل سے بچتا، پرتوِ خور سے شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا، یک بہ یک زمین پر اتر آتا ہے، اور وہاں بھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم! تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیئے؟

لالہ و گل میں نمایاں ہونے سے۔ جو صورتیں بچ رہی تھیں، اُن سے آداب و تسلیمات کرتا، قارون نے راستے میں جو خزانہ لٹایا تھا، اُسے ٹھکراتا، کسی سوختہ سامان کو فلسِ ماہی سے شمع روشن کرنے کی ہدایت دیتا، ہر موج میں جو صد حلقہ کام نہنگ ہیں، اُن میں قطرے کو گہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا، عین دریا میں حباب آسا نگوپیمانہ کرتا، ساحل کو سفینہ اور سفینے کو ساحل سے، اور دونوں کو سبک سارانِ ساحل سے ٹکراتا، پھر اپنے کرایے کے مکان میں آجاتا ہے، جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے، اور بیوی بچے فاقے کر رہے ہیں۔ یہاں کی دِقت بھی کچھ کم نہیں۔ شعر ہے کہ کسی طرح اپنے پانو، ہاتھ پر کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ کبھی لیلیٰ ہے تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں۔ فرہاد قابو میں آتے ہیں تو جوئے شیر غائب۔ حضرت موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے، تو تجلیِ طور کا پتہ نہیں۔ رودِ نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہاتھ نہیں لگتا۔ محمود ملتے ہیں تو ایاز غیر حاضر۔ محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے۔ بہار آئی تو زنجیر نہیں ملتی۔ ہجر میں مرغِ سحر نہیں ملتا تو اصل مؤذن حائل ہو جاتا ہے۔ مے خانے تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساقیِ مہوش کے بجائے لٹھ بند والنیٹر موجود ہیں۔ عالمِ وحشت میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے مرغیوں اور مویشیوں کو بسا دیا گیا ہے، اور داورِ محشر سے نپٹنا چاہتا ہے تو جمعیتِ اقوام معترض ہوتی ہے۔ ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برا ہوتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے کہیں الف بڑھ گیا ہے کہیں ی دب گئی ہے۔ ایک طرف روزمرہ کا منہ سوجا ہوا ہے، تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے۔ زحافات میں تذبذب ہے تو مصرعوں میں شتر گربگی۔ کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت غرّا رہی ہے۔ بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب

کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں... ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے، تو غزل لے کر مشاعرے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ بہلی میں سوار، نزلہ زکام میں مبتلا، فاقہ کرتے، سردی سے اکڑتے مشاعرے پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا۔ ایک نے مصرع اُٹھایا، سیکڑوں نے نعرہ لگایا، اور ہزاروں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی، جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور و بے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کرکے ایک صاحب کی باری آئی، جن کا لہجہ نکیرین کا، اور شاعری عذابِ قبر سے مشابہ تھی، پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی، جیسے پھانسی کے تختے پر جاتے سے گریز کر رہے ہیں۔ ــــــ لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا، تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا، جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک کے میونسپلٹی کے تمام اندراجاتِ فوتی و پیدائش موجود ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا۔ دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں۔ جنابِ صدر، سکریٹری مشاعرہ، شعرا مصرعۂ طرح، سب کے سب شامیانے کے نیچے گل حکمت ہوگئے... یہ تو ہوا شاعر ہونا۔ اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہونا ہے۔ شاعر ہمیشہ مشاعرے کو برا بھلا کہتا آتا (آیا) ہے، لیکن مشاعرے پر جان دیتا ہے۔ میزبان کو سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنی پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ برف پڑ رہی ہو تو اسے نمونیا کا اندیشہ نہیں۔ آگ برس رہی ہو تو اُسے لُو لگنے کا خوف نہیں۔ لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میزبان کو شاعر کے عجیب و غریب معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی سننے پڑتے ہیں۔ اس کو داد اس طور پر دینی چاہیئے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سُنے گئے، اور

نہ آئندہ اس کی توفیق ہو گی۔ شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں۔ اوّل تو فرمائش اس طور پر کیجئے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں دینے جا رہا ہے، اور شرم، خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا ہے، یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے۔ اس کے بعد موصوف مصرعۂ اوّل پڑھیں گے۔ اسے آپ اٹھائیں، یعنی دہرا دیں۔ آپ کے بعد ممدوح اس مصرعہ کی تکرار کریں گے، اور معاً دوسرا مصرعہ پڑھیں گے۔ مصرعۂ ثانی کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول، اور منہ پھاڑ لینا چاہیئے، دو تہائی پر کلماتِ تحسین ادا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیے، اور بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے ذرا پہلے آہ یا واہ کر کے لوٹ جائیے، اور ہوش میں آنے سے پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجئے۔ اس طور پر کوئی دو درجن شعر سنیئے، اور بغیر ستاتے یا دم لیے چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں چلے جائیے۔ مجھے اس قسم کی ساعتیں (سعادتیں) اکثر نصیب ہوئی ہیں۔ مگر بد نصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ میں لکھا ہوا مصرعہ بھی آنکھ سے دیکھ کر، پہلے ہلے میں غلط پڑھ جاتا ہوں، چہ جائیکہ مصرعہ اُٹھانے کے سلسلے میں، اُسے سنتے ہی دہرا دوں! میری اس کمزوری سے اکثر شعرا واقف ہیں، اور کچھ یہ بھی ہے کہ انھیں اپنا مصرعہ خاصا عزیز ہوتا ہے، اس لیئے مجھے معذور سمجھ کر مصرعہ اُٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہے۔ بد نصیبی سے ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گیا۔ اُن کے یہاں ایک اور بزرگ بیٹھے ملے۔ دوست نے پزیرائی کچھ غیر معمولی مسرت سے کی میرے بیٹھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے زنان خانے میں چل دیئے کہ یہ فلاں شاعر ہیں، آپ ان کا کلام سُن کر بے حد مسرور ہوں گے۔ میں کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب و تسلیمات و خلوص و احترام کے ایسے پینترے شروع کر دیئے کہ میں کچھ نہ کر سکا، اور انھوں نے اپنی بیاض

کی مشین گن میری طرف کر دی۔ پہلے تو ڈر کے مارے چپ رہا، لیکن ان کی آنکھوں میں طیش دلجاجت کے باری باری کچھ ایسے آثار ملے کر داد دینے کے لیے سر بکف ہو گیا۔ وہ مصرعہ کے دو چار ہی الفاظ پڑھ پاتے کہ میں جلدی سے انھیں کو دہرانے لگتا۔ انھوں نے پھر سے مصرعہ شروع کیا، اور میں نے پھر سے انھیں الفاظ کو دہرانا شروع کر دیا۔

کئی دفعہ ان کا اسٹارٹ (ابتداء) بگڑا — تو ایک دفعہ الف ہی ہو گئے۔ جھلا کر بولے: حضرت مصرعہ تو ختم ہونے دیجئے۔ میں نے بھی مری ہوئی آواز سے کہا: قبلہ، پورا کر لیجئے۔ انھوں نے مصرعہ پڑھکر میری طرف دیکھا، تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا، اس کے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی ترمیم کے بعد پڑھ دیا۔ انھوں نے چیں بجبیں ہو کر صحت کر دی۔ میں نے بھی عرق عرق ہو کر صحت کر لی۔ ان کو اطمینان نہیں ہوا، اس لئے انھوں نے پورا مصرعہ پڑھ دیا۔ میں نے بھی پڑھ دیا، لیکن ذرا رک رک کر، جس کی وجہ سے نظم، نثر میں تبدیل ہو گئی۔ میرے اس اضطراری قصور پر انھوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا، اور میزبان باہر نکل آئے۔

یہ سب تو ہوا۔ لیکن اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر یہ بات کیا ہے کہ شاعر اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے یہ اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی مشاعرہ ہی سمجھنے لگے ہیں۔ وہی اناپ شناپ خیالات، جن کو کبھی رقص کر کے، کبھی رو کر، اور کبھی چیخ کر پیش کرتے ہیں۔ کسی کو گالی دے دی، کبھی اپنا قصیدہ پڑھ دیا، خود جی میں خوش ہوئے، دشمنوں کو ہوشیار یا بدگمان کیا، اپنوں نے داد دی، دوسروں نے ڈنڈا سنبھالا، مشاعرے سے اٹھے، تو یہ سمجھا کہ سارے جہاں کو زیر و زبر کر دیا۔"

"خنداں" میں رشید احمد صدیقی کے ۲۹ نشریوں کے اسکرپٹ ہیں۔ ان

میں سے صرف ایک ،یعنی" ہوٹل کا ریڈیو" ایک جھلکی ہے۔ایک مختصر ڈرامہ، جسے فیچر بھی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے جب اصناف کی تشکیل ہورہی تھی ، تو مباحثہ اور مناظرے وغیرہ کو چھوڑ کر، ہر وہ پروگرام جس میں ایک سے زیادہ آواز یں ہوں، فیچر کہلاتا تھا۔یہاں تک کہ ایک بات چیت کو کئی آواز یں پیش کریں تو اسے بھی فیچر کہا جاتا تھا۔ لیکن اب صرف دستاویزی پروگرام کو فیچر کہتے ہیں۔ اور دستاویزی فیچر کی تعریف یہ ہے کہ حقائق ڈرامائی انداز میں پیش کیے جائیں حقائق اور ڈرامہ کا عنصر دونوں کی اہمیت مساوی ہے۔لیکن براڈ کاسٹنگ کے آغاز میں فیچر وہ بھی تھا ،جس کا مسودہ ہوٹل کا ریڈیو ہے۔ رشید احمد صدیقی ان لوگوں میں سے ہیں ،جنھوں نے ریڈیو کے قیام کے زمانے ہی سے اس نئے میڈیم کے لیئے لکھنا شروع کیا۔ خود ان کے اسلوب کے ارتقا میں ریڈیو کے لیئے لکھنے کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اس طرح کہ چھپا ہوا لفظ، فقرہ، جملہ، جملے — عبارتیں اگر فوراً سمجھ میں نہ آئیں تو انھیں دوبارہ پڑھا جاسکتا ہے۔ براڈ کاسٹ میں کچھ دہرایا نہیں جاتا۔ بات بے تکلف ہو اور فوراً سمجھ میں آئے۔ یہ اسلوب ریڈیو کی دین ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ۲۹ ریڈیو پروگرام اتنی ادبی اہمیت رکھتے ہیں کہ انھیں ایک مقتدر ناشر نے کتابی صورت میں چھاپا۔ زیادہ تر مختلف سلسلوں سے تعلق رکھنے والی تقریریں ہیں۔

رشید صاحب کی طرح ایک اور اہم نام ہلکی پھلکی تقریروں کے سلسلے میں مرزا محمود بیگ کا ہے۔ ۱۹۳۶ء ہی سے انھوں نے ریڈیو کے لیئے لکھنا شروع کیا اور چار دہوں تک لکھتے رہے۔ دلّی اور سرینگر اسٹیشنوں کے علاوہ بھوپال، لکھنؤ اور دوسرے اسٹیشنوں کے لیئے بھی انھوں نے تقریریں لکھیں۔ان مزاحیہ، بلکہ فکاہیہ تقریروں کے لیئے تو وہ مشہور تھے ہی، جب ۱۹۵۷ء میں " غدر" کی یادگار منائی گئی تو انھوں نے " بغاوت " اور سو برس پہلے کی دلّی کی تیرہ جھلکیاں فیچروں کے ایک سلسلے میں دلّی سے پیش کیں۔یہ ان کے مضامین کے انتخاب میں شامل ہیں۔[1]

---

[1] مرزا محمود بیگ : مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب (اردو اکادمی، دلّی: ۱۹۸۷ء)۔

اس میں اکیس وہ فکاہیہ تقریریں بھی شامل ہیں، جو مختلف سلسلوں کے تحت انھوں نے لکھیں۔ یہ ان کی ریڈیائی تقریروں کا دسواں حصّہ بھی نہیں ہے۔ مرزا محمود بیگ کا ایک مخصوص اسلوب ہے، اور یہ اسلوب بھی ریڈیو کی دین ہے۔ انھوں نے ریڈیو کو یادگار کردار سے روشناس کرایا، لیکن ریڈیو نے اس کارنامے کے عیوض اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر ان کو بات کہنے کا وہ اسلوب دیا، جس میں کہانی پن ہے، اور جو فوری طور پر بات کی ترسیل کرتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب سے لے کر جملے کی ساخت تک، سب ریڈیو کی دین ہے۔ یہ ہے مرزا محمود بیگ کی ایک فکاہیہ بات چیت:

<u>ہم بہت خوار ہوئے: دولت کی تلاش میں</u>[1]

"ایک زمانہ ہوا کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سُنا تھا کہ ننانوے کا پھیر بُرا ہوتا ہے۔ بچپن کی پڑھی ہوئی یا سُنی ہوئی بات کو آج چالیس پچاس سال کے بعد بالکل صحیح طور پر یاد کرنا تو مشکل ہے۔ مگر جو کہانی تھی، کچھ اس طرح تھی کہ کسی جگہ ایک غریب، بہت غریب میاں بیوی رہتے تھے۔ کُل چار پیسے روز کماتے تھے۔ مگر یہ چار پیسے اُس زمانے کے تھے، جب ایک پیسے میں دو دھیلے، ایک دھیلے میں دو دمڑیاں، ایک دمڑی میں دو ادھیاں، ایک ادھی میں دو گنڈے، اور ایک گنڈے میں چار کوڑیاں ہوتی تھیں۔ اور ایک کوڑی میں بازار سے چیز خریدی جا سکتی تھی۔ زیادہ پرانی بات تو یاد نہیں، لیکن ہم اپنے بچپن میں ایک کوڑی میں ایک دو گڈی، اور مٹھی بھر ہری مرچیں لے آیا کرتے تھے۔ مگر یہ قصّہ دوسرا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ غریب، بہت غریب دو میاں بیوی رہتے تھے۔ کُل چار پیسے روز کماتے تھے، اور خوش رہتے تھے، کھاتے تھے پیتے تھے، ہنستے تھے، اور بے فکری کی نیند سوتے تھے۔ ان کے اس آرام اور بے فکری سے

---

[1] مرزا محمود بیگ: مضامین کا انتخاب: ص ۲۳۶ — ۲۴۰۔

اُن کی بھاوج کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ یہ بھائی اور بھاوج بہت امیر تھے۔ مگر نہ سکھ سے رہتے تھے، اور نہ سکھ کی نیند سوتے تھے۔ بھاوج نے اپنے دیور اور دیورانی کی خوشی سے جل کر یہ چال چلی کہ رات کو چپکے سے دیور کے گھر میں ننانوے روپے کی ایک تھیلی ڈال دی۔ صبح کو غریب میاں بیوی کو یہ تھیلی ملی، تو پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر میں اتنے بہت سے روپے ایک ساتھ نہ دیکھے تھے۔ مگر خوشی کے ساتھ ساتھ ایک خیال دل میں یہ بھی پیدا ہوا کہ لاؤ ان ننانوے کو پورے سو کرلیں۔ اور یہ خیال آتے ہی انھوں نے اپنے اور خرچ روک کر ایک پیسہ روز جمع کرنا شروع کر دیا۔ دو، سوا دو مہینے میں پیسوں کا روپیہ بنا، اور یہ روپیہ ڈال کر ننانوے پورے سو ہو گئے۔ مگر اب لالچ نے دل میں جگہ کرلی تھی۔ خیال آیا کہ محض ایک پیسہ روز جمع کرنے سے ایک روپیہ بہت جلد بن گیا۔ لاؤ، اب دو پیسے روز بچائیں تاکہ جلدی سو کے دو سو ہو جائیں۔ اس کوشش میں نہ پیٹ بھر کر کھایا، نہ پوری نیند سوئے، نہ ہنسے، نہ کھیلے۔ ہاں صبح شام تھیلی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ کفایت کرتے کرتے اتنے کمزور ہو گئے کہ اُٹھ بیٹھ نہ سکتے اور بیشتر اس کے کہ تھیلی میں پورے دو سو ہوں، بیچارے دونوں اپنے پیدا کرنے والوں کو پیارے ہوئے، اور جٹھانی کی جلن ختم ہو گئی۔ کہانی بہت اچھا سبق سناتی ہے، مگر ہم نے اس وقت سُنی جب نہ دل میں دولت کا خیال تھا، نہ دولت نے آنکھوں کو چکا چوند کیا تھا۔ جب بڑے ہوئے، یہ کہانی بھول چکے تھے، اور سب طرف سے یہی آواز آتی تھی کہ دولت ہے تو آرام ہے، دولت ہے تو عزت ہے، دولت ہے تو شرافت ہے۔ دولت سب کچھ ہے۔ دولت نہیں تو خاندانی شریف رذیل ہے۔ دولت نہیں تو انسان کی عزت دو کوڑی کی نہیں۔ دولت نہیں تو انسان انسان ہی نہیں۔ آپ جانیے عقل آتے ہی آتے آتی ہے۔ اپنے چاروں طرف سے جب یہ

آوازیں آتی سنیں، اپنے چاروں طرف جب سب کو دولت کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ اپنے چاروں طرف جب دولت مند بے وقوفوں کو عقلمند دولت مند بداخلاقوں کو نیک اور دولت مند رذیلوں کو شریف کہلاتے دیکھا تو دل میں خیال کیا۔ پورا یقین ہوگیا کہ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں، اور اس کا یقین پیدا ہونا تھا کہ دولت کی تلاش شروع کر دی۔...... شروع شروع میں اس تلاش میں بہت لطف آیا۔ جسم جوان تھا۔ طبیعت بزرگوں کی تربیت کی وجہ سے صاف ہی تھی، اس لئے خوب محنت کی۔ ایک طرف محنت کا لطف، اور دوسری طرف دولت کا بڑھنا۔ خوشی ہی خوشی تھی، مگر انسان کا دل بھی عجیب دل ہے۔...... جنوری ۱۹۳۸ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خبریں، انگریزی اور اردو[1] میں دوسرے اسٹیشنوں سے بھی ریلے کی جاتی تھیں۔ مگر جنگ کی وجہ سے اب ساری زبانوں میں خبروں کا مرکز، دہلی کا دفتر بن گیا۔ چنانچہ انگریزی اور اردو کے علاوہ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، پشتو، تامل، ملیالم اور تلگو میں بھی خبریں دہلی سے براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ . . . . . .
آل انڈیا ریڈیو پر سب سے زیادہ اعتراض، اس کی زبان کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے جو زبان ہندوستانی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے، اُسے باری باری سے اردو اور ہندی، دونوں کیمپوں نے، اپنے اپنے معیار کی کسوٹی پر کسا ہے، اور دونوں طرف سے اس پر اعتراض ہوئے ہیں۔ ریڈیو کی زبان دنیا کے ہر ملک میں تنقید کا نشانہ بنی ہے۔ حد یہ ہے کہ انگریزی زبان، کہ جس کی قدیم روایات، اور تاریخی اسناد کا

---

[1] آغا محمد اشرف سے سہو ہوا ہے۔ خبریں اردو میں نہیں 'ہندوستانی' میں ہوتی تھیں۔ ہندی اور اردو بلیٹن ۱۹۴۹ء میں الگ الگ ہوئے۔

سب کو اعتراف ہے، جب شروع شروع میں ریڈیو کے لیے استعمال ہوئی، تو اس پر بھی سب نے اعتراض کیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اعتراض کرنے والوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ریڈیو کی زبان، بولنے کی زبان ہے Dailect یہ زبان علمی اور ادبی نہیں۔ اس میں انھیں لفظوں اور ترکیبوں کی کھپت ہو سکتی ہے، جن کا چلن عام ہے۔ غیر مانوس اور ثقیل لفظوں کو، ہوا کی لہروں پر چاہے کتنی بار دہرایا جائے، عوام انھیں ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ اور علم زبان کا یہ پہلا اصول ہے کہ جس لفظ پر قبولیتِ عام کی مہر نہ لگے، وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ نئے خیالات اور نئے حالات کو ادا کرنے کے لیئے، ہم قدیم زبانوں کے مردہ لفظوں کو زندہ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اور نہ اس میدان میں ایران و عرب سے مانگی ہوئی غیر مانوس ترکیبیں ہمارے

آغا محمد اشرف اپنے زمانے میں ایک "ریڈیو شخصیت" ہوا کرتے تھے۔ بی بی سی سے اپنے پروگرام "لندن سے آداب عرض" کے لیئے معروف تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی شروع کے دنوں میں وابستہ تھے، لیکن افسر شاہی کی سیاست کی جنگ میں وہ پسپا ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں "ساقی" (دہلی) کے سالنامے میں ان کا ایک مضمون شامل ہے، جس کا عنوان ہے "ریڈیو کے دس سال"۔ اس مضمون سے ریڈیو کے کئی اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اور کچھ باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے "ریڈیو" کے میڈیم نے اہمیت حاصل کی۔ اشرف نے ریڈیو کی زبان کے بارے میں بھی خاص طور سے لکھا ہے[1] آغا محمد اشرف، محمد حسین آزاد کے پوتے تھے۔

"ابھی آل انڈیا ریڈیو کی ترقی کا پروگرام پوری طرح سے سنورنے بھی نہیں پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔

---

[1] آغا محمد اشرف: ریڈیو کے دس سال: مضمون مشمولہ سالنامہ "ساقی" (دہلی)، ص ۴۴۲ تا ۲۳۶ (۱۹۴۶ء)۔

اور ۳ ستمبر کو برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر چیمبرلین نے برطانوی حکومت، نوآبادیوں، اور ہندوستان کی طرف سے، جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان، لندن ریڈیو کے ذریعے تمام دنیا کو سنا دیا۔ اس تاریخ سے آل انڈیا ریڈیو کی مختصر زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، کیونکہ جنگ کے اعلان نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگا دی، اور جنگ کی خبروں کے اشتیاق نے لوگوں کو اخباروں اور ریڈیو کا محتاج بنا دیا۔ "جنگ کی تازہ خبر کیا ہے؟" یہ لفظ ہر شخص کی زبان پر تھے . . . . . اسی دوران میں جرمنی، اٹلی اور جاپان نے ہندوستانی زبانوں میں خبریں سنانے کا بندوبست شروع کیا . . . . دوران جنگ میں ریڈیو کی جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہوئی، اس میں غیر ملکی ریڈیو اسٹیشن کا بہت بڑا حصہ ہے، کیونکہ جنگ کے زمانے میں لوگ جس اشتیاق سے برلن، روم، ٹوکیو، سائگون، سنگاپور (شونان) انقرہ، ماسکو اور لندن کی خبریں سنتے تھے، وہ آل انڈیا ریڈیو کے حصے میں بہت کم آیا تھا۔

سننے والوں کو کھری سی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ لیکن واقعات یاد رہتے ہیں: 'اور جب واقعہ یاد آتا ہے تو وہ تأثر بھی تازہ ہو جاتا ہے'، جو براڈکاسٹر گفتگو میں سامع کو پہنچاتا ہے۔ مرزا محمود بیگ اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں، لیکن اس بات چیت میں، ریڈیو کے لکھنے والے کی حیثیت سے انھوں نے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی۔ اور اسی وجہ سے اسے یقیناً مثالی تقریر نہیں کہا جا سکتا۔

دوسری بات جس کی وجہ سے اس بات چیت کو چنا گیا ہے، وہ اس کی زبان ہے۔ خالص بول چال کی زبان۔ کوئی لفظ ایسا نہیں کہ عام بول چال میں رائج نہ ہو۔ یا جسے سن کر سوچنا پڑے کہ مقرر کیا کہنا چاہتا ہے۔ سامعین کے لیے کسی لفظ کے بارے میں سوچنے کی گنجائش ہی کہاں۔ سیدھے اور صاف جملے، سادہ جملے۔ نہ خیال میں پیچ اور نہ جملے میں۔ جملے میں پیچ اس وقت ہوتا ہے، جب وہ پیچیدہ ہو۔ کئی جملوں کو ملا کر ایک جملہ بنایا گیا ہو۔ بولی جانے والی زبان

کا تحریری اسلوب ہی ریڈیو کا اسلوب ہے۔ جس طرح سرسیّد نے ایک کاروباری نثر اردو کو دی تھی، اور منشی پریم چند کی زبان ادب میں اس کا بہترین نمونہ ہے، اسی طرح ریڈیو نے اُردو نثر کو ایک اسلوب دیا۔ پریم چند تک جو روایت آئی تھی، وہ پھر صنّاعی سے دوسری ڈگر پر پڑ گئی۔ یہ دوسری ڈگر ابوالکلام آزاد، شبلی، نیاز فتحپوری، سجّاد حیدر یلدرم وغیرہ کی ڈگر ہے۔ ادبی نثر، روزمرّے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی تہہ میں جو عناصر کام کر رہے تھے، اُن میں اُردو کے وجود کو بچانے کے لیئے کچھ پُرخلوص "مجاہدینِ اُردو" کا بھی جذبہ تھا۔ مولوی عبدالحق اس لڑائی میں سپہ سالار تھے، لیکن انھوں نے سرسیّد کی روایت کی پیروی کی۔ انھوں نے سادہ، صاف اور بول چال کی زبان لکھی۔ بے تکلف زبان۔ جنگ میں چاہے وہ لسانی میدان میں ہو، صداقت سب سے پہلے زخمی ہوتی ہے۔ یہی اُردو کے ساتھ بھی ہوا۔ براڈ کاسٹنگ نے اُردو نثر میں نئی روح پھونکی۔ "آبِ حیات" میں جو اسلوب محمد حسین آزاد کا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ریڈیو کے لیے اس سے بہتر اسلوب ممکن ہی نہیں۔

"بے چارے بہت جلدی اس دنیا سے چلے گئے تھے، مگر یہاں اتنا غنیمت ہے کہ مرنے سے پہلے نیند سے جاگے۔ آنکھوں کے آگے کے پردے نوچ کر پھینک دیئے تو پتہ چلا کر . . . . . اب آپ کو کیا بتاؤں؟ . . . . آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جس نے دولت کو غلام بنایا، وہ کامیاب رہا۔ اور جو دولت کا غلام ہوا، وہ خوار ہوا۔ جس نے دولت کو باقی اخلاقی قدروں کا ماتحت رکھا، وہ خوش رہا، اور جس نے دولت کے سامنے باقی قدروں کو کھو دیا، وہ خود بھی ایسا کھو گیا کہ دوسرے تو دوسرے، وہ خود بھی اپنے کو نہ پا سکا۔"

مرزا محمود بیگ شروع کے براڈ کاسٹروں میں سے تھے۔ اُن کا تعلق براڈ کاسٹروں کی پہلی پیڑھی سے تھا۔ جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے[1]

---

[1] مرزا محمود بیگ: "ریڈیو پر بولنا کوئی آسان کام نہیں ہے" مشمولہ "بڑی حویلی"

"۔ ۔ ۔ ۔ ریڈیو پر بولنا۔ یوں تو بہت آسان ہے۔ جلدی جلدی لکھا۔ ریڈیو اسٹیشن گئے — مائکروفون سامنے رکھا، اور بولنا شروع کر دیا۔ کتنا آسان معلوم ہوتا ہے یہ کام؟ مگر بس معلوم ہی ہوتا ہے۔ جب کرنا پڑتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ پہلے پہل میں بھی یہی سوچتا تھا۔ سمجھتا تھا، آخر یوں بھی تو آپس میں بولتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں۔ پھر وہاں جا کر بولنا، اور پھر لکھا ہوا پڑھنا کیا مشکل ہے۔ اسی لیئے جب آج سے ۲۸ برس پہلے ۱۹۳۶ء میں جب پہلی دفعہ ہم سے ریڈیو پر بولنے کے لیئے کہا گیا تو ہم بہت خوش تھے ۔ ۔ ۔"

"دولت کی تلاش میں" ان کی فکاہیہ تقریر، دو وجہوں سے، بلکہ دو نکتے واضح کرنے کے لیئے نقل کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ ابتدا تو صحیح طریقے سے، ایک قصّے سے ہوئی، لیکن بعد میں اس میں کہانی پن نہیں ہے۔ صرف تأثرات اور مشفقانہ مشورے ہیں۔ اگر کچھ بیتائیں ہوتیں تو اس کی Anecdotal Value: لطف یہ کہ آنکھوں پر پردے ایسے پڑے تھے کہ جو آنکھیں ہمیں نفرت سے دیکھتی تھیں، ہمیں خیال ہوتا تھا کہ عزّت سے دیکھ رہی ہیں۔ زبانیں ہماری جھوٹی خوشامد کرتی تھیں۔ ہمیں یقین ہوتا تھا کہ ہماری سچی تعریف کر رہی ہیں۔ ۔ اور سب سے بڑا پردہ تو وہ تھا، جس نے حق اور ناحق کی تمیز آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دی۔ جس نے انصاف اور ناانصافی میں فرق کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جس نے اپنا تو اپنا دکھایا، مگر پرائے کو بھی اس طرح دکھایا، گویا یہ بھی اپنا ہی ہے۔ نتیجہ! نتیجہ دولت کا بڑھنا۔

منتخب مضامین (مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب) میں یہ آٹھویں "غیر ریڈیائی" تقریر بتائی گئی ہے۔ اس حصے اور کئی مضامین کی طرح یہ بھی ایک براڈ کاسٹ ہے۔ ۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو یہ تقریر الٰہ آباد سے براڈ کاسٹ ہوئی تھی۔ پہلا ورق بیگ صاحب کے قلم کا پیش ہے۔ مرزا محمود بیگ نے ۱۹۳۹ء میں پہلا براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اسی تقریر میں ذکر ہے۔ کتاب میں تحریف واضح ہے۔

جب حق داروں کا حق مارا جائے گا۔ جب بے انصافی سے کام لیا جائے گا۔ جب جھوٹ کو سچ جتایا جائے گا، تو چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی۔ ہُن برسنے لگا، اور ایسے پتھر پڑے تھے اس عقل پر کہ ہُن کا برسنا کامیابی کی دلیل سمجھ بیٹھے۔ اور یہ کامیابی خود دلیل بنی اس بات کی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔ اگر بے انصافی بری چیز ہوتی، تو کامیابی کیسے ہوتی۔ جھوٹ ہوتا تو ناؤ کیسے چلتی۔ مگر ناؤ تو چلی ہی نہیں، بلکہ کنارے پر پہنچ کر ایک کے دس، اور دس کے سَو کرواتی رہی اس لیئے یقین ہوگیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب سچ ہے، سب انصاف ہے۔ . . . . جی ہاں لطف تو یہی ہے کہ آنکھوں پر پردہ نہیں پڑا، بلکہ عقل پر پردہ پڑا، اور ایسا پڑا کہ کالا سفید نظر آنے لگا، جھوٹا، سچا معلوم ہونے لگا اور اس کی وجہ سے جو کامیابی . . . . مگر یہ کامیابی صرف اس وقت معلوم ہوتی تھی، اب نہیں۔ اس وقت دل ڈرتا رہتا تھا کہ چالاکی کا راز دوسروں پر نہ کھل جائے۔ رات کو نیند نہ آتی تھی کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اپنا کوئی ساتھی نہ تھا۔ صرف وہ رہ گئے تھے، جو اپنے فائدے کے لیئے، دوسرے کے دوست نہیں، بلکہ آستین کے سانپ ہیں۔ دولت نے آنکھوں پر پردے ڈال کر، وہ مٹی خراب کی کہ خدا دشمن کو بھی اتنا ذلیل نہ کرے۔ ننانوے کے پھیر میں پڑنے والے میاں بیوی، چپکے چپکے سمجھاتا رہتا تھا کہ اس راستے پر چلو گے (تو) کھو جاؤ گے۔ دولت مل گئی، تو آرام ختم ہو جائے گا، پر چالیں چلو گے تو رات کی نیند کھو بیٹھو گے۔ ان نئے لوگوں سے نہ ملو۔ یہ صرف دولت کے بھوکے ہیں، ان کو نیکی سے بحث ہے، نہ دولت کے ٹھیک استعمال سے۔ ان کے ساتھ رہو گے، ان جیسے ہو جاؤ گے، اور انسانیت کو بھول جاؤ گے۔ مگر بھلا جب دولت کا نشہ سر پر سوار ہو، تو دل کی اس دوستانہ آواز کو کون سنتا ہے۔ دل کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پرانی

لکیر کا فقیر ہے۔ اس کو آج کل کی ضرورتوں اور آج کل کے طریقوں کی خبر نہیں۔ دماغ اور عقل، سب سے اچھے رہبر ہیں۔ دل کی آواز سنتی تو دولت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس لئے دل بے چارا کہہ کہہ کر ہار گیا، اور ہار کر خاموش ہوگیا۔ اب راستہ صاف تھا۔ لالچ نے اُکسایا، اور دولت کی خواہش نے تڑپایا۔ نیکی اور بدی کا خیال دل اور دماغ دونوں سے ختم ہوا، تو اب . . . . . اب کیا . . . . وہ کچھ، جو نہ کرنا چاہیئے تھا، وہ کچھ کیا، جس کو سوچ کر اب شرم آتی ہے۔ وہ کچھ کیا، جس سے ذلیل و خوار ہوئے . . . . یعنی اب محسوس ہوتا ہے، اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ ہم یہ بھی کر سکتے تھے۔ مگر اُس وقت . . . . . . اُس وقت تو ہوشیاری اور عقل مندی کا احساس تھا۔ خوشامد بھی کی، اور ایسی خوشامد کہ خود اُس کے گزرے زمانے میں ذلّت اور خواری محسوس ہوتی تھی، مگر یہ کہہ کر ختم کر دیتے تھے کہ کیا ہوا، جب خوشامد سے دولت ملتی ہے تو خوشامد میں کیا برائی ہے۔

اور خوشامد ہی ایک برائی ہوتی تو شاید آج شرم کے مارے آنکھیں نیچی نہ ہوتیں۔ مگر ایک طرف خوشامد تھی، تو دوسری طرف غرور، اور غرور بھی ایسا کہ فرعون کا کیا ہوگا۔ چونکہ دولت مل چکی تھی اس لیئے خود اپنی نگاہ میں دولت ہی ایک ایسا معیار تھا، جس سے ہر چیز کو ناپا جاسکتا تھا، تولا جاسکتا تھا، اور چونکہ اس ناپ تول میں ہم پورے اترتے تھے، اس لئے ہم جیسا دوسرا نہ تھا۔ اور ملے تو ہزار کے لیئے بے چین رہتا ہے۔ ہزار ہو جائیں تو لاکھ کے لیئے بیتاب رہتا ہے، اور یہی حال اپنا ہوا۔ محنت سے جتنی آمدنی بڑھ گئی تھی، اگر اس پر قناعت کرتے تو آرام سے رہتے، مگر اس لالچ کا بُرا ہو، جتنی آمدنی بڑھی، لالچ اس سے زیادہ بڑھا، اور پھر . . . . . بس پھر کیا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر اب کہنا شروع کیا ہے، تو سب کچھ ہی کیوں نہ کہہ ڈالوں۔ لالچ نے پہلے تو

جسم کو مجبور کیا کہ اور محنت کرے۔ جتنی برداشت کر سکتا تھا، اس سے کہیں زیادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسم تھکا تھکا سا رہنے لگا۔ بیمار رہنے لگا۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ دوسروں سے ملنا جلنا اس وقت ہی اچھا لگتا تھا جب ملنا جلنا آمدنی کے بڑھانے میں مدد دے۔ اتنا ہی کچھ رہتا تو غنیمت تھا۔ مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ لالچ بری بلا ہے۔ جسم کے ساتھ ساتھ دماغ بھی اس کے جال میں پھنسا۔ اور ایسا پھنسا کہ بھلائی برائی نظر آنے لگی۔ اور برائی اگر آمدنی بڑھائے، تو بھلائی نظر آنے لگی۔ خیال ہوا کہ محنت تو کر کے دیکھ لی۔ اب اس سے زیادہ محنت ہو نہیں سکتی۔ اس لئے آمدنی بڑھانے کے لئے اب عقل استعمال کرنی چاہئے مگر عقل بھی سیدھے راستے سے چل کر ایک حد تک ہی مدد کر سکتی ہے۔ جب اس راستے پر چل کر آمدنی کا بڑا حصہ ختم ہوتے دیکھا، تو عقل نے چالاکی کی شکل اختیار کر لی۔ مگر یہ آج سمجھ میں آیا ہے۔ اُس وقت تو چالاکی ہی صحیح عقل معلوم ہوتی تھی۔ اور جو چالاک نہ تھے، ہمارے خیال میں سیدھے سادھے نہیں بلکہ بدھو تھے۔ چالاکی کا اختیار کرنا تھا، کہ زندگی کی شکل ہی دوسری ہو گئی۔ چالیں کرنے کے لئے ایسے لوگوں سے ملنا پڑا، جو اپنی چالاکیوں میں کامیاب تھے۔ ایسے لوگوں کا ساتھ چھوڑنا پڑا، جو سچے دل سے دوست تھے، مگر چالاک نہ تھے۔ اپنے دل کو بھی بہت سمجھانا پڑا۔ اب کیا بتاؤں، کتنا سمجھانا پڑا۔ آپ جانیے دل تو پرانی تربیت پائے ہوئے تھا۔ اتنی جلدی کیسے بدلتا۔ اس لئے پہلے زور زور سے، پھر کام آ سکتی ہیں۔ سائنس کی نئی ایجادیں، اپنے نام ساتھ لائیں گی۔ جنگ کے لیے ہتھیار جن ملکوں نے ایجاد کیے ہیں، ان کے نام بھی انہیں ملکوں سے مانگنا پڑیں گے۔ ہندوستان کی سڑکوں پر جب ٹینک چلیں گے تو مجبوراً ہمیں انہیں ٹینک ہی کہنا پڑے گا۔ اور جو شخص ایٹم بم کا ترجمہ کرنے کی کوشش کرے گا، اس کی محنت کا جوہر بیکار جائے گا۔"

آغا اشرف نے کھل کر تو ذکر نہیں کیا، لیکن اشارہ واضح ہے کہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں اصطلاحوں کے جو ترجمے ہو رہے تھے، وہ کچھ بہت مفید اور رائج ہونے والے نہیں تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کو سنجیدگی سے کوئی آلۂ مکبر الصوت نہیں کہتا، اور ایٹم بم آج بھی ایٹم بم ہی کہلاتا ہے، جو ہری بم نہیں۔ آج بھی اُردو کے کچھ "بہی خواہ" براڈکاسٹر ہوائی جہاز کو طیارہ اور ائرپورٹ کو ہوائی اڈہ کہنے کہنے کے بجائے ہوائی مستقر کہنے پر بضد ہیں۔ ظاہر ہے اُن کی یہ کوششیں مشکور نہیں ہوں گی۔

اسلوب کیا ہے؟ الفاظ کو ایک خاص طریقے سے عبارت میں برتنے کا طریقہ۔ اسلوب، ایک صاحب طرز ادیب کا بھی ہوتا ہے، ایک عہد کا بھی اور ایک میڈیم کا بھی۔ ریڈیو اپنا اسلوب لے کر آیا، اور یہ اسلوب فراہم اسالیب کے بہترین عناصر لے کر ابھرا۔ یہ اسالیب تھے: ڈپٹی نذیر احمد کی نثر، سرسید کی نثر، حالی کی نثر، خطوطِ غالب کی نثر، محمد حسین آزاد کی نثر، رتن ناتھ سرشار کی نثر، عبدالحلیم شرر کی نثر، منشی سجاد حسین اور ان کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں کی نثر، منشی پریم چند کی نثر، حسن نظامی کی نثر، شاہد احمد دہلوی کی نثر، عظیم بیگ چغتائی کی نثر، سید جالب کی نثر، مولانا ظفر علی خاں کی نثر، اختر حسین رائے پوری کی نثر، فضل حق قریشی کی نثر، امتیاز علی تاج کی نثر، سید انصار ناصری کی نثر، فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے، لیکن جتنی بھی طویل کی جائے گی، مکمل پھر بھی نہ ہوگی۔ تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کے انفرادی اسلوب ہیں۔ ان انفرادی اسالیب میں ایک رشتہ ہے۔ کوئی اہم بات مشترک ہے۔ وہ اہم بات، وہ خصوصیت، عہد کے اسلوب، اور اس کے ارتقا کی نمائندگی کرتی ہے۔ جب میڈیم بدلتا ہے، تو اسلوب میں انقلابی تبدیلی ہوتی ہے، ورنہ ارتقائی تبدیلیاں تو وقت کے ساتھ ہوتی ہی رہتی ہیں، کیونکہ وقت کے ساتھ زبان میں تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اُردو میں جب چھاپہ خانہ آیا تو نثر کے اسلوب میں ایک دم سے اہم تبدیلی ہوئی، کیونکہ اب ادب معدودے چند لوگوں کے لئے نہیں رہ گیا تھا، جن کے پاس مخطوطے نقل کرانے کے وسائل

ہوتے۔ چھاپے خانے کی وجہ سے جب ادب کا پھیلاؤ ہوا، تو ادبی مذاق پر بالائی طبقے کی گرفت بھی ڈھیلی پڑی۔ یہ اثر ختم نہیں ہوا۔ صرف یہ کہ ادب کی گردن پر ان کے ہاتھوں کا شکنجہ نہیں رہا۔ میر تقی میر نے طنزیہ، اپنی بپتا بیان کی تھی:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے!

چھاپے خانے نے "عوام سے تخاطب" کو بنیادی اہمیت کی بات بنانے کے ساتھ یہ بھی لازمی قرار دیا کہ جو کچھ بھی لکھا جائے، وہ "عوام پسند" ضرور ہو۔ اگر عوام پسند ہونے کے ساتھ ساتھ خواص پسند بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس تحقیق کا موضوع ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان ہے۔ چھاپے خانے کے اثرات، جو اسلوب پر پڑے، تفصیل سے ان کا جائزہ لینا اس تحقیق کے دائرے سے خارج ہے۔ لیکن ان معنوں میں یکسر خارج بھی نہیں کہ چھاپے خانے سے جو اسلوب اردو میں اُبھرا، وہی ریڈیو میں بھی برگ و بار لایا، اور "شاخ تراشی" اور "چشم بندی" کے بعد، پھولوں کے رنگوں اور باس میں، اور پھلوں کے روپ اور مزے میں بھی کچھ تبدیلی ہوئی۔۔۔

اردو شاعری کے پہلے دور میں دلی کے شاعر ایہام کے دلدادہ تھے۔ اگر روایت کو مانا جائے تو ولی کا دیوان دلی آنے کے بعد دلی کے شاعروں نے ایہام کو ترک کیا، اور حاتم نے اپنے کلام کا انتخاب "دیوان زادہ" کے نام سے کیا۔ میرزا مظہر جانِ جاناں نے بھی سختی سے اپنے کلام کا انتخاب کیا۔ فارسی اور اردو، دونوں میں پھر کوئی روایت انتخاب کی غالب تک نہیں ملتی۔ غالب کا پہلا دیوان، جو ۱۸۲۱ء میں ردیف وار صاف کیا گیا، انتخاب نہیں تھا۔ یہ بھوپال میں فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں پہنچا، اور نسخہ بھوپال کہلایا۔ اس کے بعد کا دیوان نسخۂ شیرانی کہلایا۔ یہ ۱۸۲۶ء میں نقل کیا گیا۔ اس میں کچھ اصلاحیں ہیں، اور ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام ہے۔ تیسرا نسخہ "گلِ رعنا" ہے، جو ۱۸۲۹ء میں صاف کیا گیا۔ یہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ہے۔ غالب کا پہلا مطبوعہ دیوان ۱۸۴۱ء کا ہے، اور اس میں بہت سخت انتخاب ہے

اردو کلام کا، اور یہ بھی ان کے متداول کلام کی بنیاد ہے۔ یہ کچھ ایسی دوراز حقیقت بات نہ ہوگی اگر اس سختی سے انتخاب کی وجہ چھاپے خانے کو سمجھا جائے۔ فارسی کا چلن ختم یا قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے فارسی کلیات ہی چھپا۔ لیکن اب اردو کے اخبارات بھی، کتابیں بھی تھیں، اور قارئوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے غالب کو ایڈیٹنگ کرنا پڑی۔ خطوں میں ترمیم اور تنسیخ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے شواہد موجود ہیں کہ پہلے تو غالب اپنے اردو خطوں کی اشاعت کے خلاف تھے، لیکن جب اس کے لیے تیار ہوئے، تو انھوں نے خطوں میں حذف و اضافہ کیا، جملے بدلے ——— کیوں؟ صرف اس لیے کہ چھاپے خانے کی وجہ سے تقاضے اور اسلوب بدل چکے تھے، یا بدل رہے تھے۔ خود غالب کا اردو میں خط لکھنے کی طرف ۱۸۵۲ء سے راغب ہونا، چھاپے خانے کی وجہ سے ہے۔ اردو نثر فورٹ ولیم کی کتابوں، منشی کریم الدین کے چھاپے خانے کی کتابوں اور متعدد اردو اخباروں کی وجہ سے اتنی منجھ گئی تھی کہ غالب نے، جو پہلے صرف فارسی میں خط لکھتے تھے، اردو میں خط لکھنا شروع کیے ——— اور ایسے کہ ایک اسلوب کے بانی کہلائے، اگرچہ یہ اسلوب چھاپے خانے کا ہے۔ اس میں غالب نے اپنی خوش طبعی اور شوخ مزاجی کا اضافہ کیا۔ یہ اُن کی انفرادی اسلوب کی پہچان ہے، ورنہ شوخی اور شوخ نگاری "آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد کی پہچان بھی ہے! زیادہ تفصیلات میں جانا موضوعِ تحقیق سے دور لے جائے گا۔

چھاپے خانے نے واضح طور سے اردو کو رواں نثر دی۔ سرسید سادہ، کاروباری، اور فوری طور پر سمجھ میں آنے والی نثر کے بانیوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی پہلی کتاب "آثارالصنادید" کی زبان مسجع، مقفیٰ اور فارسی زدہ ہے۔ سرسید کے بھائی نے جب مطبع قائم کیا، کچھ اس کی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ سرسید نے اصلاحی تحریک چلائی، اور اس کے لئے مضامین لکھے، اور اپنے خیالات چھاپے خانے کے توسط سے دوسروں تک پہنچانا چاہے، تو بول چال کی زبان کو تحریر کی زبان بنایا۔ یہ بات غالب کے خطوں کے بارے میں بھی درست ہے، کہ انھوں نے مکالمہ کو غائبانہ گفتگو بنا دیا۔ یہ گفتگو کا اسلوب محمد حسین آزاد کا ہے۔

ریڈیو کا اسلوب گفتگو کا اسلوب ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیو کی نثر سرسید غالب، اور محمد حسین آزاد کی نثر کی توسیع ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ غالب پر درجنوں فیچر لکھے گئے، جن کے مکالمے، خود ان کی تحریر ہیں، یعنی یہ ان کے خطوں کے جملے ہیں۔۔۔

سرسیّد اور حالی نے اردو کی جس سادہ نثر کو اپنی تحریروں سے فروغ دیا تھا۔ اور جس کے نمونے اس تحقیق کے باب میں موجود ہیں، وہ سادہ نثر پھر تکلف کے ڈھرے پر جا لگی تھی۔ سادہ اور پر تکلف دونوں طرح کی عبارتیں ابوالکلام کی "غبارِ خاطر" میں موجود ہیں۔ ریڈیو نے اُردو نثر کو دوبارہ اس کا رخ سادگی کی طرف پھیرا۔ ریڈیو کے لئے کامیاب تقریریں گفتگو کا تحریری روپ ہیں، اور بے ڈول نثر جنھوں نے لکھی، وہ کبھی کامیاب براڈ کاسٹروں میں شمار نہیں ہوئے۔ آل احمد سرور کا شمار کامیاب براڈ کاسٹروں میں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین جو "تنقیدی اشارے" میں شامل ہیں، ریڈیو نشریے ہیں۔[1]

خواجہ حسن نظامی ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے نہ صرف آل انڈیا ریڈیو کے آغاز سے پروگراموں میں شرکت کی، بلکہ جن کے اسلوب نے ریڈیو کے لیے دوسرے نو خیز لکھنے والوں کو بھی راستہ دکھایا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "سی پارۂ دل" ہے۔ اس کا دوسرا حصّہ دفتر منادی سے جولائی ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں صرف ان کے نشریے ہیں، اور "سی پارۂ دل" کے اس دوسرے حصّے کا نام ہے

سی پارۂ دل

حصّہ دوم

کانا باتی

---

[1] آل احمد سرور: تنقیدی اشارے۔

ان تقریروں کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے ، اور درست لکھا ہے :

"یہ تقریریں اردو زبان کے ایک مخصوص طرزِ تحریر اور طرزِ تقریر کا نمونہ ہیں ۔ قدرت نے میری آواز بھی ریڈیو کے لئے موزوں بنائی ہے ۔"

جو براڈ کاسٹ اس کمیاب کتاب میں شامل ہیں ، یہ ہیں :

گل بانو کی کہانی کی تمہید

آسمان کی آواز میں : ریڈیو کے ذریعے بیربل سے بات چیت (جنوری ۱۹۳۶ء)

بھوتوں کے قصے : (۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء)

بھگت کبیر (۸ مارچ ۱۹۳۶ء)

غالب کا حلیہ (۱۱ فروری ۱۹۳۶ء)

میاں کیا چاہتا ہے (۲۶ فروری ۱۹۳۶ء)

روحانی تأثرات کا عقلی مناظرہ : (۵ ستمبر ۱۹۳۶ء)

خواجہ حسن نظامی اور خواجہ محمد شفیع کے درمیان

یہ مناظرہ آل انڈیا ریڈیو دلی سے نشر ہوا ۔

امام حسین کی شہادت

میرے پانچ بادشاہ

شادی کی بری رسمیں

محرّم کا چاند

پان کی گلوری

بے جان کی زبان ، اور جان کے کان

حضرت امیر خسرو

مہمان بلائے جان

جاٹ کی کھاٹ

کربلا کی آخری رات

بہادر شاہ کے حلال خور کا قصہ

دلّی والوں کے جلیے
رسول کی دُہا کر پا
قدسیہ بیگم (آل انڈیا ریڈیو پشاور کے لیے)

"کانا باتی" میں شامل ان نشریوں کے علاوہ بھی، خواجہ حسن نظامی نے اور پروگرام ریڈیو کے لیے کیے۔ ہفتہ وار "منادی" کے صفحات پر ان کے اور دوسروں کے براڈ کاسٹ شائع ہوتے۔

خواجہ حسن نظامی کی طرح، ملا واحدی، سر عبدالقادر اور فضلِ حق قریشی پہلے دور کے اہم براڈ کاسٹروں میں سے تھے۔

گھریلو جھگڑے

شاہد بھائی۔ سلام۔

۲۴ ستمبر ۱۹۳۴ء کے منادی میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا ایک سوال نامہ شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب مصوّرِ فطرت ہی نہیں قوم کے نبّاض بھی ہیں۔ انہیں تمام ہندوستانیوں کی اور خاص طور پر مسلمانوں کی دشواریوں کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ اور ان کا دماغ ان مشکلات کے حل کرنے میں مصروف رہا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سوال نامہ کا موضوع یہ تھا کہ میاں بیوی کی باہمی زندگی کس طرح خوشگوار بن سکتی ہے۔ کیونکہ آج کل کے گھریلو واقعات عورت و مرد دونوں کے لیے عذابِ جان ثابت ہو رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اکتالیس سوالات میں سے چند کو مدِّ نظر رکھ کر میں نے یہ مضمون لکھا اور سب سے پہلے ۲۰ مئی کی صبح کو دہلی کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے تمام دنیا میں نشر کیا۔ اور اب آپ کی خدمت میں اوراقِ ساقی کے لیے ارسال ہے۔

آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے اپریل ۱۹۲۱ء سے ساقی کی خدمت شروع کی۔ اور مئی ۱۹۳۱ء کے علاوہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرا جس میں میرے خیالات

ساقی کے لئے وقف نہ ہوتے ہوں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ افتخار دنیا کے کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہ ہوا ہوگا کہ اُس نے تقریباً ساڑھے پانچ سال تک مسلسل طور پر اپنے خیالات ایک رسالے میں پیش کئے ہوں۔ (اگر کسی ایڈیٹر نے اپنے رسالے کی اس طرح خدمت کی ہو تو وہ اس زمرے سے الگ ہے) اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ ذاتی واقعات نے مجھے اس درجہ پریشان کر دیا ہے۔ کہ میں اس دیرینہ وضعداری کو زیادہ عرصہ نباہ نہیں سکتا۔ شاید تم یقین نہ کرو۔ کہ آج اِس مضبوط رشتہ کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر مجھے زبردست روحانی تکلیف پہونچ رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی میری چیز مجھ سے چھینی جا رہی ہے۔ مگر دل کی بے چینیوں کے ہاتھوں مجبور ہوں — تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی کسی رسالے کے لیئے قلم اُٹھایا تو وہ صرف رسالہ ساقی ہوگا۔ خدا کرے بزمِ ساقی سے میری یہ کنارہ کشی عارضی ہو۔:.

فضلِ حق قریشی دہلوی

اپنے مضمون کے عنوان کو مدِنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ گھریلو جھگڑوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ اوّل وہ جھگڑے جو ساس بہو کے درمیان ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جھگڑے جو نند بھاوج کے درمیان ہوتے ہیں۔ اور تیسرے وہ جھگڑے جو خود میاں بیوی کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان پر الگ الگ غور کرنا ضروری ہے۔

ساس بہو کی لڑائی زبانِ اُردو میں ایک ضرب المثل بن گئی ہے۔ کوئی گھرانا ایسا نہیں جہاں یہ شکایت موجود نہ ہو۔ اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اس لڑائی کے قصے سننے میں آتے ہیں۔ ساس عورت ہوتی ہے۔ اور بہو بھی عورت۔ اگر ان میں سے ایک ہستی مرد ہوتی تو شاید جنسی اختلاف کو باہمی لڑائی کا سبب قرار دیا جا سکتا۔ بظاہر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور غالباً کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ کچھ عرصہ ہوا میں ایک

ماہر نفسیات کی کارگزاریاں پڑھ رہا تھا۔ ایک واقعہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ لندن کی ایک عورت اپنے لڑکوں کو خوب مارتی پیٹتی۔ اور لڑکیوں کو پیار محبت سے رکھتی تھی۔ اصل سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ بھی کوئی خاص وجہ نہ بتاتی۔ ماہر نفسیات نے تحقیق کے لئے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ خاندانی واقعات کی چھان بین کرتے کرتے اُسے معلوم ہوا کہ جب وہ عورت چھوٹی سی لڑکی تھی تو اپنی ماں کو باپ کے ہاتھوں پٹتا ہوا دیکھتی تھی۔ جو بہت ہی بدمزاج اور ظالم تھا۔ باپ کو مرے عرصہ گزر چکا تھا۔ اور عورت کو وہ واقعات یاد بھی نہیں تھے۔ مگر دماغ کے اس حصّے میں جس کا عمل انسان کی غیر شعوری کیفیات کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس کا اثر باقی تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تمہیں مردذات سے نفرت ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ اور دراصل وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی۔ لیکن واقعات سننے کے بعد اُس پر ایسا اثر ہوا کہ پھر کبھی اس نے اپنے لڑکوں کو سزا نہ دی۔

اس رپورٹ کو پڑھ کر فوراً ساس بہو کی لڑائی کا نقشہ میری نگاہ کے سامنے آگیا۔ عورت جب بہو کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی ہے تو اسے ساس کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ذرا ذرا سی خطاؤں پر اور اکثر بلا قصور اسے ہزاروں صلواتیں سُننی پڑتی ہیں۔ کبھی وہ خاموشی اختیار کرلیتی ہے۔ اور کبھی دو بدو جواب دیتی ہے۔ حتّٰی کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد یا تو ساس صاحبہ اس دُنیا سے کوچ کر جاتی ہیں۔ یا ان کا جوش ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ اور بہو ان واقعات کو رفتہ رفتہ بالکل بھلا دیتی ہے۔ تاہم ایک وقت آتا ہے جب وہی عورت اپنی اولاد کی شادی کرتی ہے اور خود کسی نہ کسی بہو کی ساس بن جاتی ہے۔ فوراً اس کے دماغ کا وہی حصّہ جاگ اٹھتا ہے جس کا عمل انسان کی غیر شعوری کیفیات کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی بہو کو ویسی ہی تکلیفیں دینے لگتی ہے جیسی اس نے ابتدائی زندگی میں خود برداشت کی تھیں۔ دلیل کے طور پر وہ کہہ سکتی ہے کہ بہو پھوہڑ ہے۔ یا زبان دراز ہے۔ یا بدسلیقہ ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی الزام اس کے سر تھوپ دیگی۔ اور بے شک وہ اس سے زیادہ کچھ جانتی بھی نہیں۔ وہ جو کچھ کرتی ہے

بلاارادہ کرتی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا، اور وہ نہیں سمجھتی کہ دراصل تاریخ اپنا سبق دُہرا رہی ہے۔

بڑی بوڑھیوں کو جانے دو۔ اُن کا زمانہ گذر چکا ہے۔ ہاں اگر دورِ حاضرہ کی نوجوان عورتیں اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرلیں کہ وہ اپنی بہوؤں کو تکلیف پہنچانا گناہ کے برابر سمجھیں گی تو یقیناً ان کی بہوویں بھی ساس بننے کے بعد اس قسم کے لڑائی جھگڑوں سے باز رہیں گی۔ اور چند نسلیں گذرنے پر کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ کبھی ساس بہو کے درمیان لڑائی ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام خود عورتوں کو کرنا ہے۔ کیونکہ اُنہی کی اصلاح کے لئے ہے۔

بالکل اسی طرح نند بھاوج کی لڑائی کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ آپ نے اسلامی روایات میں پڑھا ہوگا کہ حضرت حوّا کے ہاں ایک وقت میں دو بچے پیدا ہوتے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ حضرت آدم ایک دفعہ کی لڑکی کا دوسری دفعہ کے لڑکے کے ساتھ اور ایک دفعہ کے لڑکے کا دوسری دفعہ کی لڑکی کے ساتھ نکاح کر دیتے تھے۔ سگے بھائی بہن صرف وہ سمجھے جاتے تھے جو ایک ساتھ پیدا ہوتے ہوں اسی لیے ان میں رشتہ قائم نہ کرتے تھے۔ قابیل نے اسے پسند نہ کیا، وہ اپنے ہی ساتھ پیدا ہونے والی بہن سے شادی کرنی چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جو لڑکی میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ اس پر کسی دوسرے کی نسبت مجھے زیادہ حق حاصل ہے۔ اسی رقابت میں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا۔ جو دنیا میں سب سے پہلا خون سمجھا جاتا ہے۔

یہ روایت سچ ہو یا فرضی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ مگر نفسیات کا ایک مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کہ ساتھ رہتے رہتے بھائی بہن میں قدرتی طور پر اُنس ہو جاتا ہے۔ مگر اخلاقی معاشرتی اور مذہبی اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی بہن یہ آرزو نہیں کرتی کہ اُس کی شادی سگے بھائی سے ہو۔ کیونکہ اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب اس بھائی کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جائے تو اس کو خواہ مخواہ اپنی بھاوج سے رقابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دماغ کی وہی غیر شعوری کیفیت جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اگر کسی عورت

سے پوچھا جائے کہ کیا وہ اپنے سگے بھائی سے شادی کرنی چاہتی ہے تو وہ سوال کرنے والے کو خبطی سمجھے گی۔ حالانکہ وہ نہیں جانتی کہ بلا قصد اس کا یہی جذبۂ رقابت بھاوج کے ساتھ دشمنی کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس اصول کے مطابق یہی جذبۂ رقابت مرد کے دماغ میں بھی پیدا ہونا چاہیئے۔ جب اس کی بہن کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جائے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے بہنوئی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مرد میں محبّت کا مادّہ ہی کم ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ انتقام لینے میں عورت سے بہت پیچھے ہے، فطرتاً وہ سابقہ واقعات کو جلدی بھلا دیتا ہے، مگر عورت یاد رکھتی ہے۔ اور اس ذہنیت کا اثر اُس کی غیر شعوری کیفیت پر پڑتا ہے۔

ایک عورت اگر عمر میں اپنے بھائی سے بڑی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بھاوج پر اپنی بزرگی کا سکّہ جمائے گی اور اسے ہر طرح دبانے کی کوشش کرے گی۔ اگر اس کی عمر کم ہے لیکن بھائی سے پہلے شادی ہو گئی ہے۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ کیونکہ عورت بہ نسبت مرد کے جلد جوان ہو جاتی ہے۔ تو اس صورت میں بھی وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے گی۔ وہ دل میں سوچے گی کہ اصل زندگی شادی کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے میں نے اس منزل میں قدم رکھا۔ میرے ہاں بچّے پیدا ہوئے۔ اس لئے بھاوج پر فوقیت حاصل ہے۔ اسے میرا ادب کرنا چاہیئے۔ بھاوج یہ سوچ کر کہ میرا خاندان اپنی بہن سے بڑا ہے۔ میں بھی رتبہ میں اپنی بہن سے بڑی ہوں۔ لہٰذا اس کو میرا ادب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ احساس ان کو آپس میں لڑنے کے لئے مجبور کرے گا۔ اگر ایک لڑکی اپنے بھائی سے بہت چھوٹی ہے اور ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تو وہ چاہے گی کہ آئندہ گھر کا تمام کام کاج بھاوج کرے۔ اور تمام ذمہ داریاں جنھیں وہ خود انجام دیتی تھی بھاوج کے سر ڈال دیگی، کہ وہ گھر کی مالکہ بنی ہوئی ہے۔ اور بھاوج اپنے آپ کو بزرگ سمجھتے ہوئے ان سے الگ رہنا چاہے گی علاوہ اس کے چھوٹی نند بھائی اور بھاوج کو شادی کی مسرّتوں میں دیکھ کر اُن کی رقیب بھی بن جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے درمیان ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑا ہوا کرے گا۔

میاں بیوی کے باہمی جھگڑے کچھ موروثی خصلتوں پر اور کچھ ذاتی عادتوں

منحصر ہیں۔ ذرا غور سے سوچا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ مرد کے دل میں یہ احساس کہ اُسے عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ ازدواجی زندگی پر بہت بُرا اثر ڈال رہا ہے۔ بے شک مذہب نے مرد کو عورت کا قائدِ اعظم بنایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا بھی اس مسئلہ کو اچھی طرح نہیں سمجھاتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت کو لونڈی کے برابر سمجھا جائے۔ چونکہ بقائے نسل کا تعلق زیادہ تر عورت کی ذات سے ہے۔ لہذا اس پر زندگی کے بعض ایسے دَور بھی گذرتے ہیں جبکہ وہ صحیح و سالم اور تندرست ہونے کے باوجود بیمار اور بے دست و پا نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں قدرتاً اس کا بار مرد کے کاندھوں پر پڑتا ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ دُنیا کا ہر چھوٹا بڑا کام ہزارہا آدمیوں کی متحدہ کوششوں سے تکمیل کو پہونچتا ہے۔ کپڑے کا ایک ٹکڑا لیکر سوچئے کہ ایک شخص نے کھیت میں ہل چلا کر بیج بویا ہوگا۔ دوسرے نے نبولے کے اندر سے روئی نکالی ہوگی۔ تیسرے نے اُسے دُھنک کر سوت کاتا ہوگا۔ اور چوتھے نے بُن کر تیار کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں کسی ایک شخص کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ محض تقسیم عمل ہے۔ اسی طرح مرد اگر روپیہ کمانے کے لئے محنت کرتا ہے تو کیا عورت خانگی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتی؟ کہا جاسکتا ہے کہ مرد گھر کے باہر بڑی محنت و مشقت برداشت کرتا ہے۔ اور عورت گھر کی چار دیواری میں آسان کام انجام دیتی ہے۔ سو یہ قدرت کی مصلحت ہے کہ اس نے مرد کے جسم کو قوی اور عورت کے اعضاء کو کمزور بنایا ہے۔ اولاد کی پرورش ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے اعضاء کا نرم و نازک ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر عورت چاہے تو وہ تمام سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے۔ اور دے رہی ہے جو صرف مرد کے لئے مخصوص ہونے چاہئیں۔ لیکن مرد اس کے برخلاف عورت کے فرائض پورے نہیں کرسکتا۔ نہ وہ بچہ جَن سکتا ہے اور نہ اُسے دودھ پلا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے عورت کو مرد پر فوقیت ہوئی نہ کہ مرد کو عورت پر۔ لہذا خاوند کی غلطی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ہم رتبہ ہی نہیں بلکہ اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ عورت اپنی اس حق تلفی کو محسوس کرتی ہے۔ مگر فطری کمزوری کے باعث خاموش رہتی ہے۔ تاہم دل میں نفرت و حقارت کا مادہ پیدا

ہونے لگتا ہے اور اس کے نتائج بُرے نکلتے ہیں۔ اگر مرد اپنی بزرگی کا خیال دُور کر کے عورت کو اپنے برابر سمجھنے لگے تو اس اعتبار سے گھریلو زندگی میں کوئی جھگڑا پید نہیں ہو سکتا۔

انسان کتنا ہی خوش رہنے کی کوشش کرے اور چین و آرام کی زندگی کا طالب ہو مگر ایسے واقعات ضرور پیدا ہوتے ہیں جن کے اثر سے اس کا دماغ تھک جاتا ہے روح مضمحل ہوتی ہے۔ اور دل غم سے بھر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تفریحات میں حصہ لینا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ دوبارہ مسرت اور شادمانی کی فضا نصیب ہو جائے۔ مگر اس سلسلے میں صدہا شوہر خودغرض ہوتے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ عورت کے دل پر ان واقعات کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اور اس لئے اس کو سامانِ نشاط کی ضرورت نہیں۔ وہ تنہا یار دوستوں کی محفل میں، تھیٹر اور بائیسکوپ میں اور دوسری قسم کی تفریحات میں شریک ہوتا ہے۔ مگر غریب بیویاں صرف گھر کی چہار دیواری میں قید رکھی جاتی ہیں اور کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مرد جب خوشی خوشی گھر آتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کی بیوی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے۔ مرد کی یہ خودغرضی خیال عورت کے دل میں باغیانہ سرکشی کا جذبہ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور وہ چاہتی ہے کہ اگر میں خوش نہیں رہ سکتی تو میرا شوہر ہی کیوں خوش رہے اور اس طرح گھریلو جھگڑے وجود میں آتے ہیں۔ ایسے شوہر بہت کم ہیں جو اپنی بیوی کو شریک حیات سمجھتے ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے۔ جو عورت کو کھانا تیار کرنے والی باورچن، بچوں کو پالنے والی آنا، کپڑا سینے والی درزن، ہاتھ باندھ کر سر جھکانے والی لونڈی۔ آدھی آدھی رات تک مالک کی واپسی کے انتظار میں بیدار رہنے والی نگہبان کتیا تصوّر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ امتیاز خود ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

شادی کے بعد سے بہت تھوڑے عرصے تک ہر شخص کی زندگی خوشی اور مسرّت کی فضا میں بسر ہوتی ہے اور کسی قسم کا کوئی جھگڑا ظہور میں نہیں آتا۔ لیکن اس دور کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔ عموماً سال ڈیڑھ سال کے ختم ہوتے ہی یا ایک دو بچوں کی پیدائش کے بعد سے باہمی رنجشیں شروع ہو جاتی ہیں۔

اور خاص طور پر وہ شادیاں جن کی بنا محبت پر قائم ہو بہت ہی ناکامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ہر مرد سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی روز اول کی طرح ہمیشہ حسین و جمیل اور نوجوان رہے گی۔ حالانکہ ڈالی پر سے ٹوٹ جانے والے غنچوں کا تو ذکر ہی کیا وہ پھول بھی اپنی شگفتگی اور رعنائی کو کھو دیتے ہیں جو انسان کی دستبرد سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر خاص اصولوں کی پابندی نہ کی جائے تو شادی کے بعد عورت کے رنگ اور روپ میں بہت جلد زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اور جلدی پیدا ہونے والے بچوں کی مصیبت اُسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہے۔ مرد چاہتا ہے کہ بیوی بچے بنانے کی مشین بن جائے اور ہمیشہ جوان اور حسین بھی رہے۔ لیکن جب مشاہدہ توقعات کے خلاف ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس تبدیلی کی ذمہ دار صرف عورت ہے۔ حالانکہ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ حُسن جیسی بے حقیقت چیز کا زوال ضروری ہے۔ اگر وہ اس باریک نکتے کو سمجھ لے کہ اصلی حسن عورت کے خد و خال میں نہیں بلکہ خود مرد کی نظر میں ہے تو نفرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے دماغ سے نہیں دل سے کام لیا جائے۔ کیونکہ اس مقصد کے لئے عقل کی بجائے جذبہ خلوص و محبت درکار ہے۔ عموماً بچوں کی پیدائش کے بعد بیوی سے محبت کم ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ اولاد کے ساتھ خون کا تعلق بھی قائم ہوتا ہے۔ مگر یہ کج فہمی ہے۔ جس طرح ایک تصویر کی وقعت خود اس کے مصوّر سے زیادہ نہیں ہو سکتی اسی طرح ماں سے زیادہ بچوں کا خیال کرنا حماقت ہے۔

اکثر بچوں کی پرورش کے دوران میں بھی نت نئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر بچہ رو رہا ہو یا ماں تربیت کے طور پر اُسے دھمکائے یا سزا دے تو مرد سمجھتا ہے کہ بیوی کو میرے بچوں سے دشمنی ہے۔ حالانکہ ماں کی ممتا مشہور ہے۔ اس کا سبب یہ تعصب دماغی ہے کہ مرد اپنی اولاد کو صرف ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ حالانکہ بیوی نہ صرف برابر کی شریک بلکہ ایک حد تک زیادہ حقدار ہے۔

رقابت بھی اکثر دفعہ گھریلو جھگڑوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر مرد نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہیں تو عورت کے لئے سوکن کا جلاپا عذاب جان بنا رہتا ہے۔ یا دوسری صورت یہ کہ مرد اپنی بیوی سے چھپ کر

کسی غیر عورت سے خواہ وہ بازاری ہو یا خانگی ناجائز تعلقات قائم کرلیتا ہے۔لیکن یہ راز کبھی چھپا نہیں رہتا اور کسی نہ کسی طرح بیوی کو علم ہو جاتا ہے۔ عورت دنیا کی ہر مصیبت جھیل سکتی ہے مگر اسے یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ کوئی دوسری عورت اُس کے خاوند کی محبت میں شریک ہو۔ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے۔لیکن اس کی شرطیں اتنی سخت ہیں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان پر عمل کرنا قطعی ناممکن ہے۔ اور اس طرح صرف ایک ہی شادی جائز رہ جاتی ہے۔ مردوں کی یہ زبردست غلطی ہے کہ وہ غیر عورتوں سے تعلق قائم کرنا گوارا کرلیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی بیویاں بھولے سے کسی کے سامنے بے پردہ ہو جائیں تو غصہ آجاتا ہے۔ اُنھیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ اگر عورتیں بھی اسی طرح غیر مردوں سے تعلق قائم کرلیں تو خود ان کی کیا حالت ہوگی۔ وہ عورت کی نگاہ سے اپنے افعال کا جائزہ لیں تو یقیناً اپنی غلطیوں کو محسوس کرلیں گے۔ عورت کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کے خاوند کی توجہ کسی دوسری طرف ہے تو وہ خاموش نہ رہے اور نہ اس رقابت کو نفرت و حقارت کی شکل میں بدل جانے کا موقعہ دے۔ بلکہ اُسے چاہیے کہ خاوند کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرکے اسے ان افعال سے باز رکھنے کی کوشش کرے دل ہی دل میں جلنے اور نفرت کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ بعض دفعہ مرد اسی خیال میں رہتا ہے کہ میری بیوی میری بدچلنیوں سے ناواقف ہے۔ اگر بھید کُھل جائے اور بیوی اپنے حقوق کا واسطہ دے کر التجا کرے تو مرد کا راہِ راست پر آجانا ممکن ہے۔

بعض دفعہ عورت کو اس بات کی شکایت رہتی ہے۔ کہ خاوند اس کی آسائش اور ضروریات کا خیال نہیں رکھتا۔ عموماً تہواروں یا اور تقریبوں کے موقعوں پر اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اچھا لباس نہ ہو یا تیل عطر اور چوڑی مہندی وغیرہ کی کمی ہو تو عورت کو رنج ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس کی غلطی ہے۔ اگر خانہ داری کے سلسلے میں وہ یہ کہہ سکتی ہے کہ گھی ختم ہوگیا ہے۔ اسکا نہیں ہے۔ کوئلے منگائے جائیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ذاتی چیزوں کے لئے خاوند کو توجہ نہیں دلاتی۔

اکثر چھوٹی موٹی باتیں بھی بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کرلیتی ہیں کیونکہ

شروع سے ان کی روک تھام نہیں کی جاتی۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے سے شکایت ہو تو جلدی ہی صفائی کر لینی چاہیئے۔ اس کو زبان پر لے آنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ دل میں رکھنا نہیں چاہیئے۔ ایسی باتوں کی صفائی جان پہچان والوں کے سامنے نہیں بلکہ تنہائی میں ہو تو نتیجہ معقول رہتا ہے۔ علاوہ اس کے گفتگو میں سختی یا تیزی برتنے کی بجائے نرمی سے کام لیا جائے تاکہ غصہ نہ آنے پائے بلکہ سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ آپس میں رواداری بھی نہایت ضروری ہے۔ معمولی معمولی باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ زیادہ شکوہ و شکایت بھی ناگوار گذرتے ہیں۔

ضروری ہے کہ میاں بیوی کبھی ایک دوسرے سے بدگمان نہ ہوں۔ میاں کو بیوی پر اور بیوی کو میاں پر پورا پورا اعتماد ہونا چاہیئے۔ اگر چال چلن یا کسی اور بات کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو خود تحقیق کرنے سے پہلے اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ بعض دفعہ رشتہ داریاں یا جان پہچان کے لوگ محض فساد پیدا کرنے کی غرض سے غلط اطلاعیں دیتے ہیں۔ تاکہ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو اور اُن کا دلی مقصد بر آئے۔ یا اس لڑائی سے لطف حاصل کر لیں۔ وقت نکل جانے کے بعد پچھتانا پڑتا ہے لیکن جیسی پشیمانی دل کے اندر بیٹھ جانے والی نفرت کو مشکل سے دُور کرتی ہے۔ لہذا اس کا خیال پہلے ہی سے ہونا چاہیئے۔

گھریلو جھگڑوں کی ایک بڑی ذمہ داری ہمارے ناقص تعلیمی نصاب پر بھی ہے۔ مدرسے میں نوجوان لڑکیوں کو حسن دوبالا کرنے کے صدہا طریقے بتا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ایسی تربیت کم دی جاتی ہے جس سے اُن کی فطری کمزوریاں دُور ہوں اور اُن کی ازدواجی زندگی چین و آرام سے بسر ہو۔ عورت ہو یا مرد اگر کسی کو خوشی اور مسرت نصیب نہیں ہے تو دنیا کے تمام عیش ہیچ ہیں۔

فضلِ حق قریشی دھلوی

شعری ادب کا بہت اہم سرمایہ، جو صرف ریڈیو کی وجہ سے تخلیق ہوا، شائع نہیں ہوا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ ضائع ہوگیا، لیکن سرِدست اسے نایاب اور کم یاب کے درمیان کسی جگہ رکھ سکتے ہیں۔ بہت سی معروف شخصیتوں کے کلام میں ان کو جگہ نہیں دی گئی ہے، اور بہت سی شعری تخلیقات صرف شعرا یا اُن کے وارثوں کے پاس مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔ ہر غزل یا نظم، جو ریڈیو یا ٹیلی وژن کے پروگرام میں شامل کی گئی، اس ذیل میں نہیں آتی۔ لیکن جو خاص پروگرام ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھے گئے، اور اعلیٰ معیار کے ہیں، وہ یقیناً ادب کو ان ذرائع ابلاغ عامہ کی دین ہیں۔ جگر مرادآبادی کی ایک ایسی ہی تخلیق کا پتہ کتابوں پر ایک تبصرے سے ہوتا ہے، جو محمد حسن نے لکھا ہے[1]

"جگر مرادآبادی کے چاہنے والوں میں ایک محترم نام تھا مصطفیٰ راہی کا۔ وہ بھی اب نہیں رہے۔ مگر اُن کی تازہ کتاب اُن کی جگر پرستی کا ایک اور نمونہ ہے۔ — 'باقیاتِ جگر' کے نام سے جگر صاحب کا ایسا کلام، جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے مصطفیٰ راہی نے بڑی محنت اور جستجو سے جمع کر دیا ہے۔ . . . . . اور آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈکاسٹ ہونے والے غنائیے کا وہ حصّہ بھی ہے، جو جگر صاحب نے نظم کیا تھا۔ کہانی تھی مرزا فہیم بیگ چغتائی کی، اور اس غنائیے کے دوسرے حصّوں کو لکھنے والے شعرا تھے، آرزو، نوح (ناروی) اور آسی الدنی۔"

اس تبصرے سے آرزو لکھنوی اور نوح ناروی، اور فہیم بیگ کی ریڈیو کو دین کا پتہ چلا۔ یقیناً انھوں نے اور دوسرے شعرا نے بھی لکھا ہوگا، جو ریڈیو میں محفوظ نہیں۔

کشمیر کے صحافی اور شاعر قیصر قلندر اس صدی کا پہلا نصف ختم ہونے سے کچھ پہلے ریڈیو کشمیر کے عملے میں شامل ہوئے، اور ترقی کرتے ہوئے

---

[1] محمد حسن، کتابوں کی باتیں (عصری ادب، دلی، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۶ء)۔

آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ موسیقی سے بھی ان کو شغف تھا، اور ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک انھوں نے ۷ تصوریے منظوم ڈراموں کی صورت میں لکھے۔ یہ سات تصوریے ہیں:

شمعِ راہ
موت کا مسافر
ایک شام
خوابِ رازِ تمنا
تلاشِ آدم
پری محل کا خواب
اور تلاشِ سکوں

"شمعِ راہ" بائرن کی نظم "دی پریزنر آف شیلان" اور موت کا مسافر کولرج کی "اینشنٹ میرینر" پر مبنی ہیں۔ یہ ساتوں منظوم پروگرام "سازِ جمال"[1] کے روپ میں شائع ہو چکے ہیں۔

آج، جب ٹیلی ویژن نے باصرہ کو مستحکم اور متخیلہ کو سکیڑ دیا ہے، ان تصوریوں کو نہیں، بلکہ اس صنف کو شاید بہت اہم نہ سمجھا جائے۔ لیکن کشمیر کی سرد اور طویل پہاڑوں کی راتوں میں، جب ہر رات اماوس جیسی رات ہو ۱۹۵۰ — ۱۹۶۰ کے دہے میں یہ غنائی فیچر بہت شوق سے سُنے گئے۔ کیونکہ گھروں میں بجلی کی روشنی ہوتی بھی تھی تو اتنی مدھم کہ اس میں بلب کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کتاب کے حرف تو کیا، ساتھ بیٹھے ہوئے کے خد و خال بھی تصور ہی سے واضح ہوتے تھے۔ "سازِ جمال" کشمیر کے اردو ادب میں ایک اضافہ ہے، اور یہ ریڈیو کی دین ہے۔

سلام مچھلی شہری پہلے اسکرپٹ رائٹر اور پھر پروڈیوسر کی حیثیت سے، آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ وابستہ رہے۔ کوئی تیس برس انھوں نے ریڈیو کے لئے

---

[1] قیصر قلندر: سازِ جمال (کلچرل ریسرچ سوسائٹی، سرینگر) ۱۹۶۲ء

پروگرام لکھے۔ زیادہ تر منظوم فیچر۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے مسوّدے لکھنؤ اسٹیشن میں محفوظ نہیں ہیں۔ البتہ جو گیت انھوں نے ریڈیو کے لئے لکھے تھے، وہ "پائل" کے نام سے ساقی بکڈپو دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔

ترلوک چند کوثر نے بھی ریڈیو کے لئے کئی میوزیکل فیچر لکھے تھے۔ لیکن وہ بھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔

"شکنتلا"[2] (کالی داس کے ڈرامے) کے کئی ریڈیو روپ ہوتے۔ ساغر نظامی نے سارے ترجموں کو سامنے رکھ کر ایک بڑا ڈرامہ لکھا۔ اسے ترجمہ نہیں، ریڈیو روپ ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتابی روپ میں بھی شائع ہوا، اور اسے بجا طور پر اردو کو ریڈیو کی دین کہہ سکتے ہیں۔

"انارکلی"[3] ایک ایسا "تاریخی" قصہ ہے، جس کی کوئی تاریخی اساس نہیں۔ امتیاز علی تاج نے یہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے لکھا، جو لاہور سے نشر ہوا۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ ساغر نظامی[4] نے بھی یہ کہانی ڈرامے کی صورت میں ریڈیو کے لئے لکھی، یہ کتاب کے روپ میں بھی شائع ہوئی۔

رفعت سروش عرصۂ دراز تک ریڈیو سے وابستہ رہے، اور سینیئر پروڈیوسر کے عہدے سے، تقریباً ۳۵ برس کی خدمات کے بعد سبکدوش ہوئے۔ بقدرت کے مطابق، کم و بیش ہر فارمیٹ کے پروگرام انھوں نے لکھے۔ "عروجِ آدم"[5] ان کے پانچ ریڈیو ڈراموں اور تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ آغاز میں "روحِ تاشقند" کے عنوان سے ایک نظم ہے، جس میں امن کے سلسلے میں نانک، چشتی، اقبال اور جواہر لال کا ذکر ہے، کہ امن ان سب کا پیغام تھا۔ "نغمہ جوامر ہے" ایک طویل نظم ہے، اور جواہر لال کی عظمت اور محبت اس کا مرکزی خیال ہے۔ "نئی صبح" اور "شعورِ حیات" تمثیلی ہیں، اس لئے ان میں شاعرانہ اظہارِ بیان

لہ سلام مچھلی شہری : پائل

٢ه ساغر نظامی : شکنتلا ٣ه امتیاز علی تاج : انارکلی

٤ه ساغر نظامی : انارکلی ٥ه رفعت سروش : عروجِ آدم

کی زیادہ گنجائش نکل سکی۔

"میری صدا کا غبار"[1] رفعت سروش کا مجموعۂ کلام ہے، جس میں ایک ریڈیائی ڈرامہ "زمین آدم" بھی شامل ہے۔ نظم "میری صدا کا غبار" جو اس مجموعہ کا نام ہے، ایک ریڈیو ڈرامے کی خود کلامی ہے۔

"اسی دیوار کے سائے میں"[2] سات ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے، لیکن ان میں اسٹیج کے لئے ہدایات بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک "انارکلی" بھی ہے۔

عابد سہیل جانے مانے افسانہ نگار ہیں۔ ان پندرہ کہانیوں کا مجموعہ، جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا "سب سے چھوٹا غم ہے"۔ یہ سب کہانیاں ریڈیو کے لئے لکھی گئی تھیں۔ یہ کہانیاں ہیں:

سب سے چھوٹا غم
نوحہ گر
منیر کی اماں
پیاسے
روح سے لپٹی آگ
میں اور میں
اندھیرے کا کرب
سچے جھوٹے موتی
چھوٹے لوگ
میرے بعد
دوسرا آدمی
وہ ایک لمحہ
مدد کا خواستگار

---

[1] رفعت سروش : میری صدا کا غبار
[2] رفعت سروش : اسی دیوار کے سائے میں

بفائن
اور نیاسفر

عابد سہیل ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔ "موٹر کار بگھی اور شکار" اور "بے وقوف کی تلاش" کے عنوان سے اُن کی جھلکیاں کئی بار دوردھ بارتی سے نشر ہوئی ہیں۔

اقبال مجید کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "بھیگے ہوئے لوگ" میں دو افسانے "آئینہ در آئینہ" اور "شوکیس" ریڈیو کے لئے لکھے گئے تھے۔ دوسرے مجموعہ "ایک حلفیہ بیان" میں ان کی کہانی "پوشاک" بھی شامل ہے، جو ریڈیو کے لئے لکھی گئی تھی۔ سوویت یونین میں غیر ملکی مصنفوں کی تخلیقات کا جو انتخاب ترجمہ کر کے روسی زبان میں شائع کیا گیا اس میں یہ کہانی بھی شامل ہے۔

انیس رفیع نئی نسل کے صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ ترمیم شدہ اکٹوپس، پہاڑ ٹوٹ رہا ہے، ماجرا، بنیاد ایسے افسانے ہیں جو انھوں نے ریڈیو کے لئے لکھے۔ انھوں نے کلکتہ اور گورکھپور اسٹیشنوں کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ ان میں ۲۵ کڑیوں کا ایک سیریل "ماسٹر جی" اور ۵ کڑیوں کا ایک سیریل "پٹارا" بھی شامل ہے۔

ادبی موضوعات پر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے جو تقریریں ریڈیو سے نشر کیں، وہ "ادب کیا ہے" کے نام سے مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔[1]

ریڈیو کی ادبی اور ثقافتی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ کلیم الدین احمد نے ایک کتاب لکھی "ریڈیو اور کلچر"[2]

ہر ریڈیو پروگرام میں فوری دلچسپی کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ریڈیو بات چیت میں تو یہ عنصر اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ عنصر نہ ہو تو بات چیت کوئی کیوں سُنے۔ فوری دلچسپی موضوع کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی اہم موضوع ہے تو اخباروں میں اس پر کٹ ہونا ضروری ہے۔ موضوع کی اہمیت کے ساتھ اگر براڈکاسٹر کے نام میں بھی کشش ہو تو

---

[1] نورالحسن ہاشمی : ادب کیا ہے
[2] کلیم الدین احمد : ریڈیو اور کلچر

بات چیت سنی جاتی ہے۔ اور براڈکاسٹر، سامعین سے براہِ راست گفتگو کرکے اس دلچسپی کو سننے والے کے لیے ذاتی بنا دیتا ہے۔ کوئی دلچسپ واقعہ بات چیت میں ضرور بن لیتا ہے۔ واقعہ، سپاٹ بیان کے مقابلے میں یقیناً دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح چبھتے ہوئے فقرے، کچھ مزاح، کچھ برجستہ گوئی، اور پھر ان کا موضوعِ حاضر سے گہرا تعلق، بات چیت کو زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔ کھری گفتگو، جس میں اعداد و شمار لپٹے پڑے ہوں، یا ایک سے زیادہ نکتے ہوں، کوئی سننا نہیں چاہتا۔ ایک نکتہ ہو، تو اس سے بات چیت کو مرکزیت ملتی ہے، اور سامع کی توجہ بھی برقرار رہتی ہے۔ ہلکی پھلکی بات چیت، یعنی فکاہیہ بات چیت زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ فکاہیہ صرف ہنسی ٹھٹھول نہیں، بلکہ ہنسی ہنسی میں، بڑی بات کہنے کا فن ہے۔ اندازِ بیان ہلکا پھلکا ضرور ہوتا ہے، لیکن سماجی، عالمی اور فکری مسائل، سنجیدہ مسائل بھی اس میں سمیٹ لیے جاتے ہیں۔

ریڈیو ٹاک میں تکرار نہیں ہوتی۔ کوئی جملہ دوبارہ نہیں آتا۔ لیکن اچھے براڈکاسٹر جانتے ہیں کہ نکتہ اگر مشکل ہے، تو دہرائے بغیر کس طرح کسی اور زاویے سے اس پر روشنی ڈالی جائے، تاکہ بات ذہن نشین ہو جائے۔ بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں، جن پر سیر حاصل گفتگو دس یا پندرہ منٹ کی ایک نشست میں نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں موضوع کو ذیلی موضوعات میں بانٹ دیتے ہیں، اور اس طرح سلسلہ وار بات چیت کا آغاز ہوا۔ یہ اردو ادب کو ریڈیو کی دین ہے۔

بات چیت، فکاہیہ بات چیت اور سلسلہ وار بات چیت کے علاوہ بھی، ریڈیو نے کچھ ادبی اصناف کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ریڈیو ڈرامہ ہے۔ ڈرامے کے سلسلے میں کسی قدر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ڈرامہ ریڈیو سے ٹی وی پر بھی کیا گیا اور رفتہ رفتہ سنیما کے زیادہ قریب ہو گیا۔ کلوز اپ پر زور کے ساتھ۔

تیسری اہم صنف فیچر ہے۔ شروع شروع میں ہر وہ پروگرام فیچر کہلاتا تھا، جو ایک سے زیادہ آوازوں میں ہو، اور مقررہ اصناف میں سے کسی کے تحت

نہ رکھا جاسکتا ہو۔ رفتہ رفتہ اس کے بارے میں غور کیا گیا۔ پہلے تو اگر بات چیت بھی ایک سے زیادہ آوازوں میں پیش کی جاتی تھی، تو فیچر کہلاتی تھی۔ فیچر کی تعریف یہ طے ہوئی کہ حقائق کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنا فیچر ہے۔ ریڈیو فیچر کو بعد میں دستاویزی فیچر کہا جانے لگا۔ اور اب اسے ریڈیو ڈاکومنٹری کہتے ہیں ٹیلی ویژن میں فیچر فلم کی وجہ سے، اس میڈیم میں فیچر کا تصوّر مختلف ہے۔ حالانکہ شروع شروع میں ریڈیو کی ہی تعریف وہاں بھی رائج کرنے کی کوشش ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی، ایک ہی ڈائرکٹوریٹ جنرل کے تحت تھے، اور ریڈیو کے عملے ہی کو ٹی وی چلانے کی ذمہ داریاں دی گئیں۔ چنانچہ بہت عرصے تک "فوٹو فیچر" کی ایک اصطلاح وہاں چلتی رہی۔ بالآخر ٹکنالوجی کی ترقی اور ویڈیو کی وجہ سے اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ایسے پروگراموں کو اب ٹی وی ڈاکومنٹری کہا جاتا ہے۔

ریڈیو کی فکاہیہ بات چیت، بہت زیادہ مختصر ہو کے ٹی وی میں "لطیفہ" ہو گئی۔ اور اگر بیانیہ نہ ہو، بلکہ کردار اسے پیش کریں، تو یہ ٹی وی جھلکی ہے۔

ریڈیو نے سلسلہ وار ڈرامے، اور ان کے کردار بھی ادب کو دیئے ہیں۔ پٹنہ سے نشر ہونے والا سلسلہ "لوہا سنگھ" اس کی مثال ہے۔ جتنی صلاحیتیں اس صنف میں ہیں، ان کا بھرپور فائدہ، اردو پروگراموں کے محدود وقت کی وجہ سے نہیں اُٹھایا گیا۔ دوسری زبانوں میں اس صنف نے بڑی ترقی کی۔ ٹی وی میں اس صنف نے بڑی مقبولیت پائی۔ خاندان، بنیاد، رجنی، اور بہت سے سیریل اس کے تحت آتے ہیں۔

سنگیت روپک ایک اور صنف ہے۔ رفعت سروش نے "جہاں آرا" بیلے کے طور پر ریڈیو کے لئے لکھا تھا۔ لیکن ریڈیو کا میڈیم چونکہ رقص کے لیے مکتفی نہیں ہے، اس لئے یہ صنف ترقی نہ کر سکی، کیونکہ اس کا بصری عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر بھی اس کی بدولت اردو ادب میں کچھ تازہ ہوائیں اس کھڑکی سے آئیں۔ سلام مچھلی شہری نے خاص مہارت اس صنف میں حاصل کی تھی۔ منظوم ڈرامہ بھی ایک ایسی صنف ہے۔ اس کا بھی ذکر ریڈیو

کی حد تک کیا گیا ہے۔ ٹی وی کے لیئے "واجد علی شاہ" نیاز حیدر نے اسی تکنیک میں لکھا تھا، جسے مظفر علی سیّد نے سیریل کے روپ میں پیش کیا تھا۔

ادبی اسلوب کو ریڈیو کی دین یہ ہے کہ جن ادیبوں نے ریڈیو کے لیئے لکھا اور ہر قابلِ ذکر ادیب نے ریڈیو کے لئے لکھا اس نے محسوس کیا الفاظ وہ استعمال کریں جو مخاطب کو فوری طور پر سمجھ میں آئیں۔ پیچیدہ جملوں کی عبارت نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہوں۔ تفہیم فوری ہو، اور موضوع کو اس طرح برتا جائے کہ اس سے فوری دلچسپی پیدا ہو۔ آل احمد سرور کا اسلوب ریڈیو کے لیئے مثالی ہے، اور یہ بات حقیقت سے دور نہ ہو گی کہ ریڈیو کے اسلوب نے اُن کے طرز تحریر کو متاثر کیا۔ ریڈیو کے لئے اچھا براڈکاسٹر تنافرِ لفظی سے احتراز کرتا ہے، کیونکہ براڈکاسٹ کے وقت نہ اٹکنا چاہتا ہے، اور نہ کرختِ لفظ بولنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا نادرست نہ ہو گا کہ سر سیّد نے جس نثر کی داغ بیل ڈالی تھی، اور اردو مصنف سے دور ہٹ گئے تھے، ریڈیو نے نہ صرف اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا، بلکہ وہ اسلوب پھر سے ادب میں رائج کیا۔ ریڈیو کی دین یہ بھی ہے کہ محاورے اور زبان کو خوش سلیقگی سے برتنے کے فن سے لکھنے والے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اکثر یہ بھی بھول گئے تھے کہ ایک چیز زبان کا چٹخارہ بھی ہے۔ ضلع جگت کچھ اور ہے، زبان کا چٹخارہ کچھ اور۔ ریڈیو نے محاوروں اور زبان کے چٹخارے کی اہمیت پر توجہ دلائی، اور اس طرح اُردو زبان کا ایک اہم پہلو، جو ادب میں گہنایا جا رہا تھا، پھر سے روشن ہوا۔ گنجلک نثر کی جگہ عام فہم اور رواں نثر ریڈیو کی وجہ سے، پھر سے مقبول ہوئی۔ ریڈیو میں براڈکاسٹر اور مخاطب کے درمیان یک طرفہ رابطہ ہوتا ہے۔ اس لئے براڈکاسٹر کو اس کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت سنتے وقت کیا سوالات مخاطب کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اُن کا جواب بھی اس کے بیان کا حصّہ ہونا چاہیئے۔ پھر ریڈیو تقریر، اگر ڈرامائی عنصر سے عاری ہو تو سپاٹ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ڈرامائی عنصر اچھی ریڈیو بات چیت کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ یہ اسلوب غیر محسوس طریقے سے ادب میں بھی آیا۔ ریڈیو میں اگر تقریر ہو، گفتگو نہ ہو، تو غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔ گفتگو والے لہجے کی مقبولیت اب اردو کے اچھے تنقیدی

مضامین میں بھی ہوتی ہے۔ ریڈیو نے جس طرح غائبانہ مخاطب کو گفتگو میں شریک کیا، اُردو کے اچھے نقادوں نے قاری کو بحث میں شریک کیا۔ یہ ریڈیو کی دین ہے۔

ٹیلی ویژن نے خبروں کو بصری بنا دیا۔ اخباروں پر اس کا غیر محسوس طور پر اثر پڑا کہ ایجنسی کی خبروں پر تکیہ نہ کرکے "نیوز اسٹوریز" کی طرف توجہ دی گئی۔ ریڈیو میں ڈرامے کے سیریل خاص طور پر مقبول ہوئے۔ اسٹیج، فلم اور ٹی وی۔ یہ ترتیب زمانی ہے، لیکن بقول ڈاکٹر محمد حسن ٹی وی ڈرامہ اسٹیج اور فلم کے درمیان میں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ٹی وی کلوزاپ کا میڈیم ہے۔ اسٹیج پر پس منظر کے لئے پردے ہوتے ہیں، لیکن اسٹیج بھی پیش منظر کا میڈیم ہے۔ فلم میں لانگ شاٹ اور درمیانہ لانگ شاٹ بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ فیچر فلمیں بھی ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں، بلکہ شروع شروع میں پورے فلم یا فلم کے حصّوں کو ٹی وی پروگراموں میں بڑا دخل تھا، لیکن اب میڈیم کی حیثیت سے ٹی وی کی انفرادی حیثیت پوری طرح نکھر کر سامنے آئی ہے۔ ٹی وی نے ایک اور فارمیٹ کو مقبول بنایا ہے۔ ریڈیو میں اس کے لیے میگزین پروگرام کی اصطلاح ہے۔ ٹی وی میں بکھرے ہوئے عناصر، جن میں انٹرویوز بھی شامل ہیں، اور مختلف منظرنامے بھی، ملاکر پروگرام تیار کئے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن نے ابھی اُردو ادب کو کوئی واضح اسلوب تو نہیں دیا، لیکن یہ اضافے متوقع ہیں۔

۱۔ بیان کی قطعیت: ٹی وی میں تخیلی یا حقیقی واقعہ بصری حقیقت کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ادب میں بھی بیان کو زیادہ واضح ہونا ہوگا، کیونکہ ادب کا شاید ہی کوئی قاری ہو، جس کے ذہن اور ذوق کو ٹی وی نے متاثر نہ کیا ہو۔

۲۔ ایجاز ایک خوبی تھی، جس سے اکثر ادیب فائدہ اُٹھانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ٹی وی میں ایک فریم بھی فضول نہیں ہوتا۔ اچھے پروگرام میں

انداز میں دلکشی، بیان میں جامعیت اور کم سے کم الفاظ میں، گہری معنویت کے ساتھ اصل بات کہنا آئندہ کے ادیب کے لیے ضروری ہو جائے گا۔

۳۔ ابہام کی ادب میں گنجائش نہیں رہے گی۔ بات دو ٹوک لکھنا ہوگی جو واقعہ سے مربوط ہو۔

ٹی وی میں لکھی ہوئی تقریریں گفتگو یا مباحثوں کے پروگراموں میں نہیں پڑھی جاتیں۔ اس لئے زیادہ قدرتی زبان بولی جاتی ہے۔ اردو ہندی پروگراموں کی حد تک یہ عام طور سے ترسیلی اردو ہے، اور ٹی وی سے اُردو کو زیادہ وسعت ملی ہے، وہ چاہے بغیر لکھے ہوئے پروگرام ہوں، ٹی وی فلمیں ہوں، فیچر فلمیں ہوں، غزلوں کے پروگرام ہوں، مباحثوں کے پروگرام ہوں یا ٹی وی ڈاکومنٹریاں!

کتابیات

آسا برگس	دی برتھ آف براڈ کاسٹنگ
ایچ آر لوتھرا	انڈین براڈ کاسٹنگ
امیر خسرو	نہ سپہر
	عزۃ الکمال
اسد اللہ خاں غالب	خطوطِ غالب
	دیوانِ غالب
	دیوانِ غالب جدید (نسخہ حمیدیہ) مرتبہ مفتی انوار الحق
انشاء اللہ خاں انشا	رانی کیتکی کی کہانی
	دریائے لطافت
اچاریہ چترسین	برج ساہتیہ پر مغل پربھاؤ
امتیاز علی خاں عرشی	نادراتِ شاہی
اختر حسین رائے پوری	گردِ راہ
ابوالکلام آزاد	خطباتِ آزاد
احمد علی	انگارے
اخلاق اثر	ریڈیو ڈرامے کا فن
	ریڈیو ڈرامے کی اصناف
آوارہ	بے پرکی
	میرا فرمایا ہوا
	اپنی موج میں
آل احمد سرور	تنقیدی اشارے
امتیاز علی تاج	انار کلی

امرت رائے	اے ہاؤس ڈیوائڈڈ
اے ایل باشم	دی ونڈر دیٹ واز انڈیا
ابواللیث صدیقی	ہندستانی گرامر از بنجمن شلزے
اے رچرڈ ڈائی بولڈ جونیر	ان سی پیئنٹ بائی لنگولزم
پی سی چترجی	براڈکاسٹنگ اِن انڈیا
	ٹو وائسز
	سیکولر ویلیوز فار سیکولر انڈیا
پطرس	پطرس کے مضامین
تلسی داس	تلسی گرنتھاولی (حصّہ اوّل و دوم)
ٹی برّو	اینشنٹ اینڈ ماڈرن لینگویجز
جی سی اوستھی	براڈ کاسٹنگ اِن انڈیا
جواہر لال نہرو	این آٹو بیاگرفی
جی اے گریرسن	لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد ۹ حصّہ اوّل
جی سی ڈبلیو ریتھ	انٹو دی ونڈ
جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)
چندر بردائی	پرتھی راج راسا (مرتبہ محمود شیرانی)
خواجہ الطاف حسین حالی	حیاتِ جاوید
خواجہ حسن نظامی	سی پارۂ دل
	کانا باتی
دادو دیال	دادو دیال کی بانی
راجندر سنگھ بیدی	سات کھیل
رجب علی بیگ سرور	فسانۂ عجائب
رام چندر شکل	ہندی ساہتیہ کا اتہاس
رومیلا تھاپر	اسٹوری آف انڈیا
راجندر پرساد	آتم کتھا

رتن ناتھ سرشار	فسانۂ آزاد
ریوتی سرن شرما	اور بھی غم ہیں زمانے میں
رشید احمد صدیقی	خنداں
رشید جہاں	انگارے
رفعت سروش	عروجِ آدم
	میری صدا کا غبار
	اسی دیوار کے سائے میں
سرسید احمد خاں	مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین)
سچیتانند بھٹاچاریہ	سی لکشڈ اشوکن ایپی گرافس
سریو پرساد اگروال	اکبری دربار کے ہندی کوی
سید سجاد ظہیر	روشنائی
	انگارے
سید ذوالفقار علی بخاری	سرگزشت
سید احمد دہلوی	فرہنگِ آصفیہ (ترقی اردو بیورو)
سعادت حسن منٹو	آؤ
	جنازے
سید اسد علی	ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات
سلام مچھلی شہری	پائل
ساغر نظامی	انارکلی
	شکنتلا
شیخ غلام احمد ہمدانی مصحفی	دیوانِ مصحفی
عتیق صدیقی	گلکرسٹ اور اس کا عہد
پروفیسر عتیق صدیقی	سرسید احمد خاں
عبدالحق	خطباتِ عبدالحق
علی جواد زیدی	دو ادبی اسکول

قیصر قلندر	سازِ جمال
کاظم علی جوان	سنگھاسن بتیسی
	بیتال پچیسی
کلیم الدین احمد	ریڈیو اور کلچر
گارساں دتاسی	خطباتِ گارساں دتاسی
گیان چند جین	لسانی مطالعے
لائنل فیلڈن	دی نیچرل ہیٹ
محمد عوفی	لباب الالباب
ملک محمد جائسی	جائسی گرنتھاولی (مرتبہ رام چندر شکل)
میرا بائی	میرا کے پد (سستا ساہتیہ منڈل)
ملکو داس	ملکو داس جی کی بانی (ویلویڈ پریس پریاگ)
میر امن	باغ و بہار
میر عطا حسین تحسین	نوطرزِ مرصع
میر حسن	تذکرہ شعرائے اردو
	سحر البیان
میر تقی میر	تذکرہ نکات الشعرا
مرزا محمد رفیع سودا	کلیاتِ سودا
موہن داس کرم چند گاندھی	این آٹو بیاگرافی، دی اسٹوری آف مائی اکسپریمنٹس ود ٹرتھ
	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ (مرتبہ عشرت علی صدیقی)
	مشترکہ زبان (مرتبہ قاضی عبد الغفار)
محمود الظفر	انگارے
محمد حسن	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر
	تماشا اور تماشائی
ملا وجہی	سب رس

مسعود حسین خاں	مقدمہ تاریخ زبان اردو
مورس سودیش	لنگوئسٹکس اینڈ این انسٹرومنٹ آف پری ہسٹری
محمود شیرانی	پنجاب میں اردو
	خالق باری (تالیف)
مرزا محمود بیگ	بڑی حویلی
	مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب (اردو اکادمی دہلی)
نورالحسن ہاشمی	ادب کیا ہے ؟
نند دلارے	سُر ساگر (تالیف)
ہریش چندر کھنہ	ریڈیو ناٹک
ہیوگ ہن کن	انڈو یوروپین لینگوئجز اینڈ آرکیالوجی
ہیرین باسو	میموائرس آف اے ورسٹائل آرٹسٹ
وحید مرزا	امیر خسرو
ولیم جونز	کلکٹڈ ورکس

مضامین

سجاد حیدر یلدرم	مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ (معارف ۱۹۰۰ء)
سید انصار ناصری	ذوالفقار علی بخاری (جریدہ ۱۹۸۷ء)
عبدالحلیم شرر	گذشتہ لکھنؤ (انتخاب نثر)
فضلِ حق قریشی	"گھریلو جھگڑے" ساقی (اگست ۴۶ء)
منشی پریم چند	"ہندی اور اردو کا مستقبل" (اردو جولائی ۳۶)
ملا واحدی	(منادی)
نصیر احمد خان	"اردو" (کمپیریٹو انڈین لٹریچر)
نامور سنگھ	"ہاسی بھات میں خدا کا ساجھا" (ہنس لکھنؤ)
ہرکشن سنگھ سرجیت	"اردو کے جمہوری حقوق" (قومی آواز)

رسائل

اردو	اورنگ آباد (انجمن ترقی اردو)
اردو ادب	دلی (انجمن ترقی اردو)
آواز (اردو)	دلی (آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کا جرنل)
آکاش وانی (انگریزی)	دلی ایضاً
آکاش وانی (ہندی)	دلی ایضاً
جامعہ (مجیب نمبر)	دلی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)
ساقی	دلی (۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء)
عصری ادب	دلی
فروغ اردو	لکھنؤ
منادی	بستی نظام الدین دلی
ہنس (ہندی)	لکھنؤ

ضمیمہ

۱۔ اشرف صبوحی	موٹے آکا
۲۔ آوارہ	کوا چلا ہنس کی چال
۳۔ آوارہ	دوسرا مہمان
۴۔ آل احمد سرور	یادش بخیر: ہم بھی جوان تھے
۵۔ امیر چند	حضرت وارث شاہ: ہیر رانجھا
۶۔ انیس قدوائی	عورتوں کی جرنلزم
۷۔ برج موہن ناتھ	میرے بچپن کا محرم
۸۔ خواجہ حسن نظامی	آتش بازی کی بندش کیوں

۹۔ خواجہ احمد عباس	فلم میں بے ہودگیاں
۱۰۔ سرعبدالقادر	گورو بابا نانک صاحب
۱۱۔ فیض احمد فیض اور آغا عبدالحمید	ایک ادبی مباحثہ: منشی پریم چند
۱۲۔ گیان چند جین	مسدس اور مثنوی
۱۳۔ ملا واحدی	پردہ
۱۴ مختارالدین احمد	یادیں دوسرے ملکوں کی
۱۵۔ نورالحسن ہاشمی	اقبال

منظوم پروگرام

۱۶۔ جگر مرادآبادی	دُردانہ (مثنوی)

میں خاموش تھا

مگر بول رہا تھا

صوفیوں کے دشمن کہا کرتے ہیں کہ صوفی لوگ خلافِ عقل باتیں کہا کرتے ہیں ان کی باتیں مجذوبوں کی بڑ معلوم ہوتی ہیں۔ اس نوٹ کا عنوان بھی ایسا ہی ہے کہ "میں خاموش تھا مگر بول رہا تھا"۔ جو خاموش ہو وہ بولے گا کیونکر؟ اور جو بولے گا اس کو خاموش کیونکر کہا جائے گا؟

صوفیوں کے منکر اگر حقائق اشیاء پر غور کر سکتے تو انکار نہ کرتے مگر منکر (عربی زبان میں منکر کافر کو کہتے ہیں) جب تک خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیں گے اسی طرح احمقانہ اعتراض کرتے رہیں گے وہ کان کھول کر سنیں کہ یہ تقریر ۱۹ جولائی کی شام کو سات بجے بمبئی ریڈیو سے نشر ہوئی۔ اس وقت میں دہلی میں اپنے گھر کے اندر تھا۔ میرے بیوی بچے چاروں طرف جمع تھے۔ ریڈیو مشین میرے قریب تھی اور میں اپنی تقریر کو خود سن رہا تھا۔ جس وقت بمبئی میں بول رہا تھا دہلی میں خاموش تھا۔ اور جس وقت دہلی میں خاموش تھا بمبئی میں بول رہا تھا۔

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ\
خود بر سر آں کوزہ خریدار برآمد\
بشکست و رواں شد

خود ہی کوزہ تھا اور خود ہی کوزہ گر تھا۔ اور خود ہی کوزہ بنانے کی مٹی تھا۔ اور خود ہی کوزہ کا خریدار بن کر آیا تھا۔ کوزہ خریدا اور توڑا اور روانہ ہو گیا۔

کیا سمجھے مولانا وہابی صاحب اس نکتہ کو۔ وہ کیا سمجھیں گے ان کا استاد بھی یہ نکتہ فرشتوں کو تعلیم دینے کے وقت نہیں سمجھا تھا۔ جب نہیں سمجھے تھے تو آج سمجھ لیں کہ حسن نظامی خود ہی دلّی سے ایک ہزار میل دور بمبئی میں بول

رہا تھا اور خود ہی دلی میں بیٹھا سُن رہا تھا بمبئی میں. بولنے والا کون تھا؟ حسن نظامی دہلی میں چپکا بیٹھا کون سُن رہا تھا؟ حسن نظامی. آواز کس کی تھی؟ حسن نظامی کی خاموشی کس کی تھی؟ حسن نظامی کی بول کس کے تھے؟ حسن نظامی کے. کان کس کے تھے؟ حسن نظامی کے. مگر حسن نظامی بمبئی میں نہیں. بولا. اور حسن نظامی نے دلی میں نہیں سُنا. کیونکہ حسن نظامی نہ یہاں تھا نہ وہاں تھا. وہ تھا مگر نہیں تھا. وہ ہے مگر نہیں ہے. بخدا غیر خدا اور دو جہاں چیزے نیست. خدا کی قسم دونوں جہان میں خدا کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے.

اس دیش میں ہمارا رہنا سہنا ہے اس کا اُپدیش ہے کہ اہنسا پرم پرا ہے. یعنی کسی کو دکھ نہ دینا بڑے دھرم کا کام ہے اس کارن ہندوستان میں ایسی چیزیں بہت کم پائی جاتی ہیں جن سے کسی کو دکھ پہنچے کا آتشبازی کا لفظ ہندوستان کا نہیں ہے بلکہ ایران کا ہے. آتش آگ کو کہتے ہیں اور بازی کھیل کو سنسکرت اور ہندی زبان میں مجھے خبر نہیں کہ آتش بازی جیسا کوئی لفظ ہے یا نہیں

بمبئی ریڈیو کے لئے خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

اگنی کھیل

آتش بازی کی بندش

کیوں؟

جو ۱۹ جولائی ۱۹۳۹ء کی شام کو بمبئی سے بذریعہ ریکارڈ نشر ہوئی

اسی لئے میں اس کو "اگنی کھیل" کہتا ہوں، مہابھارت اور بعد کی لڑائیوں میں بان کا ذکر آتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان میں بھی آگ کے ہتھیار کام آتے تھے مگر راجہ لوگوں میں بان کا رواج تھا۔ پر جا میں آگ کا نہیں ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے زمانہ میں شاید شادیوں خوشیوں کے وقت بھی آتش بازی نہ ہوتی ہوگی کیونکہ مسلمانوں کے پہلے کی شادیوں کے حالات میں آتش بازی کا ذکر نہیں ہے بعد کے ہندو راجاؤں کی شادیوں اور خوشیوں کے وقت آتش بازی ہوتی تھی۔ مگر مسلمانوں کے یہاں آتش بازی کا عام رواج تھا ان کے دونوں عیدوں میں اور نوروز کے دن اور شب برات کو بھی آتشبازی کی دھوم دھام ہوتی تھی اور شب برات کے تہوار کے دن تو آتشبازی ایک مذہبی کام خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شب برات کی ایک کہاوت ہندی زبان میں ہے۔ "آئی شب برات سال سے لڑی، کوئی لیپے ہے کوئی پوتے کوئی کمہار کے کھڑی، کمہار رے کمہار رے یادے بڑی، آئیں گے مرے مردے چھوڑیں گے پھول جھڑی۔

ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر جگہ رواج تھا کہ شعبان کے مہینہ کی چودھویں تاریخ سورج چھپنے کے بعد الّو جلّو پر مٹی کے دیئے روشن کرتے تھے۔ الّو جلّو مٹی پانی میں گوندھ کر گول شکل بناتے تھے۔ اور اس میں سرکنڈا اڑس دیتے تھے سرکنڈے کے اوپر چھوٹا چراغ رکھنے کے لئے اور مٹی لگاتے تھے ہر گھر کے ہر بچے کے نام کا ایک ایک چراغ روشن کرتے تھے اس کا نام الّو جلّو شاید اس واسطے رکھا ہوگا کہ اللہ بچوں کو رکھے۔ یا اللہ کے لئے یہ چراغ جلائے جاتے ہیں۔ مگر آجکل مسلمانوں کے گھروں سے الّو جلّو کا رواج جاتا رہا ہے۔

الّو جلّو کی روشنی کے ساتھ ہی شب برات کو آتشبازی ہر گھر میں ہوتی تھی مگر کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ آج کی رات آتش بازی کیوں ہوتی ہے۔ ہاں شیعہ فرقہ یہ کہتا تھا کہ آج کی رات ہمارے آخری امام پیدا ہوئے تھے ان کے پیدا ہونے کی خوشی میں آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔ مگر شیعوں سے زیادہ سنی آتشبازی چھوڑتے تھے اس واسطے یہ ماننا مشکل ہے کہ شیعہ فرقہ نے آتش بازی کو رائج کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شیعہ سنی دونوں نہیں جانتے کہ شب برات میں

آتشبازی کا رواج کیوں ہوا۔ غالباً یہ رواج اس واسطے ہوا ہوگا کہ مسلمانوں کی حکومت
جا رہی ہوگی کہ فوجوں میں توپوں اور بندوقوں کا چلن ہے اور فوجی لوگ آگ کے
کام سے بے خوف ہو جاتے ہیں اگر عام لوگ بھی آتشبازی کا شوق کریں گے تو
آگ کا ڈر ان کے دل سے بھی دور ہو جائے گا۔

دس بارہ برس کا ذکر ہے کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر سال شب برات
میں آتش بازی کے سبب سیکڑوں بلکہ ہزاروں مرد اور عورت جل جاتے ہیں اس لئے
آتش بازی کے رواج کو بند کرنا چاہیئے۔ اگرچہ یورپ اور جاپان سے ایسی آتشبازی
آنے لگی تھی جس میں پھولوں کی بہار تو ہوتی تھی مگر اس کی آگ کسی کو جلاتی نہیں
تھی۔ پھر بھی ہندوستان والے پرانے زمانے کی نقصان دینے والی آتش بازی
بند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا خرچ دوہرا ہو گیا تھا کیونکہ وہ پرانی آتش بازی
بھی بناتے تھے اور ولائتی آتش بازی بھی خریدتے تھے۔ اس واسطے میں نے اخبارات
میں اس کی مخالفت شروع کی تو اٹاوہ کے ایک مشہور مسلمان اخبار نویس نے
مجھ سے اختلاف کیا اور یہ لکھا کہ ہندوستانیوں کے پاس ہتھیار نہیں رہے ہیں
اور آتشین ہتھیار بھی لائسنس کے بغیر میسّر نہیں آتے۔ پس آتش بازی ہی ایک
ایسی چیز رہ گئی ہے جو ہندوستانیوں کو اور ان کے دلوں کو مضبوط بنا سکتی ہے
یا مضبوط رکھ سکتی ہے۔ مگر اس تحریر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور میں نے
اخباروں کے بعد لاکھوں کی تعداد میں مختلف مضمونوں کے پوسٹر شائع کئے جن کا
بہت زیادہ اثر ہوا اور تمام ہندوستان میں آدھے سے زیادہ مسلمانوں نے
آتش بازی بند کر دی اور دلّی میں بھی ایک بہت بڑا جلوس آتش بازی کے جنازہ
کا نکالا گیا۔ جس نے شہر کے سب بازاروں میں چکر لگایا، جلوس میں ہزاروں آدمی شریک
ہوئے۔ ہر محلّے کے مسلمان بچے آتش بازی لاتے تھے جو انھوں نے اس سے پہلے خرید لی
تھی یا بنا لی تھی اور آتشبازی کے جنازہ میں جو ایک بہت بڑے ٹھیلے پر رکھا تھا
ڈال دیتے تھے۔ یہ عظیم الشان جلوس جمنا دریا تک گیا اور آتشبازی کا جنازہ جمنا
میں ڈبو دیا گیا۔ اس کے بعد کئی برس تک آتشبازی کے رواج میں کمی ہوتی رہی
لیکن چونکہ پھر کسی نے آتشبازی کے خلاف کوشش نہیں کی اسواسطے یہ رواج پھر بڑھنے لگا۔

دلّی میں آتشبازی پہلے گھر گھر ہوتی تھی اور درگاہ حضرت خواجہ سید حسن رسول نمارحؒ میں بھی عرس کے دن بہت زیادہ چھوڑی جاتی تھی مگر اب گھروں میں بھی یہ رواج کم ہوگیا ہے اور درگاہ کے عرس میں بھی۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آتش بازی کو مسلمان بُرا سمجھنے لگے ہیں بلکہ اس کا سبب مسلمانوں کی مفلسی اور غریبی ہے کہ ان کو پیٹ کے لئے روٹی اور تن کے لئے کپڑا بھی مشکل سے میسّر آتا ہے آتش بازی کہاں سے لائیں۔

پہلے کی طرح میں اب آتش بازی کا زیادہ مخالف نہیں ہوں بلکہ ایک حد تک موافق ہوگیا ہوں اور اسی لئے میں ہندوستان میں ملٹری کالجوں کا بھی حامی ہوں کہ ان کے ذریعہ ہندوستانیوں میں جرأت اور ہمت اور خود داری پیدا ہوگی۔ بے شک آتشبازی سے بہت لوگ جل جاتے ہیں لیکن موٹروں کے لڑنے اور ریلوں کے ٹکرانے سے بھی آدمی کم نہیں مرتے۔ پھر کون ہے جو ان خبروں کے سننے کے بعد موٹر میں بیٹھنا اور ریلوں میں سوار ہونا چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی آتشبازی سے اگر نقصان ہوتا ہے تو دلوں کی طاقت پیدا ہونے کا فائدہ بھی تو ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آتش بازی کی بندش کیوں ہو؟ اس کیوں کا جواب کچھ مشکل نہیں ہے۔ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ آتش بازی کا رواج کیوں ہوا تھا؟ کوئی سوال کرتا ہے کہ نشہ بندی کیوں؟ تو اس سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ نشہ بازی کیوں؟ "کیوں" ایسا لفظ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کے چہرہ پر لکھا دکھائی دیتا ہے۔ سورج کیوں؟ چاند کیوں؟ سمندر کیوں؟ پہاڑ کیوں؟ دریا بہتے ہیں کیوں؟ کہیں ٹھہرتے نہیں ہیں کیوں؟ ہر وقت رواں دواں دکھائی دیتے ہیں کیوں؟ کنارہ چپ چاپ کھڑا رہتا ہے کیوں؟ پہاڑ اونچے ہیں کیوں؟ غار نیچے ہیں کیوں؟ سورج میں گرمی ہے کیوں؟ چاند میں ٹھنڈک ہے کیوں؟ سمندر میں ہلچل اور موجیں ہیں کیوں؟

پس اگر ہر "کیوں" کا جواب دیا جا سکتا ہے تو آتشبازی کی بندش پر اگر کیوں کہہ کر سوال کیا جائے تو میں کہونگا بندش اس واسطے ہونی کہ آتشبازی سے آدمی اور جانور جل جاتے ہیں گھروں میں آگ لگ جاتی ہے روپیہ فضول برباد ہوتا

ہے بارود کے دھوئیں سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کوئی سوال کرے کہ آتش بازی کا رواج کیوں ہوا تھا؟ تو اس کیوں کا جواب یوں دونگا کہ یورپ والے پرانے ٹکٹ ہزاروں اشرفیاں خرچ کر کے کیوں خریدتے ہیں؟ آپ جواب دیں گے کہ یہ ایک شوق کی بات ہے۔ میں جواب دوں گا کہ پتنگ بازی مرغ بازی، بٹیر بازی اور آتش بازی بھی مسلمانوں کے شوق کی چیزیں ہیں جب کسی قوم کے پاس دولت زیادہ ہو جاتی ہے تو ایسے ہی چونچلے اور شوق سوجھا کرتے ہیں پس مسلمانوں کے پاس بھی جب دولت کی افراط تھی تو ان کو ایسے فضول شوق ہو گئے تھے۔ اب بھی ہندوستان میں ایک رئیس کتوں کا شوق رکھتے ہیں کتوں کے لئے ایک ایک مرغ کی یخنی روزانہ تیار ہوتی ہے سونے کے پیالوں میں یخنی پلائی جاتی ہے ریشمی گدوں کی مسہریوں میں کتے سوتے ہیں جن پر ریشمی مچھردانیاں پڑی رہتی ہیں کتوں کی شادیاں بھی کرائی جاتی ہیں۔ برات میں ہزارہا روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ایک رئیس نے آم کے درخت کو سوا لاکھ روپے کا زیور پہنایا تھا کیونکہ اس درخت کا آم اس کو پسند آگیا تھا۔ ایک آدمی اپنے بیٹے کو ساتھ لئے گھوڑے پر سوار جارہا تھا کسی راہ گیر نے پوچھا تم دو آدمی ایک گھوڑے پر کیوں بیٹھے ہو گھوڑا بوجھ کے مارے دبا جاتا ہے یہ سن کر وہ آدمی اپنے بیٹے کو لے کر گھوڑے سے اُترا اور پیدل چلنے لگا۔ دوسرے راہ گیر نے کہا جب سواری موجود ہے تو پیدل کیوں چل رہے ہو تو وہ آدمی خود سوار ہو گیا اور بیٹا ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا تیسرا راہ گیر ملا اور کہنے لگا یہ پیدل چلنے والا تمہارا کون ہے؟ سوار نے جواب دیا میرا بیٹا ہے۔ راہ گیر نے کہا تم سوار ہو اور بیٹا پیدل چلے یہ کیوں، سوار گھوڑے سے اُترا اور اس نے بیٹے کو گھوڑے پر سوار کر دیا اور خود پیدل چلنے لگا۔ چوتھا راہ گیر ملا اور اس نے باپ سے پوچھا یہ جو گھوڑے پر سوار ہے تمہارا کون ہے؟ باپ نے جواب دیا میرا بیٹا ہے۔ راہ گیر نے کہا میاں لڑکے! باپ پیدل چلے اور تم گھوڑے پر سوار ہو یہ کیوں؟ غرض اسی طرح ساری دنیا میں کیوں اور یوں کا بازار گرم ہے۔ آتش بازی کی بندش کے ہر کیوں کا جواب یوں ہے کہ جو قاضی جی شہر کے اندیشہ سے دُبلے

رہتے ہیں وہ آتش بازی سے روکتے ہیں، یا جن کے سر پر ملک کی ہمدردی کا آسیب سوار ہوتا ہے وہ آتش بازی کی بندش کے لکچر دیتے رہتے ہیں، یا جو لوگ یورپ اور جاپان کی بے ضرر آتش بازی کے کمیشن ایجنٹ ہیں یا اس آتش بازی کی فروخت کے حصہ دار ہیں وہ پرانی نقصان دینے والی آتش بازی کی بندش پر زور دیتے ہیں۔

موٹے آکا

(خاکہ)

اشرف صبوحی

غدر کے بعد پٹہ باز کی ہستی تو مانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں، میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر چھپے رستموں میں ایک آکا مصطفےٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا جنہیں لوگ عام طور پر موٹے آکا کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑ سے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی والوں کے محلّے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دوکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یار نجان ایک کشمیری ناٹا سا قد۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ڈنڑ پھیلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آکا مصطفےٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر آرہے تھے۔ اور اسی لئے عصر کے بعد عموماً مرزا یار نجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر ان کی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور گلے جبڑے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی لیکن ڈنڑ دل کی مچھلیاں اب بھی ایسی طاقتور تھیں کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جاسکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انھوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابو ظفر سراج الدّین کا چراغ ٹمٹماتا رہا قلعہ ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دوہانے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلّی آئے اور جب تک جیئے اکنگ جیئے۔

آکا کی نسبت سناہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی سچ مچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی پھر لکڑی کی چھریاں ہوگئیں اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں مثلاً ہت کوڑا، بغلگیر، حلقوم، گولا لاٹھی۔ بازو بند وغیرہ۔ جس طرح بنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں۔ لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا۔ صحیح نہیں معلوم۔ داستانوں میں عیاروں کی خنجر بازی سنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہوگی تو خنجر اور کٹار سے کام لیا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آکا بھی تھے۔

آکا کی شہزوری اور بیکنتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا سانڈوں کا اکھاڑا تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ سیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آکا یار نجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ٹکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ یار نجان نے آکا سے کہا اُوپر آجائیے سانڈوں کا رخ اسی طرف ہے۔ آکا نے ہنس کر جواب دیا مرزا ڈرو نہیں۔ جانوروں سے کیا بھاگنا۔ آ رہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنا زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آجاتے یا کسی کا خوانچہ الٹ جاتے۔ ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے دوکان کے آگے آکر سینگ جوڑ لیے۔ اب پھر یار نجان نے کہا: "آکا دوکان کے اوپر کیوں نہیں آجاتے؟" آکا پھر ہنسے اور کہنے لگے: "مرزا یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے، آنے تو دو۔" یار نجان کچھ اور ہی کہنا چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہوکر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دوکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آکا کے

مونڈھے کے قریب پٹری کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

آکا:۔ بس بھائی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دیے تم بھی ہٹ جاؤ۔"

لوگ ہنسنے لگے کہ آکا جانوروں سے بھی باتیں کرتے ہیں جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آکا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جیداری اچھی نہیں اپنا مونڈھا ہٹا لیجئے۔ مگر آکا قطب تھے۔ قطب از جانمی جنبد کے مصداق، انھوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آستین چڑھا کر بولے: "نہیں مانتا اب کیا میں اٹھوں۔"

اتنے میں بچھڑا ہوا سانڈ پٹری کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ آکا نے اٹھتے ہی پہلے تو پھنپھناتے ہوئے سانڈ کی کوک پر ایک لات رسید کی۔ لات کو وہ پی گیا۔ بلکہ جھنجلا کر اس نے آکا پر حملہ کرنا چاہا تو آکا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لئے اور ایک رو میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔ سانڈ کا جھرجھری لینا تھا کہ آکا نے گاؤمکھ کا داؤں کیا۔ سانڈ اڑا کر کے زمین پر آ پڑا۔ تماشائیوں پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ واہ آکا واہ کیا بات ہے۔ سچ مچ کا گاؤمکھ آج ہی دیکھا ہے۔

سانڈ گر پڑا تو آکا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بولے: "اسی برتے پر آکا کا مونڈھا اٹھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا ورنہ بے چھری حلال کر دوں گا۔" سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا پھر اٹھ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی ڈپٹی کمشنر اور کمشنر وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی دیگ کی کھرچنیں تابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کولئے دیے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوتیں۔ مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے علاوہ شہر میں جو اچنبے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ڈپٹی ہادی حسین خاں، شہزادہ سلیمان شاہ، اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد نہر والے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلی والوں پر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا آغا مصطفےٰ بیگ کی سانڈے سے کشتی کے بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا۔ صاحب نے پوچھا یہ آغا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے کہا ایک با امن شہری ہیں۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا اب ان کے سوا شاید دلی میں دوسرا نہیں۔ رہا ان کے دیکھنے کا سوال۔ شام کو بلاناغہ چاوڑی بازار میں حافظ داؤد کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے جب جی چاہے ادھر نکل جائیے اور دیکھ آئیے۔"

صاحب بہادر:۔ وہ ہمارے بنگلہ پر نہیں آئیں گے؟

ڈپٹی صاحب:۔ ان آغاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلائے یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں۔ اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں بٹھائے جائیں گے۔ کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔"

صاحب بہادر:۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ ان پرانے دستوروں کے ہم پابند نہیں

ڈپٹی صاحب:۔ آپ پابند نہیں وہ تو پابند ہیں۔

غرضیکہ اسی طرح کی ردّ و بدل کے بعد صاحب بہادر نے وعدہ کر لیا کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انھیں لا کر آپ سے ملا دوں۔

آغا کی نشست اکرام اللہ خاں کے ہاں رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی حسین خاں نے ان کے ذریعہ سے آغا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر چلنے کے لئے مجبور کیا اور صاحب کو چٹھی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آغا کو جناب کی ملاقات کے لئے رضامند کر لیا ہے۔ آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انھیں لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ آپ اُن کی واجب تعظیم فرمائیں گے۔ صاحب نے ہادی حسین خاں کی چٹھی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ ملاقات چونکہ نجی ہے اس لئے دوستانہ ہوگی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آغا کو لے کر صاحب کے بنگلہ پر پہونچے اور

اطلاع ہوئی تو وہ بلا تائل باہر نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں آکا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی۔ جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آگے بڑھے پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آکا سے۔ معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب:۔ (آکا سے) آپ اچھے ہیں؟

آکا:۔ اچھا تو خدا کا نام ہے۔ زندہ ہوں۔

صاحب:۔ (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) کیا مطلب؟

ڈپٹی صاحب:۔ آکا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس شہر میں ہوں وہاں برائی کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہم زندہ ہیں۔

صاحب:۔ (آکا سے) مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔

آکا:۔ آپ کی مہربانی۔

صاحب:۔ آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

آکا:۔ پٹا بازی کیسی میں سمجھا نہیں؟

صاحب:۔ محترم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے ہیں کیا وہ نہیں جانتے؟

آکا:۔ صاحب۔ خدا خدا کیجئے ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل سے کیا نسبت۔

صاحب:۔ ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے۔ اور ہمارے ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ آپ اُن کے استاد ہیں۔

آکا:۔ ہاں انھوں نے دو چار گھاتیاں مجھ سے سیکھی ہیں۔

صاحب:۔ گھاتیاں کیا؟

آکا:۔ لکڑی کے فن کے داؤں یا چوٹیں۔

صاحب :۔ تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں۔
آکا :۔ اچھل کود تو پٹا بازی یا منوتی میں ہوتی ہے۔ بانک اور بنوٹ کو ان بوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق ؟
صاحب :۔ بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔
آکا :۔ ہلانے پڑتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت۔ بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اوٹ نہیں۔ اس کے داؤں سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ بانک والا بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے۔ جس طرح بنوٹ کے لئے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دو چار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بیکار ہیں۔
صاحب :۔ لیکن یہ فن اگلے زمانہ میں شاید کچھ بکار آمد ہو۔ آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلہ میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا ہے۔
آکا :۔ بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آجاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں، فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔
صاحب :۔ ولایت میں بوکسنگ اور فنسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لئے سیکھتے تھے لیکن ریوالور کے مقابلہ میں اب یہ چیزیں صرف کھیل سمجھی جاتی ہیں۔
آکا :۔ بوکسنگ اور فنسنگ کیا ہوتا ہے ؟
صاحب :۔ گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔
آکا :۔ میں نے یہ کھیل نہیں دیکھے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی کشتی اور لکڑی کے فن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔
صاحب :۔ میں نے بھی ولایت میں ان دونوں میں اچھا کمال پیدا کیا تھا۔

آکا:۔ بہت مبارک۔ لیکن کبھی ان کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔

صاحب:۔ کیا مطلب؟

آکا:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔

صاحب:۔ مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔

آکا:۔ وہ لوگ گھونسے کے مقابلہ میں گھونسے اور تلوار کے مقابلہ میں تلوار ہی چلاتے ہوں گے۔

صاحب:۔ قطعی۔

آکا:۔ اگر کسی کو گھونسہ بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے۔

صاحب:۔ تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔

آکا:۔ لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔

صاحب:۔ کیا آپ کو تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور گھونسہ کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔

آکا:۔ بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔

صاحب:۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔

آکا:۔ سانڈ کے مقابلہ میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟

صاحب:۔ مگر سانڈ تو جانور ہے۔

آکا:۔ آپ کا مکا باز ایسے موقعے پر کیا کرتا۔ سانڈ کی جھپٹ سے کیونکر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔

صاحب:۔ (کچھ سوچ کر) اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلہ

میں کیا کریں گے ؟

آکا:۔ کوئی گھونسے باز سامنے ہو تو بتاؤں۔ ایک گھونسے کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدّتوں گھونسا نہ بنا سکے۔

صاحب:۔ ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونسا ماروں تو آپ کیا کریں گے ؟

آکا:۔ (ہنس کر) مگر میں آپ کو گھونسا مارنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔

صاحب:۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

ڈپٹی صاحب:۔ کوئی دوسرا انگریز اس وقت دلّی میں ایسا نہیں جو گھونسا بازی جانتا ہو۔

صاحب:۔ گھنٹے کی طرف دیکھ کر قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے گھونسہ بازی کا پورا مشاق۔ وہ شاید ابھی آجائے۔

اتنے میں بیرے نے آکر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلا لیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آکا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ تم بڈھا آدمی ہم سے گھونسہ بازی کرنا مانگتا ہے ؟

آکا:۔ بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔

میجر:۔ پھر ؟

آکا:۔ تم گھونسہ چلاؤ ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔

میجر:۔ تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا ؟

آکا:۔ خون معاف۔ لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔

میجر:۔ (قہقہہ لگا کر) کچھ پروا نہیں۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا۔ قمیص کی آستینیں چڑھا لیں اور آکا کی طرف اشارہ کیا کہ آیئے میدان میں۔

آکا:۔ آپ گھونسہ بازی شروع کیجئے۔
میجر:۔ (ہنس کر) بیٹھے بیٹھے لڑے گا؟
آکا:۔ لڑنا کیسا تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے۔
میجر نے صاحب ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سیّد ہادی حسین سے کچھ کہا۔ سیّد صاحب نے گردن ہلا دی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کر دیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آکا پر چلا۔ آکا دیکھتے رہے۔ جب میجر صاحب آکا کے قریب پہنچے اور گھونسا ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکایک معلوم ہوا جیسے کسی درخت کا گدا ٹوٹا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب میجر زمین پر چت پڑے ہوئے دکھائی دیے اور آکا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ صاحب اور ڈپٹی صاحب اُٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم نے گھونسے مارنا چاہا بڈھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرا دیا۔
صاحب:۔ (آکا سے) ہم تو کچھ دیکھ نہیں سکے۔
آکا:۔ آپ کہاں چلے گئے تھے۔
صاحب:۔ ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہوگا اس لئے پوری توجہ نہیں کی۔
آکا:۔ ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسا مارا ہم نے کیلی کر کے انھیں پچھاڑ دیا۔ البتہ اتنی رعایت کی کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقعے پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔
صاحب:۔ کیلی کیا؟
آکا:۔ ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔
صاحب:۔ مگر آپ نے بجلی کی سی پھرتی کی۔
آکا:۔ ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔
میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پہنچے سے لے کر شانے تک

سہلایا۔ اس کے بعد آ کا کے قریب اُ کر آ کا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا۔ ان کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن۔ نہ ان کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آ کا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔

آ کا:۔ بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔

صاحب:۔ نا ممکن ہے۔

آ کا:۔ آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہیے کہ طمنچہ چلائیں۔ خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہوگا۔

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ لگے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تا کہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ اور صاحب نے اپنا ریوالور لا کر میجر کو دیا۔

آ کا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر جھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور اس کی گھوڑی دبانی چاہتے ہی تھے کہ آ کا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی۔ ہاتھ نیچے آ ہی رہا تھا کہ آ کا کے ہاتھ کی گدّی اس کی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آ کا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

صاحب:۔ یہ آپ نے کیا کیا؟

آ کا:۔ (مسکرا کر) اسے ہت کٹی کہتے ہیں۔ میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی۔ میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدّی سے لیا۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متعجب ہوتے۔ سید ہادی حسین خاں سے آکا کی تعریف کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آکا رخصت ہو کر گھر آ گئے اور اس روز سے مرزا رفوگر کی دوکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔ قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔

منادی
نمبر ۳/۱۶ستمبر ۱۹۳۹

پردہ

ملا واحدی صاحب کی تقریر جو دلی ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی

اور ڈائرکٹر صاحب دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کی اجازت حاصل کرکے شائع کی جاتی ہے

اسلام سے پہلے عرب کے مرد یہ دکھانے کے لئے کہ ہم امیر ہیں اور ہمارے پاس بہت کپڑا ہے نیچے نیچے تہمد باندھا کرتے تھے۔ جو زمین پر لٹکتے رہتے تھے۔ اسلام نے اس چھچھورپن اور غرور کو دور کرنے کی نیت سے حکم دیا کہ مسلمان ٹخنہ سے نیچا تہمد نہ باندھیں۔ بعد میں جب پاجامہ کا رواج ہوا تو اسے بھی ٹخنہ سے اونچا رکھا گیا۔ مقصد اصل میں تہبند اور پاجامہ کی لمبان مقرر کرنا نہیں تھا۔ غرور اور اینٹھ کو مٹانا تھا۔ آج اگر وہی غرور اور اینٹھ ٹخنہ سے اونچا پاجامہ پہننے والوں میں اونچا پاجامہ پہننے کی وجہ سے ہے تو اسلام کی منشا کے مطابق ان کی مولویانہ تراش ناجائز قرار پائے گی۔

پردہ کے مخالف کہتے ہیں کہ پردہ کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ لیکن پردہ کا معاملہ ایسا معاملہ ہے جیسا کہ ٹخنہ کے چھپانے اور نہ چھپانے کا معاملہ اور اس میں حالات کے لحاظ سے تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ یہ نماز نہیں ہے کہ ہمیشہ پانچ وقت ہی پڑھی جاتی گی اور روزہ نہیں ہے کہ تیس کے تین کبھی نہیں ہوں گے۔

عورتیں بدتمیزی کے ساتھ ادھر اُدھر ماری ماری پھرا کرتی تھیں اسلام نے کہا ہرج۔ بونگ پنا چھوڑ دو۔ اب تمہیں اچھائی برائی کی تمیز آگئی ہے۔ گھروں میں بیٹھو اور گھرداری کے فرائض انجام دو۔ ہاں نماز کے واسطے یا دوسری ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے باہر جا سکتی ہو۔ نظریں نیچی کئے ہوئے اور سر پر

لپیٹنے کے رومال کو ذرا لٹکا کر اور عورتیں مردوں سے دل مل کر نماز نہ پڑھیں۔ بلکہ آخری صفیں عورتوں کو پوری کی پوری دے دی جائیں۔ اور مرد اس وقت تک پیچھے نہ مڑیں جبتک تمام عورتیں مسجد سے باہر نہ ہو جائیں اور جو عورتیں بےحیائی کا کام کریں اور ان کی بے حیائی کے کم از کم چار گواہ ہوں تو چاروں گواہوں کی گواہی سے انہیں گھر سے نکلنے کی ممانعت کر دو۔

پردہ کو اسلام سے تعلق تو ہے مگر بس اتنا۔ اور اسلام کی اتنی سی پابندیاں نبھانے سے پردے کی مخالفت کے دور میں بھی غالباً کوئی انکار نہیں کرے گا تاہم ان ہدایتوں کا ہر حصہ لچکایا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ لفظ بہ لفظ پیروی کرنے پر مسلمان مجبور نہیں ہیں۔ چنانچہ پیغمبرؐ اسلام کے انتقال کو چند ہی سال گزرے تھے کہ ان کے دوسرے جانشین حضرت عمرؓ نے عورتوں کا مسجدوں میں آنا موقوف کر دیا۔ گویا اجازت بندش سے بدل گئی تو جب اجازت پردہ کے معاملہ میں بندش سے بدلی جا سکتی ہے تو بندش اجازت سے کیوں نہ بدلی جا سکے گی۔

اب غور اس بات پر کرنا ہے کہ حالات کا تقاضا پردہ کی موجودہ صورت کو باقی رکھنے کا ہے یا حالات تبدیلی اور اصلاح چاہتے ہیں۔ اسلام اپنی بیٹیوں ہی سے نہیں بیٹوں سے بھی شرم و حیا اور پاکبازی کا طلبگار رہے اس لئے فقط عورتوں ہی کو یہ حکم نہیں کیا کہ وہ غیر مردوں پر اداؤں کے تیر نہ چلائیں بلکہ مردوں کو بھی بتایا کہ انھیں نظر اور نیت پاک رکھنا چاہیئے عورتوں سے کہا کہ اپنی عصمت کی حفاظت کرو اور مردوں سے کہا کہ تم اپنی عصمت کی حفاظت کرو۔ بالکل برابر کے الفاظ ہیں۔ اسلام نے عورت اور مرد میں سوائے کام وغیرہ کی تقسیم کے اور کسی طرح کا فرق نہیں رکھا۔ ہر نیکی کا بدلہ مرد اور عورت کے لئے یکساں ہے اور ہر بدی کی سزا مرد اور عورت کے لئے ایک ہے۔ عورت کو مرد کی عصمت کا ذمہ دار مقرر نہیں کیا۔ مرد اپنے عمل کا جوابدہ ہے اور عورت اپنے عمل کی جوابدہ۔ لیکن ہم نے خود تو ان احکام کو مانا یا نہ مانا البتہ ان احکام کو بہانہ بنا کر عورتوں سے خوب منوایا۔ بے حیائی کی حرکت سرزد ہونے سے قبل ہی انہیں قید کر دیا اور ان کی عصمت کے زبردستی محافظ ہو بیٹھے۔ اور خواہ وہ ذمہ داری جو اسلام نے

عورتوں پر عاید کی تھی اپنے سر لے لی۔

صرف ہندوستان میں نہیں تمام دنیا میں مسلمان مردوں نے شرم وحیا اور پاکبازی کے اسلامی احکام کو اپنے احکام سے دبا دیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری عورتیں پاکباز تو ہیں لیکن بے اختیارانہ پاکباز ہیں۔ اگر کوئی وقت آپڑے تو وہ آپ اپنی عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتیں مردوں کو ان کی عصمت بچانے کا فرض ادا کرنا پڑے گا۔ اور جس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مرد اپنی عصمت برباد کرنے کے اعتبار سے بدنام ہیں۔ مسلمان مردنے محض عورت کی عصمت کا نام عصمت رکھ لیا۔ مرد کی عصمت کے اس کے یہاں کچھ معنی نہیں ہے اور عورت سے بھی مراد اس نے اپنی بہن۔ اپنی بیٹی۔ اپنی بیوی لی۔ اور اپنے اعمال سے اسلام کو کلنک کا ٹیکہ لگایا۔

یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہر نر اپنی مادہ کو اپنے ہی لئے مخصوص رکھنا چاہتا ہے اور ہر مادہ اپنے نر کا دوسری مادہ کی طرف متوجہ ہونا پسند نہیں کرتی۔ مگر صاحب! یہ اصلی فطرت ہے کہ کوئی نر دوسرے کی مادہ پر ہاتھ نہ لائے۔ ان جانوروں کے سوا جنھیں انسان کی صحبت حاصل ہے۔ ایک جانور آپ نہیں دکھا سکتے جو بغیر جوڑہ لگائے مادہ کو اپنی مادہ اور نر کو اپنا نر بنانے کے لئے تیار رہو۔ جنگل کا مرغ تک اپنی ہی مرغی پر قانع رہتا ہے۔

حقیقتاً خدا نے ہمیں بھی یہی فطرت بخشی تھی اور اسلام ہمیں بھی اسی فطرت کی طرف لانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اپنی فطرت کو بھی بگاڑ لیا اور عورت کی فطرت کا بھی ناس کر دیا۔

موجودہ پردہ کا فائدہ اگر کچھ بتایا جا سکتا ہے تو وہ بس ایک ہے کہ پردہ دار عورتیں باعصمت ہوتی ہیں دوسرا کوئی فائدہ موجودہ پردہ میں نہیں ہے۔ لیکن اوّل تو ہم یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں کہ بے پردہ عورتوں کو اپنی عصمت پیاری نہیں ہوتی۔ دوسرے صرف عورتوں کی عصمت کا تحفظ ہمارے نزدیک کافی نہیں ہے۔ مردوں کی عصمت کا تحفظ بھی ہم اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا عورتوں کی عصمت کا تحفظ ضروری ہے۔ تیسرے عصمت کے تحفظ میں جبر کی بجائے ارادہ اور اختیار ہماری طبیعت تلاش کرتی ہے۔

فائدہ کے مقابلہ میں نقصانوں کو لیجئے تو پہلا نقصان تو یہی ہے کہ پردہ نشین عورتوں کے مرد اپنی عصمت بے خوفی سے برباد کر سکتے ہیں۔ دوسرے عورت اپنی عصمت کا محافظ اپنے سے بڑھ کر اپنے مرد کو سمجھنے لگتی ہے۔ اور اس میں اپنی عصمت کی حفاظت کا جذبہ اور زور کم ہو جاتا ہے۔

تیسرے نیچے برقعے اور اونچی دیواریں کبھی اتفاق سے مدد نہیں کرتیں تو بھیڑیئے مرد کے آگے عورت بکری بن جاتی ہے۔

چوتھے سیدھی سادھی بیویوں اور ان کی تربیت کی ہوئی اولاد کو چھوڑ کر ہم نوکری کے لئے یا تجارت کے لئے یا سیاحت کے لئے دوسرے شہروں یا دوسرے ملکوں میں نہیں جا سکتے۔

پانچویں موجودہ پردہ فطرت کے مطابق اور اسلام کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ خود غرض دماغوں نے ایجاد کیا ہے۔ اس واسطے چچا زاد اور ماموں زاد۔ خالہ زاد اور پھوپی زاد بھائی بہنوں میں پردہ نہیں کیا جاتا اور شہر کے شہر میں بھی یہ نقص ہمیشہ پریشان رکھتا ہے۔

ساتویں دنیا کے حالات سے بے خبر اور زمانے کی رفتار سے ناواقف ماؤں کی گودیں پلے ہوئے بچے دنیا کی دوڑ میں شریک نہیں ہو سکتے۔

آٹھویں دنیا کے حالات سے بے خبر اور چار دیواریوں کے اندر زندگی بسر کرتے کرتے ہماری عورتیں ہر نئی چیز سے مرعوب ہوتی ہیں اور فرضی اور خیالی چیزوں تک سے ڈرنے لگتی ہیں۔

نویں چھپتے چھپتے عورتوں کو سب کام چھپا کر اور چوروں کی طرح کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے سچے اور کھرے انسان کی مانند جرأت اور ہمت کا اظہار ان سے نہیں ہو سکتا۔ دسویں پردہ کی بدولت عورتیں پھر اسی درجہ کو پہنچ گئی ہیں جس سے اسلام نے انھیں ابھارا تھا۔ گیارہویں صرف پردہ کی وجہ سے ہم کو اپنے کاموں میں اپنی شریک زندگی کی حوصلہ بڑھانے والی رفاقت نہیں ملتی جو ہمارے بڑوں کو جنگ کے میدان میں حاصل ہو جاتی تھی تو انہیں مرجانا آسان کر دیتی تھی۔

بارہویں روشنی اور ہوا ہماری عورتوں پر حرام ہوجاتی ہے جس سے ان کی صحت بگڑتی ہے۔

تیرہویں جب عورتیں باہر نہیں نکل سکتیں اور ہم کو نوکری یا دوکانداری سے اس قدر فرصت میسر نہیں آتی کہ روز بچوں کو کھلے میدانوں میں لے جاسکیں تو بچے بھی ماؤں کے ساتھ کسی قدر پردہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ ہماری قوم روز بروز تندرستی سے محروم ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے حاکمانہ شان سے موجودہ پردہ اختیار کیا تھا۔ لیکن اب اسے بحالہ باقی رکھنے میں غلامانہ ذہنیت نے دخل پالیا ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستان جیسا لمبا چوڑا ملک ملا تھا جس کی اتفاق سے اس وقت آبادی زیادہ نہ تھی لوگوں کے پاس ایسے ایسے بڑے محل تھے کہ آج ان میں بستیاں بستی ہیں۔ مثلاً دہلی کے چند محلوں کے نام عرض کرتا ہوں۔ حبش خاں کا پھاٹک۔ اعظم خاں کی حویلی۔ تراہہ بہرام خاں وغیرہ وغیرہ یہ سب حویلیاں تھیں۔ ان حویلیوں میں پردہ نبھ جانا عجیب نہیں تھا۔ عورتوں کی ورزش اور تفریح کے لئے ان حویلیوں کے اندر میدان اور باغ ہر چیز موجود ہوتی تھی اس لئے اس وقت کی عورتیں کم از کم اپنی صحت بحال رکھنے کے واسطے باہر نکلنے کی محتاج نہیں تھیں پھر اگر وہ نکلتی تھیں تو اس آن بان سے کہ حویلی کے سامنے دور دور تک پہرہ لگا دیا گیا ہے۔ بیگم صاحبہ جب تک سواری میں نہ بیٹھ جائیں مردوں کو رُکنا پڑے گا۔ اس میں عورت کا ایک احترام تھا اور اسے وہ اسی طرح قبول کرتی تھی جس طرح راجہ نواب اور بادشاہ شاہانہ قید و بند کو قبول کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن ۱۹۳۹ء کا حال اور ہے اس ٹھاٹھ کو رخصت ہوئے زمانہ گذر چکا اور ہمارے قبضہ میں اب محلوں کی جگہ (کم از کم شہروں کے اندر تو) فقط بھٹ اور ڈربے رہ گئے ہیں جنھیں پردہ دار عورتوں کی قبریں بھی کہا جا سکتا ہے ان گھروں میں رکھ کر عورتوں کو باہر نہ نکلنے دینا ہمارا ہی حوصلہ ہے۔ مگر زمانہ اور حالات سے کوئی کتنی ہی غفلت برتے زمانہ اور حالات اپنا لوہا منوائے بغیر نہیں رہتے۔

گوروبابانانک صاحب

علامہ سرعبدالقادر صاحب ممبراگزکٹو کونسل وائسرائے کی تقریر

جو دلی ریڈیو سے نشر ہوئی اور ڈائرکٹر صاحب دلی ریڈیو کی اجازت سے شائع کی جارہی ہے

دنیا کے ان چیدہ بزرگوں میں جنھوں نے اپنی زندگیاں خلق خدا کی رہنمائی کے لئے وقف کردیں۔ اور اپنے ذاتی آرام اور آسائش پر خدا کے بندوں کی خدمت کو ترجیح دی۔ گوروبابا نانک جی بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ ہمارے پیارے ہندوستان کا وہ گوشہ جو پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے اور ان کی نسبت سے پنجاب کہلاتا ہے۔ اس امتیاز پر جس قدر ناز کرے بجا ہے کہ گروبابا نانک جی نے اس کے ایک گاؤں میں جنم لیا۔ اس گاؤں کا پرانا نام تلونڈی ہے اور وہ ایک خاصہ بڑا قصبہ ہے جسے گوروصاحب کے نام پر ننکانہ کہتے ہیں اور زیادہ ادب سے "ننکانہ صاحب کہا کرتے ہیں۔ گورو نانک جی سکھ پنتھ کے بانی ہیں اور ہر چیز جو ان سے یا ان کے جانشین گروؤں سے منسوب ہے۔ عزت سے "صاحب" کرکے پکاری جاتی ہے۔ ہمارے سکھ بھائیوں کی مذہبی کتاب جس میں گورو نانک جی کے بھجن اور ان کی مفید تعلیم کے اقوال درج ہیں "گرنتھ صاحب" کہلاتی ہے۔ سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ جو امرتسر میں ہے۔ "دربار صاحب" کے نام سے منسوب ہے۔ ایک کھیت جسے مویشی کھا گئے تھے اور جس کی بابت مشہور ہے کہ وہ گروصاحب کی دعا سے ویسا ہی ہوگیا تھا جیسا پہلے تھا۔ اب تک ایک کیاری گوردوارے کی جگہ ہے اور "کیارا صاحب" کہلاتا ہے۔ ایک درخت جس کے سائے میں گروصاحب اپنی باتیں بیٹھے تھے "تنبو صاحب" بن گیا۔ ایک کوٹھڑی جس میں ایک دفعہ تھوڑی سی دیر کے لئے انہیں بند کیا گیا "کوٹھڑی صاحب" ہوگئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نیک وعظیم انسان کو یہ بڑائی کس بنا پر ملی۔ کہ ان کی زندگی میں بھی اس زمانہ کے بہت سے لوگ ان کے

معتقد ہوگئے ان کے اس دنیا سے گذرنے کے بعد بھی لاکھوں بندگان ان کی پیروی پر فخر کرتے ہیں اور ان کے نام پر اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔

گورو نانک صاحب انگریزی سالوں اور مہینوں کے حساب سے اپریل ۱۴۶۹ء میں تلونڈی کے ایک معزز بندے کے گھر پیدا ہوئے۔ اس واقعہ کو ابھی پورے پانچ سو برس نہیں ہوئے کہ پنجاب کے مردم خیز سرزمین اپنے اس سپوت کے قدم چھوتی رہی۔ میں خوش ہوں کہ اپنے وطن کے مشہور شاعر سر محمد اقبال مرحوم کی طرح انہیں کے الفاظ میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ ؎

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اس وحدت کے گیت سے گورو نانک کو وہ لازوال شہرت نصیب ہوئی جس کی بدولت ان کا نام آج تک زندہ ہے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس وحدت کی تعریف کیا ہے؟ ایک یہ کہ گورو نانک جی نے خدا کی وحدت کا سبق تازہ کیا اور ایسے زمانہ میں جب بت پرستی کا زور تھا اور لوگ مصنوعی خداؤں کو پوجتے تھے۔ انہوں نے بے دھڑک پکار کر کہدیا کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ اور اس عقیدے کی پختہ بنیاد پر وحدت کا وہ محل تعمیر کیا جس میں خدا کے سب بندے ایک ہو جاتے ہیں اور ہندو اور مسلمان عیسائی اور زرتشتی سب ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں۔ غیریت اٹھ جاتی ہے اور یگانگت اس کی جگہ لیتی ہے۔ امیر مینائی لکھنوی نے اس وحدت کی تعریف کیا خوب لکھی ہے۔ ؎

سب دوئی کا ہی یہ پردہ ہے۔ جو وحدت ہو جائے
گردن شیخ میں زنار برہمن ڈالے

گورو نانک نے سب سے بڑا کام یہی کیا ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا انہوں نے اپنے اس وطن کو یہ سمجھانے اور سکھانے کی کوشش کی کہ مختلف فرقوں کے امتیازات ظاہری اور عارضی ہیں اور اصل میں سب انسان ایک ہیں اور انہیں آپس میں محبت رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے شیخ اور برہمن دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ دونوں سے خود دوستی پیدا کی اور دونوں کو نصیحت کرتے رہے کہ مذہب

کی اصلیت کو حاصل کرو اور صرف ظاہرداری پر نہ بھولو۔

گورو نانک میں یہ خصوصیت ان کے بچپن سے ہی موجود تھی کہ وہ باطن کو ظاہر پر ترجیح دیتے تھے مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ اس ہونہار بروا کا یہ حال تھا کہ پاندھے کے پاس پڑھنے گئے تو تختی لکھتے لکھتے اس کو روحانیت کا سبق پڑھا دیا۔ اس کے بعد سنسکرت سیکھنے کے لئے ایک پنڈت کے شاگرد ہوئے تو اسے بھی علم باطن سے حصّہ دے آئے۔ فارسی پڑھنے کے لئے ایک مولوی کی شاگردی کی تو اس کی توجہ بھی صورت سے ہٹا کر اصلیت کی طرف پھیر دی۔ کہا جاتا ہے کہ گورو نانک جی کے والدین کو ان کی ابتدائی عمر میں ان سے بار بار مایوسی ہوتی کہ جس پڑھائی میں انہیں لگایا گیا اس پر انہوں نے کافی دل نہ لگایا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے والدین ان کے کاموں کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھ کر مایوس ہوتے تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا کاروباری آدمی نہیں بنے گا۔ اور دنیاوی معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ نہ بہت روپیہ کمائے گا۔ نہ اس کو سنبھالنا سیکھے گا۔ لیکن اور بہت سے مردم شناس لوگ گورو نانک کے باپ کے جاننے والوں میں ایسے تھے جو یہ پہچان رکھتے تھے کہ اس لڑکے میں بڑھنے کی نشانیاں ہیں اور کہتے تھے کہ یہ کسی دن بہت بڑا آدمی ہوگا۔ صرف نانک کے والدین کے خیالات میں فرق تھا۔ والدین اپنے بیٹے کی دولت کی ترقی چاہتے اور دوسرے زیادہ سمجھدار دوست اخلاقی عظمت اور علم باطن کی بڑائی کے آثار ان میں دیکھتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرو نانک پڑھائی میں دل نہ لگانے کے سبب تعلیم سے کافی بہرہ ور نہ ہو سکے۔ مگر ان کے ایک فاضل سوانح نگار کی یہ رائے مجھے درست معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے تینوں استادوں سے تھوڑے عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ ان کی طبیعت ذہین تھی اور حافظہ عمدہ۔ کوئی اور جو کچھ مدت کی محنت کے بعد سیکھتا وہ تھوڑے دنوں میں سیکھ لیتے تھے۔ اسکا بہترین ثبوت یہ ہے کہ "گرنتھ صاحب" میں معرفتِ الٰہی کے جو باریک نکتے بھرے ہوئے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ گورو نانک صاحب

کا دائرہ علم خاصہ وسیع تھا اور انہیں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے اصولوں سے گہری واقفیت تھی۔ اسی طرح ان کی زبان گو پنجابی تھی لیکن ان کے کلام نظم و نثر میں فارسی اور سنسکرت کے اچھے اور پرزور الفاظ بکثرت موجود ہیں۔

مذہبی اصولوں کے سکھانے کے لئے جو طریقہ گرو صاحب نے شروع سے اختیار کیا اور آخر تک نباہا وہ یہ تھا کہ آسان مثالوں، سیدھی سادی کہانیوں اور سہل اشارات سے بڑے بڑے مسئلے لوگوں کو سمجھا دیتے تھے۔ ان کے ایسے سبق آموز واقعات کے متعلق بے شمار روایات مشہور ہیں۔ ان میں سے دو ایک نمونے کے طور پر یہاں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً وہ واقعہ لیجئے کہ جب گرو نانک کی زنار بندی کی رسم ادا ہونے لگی۔ عزیز رشتہ دار جمع ہوئے اور برہمن کو بلایا گیا کہ وہ دھاگا جسے زنار کہتے ہیں ان کے گلے میں ڈالا جائے۔ تو نوعمر نانک جی نے برہمن سے پوچھا کہ یہ دھاگا کیوں پہناتے ہو۔ اس نے کہا بڑوں سے یہ رسم چلی آتی ہے۔ اس کے پہنے بغیر آدمی شودر شمار ہوتا ہے اور اس کے پہنتے ہی اونچی ذاتوں میں داخل ہو جاتا ہے اور دونوں جہان میں اس کا بھلا ہوتا ہے۔ یہ سن کر نوعمر مگر دانا دل لڑکا بولا۔ "پنڈت جی! دھاگا اگلے جہان میں کسی کی بہتری کیسے کرتا ہے۔ یہ تو جسم کے ساتھ ہی رہ جاتا ہے اور جو منزل روح کے لئے اس زندگی کے بعد درپیش ہوتی ہے اس میں وہ اس کے ساتھ نہیں جاتا وہاں تو ہر شخص اس دھاگے کے بغیر جاتا ہے۔ مجھے وہ دھاگا دیجئے جو آنیوالی زندگی میں میری روح کے ساتھ جائے۔" اس پر برہمن نے سوال کیا کہ "تمہیں بتلاؤ کہ جو دھاگا تم چاہتے ہو کیسا ہوتا ہے اور کہاں سے مل سکتا ہے؟" گرو نانک نے جواب دیا۔ "روح کے لئے جو پائدار دھاگا درکار ہے وہ زندگی میں نیک کام کرنے اچھے خیالات رکھنے اور اخلاق کی سچی پابندی سے بن سکتا ہے۔ رحمدلی کی روئی لو اس سے قناعت کا سوت کاتو۔ اس میں پاکیزگی کی گرہ لگاؤ اور سچائی سے اس دھاگے کو بل دو۔ ان نیکیوں سے تمہاری روزمرہ کی زندگی مرکب ہو تب تمہاری روح کے گرد اس دھاگے کا حلقہ ہوگا جو نہ کبھی پرانا ہوتا ہے۔ نہ میلا۔ نہ جلتا ہے نہ کھویا جاتا ہے۔ جو سچ مچ برکت والا

ہے۔ پھر اُسے کسی اور دھاگے کی ضرورت نہیں۔ پس مجھے اس دھاگے کی ضرورت نہیں جو بازار میں سستے داموں ملتاہے اور میلا اور پرانا ہو کر ٹوٹ جاتا ہے۔ ے

"ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنّار نیست"

اس روایت میں جیسے ایک بڑا سبق ہندوؤں کے لئے ہے اسی طرح ایک اور روایت میں مسلمانوں کے لئے ایک بڑا سبق موجود ہے۔ گرو نانک جی کے عہد کے بڑے مسلمانوں میں ایک صاحب نواب دولت خاں تھے۔ جو ان کو بہت اچھا جانتے تھے ایک قاضی صاحب نواب صاحب کی مسجد میں نماز پڑھاتے تھے ایک مرتبہ گرو نانک جی کی قاضی صاحب سے بحث ہوئی گرو جی کہہ رہے تھے کہ ہندو ہندو نہیں رہے اور مسلمان مسلمان نہیں رہے قاضی صاحب نے کہا ہندوؤں کی بابت تو ہم کہہ نہیں سکتے مگر اسلام کے کروڑوں ماننے والے اچھے مسلمان ہیں۔ گرو جی نے اپنے رفیق بھائی مردانے سے کہا کہ ذرا رباب کو چھیڑو اور خود اس کے ساتھ ایک گیت گانا شروع کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

سچا مسلمان کہلانے کا استحقاق پیدا کرنا مشکل ہے۔ جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہو اسے چاہئے کہ پہلے اسلامی نیکیاں اور صفات حاصل کرے۔ اسے پہلے وہ مذہب سیکھنا چاہیئے جس کا وعظ خدا کے سچے ماننے والوں نے کیا ہے۔ غرور اور طمع سے وہ اپنے آپ کو خالی کر دے۔ خدا کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر کے عجز اور انکسار کی عادت کرے۔ پیدائش اور موت کا خوف دل سے نکال دے۔ جو خدا کی مرضی ہو اسے خوشی سے قبول کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ خدا ہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ خود غرضی کے سب خیال دل سے نکال دے۔ سب انسانوں سے رحمدلی اور مہربانی کا برتاؤ کرے۔ جو شخص یہ سب کر سکے وہ درحقیقت مسلمان کہلا سکتا ہے اور بغیر اس کے نہیں"

تھوڑی دیر بعد گرو نانک نے بھائی مردانے سے پھر کہا۔ ذرا رباب پھر چھیڑنا۔ اور یوں نغمہ سرا ہوئے۔

"رحم کو مسجد بنا۔ ایمان اور سچائی کی جانماز لے۔ انصاف کو اپنی مقدس کتاب سمجھ۔ میٹھا چلن تمہارا روزہ ہو۔ تب تم سچے مسلمان بن سکتے ہو۔ اچھے

عمل تمہارا کعبہ ہوں۔ سچ تمہارا روحانی مرشد ہو۔ دوسروں کی بھلائی تمہاری نماز ہو اور نہ گھبرانے والی طبیعت تمہیں تسبیح کا کام دے۔"

کاش ہمارے ملکی بھائی اپنے وطن کے اس قابل عزت فرزند کی زندگی اور اقوال سے سبق لے کر وہ طریق اختیار کریں جس کی گرو بابا نانک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مخاطب بنا کر دنیا بھر کو تلقین کی ہے۔ تو جن مشکلات کا آج ہم کو سامنا ہے وہ سب حل ہو جائیں۔ سب جھگڑے مٹ جائیں۔ ہمارے سکھ بھائی اگر اپنے مذہب کے مقدس بانی کے نقش قدم پر چلیں تو انہیں اسلام اور ہندو دھرم دونوں سے دوستی ہونی چاہیئے۔ اپنے گرو صاحب کی طرح صلح کل ان کا مسلک ہونا چاہیئے۔ وحدت کی تعلیم کے لحاظ سے ان کے گرو صاحب نے ایسی برادری پیدا کی تھی۔ آج جب اس بزرگ ہستی کی پیدائش کا دن منایا جا رہا ہے۔ تو چاہیئے کہ ان کی یاد کے ساتھ ان کی تعلیم کے یہ زرّین الفاظ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں ہم سب کے دل نشین ہو جائیں اور ہم ان پر عمل پیرا ہوں۔

نگارش رفتہ
ماضی کی شگفتہ و شاداب تحریروں کا انتخاب

فلم میں بے ہودگیاں

خواجہ احمد عباس

میرے بزرگوں کی رائے تو یہ ہے کہ سینما بذات خود ہی سب سے بڑی بیہودگی ہے۔ بزرگوں سے۔ بحث نہیں کرنی چاہیئے ورنہ میں ان سے ادب سے یہ عرض کرتا کہ اس لحاظ سے تو دنیا میں کوئی چیز بھی بیہودگی سے خالی نہیں ہے۔ ریڈیو کو بیہودہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس پر اکثر عشقیہ گانے سنائی دیتے ہیں اور بزرگوں کی رائے میں عشق محبت اور پریم سب بے ہودگیاں ہیں۔ علیٰ ہٰذاالقیاس گراموفون۔ تو پھر چھاپے خانے کو کیوں معاف کیا جائے؟ جو ہر سال سیکڑوں بے ہودہ کتابیں چھاپتے ہیں۔ اور انسان کی زبان بھی تو بہت بڑی بیہودگی ہوئی کیونکہ اس سے ہر روز لاکھوں بے ہودہ باتیں بکی جاتی ہیں۔ سینما کا حال بھی ریڈیو یا گراموفون یا چھاپے خانے یا انسان کی زبان کی طرح ہے۔ بذات خود یہ ایک مشین ہے۔ بیجان۔ نہ اچھی نہ بری۔ نہ نیک نہ بد۔ نہ معقول نہ بے ہودہ۔ مگر ہاں اس مشین کے ذریعہ اچھی اور بری، معقول اور بے ہودہ سب قسم کی باتیں دکھائی اور سنائی جاسکتی ہیں۔ "سنت تکارام" کا گیان بھی اور "ہنٹر والی" کا ہنٹر بھی۔ "آدمی" کی آدمیت بھی اور "پکے بدمعاش" کی بدمعاشی بھی "جیون ہے سنگرام بندے" کا زندگی بخش نعرہ بھی بلند کیا جاسکتا ہے اور "پیا بن ناہیں آوت چین" کا رونا بھی رویا جاسکتا ہے۔ "چل چل رے نوجوان" سے ہمت دلائی جاسکتی ہے اور "چولی پہ نجر یا جائے" سے ہوس بھڑکائی جاسکتی ہے۔

مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوستانی فلموں میں بے ہودگیاں زیادہ اور معقول باتیں کم دکھائی اور سنائی گئی ہیں۔

مگر اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مدت تک پڑھے لکھے اور معقول لوگوں نے سینما کو ایک بے ہودگی سمجھ کر اس کا بائیکاٹ کئے رکھا۔ اور اتنے زبردست ذریعۂ تعلیم کو بیہودہ اور جاہل لوگوں کے حوالے کر دیا۔ اب صورت حال بدلتی جا رہی ہے۔ جوں جوں سینما اسٹوڈیوز میں معقول لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری فلموں سے بیہودگیاں بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔ ممکن ہے بہت جلد یہ سب بے ہودگیاں بالکل ختم ہو جائیں۔ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ہم ان کی فہرست بنا کر رکھ لیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ بے ہودگیاں واقعی فلمی دنیا سے ناپید ہو گئیں تو مزہ جاتا رہے گا۔ اوّل یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اجالے کے لئے اندھیرا اور نیکی کے لئے بدی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر فلموں میں بے ہودگیاں نہ رہیں تو معقول فلموں کی معقولیت کیسے ابھرے گی۔ دوسرے یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ بے ہودگیاں باوجود اپنی بیہودگی کے کسی حد تک دلچسپ ضرور ہوتی ہیں اگر آپ ان کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ مثلاً میرے ایک دوست ہیں سنجیدہ اور پڑھے لکھے۔ جو دل بہلانے اکثر مار پیٹ اور اچھل کود سے لبریز فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ فلم جتنی زیادہ بے ہودہ اور لغو ہوتی ہے اتنا ہی ان کو مزہ آتا ہے اور فلم کی حماقتوں پر ہنستے ہنستے ان کی دن بھر کی تمام کوفت اور تھکن دور ہو جاتی ہے۔

میری رائے میں تو سب سے زیادہ بیہودہ وہ فلم نہیں ہے جن میں مارپیٹ، موٹروں کی بھاگ دوڑ، آدھی ننگی عورتوں کے ناچ وغیرہ کے سین ان پڑھ عوام کا دل بہلانے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان سے زیادہ قابل اعتراض بے ہودگیاں ان فلموں میں ملیں گی جو دعویٰ تو کرتے ہیں سماجی سوالوں کے حل کرنے کا مگر گھٹیا اور گندے مناظر سے بھرے ہوتے ہیں۔

اس قسم کی فلموں میں سب سے بڑی بے ہودگی تو وہ ویشیا یا کسبی ہوتی ہے جو بلا ضرورت سماج کے خلاف ایک لمبا چوڑا لکچر دینا شروع کر دیتی ہے۔ "او سماج کے ٹھیکیدارو! او عقل کے اندھو! ہمیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ ہم تمہارے ہی کرموں کا پھل ہیں۔ تمہارے ہی گناہوں کی یادگار ہیں۔"

وغیرہ لطف یہ ہے کہ اس ویشیا یا اس لکچر کا فلم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سین صرف اس لئے رکھا جاتا ہے کہ ڈائرکٹر صاحب اپنی آزاد خیالی اور ترقی پسند طبیعت کا ثبوت دے سکیں۔ مگر دراصل وہ ثبوت دیتے ہیں اپنی جہالت اور تنگ نظری کا۔ ویشیا ضرور ہمدردی کے قابل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا وجود سماج پر ایک دھبہ ہے۔ مگر اس ہمدردی کو ظاہر کرنے کا یہ ایک نہایت گھٹیا اور بازاری طریقہ ہے کہ ویشیا کی زبان سے سماج کو گالیاں دلوادی جائیں۔ گویا اس پر بڑا احسان کیا گیا ہے۔ مگر اس طرح وہ بے چاری کی تحقیر کرتے ہیں۔ اس کے جذبات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے کلیجے کے ناسور کو کھلے بازار میں برہنہ کرتے ہیں۔

اس لکچر دینے والی ویشیا کا فلمی بھائی وہ بے کار اور بے روزگار نوجوان مزدور ہوتا ہے۔ جو سماج اور سرمایہ داروں کے خلاف لکچر دیتا سنائی دیتا ہے اور آخر میں کسی امیر کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ یہ کیرکٹر بھی اسی لئے رکھا جاتا ہے کہ دنیا کو دکھا دیں کہ کہانی لکھنے والا اور ڈائرکٹر سماجی اونچ نیچ اور مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش سے ناواقف نہیں ہیں۔ کاش یہ کہانی لکھنے والے اور ڈائرکٹر غریبوں اور مزدوروں کے اصل جذبات کو سمجھ سکتے اور یہ جانتے کہ عزت نفس غریبوں کے حصے میں بھی آئی ہے۔ خود دار مزدور اپنے حقوق کے لئے کوشش کرے گا مگر کبھی گڑگڑائے گا نہیں۔ چپ چاپ مصیبتیں سہے گا مگر بات بے بات اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا اعلان نہیں کرے گا۔ یہی تو مزدور اور بھکاری میں فرق ہے۔

جب کبھی ہمارے اکثر ڈائرکٹر اپنی فلموں میں غریبوں کی زندگی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں ان سے بے ہودگیاں سرزد ہوتی ہیں۔ نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ غریب کا گھر کیسا ہوتا ہے۔ نہ یہ معلوم ہے کہ غریب کا دل کیسا ہوتا ہے۔ چند روز ہوئے میں نے ایک اچھے خاصے مشہور ڈائرکٹر کی فلم میں ایک غریب آرٹسٹ کا کیرکٹر دیکھا۔ آرٹ اور دولت کی ٹکر دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر کس قدر ناکامیاب۔ پہلے ہی سین میں دکھایا کہ آرٹسٹ ایک اچھے گرم سوٹ پر آرٹسٹس کا مخصوص سفید کوٹ پہنے تصویر پر پینٹ کر رہا ہے۔

ایک دولت مند آتا ہے اور آرٹسٹ کو اپنی بدصورت بیٹی کی تصویر دکھاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اس میں رنگ بھر کر اس کو خوبصورت بنا دے۔ باوجود کنجوس ہونے کے یہ دولت مند اس کام کے لئے روپیہ بھی دینے کو تیار ہے۔ آرٹسٹ انکار کر دیتا ہے۔ مگر کس طرح۔ تمیز یا شائستگی سے نہیں بلکہ نہایت بدتمیزی سے روپے اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور فوراً آرٹ کے سچے اصولوں پر چیخ چیخ کر لکچر دینا شروع کر دیتا ہے۔ "میں بھوکا مرجانا پسند کروں گا مگر اپنے آرٹ کو بازار میں امیروں کے ہاتھ کبھی نہ بیچوں گا۔" اس انداز میں گویا وہ آرٹسٹ نہیں تھا بلکہ چوپاٹی یا جامع مسجد کی سیڑھیوں کا دوافروش تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد اس آرٹسٹ کا نوکر۔ جی ہاں! اس بھوکے کنگال مگر خوش پوش کے ہاں ایک نوکر بھی تھا۔ آکر کہتا ہے "بابو جی! بھاجی بنانے کو ایک آنہ بھی نہیں ہے۔" میرے جی میں آئی کہ چلا کر کہوں کہ یہ اپنی شاندار میز یا بڑھیا کپڑے کا سوٹ بیچ ڈالو۔ مہینہ بھر کی بھاجی بلکہ پوری اور مٹھائی کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

اور پھر ایک مستقل بے ہودگی کالج کی وہ لڑکی ہے جو فلموں میں نظر آتی ہے۔ اس کا لباس دیکھئے تو کوئی چھوٹی موٹی ریاست کی مہارانی یا گھٹیا اور جاہل قسم کی فلم اسٹار معلوم ہوتی ہے — گوٹے ٹھپے کی چیختی ہوئی ساڑھیاں۔ نیم برہنہ بلاؤز۔ اونچی ایڑی کے جوتے۔ عجیب وغریب وضع کے بال بنے ہوتے۔ غرض ہر چیز بدمذاقی کا اشتہار۔ اس کی بول چال کا انداز۔ اس کی ہر حرکت۔ اس کا تھرکنا۔ اس کا مٹکنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چاوڑی بازار اور پیرس کے ناچ گھروں کی خصوصیات کو جمع کر کے کالج کی لڑکی کا یہ افسوسناک کارٹون تیار کیا گیا ہے۔ ہم نے بھی کالج دیکھے ہیں اور کالج کی لڑکیاں بھی۔ مگر ایسے نمونے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ جو بعض اوقات فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ سو فلموں میں سے شاید چار یا پانچ میں پڑھی لکھی لڑکیوں کا اچھا کیرکٹر دکھایا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں دیکھئے لباس۔ چال ڈھال ہر چیز اتنی بے ہودہ ہے کہ اس کا نہ فن سے کوئی واسطہ ہے نہ اصلیت سے۔ اکثر اس کالج کی لڑکی کے ساتھ

بیہودگیوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے جن کو ہیروئن کی سہیلیاں کہا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کا کام یہ ہے کہ بھڑک دار ساڑھیاں پہن کر ہر سین میں ہیروئن کے اِدھر اُدھر موجود رہیں۔ تاکہ ڈائرکٹر ان کے غیر ضروری Close up لگا کر اپنے خیال میں فلم کو 'جنت نگاہ' اور ان کی چہلیں اور قہقہے سنا کر 'فردوس گوش' بنا سکے۔ یہی انگلو انڈین لڑکیاں کبھی ساڑھیاں اتار کر نیم برہنہ ناچنے کا لباس پہن لیتی ہیں اور اس طرح ایک اور بے ہودگی کا سامان مہیّا کرتی ہیں۔ یعنی ناچ کے سین۔ معلوم نہیں کیوں ہر فلم میں یہ "مردہ ناچ" دکھانا ضروری سمجھا گیا ہے۔ مردہ ناچ کیوں کہا؟ اس لئے کہ اس ناچ کو جو اسٹیج پر نظر آئے "زندہ ناچ" کہا جاتا ہے تو فلم کا یہ ناچ "مردہ ناچ" ہی کہلائے گا۔ یہ ناچ کے سین بھی ایک مستقل بیہودگی ہیں۔ ان میں نہ آرٹ ہوتا ہے نہ حسن۔ نہ کتھا نہ کتھک۔ نہ بھارت ناٹیہ نہ منی پوری۔ صرف آدھے ننگے جسموں کی نمائش ہوتی ہے۔ جس کا فلم کی کہانی سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

اور یہ ناچ دکھائے کہاں جاتے ہیں۔ اس کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ ہیرو یا ولین ایک شہر میں کسی نائٹ کلب میں جاتے ہیں اور وہاں فوراً یہ ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ نائٹ کلب کے سین ایک زبردست بے ہودگی ہیں۔ اس لیے کہ ایسے نائٹ کلب دنیا کے کسی ملک میں بھی نہیں پائے جاتے خصوصاً ہندوستان میں تو اس قسم کے ناچ گھروں کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی دہلی، لاہور اور لکھنؤ میں رہنے والے جو سنیما دیکھنے جاتے ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ بمبئی کے ہر ہوٹل اور رستوران میں ناچ رنگ کی محفلیں ہمیشہ جمی رہتی ہیں۔ حال ہی میں میرے ایک دوست دہلی سے بمبئی پہونچے اور پہونچتے ہی انھوں نے فرمایش کی کہ میں ان کو کسی نائٹ کلب میں لے چلوں اور ناچ دکھاؤں۔ میں نے کہا: مجھے تو بمبئی میں رہتے ہوئے چھ سال ہوگئے ہیں۔ مگر میں نے تو کوئی ایسا نائٹ کلب یا ناچ گھر دیکھا نہیں۔ اس پر میرے دوست نے ایک درجن فلموں کے نام سنا دیئے جن میں انھوں نے اس قسم کے ناچ دیکھے تھے۔ ناچ گانے کے سین دکھانے کا یہ شوق اس بے ہودہ حد تک پہونچ گیا ہے کہ ایک فلم میں تو چلتی ریل میں ناچ گانا دکھایا گیا ہے اور ایک اور فلم میں جہاز میں دیکھنے میں آیا۔ ایک فلم میں ایک عورت دو برس کے بچے کو بہلانے کے لیے رادھا کرشنا کا ناچ شروع کر دیتی ہے اور ایک اور فلم میں ایک نوجوان لڑکی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی

شادی ہونے والی ہے تو وہ ناچنے اور گانے لگتی ہے۔ گویا ہندوستانی گھرانوں کی دلہنوں کا یہی دستور ہے۔

گانا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہندوستانی فلموں کا ایک لازمی جزو قرار پایا ہے۔ ہر فلم میں ایک درجن گانے ہونا لازمی ہیں۔ اور کس کس بہانے سے گانے کے یہ سین رکھے جاتے ہیں۔ اندھا فقیر جس نے پہلے ہندوستانی ٹاکی "دے دے خدا کے نام پہ بابا" کہہ کر بھیک مانگی تھی آج تک ہر فلم میں اپنا رونا روتے جا رہا ہے۔ سہگل اور اوما شانتی کا گانا "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" تھوڑی بہت ردو بدل کے ساتھ ہر فلم میں سن لیجئے۔ موسیقی اور گانا دنیا کی بہترین فنوں میں سے ہیں۔ مگر سب سے بڑی بے ہودگی تو یہ ہے کہ زیادہ تر گانے والوں اور گانے والیوں کو گانے کا سلیقہ ہی نہیں۔ ہاں! ایک بڑی بیہودگی کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا۔ یہ ہے فلموں کا نوکر۔ نوکر مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے اور برے۔ فرماں بردار اور نافرمانبردار مگر ایسے نوکر کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئے جو اپنے مالک کو موقع بے موقع قوالیاں اور ٹھمریاں سنایا کریں یہ فلمی نوکر ہندوستانی تھیٹر کے "کامک" کی روایات تازہ کرتے ہیں اور ان کی اوندھی سیدھی باتوں اور ان کے ناچ گانوں سے ہمارے بعض ڈائرکٹر اپنی فلموں میں تفریح کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک فلم میں تو کمال ہی ہوگیا۔ مالک گھر سے باہر نکلا تو نوکر صاحب اور نوکرانی صاحبہ نے اپنے یار دوستوں کی دعوت کر دی اور اب آپ کیا دیکھتے ہیں کہ خانساماں آیا ناچنے کا لباس پہنے باورچی خانے میں ناچ رہے ہیں۔ محلہ بھر کے دوسرے نوکر تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اب اس سے کیا مطلب کہ ان جنگے کے ملازموں کو اتنا اچھا گانا ناچنا کس نے سکھایا۔ یہ ناچنے کا لباس وہ کہاں سے لائے۔ گھر میں یہ طوفان بدتمیزی برپا کرنے کی اجازت ان کو کس نے دی۔ اگر ہمارے فلم بنانے والے اپنے ہر سین کے متعلق اس "کیا" اور "کیوں" اور "کیسے" پر غور کر لیا کریں تو یہ بیہودگیاں پیدا ہی کیوں ہوں۔

غرض کہاں تک ان فلمی بیہودگیوں کی فہرست آپ کو سناؤں پچھلے ستائیس سال میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہندوستانی فلم تیار ہو چکی ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر نئی فلم میں ایک نئی بیہودگی نظر آتی ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یا تو ان بیہودگیوں کے۔ یا شاید ان بیہودگیوں کی وجہ سے یہ فلم دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اچھا اب اجازت کہ مجھے ایک فلم دیکھنے جانا ہے تاکہ کچھ نئی بیہودگیاں دریافت کر دوں۔ آداب عرض۔ (یہ تقریر خواجہ احمد عباس نے ۴؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کی)۔

حضرت آوارہ

کوّا چلا ہنس کی چال

ببن: (آتے ہوئے) حضور نواب اختر مرزا آئے ہیں۔

عجائب خاں: بڑے گنوار ہو۔ یوں نہیں کہتے کہ تشریف لائے ہیں۔ یا ٹھہرو۔ یوں کہو نواب اختر مرزا بہادر قدم رنجہ فرمانا چاہتے ہیں۔ جاہلو! شہر کے رئیسوں کے آگے میری آبرو لینا چاہتے ہو۔

ببن: بہت اچھا۔ اب تو وہ آ ہی چکے۔

عجائب خاں: ہائے ہائے۔ لاکھ طوطے کو پڑھایا۔۔۔ پڑھایا۔۔۔ آگے کیا ہے، یاد نہیں آتا

ببن: پھر یاد کر لیجیے گا۔ اب کیا حکم ہوتا ہے۔ بلا لاؤں؟

عجائب خاں: ٹھہرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے کپڑے وپڑے تو ٹھیک ہیں نا؟

ببن: روپے میں سترہ آنے، دو شالہ اوراوڑھ لیجیے۔

عجائب خاں: لاؤ جلدی کرو۔

ببن: (قدم، دو رسے) یہ لیجیے، اب بلا لوں؟

عجائب خاں: ہاں (ببن جاتا ہے)۔

نواب: تسلیمات عرض کرتا ہوں، مزاجِ مبارک!

عجائب خاں: عنایت ہے، نوازش ہے، کرم ہے وغیرہ وغیرہ۔ تشریف لائیے، یوں اِس کرسی پر۔

نواب: ماشاءاللہ کس شان سے بیٹھے ہیں آپ اس وقت کر دیکھ کر جی باغ باغ ہو گیا۔ شہر کے سچے رئیس دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کلا ٹھلا تو سچ پوچھیے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں۔

عجائب خاں: ذرا ٹھہریے (ببن سے) بے ادب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو نواب کے لیے شربت و ربت نہیں لاتے۔

ببن: سرکار خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈیوڑھی میں پچاس قسم کے شربت تیار ہیں، کون سا لاؤں؟ بادام، انگور، فالسہ وغیرہ وغیرہ۔ جو حکم ہو۔

عجائب خاں: جو آج کل شہر میں پیا جاتا ہے۔

ببن: بہت خوب، ابھی

نواب: آپ بھی واللہ کس خاطر مدارات کے لوگ ہیں۔ تبھی تو شہر کی ہر بزم میں، ہر جلسے میں، ہر محفل میں آپ ہی آپ کا شہرہ ہے۔ کہنے کو دیہات میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔

عجائب خاں: (بات کاٹ کر) یہ بھی تو کہیے کہ والد مرحوم نے وفات بھی وہیں پائی۔

نواب: جی جی، اور کیا ہاں تو کہنا یہ تھا کہ آپ نے ہم شہر والوں کی بو باس کو اتنی جلد اور اس بے تکلفی کے ساتھ اپنا لیا کہ اب کوئی اندھا ہی آپ کو دیہاتی کہہ سکتا ہے۔ اور بھئی بزرگوں کی پاک ارواح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دنیا میں اب مجھے کوئی نظر آتا ہے تو وہ ایک آپ کی ذات ہے۔ کل ہی میں شہزادہ صاحب سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔

عجائب خاں: ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔ یہ خاکسار تو آپ کا خادم ہے۔

نواب: خیر یہ تکلف کی باتیں ہوتی رہیں گی۔ اس وقت ایک ضرورت سے حاضر ہوا ہوں اور جانتا ہوں آپ کے دشمن چاہے فاقے کریں۔ میرا کام نکال ہی دیں گے۔

عجائب خاں: اوہ! وہ کیا بات ہوتی ہے جو پہلے باندھی جاتی ہے . . . لاحول ولا . . . موٹا سا لفظ ہے۔ ارے صاحب شہر کے لوگ برابر بولتے ہیں . . . وقت پر کمبخت یاد نہیں آتا۔ خیر بہرحال۔

نواب: (ہنس کر) اوہو، میں سمجھا۔ تمہید کو کہہ رہے ہوں گے شاید۔ تو یہ کہیے، میرا مطلب تھا، یعنی یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آپ کا قرضدار ہوں۔ یعنی کئی بار آپ نے بڑی دریادلی سے محض مجھ پر احسان کرنے کے لیے

وہ بھی ہنستے کھیلتے روپے سے میری مدد کی تھی . . .

عجائب خاں: لاحول ولا۔ اس کا ذکر ہی کیا۔ کوئی اور بات کیجیے۔

نواب: جی نہیں جانتا ہوں کہ قرض لیا ہے تو چکانا بھی ہے۔

جمن خاں: آپ بلا کے ضدی ہیں نواب صاحب، ادا ہوتا ہے گا۔

نواب: جی، یوں نہیں، میں چاہتا ہوں کہ اب میرا نام آپ کے کھاتے میں سے نکل جائے اور حساب کتاب صاف ہو جائے۔ آپ جانیں میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کسی کی ایک دمڑی بھی اپنے ذمے نہیں رکھنا چاہتے۔ فرمائیے مجھ پر آپ کی کتنی رقم نکلتی ہے؟

عجائب خاں: توبہ توبہ۔ یہ کیا خرافات لے بیٹھے آپ۔ ٹھہریے آپ کا ایسا ہی اشارہ ہے تو یاد پڑتا ہے کہ آپ نے ایک بار دو سو روپے لیے تھے۔

نواب: بے شک لیے تھے۔

عجائب خاں: اور پھر چھ سو۔

نواب: یہ بھی واجبی۔ اور؟

عجائب خاں: پھر ایک سو چالیس۔

نواب: خوب یاد رکھے۔

عجائب خاں: تو یوں سمجھیے کہ یہ سب ملا کر ہو گئے نو سو چالیس۔

نواب: پائی پائی ٹھیک ہے۔

عجائب خاں: ایک ہزار آٹھ سو تیس آپ نے کپڑے والے کو دلوائے اور دو ہزار سات سو چار بیس نقد لیے۔

نواب: بالکل درست۔ تو اگلے پچھلے ملا کر کتنے ہوئے۔

عجائب خاں: تو چالیس وہ اور یہ ملا کر پانچ ہزار پانچ سو تیس۔

اور موقع ملتے ہی فوراً ادا کر دیے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کے لیے یہ معمولی سی رقم زحمت کا باعث تو نہ ہو گی؟ ہے؟ تو میں دوسری جگہ انتظام کروں۔

عجائب خاں: ہے ہے۔ یہ آپ نے کیا فرمایا۔ ہرگز نہیں زحمت کیسی، یہ تو عین راحت ہوگی۔

نواب : جی ہاں وہی تو میں نے سوچا کہ رقم تو جس سے چاہوں مل جائے گی مگر آپ کے ہوتے ہوئے دوسرے کے آگے ہاتھ پسارنا آپ کی توہین اور اپنی بے تکلفی کو ذلیل کرنا ہے اور یہ شرافت کے خلاف ہے۔

عجائب خاں : رقم ابھی حاضر کی جاتی ہے . . . (لمحہ بھر کے بعد) . . . یہ لیجیے پورے چار سو اڑسٹھ ہیں۔

نواب : شکریہ شکریہ۔ ہے ہے دیکھا آپ نے۔ شہر کے لوگوں میں یہ مروت کہاں۔ جمن خاں صاحب مجھے تو اب سے آپ اپنا بندۂ بے دام سمجھیے۔ اللہ اللہ کیا شان ریاست ہے۔ ہاں لیجیے یہ کہنا تو بھول ہی گیا۔ مبارک ہو بیگم نے آپ کی دعوت قبول کر لی۔ نواب زادی ہو تو ایسی ہو۔ فرماتی تھیں بھئی جمن خاں صاحب کا دل توڑتے ہوئے ہمارا جی کڑھتا ہے۔ (ذرا اِدھر اُدھر دیکھ کر) کوئی ہے تو نہیں ؟ (دھیرے سے) آج سے آٹھ دن پہلے کی ملاقات میں اُس ہیرے کی انگوٹھی کا ذکر نہ کر سکا جو آپ نے میرے ہاتھ بیگم کو بھجوائی تھی۔ وجہ ؟ تو کیا بتاؤں کتنی آگے پیچھے ہوئی ہیں وہ کہ توبہ توبہ۔ کیسا کیسا پھسلانا پڑا ہے تب آج کہیں جا کے لینا قبول کیا ہے۔

عجائب خاں : یہ تو کہیے پسند بھی آئی ؟

نواب : یہ بھی ایک کہی آپ نے۔ ارے صاحب ہزار جان سے۔ انگوٹھی پہن کر تو ان کے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے اور آپ کی طرف تو ان کا میلان ایک ہے تو ایک سو ایک ہو جائے گا۔

عجائب خاں : آپ کے منہ میں گھی شکر۔

نواب : میں ہی جانتا ہوں کس کس ڈھنگ سے میں نے آپ کے تحفے کی قیمت اور آپ کی محبت کا نقش بیگم صاحب کے دل پر جمایا۔

عجائب خاں : نواب صاحب آپ کی مہربانی کے بوجھ سے تو میں چکنا چور ہوا جاتا ہوں۔ آپ سا معزز آدمی میری خاطر اتنی زحمت اُٹھائے۔

نواب : اب آپ بنائیے تو نہیں۔ وقت پر آپ میرے کام نہیں آئیں گے کیا؟

عجائب خاں: سر آنکھوں پر۔

نواب : نواب اجازت دیجیے۔ ایک ضروری کام ہے۔

عجائب خاں: بہت اچھا خدا حافظ (فیڈ آؤٹ)

(پردہ اٹھتا ہے)

ببّن : (آتے ہوتے) کوئی ہے تو نہیں؟ (اونچی آواز میں) گھامڑ! نرے اُلّو! نہیں بلکہ کاٹھ کے اُلّو! احمق۔ کتاب میں لکھ رکھنے والے احمق۔ یہ ہے کم سے کم لفظوں میں ہمارے آقائے نامدار کی تعریف، دال روٹی سے خوش، نہیں۔ زردہ پلاؤ میں مگن۔ دیہات کے آدمی۔ الف کے نام لٹھا بھی نہیں پڑھے۔ بابا کا سایہ سر سے اٹھتے ہی ہل کھلے ہیں۔ گاؤں کو لات مار کر شہر بسا ہا ہے اور خبط اچھا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو . . . . . (دروازہ پر کھٹکا) کون ہے؟ آتے جاؤ۔ چپکے جاؤ (پھر کھٹکا) آجاؤ نا (کئی قدم گھنگھرو کی آواز) اخاہ! آپ لوگ ہیں۔ آئیے۔ آئیے۔

گویّا : اللہ سلامت رکھے۔ نواب اختر مرزا نے کھوڑی بھیج کر یہاں یاد فرمایا تھا۔ سنا بڑی دھوم کا جلسہ ہے۔ آپ کے سرکار کہاں ہیں۔ اللہ سلامت رکھے۔

ببّن : آتے ہیں، کپڑے بدل رہے ہیں۔

گویّا : (اپنے ساتھیوں سے) سرکار برآمد ہوں، جب تک ساز ہی ملالیں۔ (ساز ملانے کی آوازیں) کہیے استاد بندگی عرض ہے، کیا ٹھاٹ ہے؟

ڈانسر : کہاں کے ٹھاٹ! ٹھاٹ گئے بڑوں کے ساتھ۔ ان بی کے پیر دل سے اوندھا سیدھا توڑا نکلوایا ہے۔ سرکار پسند فرمالیں تب کی پسند ہے اپنی کہیے کیا رنگ ہیں؟

گویّا : رنگ تو اڑ چکے استاد۔ ہم کیا پدڑی ہیں۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے ٹوں ٹاں کر لیتے ہیں۔

ڈانسر: یہ کیا کہا۔ قسم سے آج شہر کی آبرو ہے تم سے۔ بٹوے میں وہ سُر کی پھندے بسے ہوئے ہیں تمہارے کر اِدھر ہلا اُدھر فلک جھوم گیا، زمین چکرانے لگی۔

گویّا : میں کس لائق ہوں سرکاروں کی فرمائش تھی۔ یوں ہی سی ایک دھن پر
مغز پچی کی ہے۔ سنیئے گا۔

ڈانسر : داتا پالن ہار ان سرکاروں کو بنائیں رکھیں۔

گویّا : سچ ہے دنیا قدرداں ہوتی تو ہمارے دن پھر جاتے۔

ڈانسر : خدا خدا کرکے یہ ایک رئیس ملا ہے۔

گویّا : اس میں کیا شک ہے پر سنا ہے تبرا ہے۔

ڈانسر : مٹھی کا تو کھلا ہے۔

گویّا : یہ تو ہے پر ہنر سے بھی آشنا ہوتا تو سونے پہ سہاگہ تھا۔

ڈانسر : ارے میاں اچھا ہے کہ نہ ہوا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ مٹھی کھلی ہو (کسی
کی آہٹ)۔

گویّا : سنیلا استاد۔ خود بدولت آرہے ہیں۔

عجائب خاں : آگئے تم لوگ ؟

گویّا : اللہ سلامت رکھے۔

ڈانسر : ڈیوڑھی کا چراغ روشن۔ مجال پڑی تھی کہ یاد پر آنا کافی ہو۔

عجائب خاں : سناؤ بھائی کیا تیاری کی ہے۔

گویّا : حکم کی دیر ہے۔

عجائب خاں : ہاں کپڑے بدلنے میں رہ گیا۔ آج کے لیے نیا جوڑا بنوایا تھا۔ وہ اس کام
چور نکمے درزی نے اتنا چست کر دیا کہ میں شکنجے میں کس گیا ہوں۔
بڑی کھینچ تان سے پہن پایا ہوں۔

ڈانسر : تابع دار حاضر ہے۔ ارشاد کی دیر ہے۔

عجائب خاں : بھئی تم لوگ ابھی تسلی سے بیٹھو۔ درزی کے یہاں سے دعوت میں
پہننے کا دوسرا جوڑا آرہا ہے وہ پہن لوں تو سنوں۔

ڈانسر : سرکار کی مرضی۔

عجائب خاں : دیکھنا سر سے پاؤں تک کیسا سجتا ہوں۔

گویّا : حضور ہم تو ابھی سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈانسر : کتنا حسین جوڑا ہے۔
گویّا : اور ہمارے سرکار پر پھبے گا بھی خوب۔
عجائب خاں : ہاں بھئی شہر کے بڑے وضع دار لوگ صبح کے وقت ایسے ہی کپڑے پہنا کرتے ہیں۔
ڈانسر : حضور دیکھا تو نہیں مگر جوڑا نہیں کرامات ہوگا۔
عجائب خاں : خوب یاد آیا (آواز سے) کوئی حاضر ہے؟
بلن : (دور سے آتے ہوئے) حاضر۔
عجائب خاں : جاؤ کوئی کام نہیں (پکار کر) کوئی حاضر ہے؟
(نوکر فیڈ آؤٹ)
جمن : جی حاضر
عجائب خاں : کچھ نہیں جاؤ، دیکھنا تھا کہ ہماری آواز پر حاضر ہوتے ہو کہ نہیں؟
(جمن فیڈ آؤٹ)... کہو بھئی ہمارے نوکروں کی پوشاک بھی دیکھی۔ کیسی ہے۔
ڈانسر : ایسی ہے۔ ہماری آنکھیں خاک کی۔ بین بین شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔
عجائب خاں : (پکار کر) ادھر آؤ (نوکروں کے قدم) یہ ہمارا دوشالہ سنبھالے رہو (گویّے سے) ہاں بھئی۔
گویا : حضور اس جلسے کے لیے خانہ زاد نے غزل کی ایک دھن بٹھائی ہے۔ اور تو کیا عرض کروں زہرہ اور مشتری بھی آسمان سے اتر آئیں تو پھڑک جائیں۔
عجائب خاں : (نوکر سے) کھڑے منھ کیا تک رہے ہو۔ دوشالہ اڑھاؤ، نہیں ٹھہرو، دوشالہ اوڑھے بغیر ہی سنوں گا۔ ہاں بھئی (ساز چھڑتا ہے)۔
گویّا : (سوہنی کی دھن میں) زلف پر پیچ میں دل جب سے گرفتار ہوا جینا دشوار ہوا۔ (تان اور سرگم)۔
عجائب خاں : ٹھہرو، یہ غزل تو بالکل سوئی ہے۔ اسے سنکر ہمیں نیند سی آنے لگی۔ بھئی۔ دھن میں کچھ جان ڈالو۔

گویا : حضور۔یوں سمجھیں کہ فدوی نے سُروں کا برتاؤ غزل کے مضمون پر کیا ہے۔

عجائب خاں : ارے بھئی: گاؤں میں ہم نے بھی ایک غزل سیکھی تھی۔ کیا تھی وہ؟

گویا : سبحان اللہ! کیا کہنے اس غزل کے۔

عجائب خاں: ارے بھئی اس میں تنکوں کا ذکر تھا اور وحشت بھی تھی۔

گویا : حضور ان دونوں کا ہمیشہ سے ساتھ رہا ہے۔

عجائب خاں: ہاں تو بھئی یاد آگئی۔ (گاکر) واہ سے وحشت ہوئی۔۔۔دیکھا یہ آئی وحشت (گاکر)

بے اعتنائی آپ کی تنکے چنوانے لگی

تو تنکے بھی آگئے (گاکر) ، ہم سے جدائی آپ کی ، اجی بھائی صاحب ، جدائی آپ کی۔ کتنی خوبصورت غزل ہے۔

گویا : واہ واہ ماشاء اللہ کیا کہنے۔حضور گاتے نہیں جادو کرتے ہیں۔

عجائب خاں: ارے بھئی ہمیں کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔

گویا : حضور ان سروں میں سے دو چار غلام کو عطا ہو جاتے تو گلا پاک کر لیتا۔

ڈانسر: سرکار بے تال کے دو ٹکڑے ادھر بھی سرفراز ہوں۔پاؤں کی موچ نکل جائے۔ یہ تھی کرشین کی ڈھیلی تھی۔

عجائب خاں: تم لوگ سنوگے تو حیرت کروگے۔ کہ بے تال رہی الگ۔ میں نے گانا ہی ایک سرے سے نہیں سیکھا۔

گویا : گانا تو پیدا ہے حضور ہے۔اور دسیکھا ہو تو اب شوق فرمائیں۔رئیسوں کی چیز ہے۔

ڈانسر : ساتھ ہی ناچ کا جوڑ بھی لگ جائے تو حضور کیا کہنا۔

عجائب خاں: ٹھہرو۔ ناچ کا نمونہ دیکھ لوں تو کہوں۔ ہاں بھئی۔

(ساز چھڑے)

ڈانسر: ملاحظہ ہو یہ توڑا اور حضور اب اس لونڈی کا ریاض دیکھیے

(گھنگھرو پر توڑے)

گویا : واہ استاد ستم کر دیا کیا ریاض ہے۔کیا محنت ہے۔ بادشاہ ہوتے تال کے۔

عجائب خاں: ہوں، تو مطلب یہ کہ رئیسوں کو ناچ گانا ضرور سیکھنا چاہیئے۔

گویّا: ریاست کا زیور ہے سرکار۔

عجائب خاں: تو ہم ضرور سیکھیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اتنا وقت کیسے ملے گا۔ ادھر ہم نے ایک ماسٹر صاحب کو بھی دیکھا ہے۔ جو دیکھیے کیا کیا پڑھاتے ہیں؟

گویّا: پڑھنا ایک چیز ہے ضرور۔ پر گانا۔ حضور گانا۔

ڈانسر: اور ناچ۔ سرکار ناچنا اور بھی ضروری ہے۔

گویّا: رئیس کے لئے گانا جیسے کھانے میں نمک۔

ڈانسر: اور ناچ جیسے انسان کے لیے سانس۔

گویّا: گانے کے بغیر ریاست نہیں چلتی۔

ڈانسر: اور ناچ کے بنا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

گویّا: حضور دنیا کی یہ ساری افراتفری یہ سارے لڑائی جھگڑے صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ لوگ گانا نہیں جانتے۔

ڈانسر: اور میں کہتا ہوں جہاں بھر کی مصیبتیں اور بلائیں محض اس لیے ہیں کہ لوگ ناچ نہیں سیکھتے۔

عجائب خاں: وہ کیسے؟

گویّا: سنیے۔ کیا یہ ساری لڑائیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ لوگوں میں تال میل نہیں۔

ڈانسر: اور ملاحظہ ہو کہ آدمی کے چلن میں کوئی بھول چوک ہو جاتے تو یہی کہتے ہیں نہ کہ غلط قدم اٹھایا۔

عجائب خاں: بے شک، بے شک

ڈانسر: اور حضور یہ غلط قدم تبھی اٹھتا ہے جب ناچ نہیں آتا۔

عجائب خاں: تم دونوں ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا بھئی سنو، یہ سارا ٹھاٹ میں نے جس کے لیے کیا ہے آج میرے یہاں اس کی دعوت ہے۔

ڈانسر: سرکار، ہم بھی تیار ہیں۔

گویّا: غلام کی مانیں تو حضور بدھ کے بدھ جلسہ کیا کریں۔ رئیسوں کا قاعدہ ہے۔

عجائب خاں : ضرور ضرور، دیکھو دعوت کے وقت چوٹی کا ناچ گانا ہو۔

ڈانسر : نشا خاطر رہیں حضور۔

عجائب خاں : خوب یاد آیا۔ ارے بھئی تم سرکاروں درباروں کے مجرائی ہو۔ یہ تو بتاؤ کسی بیگم کو آداب کرنا ہو تو کیسے کیا جائے۔

ڈانسر : یہ کیا بڑی بات ہے پہلے جھکیے اور جھکیے، پھر آداب بجالائیے۔ پھر چار قدم پیچھے ہٹیے اور چار قدم آگے بڑھیے اور جھک کر آداب بجالائیے۔

عجائب خاں : (آواز دے کر) ادھر آؤ (نوکر کے قدم) استاد ذرا آداب کا قاعدہ اسے سمجھا دو۔

ببن : حضور، رئیس کا نوکر ہوں۔ سارے قانون قاعدے مجھے زبانی یاد ہیں۔

عجائب خاں : بس تو جب مہمان آئیں تم میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ بھول چوک پر ٹوک دینا۔ خبردار۔

ببن : سرکار کے بدلے حکم ہو جاتے تو غلام ہی آداب بجالاتے۔

(جمن آتا ہے)

جمن : سرکار ماسٹر صاحب آتے ہیں۔

عجائب خاں : بلالو (ماسٹر آتا ہے)۔

ماسٹر : میں آگیا۔ کہیے کیا شروع کیجیے گا۔

عجائب خاں : میں کیا شروع کرتا، آپ شروع کرائیے تو شروع کروں۔

ماسٹر : منطق پڑھیے گا؟

عجائب خاں : اس میں کیا ہوتا ہے؟

ماسٹر : آدمی کو ٹھیک سے بولنا آجاتا ہے۔

عجائب خاں : خوب، تو آپ سمجھتے ہیں میں اٹرم سٹرم بولتا ہوں۔ ارے صاحب پانی کو روٹی نہیں کہتا، روٹی کو پانی نہیں بولتا۔ منطق تو مجھے پہلے سے ہی آتی ہے۔ کچھ اور پڑھائیے۔

ماسٹر : تو پھر سائنس پڑھیے۔

عجائب خاں : اس میں کیا ہوگا؟

ماسٹر : آپ کو پتہ چلے گا کہ قدرتی چیزیں کیسے بنیں، دھاتیں کیا ہیں، جھاڑ
پہاڑ، انسان، حیوان، بجلی، تارے، اولے، پانی، برف، ہوا اور وغیرہ
وغیرہ یہ سب کیا ہیں، کیوں ہیں، کب سے ہیں۔

عجائب خاں: اوں ہوں! ماسٹر صاحب یہ تو بڑا جنجال ہے۔ مجھے تو آپ قاعدہ پڑھائیے
قاعدہ۔ پھر وہ کتاب جس میں لکھا ہو کہ مہینے کی پہلی کس تاریخ کو پڑےگی۔
چاندنی راتیں کب سے کب تک اور اندھیرا پاکھ کہاں سے کہاں تک رہیگا۔

ماسٹر : ایک ایک کرکے میں آپ کو یہ ساری باتیں پڑھا دوں گا۔

عجائب خاں: ہاں سنیے۔ میں آپ سے راز میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک
نہایت شاندار اور بھاری بیگم سے وہ ہو گئی ہے جو میں آپ سے بھی نہیں
کہنا چاہتا۔ انھیں ایک خط لکھنا چاہتا ہوں، اس کا مضمون بنا دیجیے۔

ماسٹر : کچھ نہیں، محبت ہو گئی ہوگی۔ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے۔

عجائب خاں: (دھیرے سے) او ہو آپ سمجھ گئے۔ پر کسی سے کہہ نہ بیٹھیے گا، ہاں تو
دیکھیے مضمون ذرا رنگین ہو۔

ماسٹر : نثر میں ہو کہ نظم میں؟

عجائب خاں: نہ نہ مجھے آپ کی نثر پھسر نہیں چاہیے۔

ماسٹر : تو پھر وہی نظم۔

عجائب خاں: دونوں نہیں۔

ماسٹر : ارے صاحب دونوں میں سے ایک تو ہونی ہی پڑے گی۔

عجائب خاں: وجہ؟

ماسٹر : جو نثر نہیں وہ نظم ہے، جو نظم ہے وہ نثر نہیں۔

عجائب خاں: اچھا تو آدمی بات کرتا ہے، وہ کس میں ہوتی ہے۔

ماسٹر : نثر میں۔

عجائب خاں: فرض کیجیے میں کہوں نوکر! ہمارے سلیپر لاؤ تو یہ نثر ہوئی؟

ماسٹر : اور کیا۔

عجائب خاں: اوہ! لیجیے تو میں چالیس پچاس سال سے نثر ہی بول رہا ہوں۔ ماسٹر صاحب

آپ کا احسان کہ آج یہ بھید کھلا۔ اچھا تو دیکھیے اگر یہ لکھوانا ہو کہ میری حسین بیگم تمہارے بڑے بڑے دیدے دیکھ کر میرا دم نکلتا ہے تو اسی کو ذرا رنگین بنا دیجیے۔ چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں ذرا شوخی آجائے۔

ماسٹر : تو۔ یوں ہوگا کہ تمہاری آنکھوں کی آگ نے میرے دل کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔

عجائب خاں : یہ کچھ نہیں جو میں کہتا ہوں وہی ہونا چاہیئے میری حسین بیگم وغیرہ وغیرہ۔ اسی کو ذرا خاص انداز میں کہیے۔

ماسٹر : لیجیے۔ بیگم حسین میری۔ دیدے۔ بڑے۔ بڑے تمہارے۔ میرا دل نکلتا ہے دیکھ دیکھ کر۔

عجائب خاں : ان دونوں میں کون سا بہتر ہے ؟

ماسٹر : آپ کا سوچا ہوا۔

عجائب خاں : واہ واہ۔ ایں۔ ارے ماسٹر صاحب۔ یہ تو لکھے پڑھے بغیر ہی رنگین بن گیا۔ بس ٹھیک ہے۔ او ہو۔ اچھا یاد آیا۔ اگر بیگم آجائیں تو ان سے کیسے پیش آؤں۔ آداب کے قاعدے قانون تو میرے نوکر نے یاد کر لیے ہیں بس اتنی کسر اور رہ گئی ہے۔

ماسٹر : یہ کیا بڑی بات ہے۔ فرض کیجیے وہ آگئیں۔ آداب کا مرحلہ گزر گیا۔ وہ ظاہر ہے کہ مسکرائیں گی۔ بس یہیں سے شروع ہو جائیے گا۔ کہیے مجھے اس بات کا شرف حاصل ہوا کہ خوش قسمتی سے آپ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر دل محزوں کو باغ باغ کر دیا۔ زہے عزت کہ آپ کے مبارک قدم یہاں آئے۔ زمین آسمان میری قسمت پر رشک کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لہجہ نرم ہو۔ آواز میں درد ہو، ہاتھ جڑے ہوں، آنکھیں نیچی اور کبھی کبھی ہلکی آہیں کھینچتی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ بس اب مجھے اجازت دیجیے۔

بدھن : (آتے ہوئے) حضور کا نیا جوڑا آگیا۔

عجائب خاں : دعوت کا وقت بھی قریب ہے۔ چلو پہناؤ۔ استاد آپ لوگ بیٹھیں، میں آتا ہوں۔ (فیڈ آؤٹ)

(پردہ اُٹھتا ہے)

ببن ؛ (زور زور سے مسلسل قہقہے لگاتا ہے)
عجائب خاں: اے بے ادب یہ کیا بدتمیزی ہے۔
ببن ؛ سرکار..... (پھر قہقہے لگاتا ہے)
عجائب خاں؛ نہ چپ ہوا تو؟
ببن ؛ (ہنستے ہوئے) حضور کیا کروں ہنسی نہیں رکتی (ہنستا ہے)
عجائب خاں؛ بس خاموش۔ اب ہنسا اور میں نے تیرا گلا گھونٹا۔
ببن : (منہ کو دبا کر ہنستا ہے)
عجائب خاں؛ کیوں ہنستا ہے بتا؟
ببن : (ہنستے ہوئے) میاں یہ کپڑے پہن کر تو آپ نرے سرنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔
عجائب خاں: گستاخ، تو یوں نہ مانے گا۔ دیکھو اب ہنسا اور پٹا۔
ببن ؛ مار لیجیے۔ ہنسی تو آئے گی ہی (ہنستا ہے)
عجائب خاں؛ تو لے (مارتا ہے) اور ہنسے گا؟
ببن ؛ (ہنس کر) میں کوئی آپ سے ہنستا ہوں۔ آپ ہنسواتے ہیں تو رکا نہیں جاتا۔

(ہنسی)

عجائب خاں: (مارتے ہوئے) دور ہو۔ نکل جاؤ ہمارے سامنے سے۔
ببن : جاتا ہوں۔ اور (دبی زبان سے) بیگم صاحبہ کو دکھاتے دیتا ہوں کہ آپ یہاں کن رنگ رلیوں میں پڑے ہیں (فیڈ آؤٹ) جمن آتا ہے۔
عجائب خاں؛ نالائق، ناکارہ، ناہنجار۔
جمن : حضور میری خطا؟
عجائب خاں؛ اچھا تو ہے! کچھ نہیں۔ کیا ہے؟
جمن : نواب صاحب آئے ہیں۔
عجائب خاں؛ (گھبرا کر) او ہو! دیکھو تو کپڑے ٹھیک ہیں نہ؟ اکیلے ہیں یا وہ مطلب کروہ۔
جمن : یہ وہ کوئی نہیں اکیلے ہیں۔

عجائب خاں: اکیلے۔ خدا خیر کرے۔ جا بلالو (جمن فیڈ آؤٹ)

نواب: تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ اللہ اللہ۔ بڑے ٹھاٹ کر رکھے ہیں آپ نے تو۔
ہاں صاحب کیوں نہ ہو۔ دعوت بھی کس کی ہے۔ ماشاء اللہ (ہنس کر)
اس وقت تو آپ بھی ..... اب میں کیا عرض کروں۔ نظر لگتی ہے۔

عجائب خاں: وہ ہیں کہاں؟ تشریف نہیں لاتیں؟

جمن: (آتے ہوئے) حضور خاصا تیار ہے۔

عجائب خاں: کیوں بدتمیز دوسرا نوکر کہاں گیا۔ چلو دونوں مل کے جاؤ اور خاصے کی اطلاع کرو۔

ببن، جمن: (مل کر) حضور خاصا تیار ہے۔

عجائب خاں: گنوار۔ شہر کی تہذیب چھو کر نہیں گئی۔ چلو نواب صاحب ذرا دستر خوان
دیکھ آؤں (نوکروں سے) سازندے تیار ہیں؟

جمن: تیار۔

عجائب خاں: دوسرا بھرے بولا۔

ببن، جمن: حضور تیار ہے (اور ساز چھیڑنے کی آواز)

عجائب خاں: نواب معاف کرنا، میں ابھی آیا۔ دستر خوان کی سجاوٹ دیکھ لوں (فیڈ
آؤٹ) (دوسرے کمرے میں فیڈان)۔
بھئی آپ لوگ ہمارے دستر خوان پر بیٹھتے ہی کام شروع کر دیں۔
مہمان آچکے ہیں۔

گویا: اللہ سلامت رکھے۔

عجائب خاں: (نواب کے کمرے میں آتے ہوئے) سارا معاملہ چوکس ہے۔ صرف ان کی
کسر ہے (پکار کر) کوئی ہے؟

ببن: (آتے ہوئے) حاضر حاضر

عجائب خاں: (دھیرے سے) تم میرے پاس رہو۔ بیگم کے آتے ہی آداب وغیرہ کرنا
ہے۔ چپکے چپکے مجھے بتا دینا۔ چوکے اور .....

جمن: (اچانک گھبراتے ہوئے) بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ سرکار آگئے (چپکے سے)
برقعے میں ہیں۔

نواب : (ہنس کر) بھئ آپ کے نوکر بھی کیا بہلول ہیں۔ سرکار کی جگہ بیگم بہت خوب۔

عجائب خاں، (جمن سے) چلو دروازہ کھولے کھڑے رہو۔ مہمان کے آتے ہی گردن جھکالو
(کسی کی آہٹ)

جمن : (چپکے سے) جھکی ہے۔

عجائب خاں، ہوں!

جمن : (چپکے سے) اور جھکیے۔

عجائب خاں: جھک نکلا جاتا ہے آگے بول۔

جمن : آداب بجا لایئے۔

عجائب خاں؛ آداب بجالاتا ہوں (چپکے سے) بھول رہا ہوں جلدی بول!

ببن : (چپکے سے) چار قدم پیچھے چار قدم آگے آداب بجا لایئے۔

عجائب خاں: کورنش ہے۔

ببن : میاں آگے مجھے بھی یاد نہیں۔

عجائب خاں؛ ہائے کمبخت کیا وقت پر دغا دی۔ خیر یاد آگیا (قدم قدم پر) آداب، تسلیمات، مجرا کورنش، بندگی وغیرہ وغیرہ (نواب کی ہنسی)

نواب : کچھ کہیے گا یا آداب اور مجرگی میں رہیے گا۔ کھڑے کھڑے بیگم تھک رہی ہیں۔

عجائب خاں؛ دیکھیے یاد کر رہا ہوں۔ ہاں بعد آداب وغیرہ کے عرض ہے۔ دل بار بار آپ کی خوش قسمتی میں محزون کر دیا۔ قدم رنجہ بہ غریب خانہ فرما کر شرف کو یہ بات حاصل ہوئی کہ زمین آسمان کے مبارک قدم یہاں آئے وغیرہ وغیرہ رشک کر رہے ہیں میری خوش قسمتی پر۔ دیکھیے لہجہ نرم ہے، آواز میں درد بھی ہے، ہاتھ جڑے ہیں۔ آنکھیں نیچی اور ہلکی ہلکی آہیں بھر رہا ہوں۔ فقط

بیوی : (بگڑ کر) ہوں تو یوں دماغ بگڑا ہے۔

عجائب خاں، ک ک ک ک کون؟

بیوی : کون! جی وہ جسے اس کے اور آپ کے ماں باپ نے دو گواہوں کے سامنے ٹوکری بھر مہر کے بدلے آپ کے نکاح میں باندھا تھا۔ آپ کی بیاہتا بیوی زینت بیگم

عجائب خاں: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بیوی: یہ ایسے ہو سکتا ہے (برقعہ کی نقاب الٹ دیتی ہے) دیکھا آپ نے؟ ایسے ہو سکتا ہے۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ میں بے خبر ہوں۔ بزرگوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی یوں اڑائی جا رہی ہے۔ شرم، شرم۔

نواب: تو میں اب اجازت چاہتا ہوں۔

بیوی: جائیے شوق سے جائیے۔ مگر بائیں ہاتھ سے وہ ہیرے کی انگوٹھی یہاں رکھتے جائیے۔ مجھے منہ دکھائی میں ملی تھی۔ ان بدنصیب کی بدولت مجھے غیر مرد کے سامنے نقاب الٹنی پڑی۔ اللہ معاف کرے۔

جمن: سرکار وہ سارنگیے، طبلے والے اپنا مجرا مانگ رہے ہیں۔

عجائب خاں: دینا ہی پڑے گا! (فیڈ آؤٹ)

آوارہ

دوسرا مہمان

آبادی سے دُور میجر چندر کانت کی خوشنما کوٹھی، اندھیاری رات، موسلا دھار بارش گرجتے بادل، کڑکتی بجلی، ایک کمرے میں میجر اور ان کے مہمان کنور بلرام بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ دفعتاً بجلی زور سے کڑکتی ہے۔

کنور: (کرسی سے اچھل کر "اُف کہیں گری"

میجر :۔ "ہاں کوٹھی کے پاس ہی، شاید املی کے سوکھے درخت پر"
کنور :۔ (گھبرائے ہوئے) "بڑی بھیانک کڑک تھی جیسے جوالامکھی پھٹ پڑا"
میجر :۔ اور ابھی نہ جانے کب تک پھٹتا رہے گا۔ (مسکرا کے) "بجلی سے بہت ڈرتے ہو کنور جی ؟"
کنور :۔ ہاں میجر۔ نام سے جان نکلتی ہے۔
میجر :۔ شکر ہے میں نہیں ڈرتا۔ ہاں آندھی سے بے شک گھبراتا ہوں۔ ڈر تو مجھے مورچے پر بھی نہیں لگا جہاں گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی بم پھٹ رہے تھے توپیں آگ اگل رہی تھیں۔ ساتھیوں کے چیتھڑے اڑ رہے تھے۔ گولے کا ٹکڑا لگا، بھیجا نکل پڑا۔ بم گرا، دس پانچ کھیت رہے دیکھئے تو شکل نہ پہچانی جائے۔ جل کر کباب ہو گئے۔ جھلسی ہوئی چربی کے پتلے بن گئے تب بھی خدا جانتا ہے اپنے تو رونگٹے تک کھڑے نہیں ہوئے . . . "
کنور :۔ (جھرجھری لے کر) ایسی باتیں نہ کہو میجر۔ رَن کا نقشہ آنکھوں تلے پھرنے لگا
میجر :۔ "اوہو! معاف کرنا، باتوں میں دھیان نہیں رہا کہ تم، . . . "
کنور :۔ اس چمک اور کڑک سے تو آج دل بیٹھا جا رہا ہے۔
میجر :۔ (کافی پاٹ بڑھا کر) "لو اور ایک پیالی لو۔ گرما جاؤ گے۔"
کنور :۔ (کانپتے ہوئے) "شکریہ"
میجر :۔ "تمہارا ہاتھ بری طرح کانپ رہا ہے۔ لاؤ میں ڈھال دوں۔ کافی اس وقت بڑا لطف دے رہی ہے"
کنور :۔ اس گھبراہٹ میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ رات کے کھانے پر ایک مہمان اور بھی ہوگا۔
میجر :۔ "ہوگا تو سہی"
کنور :۔ "اس بجلی پانی میں شاید آنے میں دیر ہو گئی ؟"
میجر :۔ (گمبھیر لہجے میں) "نہیں۔ یہ مہمان کبھی دیر نہیں لگاتا۔ (بجلی پھر زور سے کڑکتی ہے)۔
کنور :۔ (تڑپ کے اٹھتا ہے۔ "ارے . . . "

میجر:۔ بیٹھو بھی۔ اتنی گھبراہٹ بھی کس کام کی۔ بجلی تو کڑکا ہی کرتی ہے۔"
کنور:۔ "اوہ! نہ جانے آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بالکل جیسے کسی نے جلتے توے پر بٹھا دیا"
میجر:۔ "ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"
کنور:۔ دکھایا کہتے ہیں کہ مجھے اچانک صدمے اور گھبراہٹ سے بچنا چاہئے۔
میجر:۔ اور شاید حسین عورتوں کے شوہروں سے بھی۔
کنور:۔ کیا! کیا مطلب؟"
میجر:۔ شوہر کنور جی شوہر۔ اور کیا کہوں۔ سیدھی سی بات ہے۔"
کنور:۔ "میرے مرض سے شوہر کا کیا ناتا؟"
میجر:۔ کیا ناتا؟ بیاہی عورتوں سے تمہاری غیر معمولی دلچسپی جان کر میں سمجھا تھا کہ شاید ہو۔"
کنور:۔ چندر کانت۔ میرے خیال میں تم میری دلچسپی کے بارے میں کچھ مبالغے سے کام لے رہے ہو، اور یہ بات تہذیب سے گری ہوئی ہے۔"
میجر:۔ سچ کہا آپ نے کنور جی بے تکلفی میں نہ جانے کیسے گھناؤنی بات منہ سے نکل گئی۔ جانے دیجئے۔ میزبان کی حیثیت سے معافی چاہتا ہوں۔"
کنور:۔ معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ذکر جانے دیجئے۔"
میجر:۔ مگر مجھے اپنے سوال کا جواب تو ملنا ہی چاہئے۔"
کنور:۔ (ترش ہو کر) مجھے تمہارا سوال پسند ہے نہ سوال کرنے کا ڈھب (اپنے آپ سے) "مہمان ہوں، چپ ہی رہنا چاہئے۔"
میجر:۔ کیوں..... جواب دیجئے نا؟"
کنور:۔ (کرسی چھوڑ کر چلتے ہوئے) "میجر مہمانی کا شکریہ! مجھے رخصت ہونا چاہئے میں جا رہا ہوں۔"
میجر:۔ نہیں کنور جی "آپ نہیں جا رہے۔"
کنور:۔ (چلتے چلتے رک کر۔ دورسے) "تم سمجھتے ہو کہ مجھے روک بھی سکتے ہو؟"
میجر:۔ "بے شک"
کنور:۔ ہونہہ! (چلتے ہوئے) "نمستے"

میجر:- (ڈانٹ کر) "کنور بلرام سنگھ۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔ اِدھر دیکھو مجھ میں اب کچھ رہا تو نہیں ہے۔ اس بات کو جھولا مار گیا ہے۔ پھر بھی جو رہ گیا ہے وہ اس ریوالور سے کام لینے کے لئے بہت ہے۔" (نرمی سے) بہتر ہوگا کہ تم بیٹھ جاؤ۔"

کنور:- نشے میں تو نہیں جان پڑتے۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ تم پاگل ہو۔ اتنا جتائے دیتا ہوں کہ تم پاگل چاہے نہ ہو مگر نہایت خطرناک کام کر رہے ہو۔ میجر، اس طرح دھمکانا جرم ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر میں تھانے چلا گیا تو؟"

میجر:- (نرمی سے) تم تھانے نہیں جاؤ گے کنور جی۔"

کنور:- (کڑوے لہجے میں) "نہیں جاؤں گا؟ اب ایک منٹ کے لئے بھی تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی پاگل آدمی، تو میں. . . ."

میجر:- (گمبھیرتا سے) یہاں آکے بیٹھو اور سنو۔

کنور:- میجر چندر کانت کہے دیتا ہوں کہ تمہیں اس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔"

میجر:- "کنور بلرام سنگھ۔ بھگتنا عورتوں کا کام ہے۔ یہ تو کہو رندھیر بھی یاد ہے؟"

کنور:- کون رندھیر؟ رندھیر وندھیر کوئی مجھے یاد نہیں۔"

میجر:- "پھر سوچو"

کنور:- "کیوں سوچوں۔ کہہ دیا نہ"

میجر:- ٹھیک کہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ خیر۔ سنو، رندھیر میرا گہرا دوست تھا۔ دونوں ایک ساتھ پڑھے۔ فوج میں ساتھ ساتھ بھرتی ہوئے۔ خوب آدمی تھا۔"

کنور:- "یہ سب مجھے کیوں سنایا جا رہا ہے۔ ؟"

میجر:- "اس لئے کہ آج رندھیر کی برسی ہے۔"

کنور:- (کانپتی آواز سے) "پھر کیا؟"

میجر:- ڈاکٹر نے اس کی موت کو حادثہ قرار دیا تھا مگر رندھیر کے دوستوں کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی۔ کیوں کہ اس بدنصیب کی بیوی ایک بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

کنور :۔ (بگڑ کے) پھر وہی۔ میں کہتا ہوں کہ رندھیر کی کتھا مجھے کیوں سنا رہے ہو؟ مجھ سے مطلب؟"

میجر:۔ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں بھی اس سے دلچسپی ہو اور کوئی بات نہیں"

کنور :۔ تو سن لو مجھے اس سے رتی بھر دلچسپی نہیں۔"

میجر:۔ (سنی ان سنی کر کے) "خیال ہوا کہ تم شاید اروند کو جانتے ہو۔"

کنور :۔ "اروند کو اور میں جانوں؟"

میجر:۔ اس لئے کہ اروند اس کا اصلی نام نہیں تھا اور وہ اتنا چالاک تھا کہ یہ راز اُس نے کسی پر کھلنے بھی نہیں دیا۔ رندھیر کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھا کہ جو اروند کے دِل کی دھڑکن کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوتا۔"

کنور:۔ (سہمے ہوے)۔ میجر ان باتوں سے تم کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہو؟ بس کرو اور اپنی حماقت کی باتیں بند کرو" (کہتے کہتے کافی کی پیالی ہاتھ سے گر جاتی ہے)" اوہ! گر پڑی۔"

میجر:۔ کوئی حرج نہیں۔ دیکھو مجھے تمہارے دل کی دھڑکن کا کتنا خیال ہے اور میں دیکھتا ہوں تمہیں اس کی پرواہ نہیں۔" (لہجہ بدل کر) "کنور جی مجھے شبہ ہے کہ تم اروند کو ضرور جانتے ہو۔"

کنور:۔ ہرگز نہیں۔"

میجر:۔ "ہوں ہرگز نہیں! کتنا چالاک تھا وہ رندھیر کی بیوی بھگالے جانے کے لئے گھات میں لگا رہا کہ رندھیر شیر کے شکار کو کب ترائی جاتے، اور کب رستہ صاف ہو۔ کتنا عیار کہ رندھیر کی بیوی کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا گیا یہاں تک کہ نوکروں نے بھی اُسے بنگلے پر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ مگر رندھیر کو کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا اور وہ اچانک شکار سے لوٹ آیا۔ مگر ایک رات اروند اور رندھیر کی بیوی دونوں ایسے غائب ہوئے کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی" (سانس لے کر) کنور جی تم اکتا تو نہیں گئے؟"

کنور:۔ (خاموش)

میجر:۔ اچھا تو سنو۔ اروند نے بھاگنے کی کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑی اور جب رندھیر اس حالت میں پایا گیا کہ ریوالور کی گولی سے بھیجا اڑ گیا تھا، اور پاس ہی ریوالور اور میز پر ریوالور صاف کرنے کا سامان رکھا ہوا تھا تو ڈاکٹر نے مان لیا کہ صاف کرنے میں چل گیا۔ اچھا ہوا رندھیر مر گیا۔ اروند جیسے آدمی کو مار کر پھانسی کے تختے پر لٹکنے سے یہ کہیں اچھا ہوا۔ اسے پھانسی کی سزا ضرور دی جاتی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اروند کون تھا اور کنور بلرام سنگھ میں بھی جانتا ہوں۔"

کنور:۔ (کرسی اچھل کر) "تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے میجر؟"

میجر:۔ (گمبھیرتا سے) اچھلئے نہیں اروند جی تشریف رکھئے۔"

کنور:۔ میں اروند ہوں تو آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟

میجر:۔ ایسا تو نہیں کہ تمہیں عدالت سے پھانسی کی سزا دلوا سکوں۔ ہاں اپنا کام نکالنے بھر کا ثبوت ضرور رکھتا ہوں۔ اس ثبوت کے توڑ جوڑ ملاتے ایک سال ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا اور میں جانتا تھا کہ رندھیر خودکشی کرنے والا آدمی نہیں۔ وہ ریوالور کی کھول موندا تنی جانتا تھا کہ صاف کرنے میں ایکا ایکی گولی چل جانا ممکن نہ تھا۔ کنور جی رندھیر مارا گیا اور تم نے مارا!

کنور:۔ تم جھوٹے ہو، اور میں اب دیر تک اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جانے دو۔ تم مجھے روکنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تم پاگل ہو۔ تم — (دونوں ہاتھوں سے دل پکڑتے ہوئے) "اف! خدا وندا۔ (چلنے کو ہوتا ہے)۔

میجر:۔ ہاں کنور جی دل کو تھامے رکھو۔ تمہیں جلد ہی اس کی ضرورت پڑے گی۔ چلے کہاں، بیٹھ جاؤ۔"

کنور:۔ (رک رک کر) "کہو کیا ارادہ ہے؟ تم مجھے ہمیشہ کے لئے تو یہاں روک نہیں سکتے۔ کوئی منٹ گزرتا ہے جو تمہارا دوسرا مہمان آیا جاتا ہے۔"

میجر:۔ (گمبھیرتا سے) "کنور جی میرا مہمان یہیں ہے۔"

کنور:۔ (گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) "یہاں کیا کہہ رہے ہو؟ پاگل

یہاں کوئی نہیں۔ گھر میں بلا کر پہلے میری ہی تو ہین کرتے ہو۔ دھمکیاں دیتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، اور اب ایک فرضی مہمان سے ڈراتے ہو، میجر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم پاگل ہوگئے ہو بالکل پاگل!"

میجر:۔ (ہنس کر) کنور جی اتنا ہی سیانا ہوں جتنے تم۔ پھر کہتا ہوں میرا مہمان یہیں ہے۔ اسی کمرے میں، تمہارے پاس۔

کنور:۔ "کیا مطلب؟ کہاں؟ کدھر؟

میجر:۔ کنور جی اس مہمان کا نام ہے یم راج! موت! جلد یا دیر کر کے مگر دعوت کے وقت ہمیشہ آتا ہے۔ موت! آج تم اس سے ملوگے میں خود تمہیں اس سے ملاؤں گا۔"

کنور:۔ (کھوکھلی آواز سے) "موت۔ موت! تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ تو نہیں کہ تم مجھے —"

میجر:۔ تم نے اخبار میں اس چینی کی کہانی نہیں سُنی جس کی بیوی کو اس کے گہرے دوست نے بہکا لیا تھا۔ چینی نے اپنا بدلہ چکایا تھا؟"

کنور:۔ (سوکھے ہوئے ہونٹوں سے) "میں ایسی فضول، لچر کہانیاں نہیں پڑھا کرتا۔ حماقت کی باتیں نہ کرو، مجھے جانے دو۔"

میجر:۔ نہیں، گھبراؤ نہیں۔ تمہارے ہونٹ سوکھے جا رہے ہیں"(جگ سے پانی انڈیل کر) "لو ٹھنڈے پانی کا گلاس پی لو۔ پیئو۔"

کنور:۔ (ڈگ ڈگا کے پی لیتا ہے) "اُف!"

میجر:۔ ہاں اب سنو کہ یہ چینی ٹھنڈے جی سے سب کچھ سہتا رہا۔ دوست کی دعوتیں کرتا، چائے پر بلاتا۔ آخر ایک دن چینی نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ میں نے چائے میں زہر ملا دیا ہے جس کا پتہ نہیں چلتا۔"

کنور:۔ (تڑپ کر) "اوہ کیا کہا۔ تو نے مجھے زہر تو نہیں دے دیا؟

میجر:۔ کنور جی دل کو قابو میں رکھو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔"

کنور:۔ شیطان کے بچے تو مجھ سے کھیل رہا ہے۔ بتا تو نے مجھے —"

میجر:۔ (سنی اَن سنی کر کے) "ہاں تو اس زہر کا اثر بہت دیر میں ہوتا تھا، مگر

ہوتا یقینی تھا، چینی کا دوست . . . . "

کنور:۔ خدا کے لئے بتاؤ تم نے پانی میں زہر تو نہیں دیا ہے "

میجر:۔ کنور جی کہانی تو پوری ہونے دو۔ اصل موقع تو اب آرہا ہے۔ زہر کا اثر کیوں کر ہوا۔ دوست پر کیا بیتی یہ بھی تو سنو۔"

کنور:۔ میجر میں کہتا ہوں رندھیر کو میں نے ہرگز نہیں مارا، مجھے جانے دو (اچانک دروازے کی طرف بھاگتا ہے) دوڑو، دوڑو کوئی میری مدد کو آؤ۔"

میجر:۔ (ہنس کر) "مدد! اس کا تو دُور دُور پتہ نہیں۔ سنو۔ اِدھر آؤ مجھے تمہاری دعوت کی تیاری میں کچھ دن لگے۔"

کنور:۔ (واپس آتے ہوئے دانت بھینچ کر) شیطان مجھ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔"

میجر:۔ رہاں کہانی میں چینی کے دوست نے یہی کہا تھا۔ بس اب خاموش رہو۔ تم نے رندھیر کو مارا اور تم جانتے ہو۔ تم نے قتل کی ساری علامتیں چھپادیں مگر اپنے خط نہیں جلائے۔ اور گھر میں بنی سا لو کر رکھ کر تم اس لائق ہو کہ محض اس حماقت پر تمہیں پھانسی دے دی جائے (جیب سے کاغذ نکال کے) پہچانتے ہو یہ خط کس کا ہے (کنور ہاتھ بڑھاتا ہے اور میجر اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے)۔

کنور:۔ "تم پہچان گئے۔ اب میں رندھیر کی بیوی تمہاری محبوبہ کا خط پڑھے دیتا ہوں۔ چار ہی تو سطریں ہیں۔ سنو، لکھا ہے۔" ہوشیار۔ رندھیر کو پتہ چل گیا، وہ نہایت خطرناک آدمی ہے اور تمہاری کھوج میں دنیا اُلٹ پلٹ کر دے گا" کنور جی مجھے اس چٹھی کے لئے دو ہزار روپے خرچ کرنا پڑے جو تمہارے نوکر کو تم سے عمر بھر نہ ملتے۔

کنور:۔ تو پھر مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے۔

میجر:۔ میں ٹھیک طور سے جاننا چاہتا ہوں کہ تم قاتل ہو یا نہیں۔ تم نے اپنے کئے کی سزا پائی۔

کنور:۔ اور تم نے مجھے زہر پلا دیا؟ خدا کے لئے بتاؤ۔"

میجر:۔ تمہاری باتوں میں کہانی رہی جاتی ہے۔ ہاں تو چینی زہر دینے کی بات

بتا ہی رہا تھا تو اس کا دوست چیخ مار کے اُٹھ کھڑا ہوا، پیٹ میں بری طرح درد اُٹھا تھا۔۔۔۔"

کنور:۔ (کرسی سے اچھل کر) آہ تم نے یقیناً زہر دیا۔ ضرور دیا۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ اُف: میرا حلق: میرا سر پھٹا جا رہا ہے! میں۔ اُف۔ مینجر جی تحت رحم کرو۔ مجھ پر رحم کرو۔ گولی مار دو۔ مار ڈالو۔ کچھ بھی کرو مگر (دل پکڑ کے) یہ کرب، یہ درد۔ آہ۔ اُف۔۔۔۔"

مینجر:۔ تم نے کون سا رحم کیا تھا۔ نہیں کنور جی! آج رات ہم تین ہیں۔ تم، میں اور دوسرا مہمان، موت جو تمہارا انتظار کر رہی ہے اور شام سے یہیں ہے۔ تمہارے کھانے میں، ہو سکتا ہے تمہاری کافی میں، بلکہ اس ہوا میں جو تم سانسوں کے ذریعے کھینچ رہے ہو۔

کنور:۔ (دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور زور زور سے پیٹتا ہے) کھولو کھولو مجھے جانے دو۔"

مینجر:۔ ہٹو، دروازے سے دور رہو۔ رندھیر تمہیں دیکھ رہا ہے۔ کنور جی۔ وہ دیکھو اس کی آنکھوں سے بدلے کی آگ ٹپک رہی ہے، دیکھو تمہیں وہ گھور رہی ہے۔ تمہیں کھاتے جا رہی ہے۔ دیکھو وہ اس کا سر۔ کنور جی تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ خون۔ خون۔"

کنور:۔ (پاگلوں کی طرح) "رندھیر، رندھیر! ہٹ جا سامنے سے ہٹ جا۔ دور ہو۔ تو مر چکا ہے۔ اور تجھ کو۔ تجھ کو میں نے مارا ہے۔ میں نے۔ (گر پڑتا ہے)۔

مینجر:۔ کنور جی میں نے کہانی کا انجام تمہیں بتایا ہی نہیں۔ سنو، چینی نے اپنے دوست کو زہر نہیں دیا۔ کنور ڈر بڑا قاتل زہر ہے، اور اپنا نشان تک نہیں چھوڑتا۔ اس کا دوست تمہاری طرح مر گیا۔"

—:۔۔۔:—

آل احمد سرور

یادش بخیر

ہم بھی جوان تھے

جوانی بڑی نعمت ہے۔ مگر بڑھاپے میں بوڑھے ملاح کی طرح ہر شادی کی محفل میں جانے والے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جوانی کی داستان سنانا بدمذاقی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے سانپ نکل جانے کے بعد سر پیٹتے رہنا یا نقلی دواؤں کا اشتہار دینا۔ مگر اچھے خاصے معقول آدمی بھی اس مرض میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

یادوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑی سہانی ہوتی ہیں۔ انسان عام طور پر حال سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔ اس لیے یا تو ماضی کی سنہری یادوں سے دل بہلاتا ہے یا مستقبل کے خواب بنتا ہے۔ بچپن کچھ حیرت اور کچھ جوانی کی آرزو میں گذر جاتا ہے۔ جوانی کے زمانے میں خوابوں کی دنیا کے حقائق سے جنگ ہوتی ہے۔ بہت سے خواب کام آجاتے ہیں مگر کچھ سخت جان بچ بھی جاتے ہیں۔ اس زمانے میں بچپن کی موہوم آرزوئیں اور گھریلو زندگی کی سادہ خوشیاں یاد آتی ہیں پھر جب بڑھاپا آتا ہے اور تجربے کی وجہ سے تخیل چراغ تہ دامن ہو جاتا ہے تو یہ ماضی کے تاریک گوشوں کو روشن کرتا ہے۔ اسے ایک مقدس ہالہ عطا کرتا ہے اور وہی جوانی جو کھردری اور میلی میلی سی، مٹیالی سی تھی، اب عروس جمیل اور لباس حریر کے مصداق معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بوڑھے عام طور پر جوانوں کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جوان عام طور پر بوڑھوں پر ترس کھاتے ہیں۔ جوان عام طور پر اپنے گرد و پیش کی دنیا اور اس کے محشرستان میں مگن رہتے ہیں۔ بوڑھے عام طور پر پیچھے دیکھتے ہیں اور وقت کا فاصلہ ماضی کے در و بام کو ایک شفق آلود سحر عطا کر دیتا ہے وہ قدریں جو جوانی میں طوق گلو معلوم ہوتی تھیں اب پھولوں کا ہار بننے لگتی ہیں۔ ماضی کی ہر لڑکی پری نظر آتی ہے اور ہر داستان طلسم ہوش ربا

اور بوستان خیال۔ ہر صبح صبح بنارس، ہر شام، شام اودھ، ہر مزار تاج محل اور خرابہ قانون یا غباتی صحرا کا منتظر۔

مولوی عبدالحق نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "ایک بوڑھا لکڑی ٹیکتا ہوا کسی سڑک پر جا رہا تھا۔ اتفاق سے ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ گرتے ہی اس نے ایک دل دوز نعرہ لگایا "ہائے جوانی" پھر ذرا حواس بجا ہوئے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا مگر جوانی میں بھی کون سے تیر مارے تھے"۔ اپنا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے لوگ کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ہوتی ہوگی۔ ہماری جوانی میں تو نشہ تھا بد مستی نہ تھی، شعلے تھے آتش فشاں نہ تھا فطرت سے عشق تھا۔ حسن نسوانی کے جلوے تھے۔ کتابوں کی نت نئی ادائیں تھیں۔ آزادی کی تحریک کا ولولہ تھا۔ انسانیت کے لیے خوب سے خوب تر کی جستجو تھی۔ میر، غالب، اقبال، حسرت، فانی، جگر، اختر شیرانی کی کائنات کا حسن تھا۔

آج کل اٹھتے بیٹھتے ایک فلمی گانا سننے میں آتا ہے 'جب پیار کیا تو ڈرنا کیا' پیار تو ہمارے زمانے میں بھی ہوتا تھا مگر ڈر غالب رہتا تھا۔ بزرگوں کا ڈر، سماج کا ڈر، استاد کا ڈر، پھر اوامر و نواہی، جائز و ناجائز، خوب اور ناخوب کی لکیریں واضح اور روشن تھیں۔ اب تو جیسے سب کچھ دھندلا سا گیا ہے۔

یادش بخیر سلطان حیدر جوش جو ادب لطیف کے دور کے ایک ممتاز ادیب تھے، بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے، ایک دفعہ کہنے لگے۔ زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ ایک جلالی، ایک جمالی، ایک مقالی ایک خیالی، پھر اس کی شاخیں بتاتے تھے کہ کچھ لوگ ساری عمر جلالی رہتے ہیں، کچھ جمالی کچھ مقالی اور کچھ خیالی۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کچھ لوگ ساری عمر بچہ ہی رہتے ہیں کچھ اقبال کے زندگی کے تصور کی طرح ہر دم جوان، کچھ پیدا ہی بوڑھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ گفتار کے غازی ہوتے ہیں اور اپنی جوانی کی محرومیوں یا نامرادیوں کو چھپانے کے لیے ہر جوئے کم آب کو ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اور ہر کرن کو آفتاب و ماہتاب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بہر حال جلالی قبیلے میں جوش ملیح آبادی کا نام ضرور لیا جا سکتا تھا جن کی یادوں کی بارات جھوٹ ہو یا سچ ہے مزے کی چیز، جمالی قبیلے میں اختر شیرانی کا نام لیا جا سکتا ہے جن کے یہ مشہور شعر سبھی کو یاد ہوں گے۔

ہر چیز ہر بہار ہر اک شے حسین تھی
دنیا جوان تھی میرے عہد شباب میں
یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

اور پھر حفیظؔ جالندھری کی مشہور نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" جو وہ اب بھی مشاعروں میں پڑھتے ہیں تو ممکن ہے کہ کچھ سننے والے اسے اپنی داستان سمجھ کر پھولے نہ سماتے ہوں، مگر زیادہ تر لوگ ان پر ترس ہی کھاتے ہیں، کس خانے میں رکھی جائے اس کا فیصلہ آپ لوگ ہی کیجیے۔ اور اقبالؔ نے خضر کے متعلق جو کہا تھا "جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب" ایسے بوڑھے بھی نظر آجائیں گے۔ مجھے اس سلسلے میں چودھری محمد علی ردولوی یاد آتے ہیں جو بڑھاپے میں بھی ایسے باغ و بہار جاندار اور طرح دار تھے کہ ان کے گرد جوانوں کا جھرمٹ رہتا تھا۔

ادھر خود نوشت سوانح عمریوں کو خاصی مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ میں انھیں فوٹوگرافی نہیں مصوّری کہتا ہوں کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ آدمی کچھ بدلتا ضرور ہے اور پچھلے واقعات اسی طرح ہی بیان کیے جا سکتے ہیں ان میں کچھ تخیل کی اور کچھ نظر کی کارفرمائی رہتی ہے۔ ہاں جن کی زندگی بھرپور ہوتی ہے جیسے رضا علی کی تھی، ان کے اعمال نامے میں منہ بولتی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ تصویریں شاعری میں بھی بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ مثلاً اکبرؔ کا یہ شعر تو سبھی کی ترجمانی کرتا ہے۔

بہت رہا ہے کبھی لطف یار ہم پر بھی
گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

یہی اکبرؔ ہیں جنھوں نے سعدیؔ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

لکھوا لائف میری ایام جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمہیں افسردہ دانی کے سوا

لیکن ہمارے یہاں افسردہ دانی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ پہاڑوں کی سیر جہاں برف پوش چوٹیاں، تند رو چشمے، گنگناتے جھرنے، گھنے اور حد نظر تک پھیلے ہوئے دیوداروں کی چھتر چھایا ہے۔ چناب کی وہ جوانی اور شورش ہے جو اب نظر نہیں آتی،

مسوری سے چکراتے جاتے ہوئے جمنا کا وہ مستانہ رقص ہے جو لکھواڑ کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ شیش ناگ کی وہ مقدس جھیل ہے جس میں برف کے تودے تیرتے ہیں۔ ننگا پربت کا وہ منارۂ نور ہے جو کبھی کبھار موسم کی مہربانی سے کھلن مرگ سے دکھائی دیتا ہے سونمرگ میں گلشیروں کی وادی ہے جہاں پگھلی ہوئی چاندی بہتی ہے پھر وہ کتابیں ہیں جنھیں مہدی نازنسیان حرم کہتے ہیں، لکھنؤ کا وہ کافی ہاؤس ہے جہاں دید و دانش دونوں کا سامان تھا، جہاں نگاہوں کے تیر دلنشیں تھے اور کافی کے چمچوں میں زندگی تھی۔ جہاں ڈی پی مکرجی، چیلاپتی راؤ، یشپال، ڈاکٹر علیم، آچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، رشید جہاں، احتشام حسین، مجاز، ڈاکٹر فریدی، آنند نرائن ملا، ڈاکٹر موجمدار، کالی پرشاد، گرجا کمار ماتھر، اکثر آتے اور دنیا جہاں کے مسائل پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے وہ جلسے ہیں جن کی اطلاع اخبار میں دیے بغیر نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوتی کیونکہ کوئی اتوار ناغہ نہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور شہر کے وہ معرکے ہیں جب لکھنؤ کے مرد آہن سی بی گپتا گھر پر آئے تو ان سے ملنے کے لیے انکار کردیا جاتا اور وہ جوش جنون تھا جس نے ذرا سی بے انصافی پر یونیورسٹی سے استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا تھا اور گپتا جی کو وائس چانسلر رادھا کمل مکرجی سے کہنا پڑا تھا کہ سرور صاحب کو جانے نہ دیجئے۔ اس سے پہلے علی گڑھ کے معرکے یاد آتے ہیں جن میں ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر نے میرے ایک مضمون پر ایگزیکٹو کونسل میں تحریک کی تھی کہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے کیونکہ مضمون کے آخر میں اقبال کا یہ شعر تھا ؎

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

غرض ہم بھی جوان تھے۔ اگرچہ بڑھاپے کی عام کیفیت نحوست، افسردگی، ماضی پرستی، مردم بیزاری، زمانے کی ناقدری کی شکایت اب بھی ہمیں نہیں چھو سکی اور ہم آج کے آشوب اور بہت سی قدروں کی پامالی میں نئی تعمیر اور نئی تخلیق کے مظہر بھی دیکھ لیتے ہیں گویا ذہنی طور پر بوڑھے نہیں ہوئے ہیں اور نئی نسل کی کمزوریوں اور طاقت دونوں کو سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بہرحال کہہ سکتے ہیں ؎

دشت میں پھول کھلاتے تو ہے اہلِ وفا ۔۔۔ شہر خوباں میں اگر نام نہ کرنے پائے

جب ایم اے میں پڑھتے تھے تو استاد نے اپنی ذاتی لائبریری کی ساری الماریاں ہمارے لیے کھول دی تھیں۔ چنانچہ ایچ لارنس کی کتاب Lady Chatterly's کا مکمل ایڈیشن اس وقت پڑھا تھا۔ ہوسٹل کے ساتھی خدا جانے اپنے کچھ اصلی اور کچھ فرضی معاشقوں کی داستانیں ہمیں کو سنایا کرتے تھے۔ سینٹ جانس کالج میں اتنے شریف اور سنجیدہ سمجھے جاتے تھے کہ ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی ہم سے لڑ پڑے۔ بات یہ ہوئی کہ اس زمانے میں کالج میں لڑکیاں خال خال تھیں اور وہ بھی اینگلو انڈین۔ ایک پری پیکر نے جسے سبھی دور سے دیکھا کرتے تھے ایک دن نہ جانے کیوں ہم سے بات کی اور یہ پوچھا کہ انگریزی کا کلاس اب کس کمرے میں ہونے لگا ہے۔ ہم نے اسے بتا دیا۔ اس پر ہمارے یہ دوست آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں ہم نے یہ گفتگو دہرا دی۔ اس پر ہمارے ساتھی نے کہا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ مجھے معلوم نہیں' میرے اس ساتھی کو معلوم ہے' اس طرح مجھے بھی شرف ہمکلامی حاصل ہو جاتا۔

غرض جب ہم جوان تھے تو گویا آسمان زیادہ روشن ستارے زیادہ چمکدار اور دھرتی زیادہ حسین نظر آتی تھی مگر گل رخوں کو دیکھتے رہے اور کانٹوں سے نباہ کرتے رہے' اس کے علاوہ کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا جس سے دنیا بدل جائے' یا تاریخ سرے سے لکھی جائے۔ ہم نہ جوان رہے نہ انقلابی رہ نما، نہ کبھی جیل خانے کا اتفاق ہوا نہ پاگل خانے، نہ شفا خانے۔ ایک دفعہ طلباء کی ایک اسٹرائک کے لیڈر تھے، مگر وہ اسٹرائک ایک گھنٹہ میں ختم ہو گئی اور ہماری شرطیں مان لی گئیں۔ پھر بھی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بقول شاعر

حیات گرچہ بہت مختصر تھی شبنم کی
گلوں کے ساتھ رہی رات بھر یہ کیا کم ہے

(سرینگر سے)

پروفیسر نورالحسن ہاشمی

اقبال

ہماری اُردو زبان میں اقبالؔ ایک ایسا شاعر ہے جو دنیا کے عظیم شاعروں کی صفِ اوّل میں شامل کیے جانے کے لیے بلا تکلف پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کو بھی بقائے دوام کے دربار میں ایک بہت معزز مقام پر نشست بجا طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں کیا عظمت تھی کیا بڑائی تھی اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کسی شاعر کے کلام میں عظمت کی کیا نشانیاں ہونی چاہئیں یا کیا باتیں ہوں کہ اس کو ایک عظیم شاعر گردانا اور مانا جاسکے۔ آپ سوچیں اور خوب سوچیں تو بالآخر یہی کہہ سکیں گے کہ اس کے خیالات عظیم ہوں یا اس کے پاس کوئی عظیم مقصد یا پیغام ہو جسے وہ بڑے جذبے کے ساتھ متواتر اور مسلسل اور اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ ہر شخص کے لیے ایک سامانِ اہتزاز اور سامان بصیرت بن سکے۔ دنیا کے تمام بڑے شاعر، کالی داس، شیکسپیر، ملٹن، فردوسی، ہومر، ٹیگور، تلسی داس، میرؔ، غالبؔ، اور انیسؔ وغیرہ انہیں خصوصیات کے حامل مانے گئے ہیں۔

اقبالؔ کی عظمت کے عناصر کیا ہیں انھیں پیش کرنے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اقبالؔ قومیت کے لحاظ سے ہندوستانی تھے، مذہباً مسلمان اور ساتھ ہی عالمگیر انسانی برادری کے ایک فرد بھی۔ ان کے زمانے کا ہندوستان برطانوی حکومت کے زیر اقتدار تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کے پنجے سے آزاد ہونے کے لیے اس وقت یعنی جب اقبالؔ نے شاعری شروع کی، سخت بے چینی تھی۔ ادبیات اردو انگریزی ادب سے متاثر ہو رہی تھی۔ غزلوں کے بجائے شاعر نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ لاہور میں حالیؔ اور آزادؔ ایک ایسی بزم کی بنیاد پہلے ہی ڈال چکے تھے جہاں صرف نظمیں ہی پڑھی اور

سنائی جاتی تھیں، نوجوان اقبال نے بھی شروع شروع میں تو کچھ غزلیں کہیں لیکن جلد ہی نظمیں لکھنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جب وطن کا جذبہ اس وقت اقبال میں موجزن تھا چنانچہ ان کی پہلی نظم جو ۱۹۰۱ء کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی بہت مقبول ہوئی۔ یہ نظم 'ہمالیہ' پر تھی۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اپنے وطن ہندوستان سے ان کی والہانہ محبت اور پھر فرنگیوں کے تحت اس کی غلامی اور معاشرتی طور پر ہندو مسلم نفاق نے انھیں بہت متاثر کیا تھا اور اسی لیے انھوں نے تصویر درد اور نیا شوالہ جیسی خوبصورت نظمیں لکھی تھیں۔ تصویر درد میں لکھتے ہیں۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
زمیں پر تو ہوا در تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

نظم نیا شوالہ میں یہ کہنے کے بعد کہ

ع خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ہندو مسلم میل جول کی یوں بات کرتے ہیں۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

یہ زمانہ بالکل شروع بیسویں صدی کا تھا جب اقبالؔ حب وطن اور وطنیت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کا ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

بہت مشہور و مقبول ہو چکا تھا۔ اور ان کی نظم ہندوستانی بچوں کا گیت جس کا ابتدائی بند یہ ہے۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

تمام لوگوں نے بہت پسند کی تھی۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۹۰۵ء میں اقبالؔ بغرض تعلیم یورپ چلے گئے وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ وہی وطنیت جو ہندوستان میں سب مصیبتوں کا علاج سمجھی جاتی تھی یورپ میں سخت نفاق کا باعث بن رہی ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کو تباہ و برباد کر دینے کے درپے ہے اور جنگ کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ دیکھ کر اقبالؔ

وطنیت کے نظریے سے بیزار ہو گئے اور وہ ایک ایسی عالمگیر جمعیت کا تصور ڈھونڈنے لگے جس میں سب کے لیے اخوت و ہمدردی ہو سب کے لیے برابری کا عدل وانصاف۔ اور یہ انہیں اسلامی تعلیمات میں نظر آیا۔ اسی وقت سے وہ ملّی شاعر ہو گئے اور مسلمانوں کی ذہنی تعمیر نو میں لگ گئے اور اپنے فارسی اور اردو کلام میں مسلمانوں کے اس ذہنی اور اخلاقی احیا کا اس قدر سامان فراہم کر دیا کہ مسلمانوں نے انھیں حکیم الامت کے لقب سے نوازا۔ لیکن اس ملّی رجحان کے باوصف ایسا نہیں تھا کہ انھوں نے اپنے اردگرد کے حالات سے آنکھیں بند کر لی ہوں۔ ان کی اردو کی دوسری مشہور تصنیف 'بال جبریل' میں لینن نپولین اور مسولینی جیسے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ ایسے موضوعات پر بہت سی نظمیں شامل ہیں جن کا تعلق مذہب سے نہیں۔ اور ان کے تیسرے مجموعۂ کلام 'ضرب کلیم' میں جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا بہت سی ایسی نظمیں شامل ہیں جن کا تعلق حالات حاضرہ سے ہے۔ مثلاً اشتراکیت، کارل مارکس کی آواز، انقلاب، سیاسیات فرنگ، جمہوریت جمعیت اقوام وغیرہ۔ ان سب موضوعات پر ان کے منظوم تبصرے بہت بصیرت افروز ہیں۔

لیکن دراصل اقبالؔ نے اپنے کلام میں ایک پیغام بھی دیا ہے۔ ان کے فارسی اور اردو کلام کی بنیاد اسی پیغام رسانی پر ہے اور یہ پیغام خودی کا ہے۔ اسے ان کا فلسفہ بھی کہہ سکتے ہیں اس خودی سے ان کا مطلب اپنی ذات کی معرفت ہے۔ یعنی اپنے کو پہچاننا، اپنی قوتوں کو جاننا اور انھیں ترقی دیتے رہنا پھر یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا تعلق کائنات سے کیا ہے، اپنی سوسائٹی سے کیا ہے۔ یہ ہر شخص میں خودی کا جذبہ ہوتا ہے اسے تعمیری کاموں میں لگانے سے خودی میں وسعت پیدا ہوگی اور وہ مستحکم ہوگی۔ اسے تخریبی کاموں کی طرف پہنچانے میں ضعیف اور کمزور ہو جائے گی۔ اس خودی کے موضوع پر اقبالؔ نے کثرت سے لکھا ہے اور اس کی تعریف بارہا مختلف انداز میں کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اقبالؔ نے خودی کو قائم رکھنے، اسے مستحکم اور وسیع تر کرتے رہنے کو اپنے فلسفۂ تمدن

کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ خود کو مکمل کرنے کا شوق اگر دل میں پیدا ہو جائے تو وہ کسی منزل پر ختم نہیں ہوگا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ طے

یا

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

اقبالؔ اپنی اس خودی کے پیغام کو ہر جگہ بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور انسان کے ہر فعل میں اس کا عمل دخل دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین تک کو بھی یہ مشورہ دیتے ہیں۔

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

اقبالؔ سمجھتے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر انسان کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ کائنات کو تسخیر کر کے اپنے کو واقعی خدا کا خلیفہ ثابت کر سکے۔ اقبالؔ اس سلسلے میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن اقبالؔ اس کے بھی قائل ہیں کہ یہ خودی مثبت اخلاقی معیاروں پر استوار کی جائے ورنہ غلط طریقے پر ترقی دینے سے تو مفسد اور شیطان ہی پیدا ہوں گے جو انسانی زندگی ہی کو اس دنیا میں ختم کر دیں گے۔

آخر میں اقبالؔ کے اسلوبِ بیان کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے۔ وہ خواہ فلسفیانہ بات کریں خواہ سیاست، حکمت اور اخلاق کے رموز بتائیں، ان کے طرزِ ادا میں ایک مخصوص مستی، قلندری اور جذب ہے جو ہر جگہ اپنی تمام شاعرانہ خوبیوں، اپنے تمام جمال

وجلال کے ساتھ پیش ہوتاہے اور انسان اس کو سن کر وجد میں آجاتاہے۔ اقبالؔ کے نزدیک شعر میں جذب اور تاثیر شاعر کے خلوص سے پیدا ہوتی ہے۔ اس خلوص کو اقبالؔ خونِ جگر کا نام دیتے ہیں اور اسے تمام فنونِ لطیفہ کو ابدی اور جاودانی بنانے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبالؔ کے کلام کی مقبولیت کو جاودانی اسی لیے حاصل ہو گئی کہ انھوں نے اپنی شاعری میں، اپنے پیام کی تبلیغ میں اپنے خونِ جگر کو شامل کر دیا ہے۔

برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است

(آکاش وانی لکھنؤ سے)

فیض احمد فیض / آغا عبدالحمید

ایک ادبی مباحثہ

۱۹۴۵ء میں "ادبی مناظرے" کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو لاہور نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس میں "پریم چند کے ناول اور افسانے" کے موضوع پر آغا عبدالحمید اور فیض احمد فیض کی یہ گفتگو نشر کی گئی تھی۔ ۳۱ر جولائی کو پریم چند کا یوم پیدائش ہے۔ اس موقع پر یہ دلچسپ بحث ہم اپنے قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

فیض:۔ بھئی چند دن ہوئے وہ تمہارا پریم چند پر لکھا ہوا مضمون پھر دیکھا تھا۔ وہی جو "مجلس" میں چھپا ہے۔ تم نے تو اس میں پریم چند کی اتنی تعریف کی ہے کہ ٹالسٹائی دوستوسکی وغیرہ سب ہیچ معلوم ہونے لگے ہیں۔ پریم چند میں دو چار خوبیاں سہی لیکن ناول کے میدان میں ایسے تیس مار خاں تو وہ ہرگز نہیں تھے۔

حمید:۔ جس مضمون کا تم ذکر کر رہے ہو وہ میں نے تقریباً ۸ - ۹ سال پہلے لکھا تھا۔ اگر اسے اب دوبارہ لکھوں تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی تھی جو بالکل غلط ہو۔ آخر تمہیں کس چیز پر اعتراض ہے؟

فیض:۔ اعتراضات تو ہوتے رہیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم اب بھی پریم چند کو ٹالسٹائی اور دوستوسکی کا ہم پلہ سمجھتے ہو؟

حمید:۔ بھئی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پریم چند کو ٹالسٹائی اور دوستوسکی کا ہم پلہ تو قرار نہیں دیا تھا، نہ اب ایسا کہتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں پریم چند کو بڑا افسانہ نویس سمجھتا ہوں۔

فیض :۔ تو ذرا سنو۔ اس مضمون کے شروع میں تم نے سرشار، نذیر احمد، شرر اور رسوا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ان میں سے ہم کسی کو بھی اول درجے کا ناول نویس نہیں کہہ سکتے۔ ہر ایک میں جہاں کچھ محاسن ہیں وہاں ساتھ ہی اتنے بڑے نقائص بھی موجود ہیں۔ چنانچہ وہ اعلیٰ درجے کا ایک ناول بھی پیدا نہ کرسکے ان درجہ دوم کے ناول نویسوں میں اچانک پریم چند ظاہر ہوتے ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے قصہ گو اور بیسیوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔" اسے نا انصافی نہیں ظلم کہتے ہیں۔ اگر کلیم، ظاہر دار بیگ، ابن الوقت اور امراؤ جان ادا جیتے جاگتے کردار نہیں ہیں تو کچھ نہیں بھی پتہ چلے کہ پریم چند مرحوم نے ان سے بڑھ کر کیا تیر مارا ہے۔

حمید :۔ میں مانتا ہوں کہ نذیر احمد کے ساتھ میں نے بے انصافی کی ہے۔ مرأة العروس کے لئے میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اب تو میں یہ بھی خیال کرنے لگا ہوں کہ نذیر احمد، پریم چند سے کم مرتبہ نہیں بلکہ جہاں تک فن کا تعلق ہے نذیر احمد پریم چند پر سبقت لے گئے ہیں۔

فیض :۔ لیکن تمہارے جو فقرے میں نے ابھی پڑھے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم پریم چند کی تصنیفات کو بالکل بے عیب سمجھتے ہو۔ گویا پریم چند سے پہلے کسی کو افسانہ نویسی کی تمیز ہی نہیں تھی

حمید :۔ نہیں، میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ میں نے تو اس مضمون میں پریم چند کے کئی ایک نقائص کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

فیض :۔ بھئی تم اچھے وکیل ہو۔ اب ہر بات مانتے جاؤ گے تو بحث کیسے چلے گی ؟

حمید :۔ یہ تمہیں کیسے خیال ہوا کہ میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ پریم چند کو ہمارے سب افسانہ نویسوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک کردار نگاری ہی کو لو۔ یہ تو تمہیں ماننا ہی پڑے گا کہ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے ہمارا کوئی ناول نویس پریم چند کے سامنے نہیں ٹھہرتا۔

فیض :۔ خیر۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ پریم چند کو کردار نگاری میں خاصی مہارت حاصل تھی لیکن وہ اس میں بھی یکساں طور پر کامیاب نہیں ہوتے ان کے بیشتر مرد و زن مثالی یا Typical کردار ہیں۔ مثلاً ان کے کئی ناولوں

اور اکثر افسانوں میں آپ کو ایک ہی قسم کا امیر زمیندار دکھائی دے گا جو انگریزی طرح سے رہتا ہے۔ حکام کی اطاعت اپنا ایمان خیال کرتا ہے، رعیت کا قطعاً خیال نہیں رکھتا۔ ایسے اور بھی کئی کردار ہیں جن میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں ذرا بھی انفرادیت یا جان ہو۔

حمید:۔ یہ کسی حد تک درست ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ پریم چند کو صرف غریبوں اور خاص طور پر غریب دیہاتیوں سے دلچسپی تھی اور انھیں کی کردار نگاری میں ان کا فن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے امیر اور رؤسا کٹھ پتلیاں سہی لیکن اس کے باوجود پریم چند کی فنی اہمیت میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔

فیض:۔ بہر حال تم یہ تو مان گئے کہ پریم چند کی کردار نگاری بہت حد تک محدود ہے۔ آگے چل کر تم نے پریم چند کی حقیقت نگاری کی نہایت مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ اوّل تو جو ناول نویس صرف ایک ہی طبقے کی زندگی کو نمایاں کرکے دکھانے کے قابل ہو اسے حقیقت نگار کہا ہی نہیں جا سکتا۔ حقیقت ایک جامع چیز ہے اور اس کی وضاحت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن میں سماج کا مجموعی تصوّر موجود ہو اور پریم چند کے ذہن میں یہ تصور موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے متعلق نہ صرف پریم چند خاموش رہتے ہیں بلکہ دانستہ ان سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ بھی ہوں حقیقت نگار ہرگز نہیں کہلا سکتے۔

حمید:۔ مجھے تمہارے پہلے اعتراض سے اتفاق نہیں۔ ایک افسانہ نویس زندگی کا ایک گوشہ دکھا کر بھی حقیقت نگار کہلا سکتا ہے۔ ضروری صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے جس حصے یا جس پہلو کو پیش کرے وہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو۔ پڑھنے والوں پر اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ بہت سے ناول نویس ایسے ہوئے ہیں جن کی واقعاتی دنیا نہایت محدود تھی لیکن پھر بھی وہ اعلیٰ درجے کے افسانہ نویس گنے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جین آسٹین کو لے لو۔ دنیا میں کم ناول نویس ایسے ہوں گے جو ایک محدود طبقے کے بارے میں لکھتے ہیں لیکن جین آسٹین کی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور بھی مثالیں ہیں، مسز گاسکل، ایملی برونٹے وغیرہ۔

فیض :۔ دیکھو اب تم غلط بحث کر رہے ہو۔ اس وقت ناول کی اچھائی یا برائی سے بحث نہیں تھی۔ حقیقت نگاری کی بات ہو رہی تھی۔ مجھے جین اسٹین کی عظمت سے انکار نہیں لیکن میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ایک محدود بے کار طبقے کی زندگی کو بیان کرکے جین اسٹین ہرگز حقیقت نگار کہلانے کا مستحق نہیں خواہ اس طبقے کے متعلق اس کا بیان کتنا ہی تفصیلی اور سچا کیوں نہ ہو۔ ایک ناول نویس زندگی کا ایک کونا دکھا کر بڑا ناول نویس تو بن سکتا ہے حقیقت نگار نہیں بن سکتا۔ خیر اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میرے دوسرے اعتراض کا تمہارے پاس کیا جواب ہے یعنی یہ کہ پریم چند زندگی کے بعض ناگوار پہلوؤں کے متعلق کچھ نہیں کہتے اور ان سے گویا آنکھ بچا کر نکل جاتے ہیں۔

حمید :۔ ذرا تفصیل سے بیان کرو، تمہارا کن ناگوار پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

فیض :۔ اس کی فہرست تو بہت لمبی ہے۔ اور یہ تمام پہلو ناگوار بھی نہیں۔ میں صرف دو ایک کا نام لوں گا۔ جنسیات ہی کو لے لو۔ انھوں نے ہر جگہ اس موضوع سے پہلو تہی کی ہے۔ ان کے یہاں جب بھی ایک مرد عورت کو آپس میں محبت ہوتی ہے تو اس میں وہی طہارت اور تقدیس اور روحانیت اور جانے کیا کیا الابلا شامل ہوتے ہیں، جنھیں بیس، بائیس سال کی عمر تک ختم ہو جانا چاہیئے۔ پریم چند کے باہمی کرداروں کی محبت وہی نوخیز جوڑے کی سی محبت ہوتی ہے۔ جس پر روحانیت اور آئیڈیلزم کا ملمع چڑھا ہوتا ہے۔

حمید :۔ تو کیا یہ بھی کوئی قابل اعتراض بات ہے ؟

فیض :۔ اخلاقی طور پر شاید قابل اعتراض نہ ہو، فنی طور پر قابل اعتراض ہے۔ انسانی جسم اور اس کی ازلی خواہشات کے متعلق پریم چند کو یا تو کچھ معلوم نہیں ہے وہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے حالانکہ کھانے پینے کے بعد جنسیات کا مسئلہ انسانی زندگی میں سب سے ضروری مسئلہ ہے مثال کے طور پر "چوگان ہستی" ہی کو لے لو۔ صوفیہ اور ونے سنگھ کی محبت بالکل بچوں کی سی محبت ہے لیکن وہ دونوں باقی معاملات میں کافی پختہ کار ہیں۔

حمید:۔ نہیں اس سے تو انکار نہیں ہوگا کہ کوئی مصنف اپنے ماحول کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا جس زمانے میں اور جس ماحول میں پریم چند نے اپنی عمر گزاری اس میں سماج پر ایک غلط قسم کی حیا کا غلبہ تھا لوگ خیال کرتے تھے کہ جنسیات وغیرہ کے متعلق کچھ لکھنا قابل اعتراض بات ہے اگر پریم چند نے خواہ مخواہ لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کی تو کیا برا کیا؟

فیض:۔ اسی صلح پسندی پر تو مجھے اعتراض ہے ایک اور چیز لو پریم چند مذہب اور سماج کے بعض اصولوں کو بغیر سوچ بچار کے مان لیتے ہیں بعض رواج ایسے ہوتے ہیں جو کسی سماجی ضرورت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کچھ عرصے کے بعد سماجی حالات کے بدلنے سے ان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور سماج میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ انھیں ترک کر دے اور لوگ انھیں بیکار بوجھ کی طرح اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں مثلاً عورت کے متعلق پریم چند کا نظریہ' کہ ان کے نزدیک مثالی عورت وہ ہے جو کسی اصول کے لیے اپنی جان تک قربان کر دے' خواہ وہ اصول غلط ہی کیوں نہ ہوں' قربانی پر پریم چند بہت زور دیتے ہیں زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر دنیا کو تیاگ دینا ان کے نزدیک بہت قابل احترام بات ہے حالانکہ موجودہ حالات میں قربانی بہادرانہ نہیں بزدلانہ بات ہے۔

حمید:۔ خیر! یہ کوئی ایسی بات نہیں' جیسے میں نے پہلے کہا ہے کہ' یہ باتیں خاص ماحول کی پیداوار ہیں اور تم ہی روز کہا کرتے ہو کہ مصنف ماحول کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ پریم چند نے چند ایک ایسے اصولوں کو اہم سمجھا ہے وہاں انھوں نے بہت سی بیہودہ رسوم پر شدید نکتہ چینی بھی کی ہے انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں جگہ جگہ ہماری طرزِ زندگی' ہماری معاشرت اور ہمارے رسم و رواج کے عیب دکھائے ہیں ان کی کتابوں کا سب سے اہم عنصر ہی یہی ہے کہ وہ ایک تمدنی نقاد ہیں اور بعض اوقات تو وہ اپنے کرداروں کی نسبت ہمارے اصولِ معاشرت میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں " ہماری عادتیں کتنی ہی استوار کیوں نہ ہوں اس پر صحبت کا اثر

پڑتا ضروری ہے ہم اپنی خانگی زندگی کی طرف سے کتنے بے فکر ہیں اس کے لیے کسی تیاری یا تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھتے گڑیاں کھیلنے والی لڑکی، سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے والی دوشیزہ گھر کی مالک بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے الھڑ بچھڑے کے کاندھے پر بھاری جوا رکھ دیا جاتا ہے ایسی حالت میں اگر ہماری زندگی مسرت آمیز نہ ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔"

فیض :۔ یہ تو اور بھی تعجب کی بات ہے کہ پریم چند نے بعض رسوم پر تو اعتراض کیا لیکن ساتھ ہی بعض کو جو اتنی ہی یا زیادہ قابل اعتراض تھیں۔ صحیح مان لیا۔ بات یہ ہے کہ پریم چند بے چارے نہایت شریف آدمی تھے اور سماجی تنقید شرفا کا کام نہیں ہے اگر آپ ہر بات پر سماج کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیں ہر مسئلہ پر اپنی رائے کے ساتھ ساتھ غیر ترقی پسند آرا، بھی ذہن میں رکھیں تو آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی تنقید دھری رہنے دیجئے بنیادی نقائص کو دور کرنے کے لیے انقلابی دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا پریم چند بے چارے نہایت شریف آدمی تھے۔

حمید :۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ پریم چند میں سماجی زندگی کے نقائص کو بیان کرنے کی جرأت نہ تھی ان کے ابتدائی افسانوں یا ناولوں میں کچھ جذبات پرستی ضرور پائی جاتی ہے لیکن "گوشہ عافیت" "میدان عمل" "گئودان" میں انھوں نے ہمارے دیہات کا نہایت صحیح نقشہ پیش کیا ہے ان کتابوں کے لکھنے سے ان کا مقصد ہی یہی تھا کہ دیہات کے لوگوں پر کیا کیا ظلم توڑے جاتے ہیں اور انہیں مٹھی بھر اناج کے لیے کتنی ذلت اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے "فسانۂ آزاد" کے بعد ہمارے کسانوں اور دیہاتیوں کے تجربات انھیں کی زبان میں صرف پریم چند نے ہی ادا کیے ہیں۔

فیض :۔ یہ دیہاتی زبان کی طرف اشارہ کرنے کا شکریہ! میں کہنے والا ہی تھا پریم چند کو بیٹھے بٹھلائے دیہاتی زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے عام طور پر ان کی دیہاتی زبان صرف اتنی ہے کہ "حضور" کو "ہجور" اور "مشکل" کو "مسکل" لکھ دیا جائے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی دیہاتی

ایک ہی تقریر میں ایک فقرہ دیہاتی زبان میں بولتا ہے اور دوسرا فقرہ اچھی خاصی لکھنوی اُردو میں ــــــــــ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، مجھے پریم چند پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے افسانوں میں کھلّم کھلّا وعظ شروع کر دیتے ہیں۔ یوں تو کوئی آرٹ پروپیگنڈے سے خالی نہیں ہوتا لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ ایک ناول یا افسانے پر دیہات سدھار کے پمفلٹ کا شبہ ہونے لگے۔

حمید:۔ پھبتی کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں کئی مصنف گنوا سکتا ہوں جن کی کتابوں میں وعظ کی کئی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ٹالسٹائی کو لے لو، اس نے اپنی آخر عمر میں چند مختصر افسانے خالص وعظ کے لیے لکھے تھے اور کوئی نقاد ان پر اعتراض نہیں کرتا کہ اس وعظ سے ان کی ادبی قیمت میں فرق آگیا ہے۔

فیض:۔ ٹالسٹائی کے علاوہ کوئی اور بھی تو بتاؤ۔

حمید:۔ میکسم گورکی۔

فیض:۔ ان لوگوں کی بات دوسری ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا ٹالسٹائی یا گورکی اتنا بڑا مصنف ہو، وہ وعظ بھی لکھے تو اس میں آرٹ پیدا ہو جائے گا۔ اگر ایک ناول فنی اعتبار سے کامیاب ہو تو اگر اس میں وعظ بھی شامل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو نہ صرف ناول کی ادبی قیمت میں فرق آجاتا ہے بلکہ وہ وعظ بھی بے اثر ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال لے لو۔ پند و نصائح کی جس قدر بھرمار فارسی ادب میں ہے، شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔ کم ہی فارسی شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنے اشعار میں طرح طرح کی نصیحتیں نہ کی ہوں۔ لیکن تاریخ سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ ایرانی لوگ ساری دنیا سے زیادہ نیک ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے کہ اخلاق کے متعلق ان میں ایک نہایت صحت مند کلبیت پائی جاتی ہے۔

حمید: یہ درست ہے کہ کھلّم کھلّا وعظ آرٹ کے لیے اکثر مضر ثابت ہوتا ہے لیکن پریم چند کے چند ایک افسانے ایسے بھی ہیں جن میں وعظ موجود نہیں ہیں اور کم از کم ایک افسانہ تو ایسا ہے جو کھلّم کھلّا وعظ کے باوجود حد درجہ کامیاب ہے۔

فیض:۔ کونسا؟

حمید:۔ اس کہانی کا نام ہے "راہ نجات" یہ ایک کسان اور چرواہے کی کہانی

ہے۔ایک دن چرواہے کی بھیڑیں کسان کے کھیت میں گھس جاتی ہیں۔کسان چندایک بھیڑوں کو زخمی کر دیتا ہے اور چرواہا بدلہ لینے کے لئے کسان کی فصل کو جلا دیتا ہے۔ کسان جس کا نام جھینگر ہے۔ایک کارخانے میں مزدوری کر لیتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد چرواہے کی بھیڑوں میں اپنی بچھیا باندھ کر بچھیا کو کچھ کھلا دیتا ہے۔ بدھو چرواہے پر گئو ہتیا کا الزام لگ جاتا ہے۔ پراشچت میں اپنا سب کچھ بیچ کر وہ بھی جھینگر والے کارخانے میں کام کرنے لگتا ہے۔

فیض:۔ یہ کہانی تو کچھ دلچسپ ہے ختم کیسے ہوتی ہے ؟

حمید:۔ میں پڑھ کر سناتا ہوں " ساون کا مہینہ تھا۔ چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگر کے بیل نہ تھے، کھیت بٹائی پر دے دیئے تھے۔ بدھو پراشچت سے فارغ ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ بھی مایا کے پھندے سے آزاد ہو گئے تھے۔ نہ جھینگر کے پاس کچھ تھا نہ بدھو کے پاس۔ کون کس سے جلتا اور کس لیے جلتا۔ سن کی کل بند ہو جانے کے سبب جھینگر اب بیلداری کا کام کرتا تھا۔ شہر میں ایک بڑا دھرم شالہ بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام کرتے تھے، جھینگر بھی انھیں میں تھا۔ ساتویں روز مزدوری کے پیسے لے کر گھر آتا تھا اور رات بھر رہ کر سویرے پھر چلا جاتا تھا۔ بدھو بھی مزدوری کی تلاش میں یہیں پہنچا۔ جمعدار نے دیکھا کہ کمزور آدمی ہے، سخت کام تو اس سے ہو نہیں سکتا کاریگروں کو گارا پہنچانے کے لیے رکھ لیا۔ بدھو سر پر طاش رکھے گارا لینے گیا تو جھینگر کو دیکھا۔ رام رام ہوئی، جھینگر نے گارا بھر دیا۔ بدھو نے اٹھا لیا۔ دونوں دن بھر اپنا اپنا کام کرتے رہے۔ شام کو جھینگر نے پوچھا "کچھ بناؤ گے نا ؟" بدھو، "نہیں تو کھاؤں گا کیا ؟" جھینگر: میں تو ایک جون چبینا کر لیتا ہوں، اس جون نہ تو پکاتا ہوں کون جھنجھٹ کرے۔" بدھو، ادھر ادھر لکڑیاں پڑی ہیں، بٹور لاؤ، آٹا گھر سے لیتا آیا ہوں، گھر میں ہی پسوا لیتا ہوں، یہاں تو بڑا مہنگا ملتا ہے اس پتھر والی چٹان پر آٹا گوندھ لیتا ہوں۔ تم تو میرا بنایا کھاؤ گے نہیں اس لیے تم ہی روٹیاں سینکو۔ میں روٹیاں بناتا جاؤں گا۔" جھینگر: "توا بھی تو نہیں ہے۔" بدھو، توے بہت ہیں۔ یہی گارے کا تسلا مانجھے لیتا ہوں۔"

آگ جلی، آٹا گوندھا گیا، جھینگر نے کچی پکی روٹیاں تیار کیں۔ بدھو پانی لایا، دونوں نے نمک مرچ کے ساتھ روٹیاں کھائیں، پھر چلم بھری گئی، دونوں پتھروں کے سلوں پر لیٹے اور چلم پیتے رہے۔

" بدھو نے کہا: "تمہاری اوکھ میں آگ میں نے لگائی تھی"

" جھینگر نے مذاق آمیز لہجے میں: "جانتا ہوں"۔

(ناتمام)

یادیں
دوسرے ملکوں کی

پروفیسر مختار الدین احمد

مصر کے مشہور فاضل اور عربی زبان وادب کے ممتاز مصنف الاستاذ احمد امین سے میری ملاقات قاہرہ میں ۱۹۵۲ کے اواخر میں ہوئی۔ جدید عربی ادب کے مطالعے کے لیے روکیفلر فاؤنڈیشن نے مجھے ایک سال کے لیے فیلوشپ تفویض کی تھی جس کے مقاصد میں شرقِ اوسط کے سارے اہم مقامات میں میرا قیام اور وہاں کے ممتاز عالموں اور ادیبوں سے ملاقات شامل تھی۔ بغداد، دمشق، بیروت ہوتا ہوا اور وہاں کے ادیبوں سے اور شاعروں سے ملتا ہوا قاہرہ پہنچا تھا۔ فاؤنڈیشن کے شرق اوسط کے مسائل کے ماہرین نے جن لوگوں سے مجھے وہاں ملنے کا مشورہ دیا تھا ان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور احمد امین کے نام سرفہرست تھے۔

بیروت سے جب میرا جہاز قاہرہ پہنچا تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شاہ فاروق، مصری تاج و تخت کی صعوبتوں سے دستبردار ہو کر اطالوی جھیلوں کے کنارے آرام کر رہے تھے۔ نجیب جنھیں عام مصری "نگیب" کہتے ہیں زمام حکومت سنبھالے ہوتے تھے اور ملک کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی دور کرنے میں مصروف تھے۔ انگریز اب بھی اپنا لڑکھڑاتا ہوا اقتدار قائم رکھنے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔

ان ہی دنوں کچھ مصریوں اور غیر ملکیوں کی ایک انقلابی سازش پکڑی گئی تھی اور ملزموں کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی تھی، اخبارات ان کی تصاویر اور اس واقعے کی تفصیلات سے بھرے ہوتے تھے۔ باہر آنے جانے والوں پر نگرانی تھی اس کا احساس مجھے مطار (ہوائی اڈے) پر اترتے ہی ہوگیا۔ بہت دیر کے بعد میری

باری پاسپورٹ اور سامان دکھانے کی آئی۔ پاسپورٹ آفیسر شکستہ انگریزی، فرانسیسی لہجے میں بول رہے تھے۔ جب انھوں نے پوچھا کہ تم کہاں سے آرہے ہو۔ مصر میں کب تک قیام کروگے تو میں نے انگریزی کے بجائے ان ہی کی زبان میں جواب دیا کہ میں آکسفرڈ اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہا ہوں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آرہا ہوں تو ایک معمر اور باوقار آفیسر مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور بولے کیا آپ الأستاذ عبدالعزیز المیمنی کی یونیورسٹی سے آرہے ہیں؟ میں نے جواب اثبات میں دیا اور انھیں بتایا کہ میں ان کا شاگرد ہوں اور عربی ادب پر تحقیقی کام کے لیے اوکسفورڈ جا رہا ہوں اور یہاں طٰہٰ حسین اور احمد امین اور مصر کے دوسرے علماء اور ادباء سے ملنے اور اپنے موضوع کے متعلق معلومات فراہم کرنے آیا ہوں تو پاسپورٹ اور کسٹم کے مراحل لمحوں میں طے ہوگئے۔ گویا انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ علامہ عبدالعزیز المیمنی کا شاگرد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم مصر کے علماء اور دانشوروں سے ملے گا، دارالکتب المصریۃ جائے گا، مخطوطات پڑھے گا، اہم اور نادر کتابوں کے فوٹو اسٹیٹیں اور مائکروفلم بنوائے گا، ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کرے گا، قہوہ خانے جائے گا، ام کلثوم اور عبدالوہاب کے نغمے سنے گا، شادیہ اور فریدالاطرش کی فلمیں دیکھے گا، دریائے نیل اور اہرام مصر کی سیر کرے گا۔ لیکن نہ تو مصر میں جاسوسی کرے گا۔ اور نہ یہاں کی سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لے گا۔ معمّر آفیسر بار بار اہلاً وسہلاً مرحبا کہہ رہے تھے اور الأستاذ المیمنی کا ذکر کرتے جاتے تھے۔ وہ اس وقت تک باتیں کرتے رہے اور قہوہ پلاتے رہے جب تک برٹش ایر ویز کی بس ہوائی اڈے سے مسافروں کو شہر لے جانے کے لیے روانہ نہ ہوگئی۔

قاہرہ میں جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان کے ذکر کے لیے دفتر چاہیئے، یہاں صرف احمد امین کا ذکر کروں گا۔ قاہرہ آنے کی اطلاع میں نے انھیں علی گڑھ ہی سے دیدی تھی۔ وہاں پہونچ کر بہت جلد ان سے ملاقات کا وقت بھی طے ہوگیا میری پہلی ملاقات ان کے دفتر کے ایک کمرے میں ہوئی۔ ایک لمبی میز پر کتابوں اور کاغذات کا انبار تھا، کسی زیر طبع کتاب کے کچھ پروف بھی رکھے ہوئے تھے اور میز کے پیچھے دراز قد، مضبوط جسم کے ایک بزرگ عینک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جنون تھا لیکن لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر بشاشت تھی۔ یہ استاذ احمد امین تھے جو مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے۔

انھوں نے معانقہ کیا، عربی طریقے سے رخسار پر بوسہ دیا، مسکرائے خوش آمدید کہا اور قہوہ دنواکہ منگوانے کے لئے آدمی کو آواز دی اور فوراً اس بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے جیسے میں ان کا قدیمی رفیق اور پرانا شاگرد ہوں۔ گفتگو کی ابتدا استاذ المیمنی کی خیریت جوئی سے ہوئی۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ وہ ساٹھ سال سے زیادہ کے ہو چکے ہیں اور اب متقاعد ہو کر علی گڑھ چھوڑ کر کراچی چلے گئے ہیں تو ان کے چہرے پر افسوس اور تشویش کے آثار ظاہر ہوئے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ استاذ مکرم جامعہ کراچی کے قسم عربی کے صدر اور ایک ادارہ تحقیقات علمیہ کے نگراں مقرر ہوئے ہیں تو ان کی سابقہ بشاشت چہرے پر عود کر آئی۔ وہ قاہرہ میں استاد کے ساتھ گذری ہوئی صحبتوں کو یاد کرنے لگے اور ان کے وسیع مطالعے اور اعلیٰ قوت حافظہ کی متعدد مثالیں انھوں نے سنائیں۔

جب میں نے بتایا کہ شرق اوسط کا دورہ مکمل کر کے پروفیسر گب کی نگرانی میں کام کرنے اوکسفورڈ جا رہا ہوں تو بولے: پروفیسر گب بہت ذہین آدمی ہیں اور مسائل کا استقراء خوب کرتے ہیں وہ جب عربی بولتے ہیں تو تکلف کا احساس ہوتا ہے، وہ عربی عبارت اگرچہ رک رک کر اور یورپی لہجے میں پڑھتے ہیں لیکن ان عبارتوں سے جس طرح وہ نتائج اخذ کرتے ہیں اور جس خوبصورتی سے اپنے خیالات کاغذ پر منتقل کرتے ہیں وہ ہم مصریوں کو بھی بہت کم نصیب ہے۔ جب انھوں نے پھلوں کی پلیٹ میری طرف بڑھائی اور قہوہ کی پیالی اپنے ہاتھ میں لی تو میں نے محسوس کیا کہ عمر کی زیادتی کے باعث ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے اور ہاتھوں میں ارتعاش۔ وہ کچھ رک کر اور قہوہ کا ایک گھونٹ لے کر بولے میں یورپ کے علماء میں نلّینو اور گویدی سے بے پناہ طور پر متاثر ہوں۔ نلّینو کی کتاب علم الفلک والی اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن میں اس کے ان خطبات کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں جو اس نے قاہرہ میں تاریخ ادب عربی پر دیے ہیں۔ ان خطبات نے تحقیق کی پیچیدہ راہوں کے کئی ایک تاریک گوشے منوّر کیے ہیں، اور جویدی! جویدی خدا کی قسم بہت بڑا عالم ہے اس کی نحو پر بھی بڑی گہری نظر ہے اور عربی تو وہ قدیم عربوں کی طرح لکھنے پر قادر ہے۔

اپنے اساتذہ کے ذکر پر انھوں نے محمد عبدہ کا خاص طور پر نام لیا۔ انھوں نے

شیخ الخضری، شیخ محمد مہدی اور شیخ علی فوزی کا ذکر کیا، علی فوزی کے ذکر پر ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اور انھیں بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں اور وہ اس زمانے کا حال سنانے لگے جب علمی استفادے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کہنے لگے شیخ عبدالحکیم بن محمد اور عاطف بکر میرے دوست اور رفیق تھے، عبدالحکیم مجھ سے بڑے تھے اور مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے، اور عاطف بکر کے ساتھ پتا نہیں کتنی صبحیں اور شامیں میں نے ایک ساتھ گزاری ہیں، میری شخصیت کی تعمیر میں ان لوگوں کا بڑا حصہ ہے۔

یہ صحبت ابھی جاری رہتی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وہ ادھر متوجہ ہوئے، اس کے ساتھ میں نے دیکھا کمرے میں دو صاحبان داخل ہوئے جو بعد کو معلوم ہوا کہ قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں تھے اور ان کے قدیم رفیقوں میں۔ میں اجازت لے کر اور دوسری ملاقات کا وعدہ کرکے ان سے رخصت ہوگیا۔ یہ پر تکلف صحبت ختم ہوگئی۔

احمد امین سے دوسری ملاقات کئی دنوں کے بعد ان کے گھر پر ہوئی، ان کی آنکھوں کا جنون اور بڑھ گیا تھا اور وہ مزید افسردہ نظر آرہے تھے، میں ان سے کہہ رہا تھا کہ ان کی کن کن تصانیف کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی ہے اور اقطاع عالم کے لوگ ان سے کس قدر مستفید ہو رہے ہیں۔ وہ خاموش سنتے رہے لیکن خلاء کو تاکتے رہے۔ جب وہ بولے تو ان کتابوں کے ماتم گذار نکلے جنھیں وہ لکھنا چاہتے تھے مگر اب تک نہ لکھ سکے تھے کہنے کو تو بہت سے موضوعات زمانے سے سوچ رکھے ہیں، کچھ تصنیفات کے بطائق (کارڈ) بھی تیار ہیں اور مواد بھی فراہم کر رکھا ہے لیکن فرصت نہیں ملتی۔ اور اب صحت بھی اجازت نہیں دیتی۔ وہ مصری رسالوں اور اخباروں کے شکر گزار نظر آتے تھے جن کی بدولت انھیں سیکڑوں مضامین لکھنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتظامی ذمہ داریوں کی مصروفیات کے شکوہ سنج تھے جن کی وجہ سے وہ علمی دنیا سے وقتاً فوقتاً کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ جامعہ قاہرہ کے کلیۃ الاداب کی عمارت یعنی پرنسپلی کے دو تین سال کے زمانے کو وہ اپنا "عقم" "بانجھ زمانہ" بتاتے تھے، جب وہ تالیف و تصنیف کی طرف کم توجہ دے سکے تھے۔ ان کا بیشتر وقت بقول ان کے لایعنی مسائل، کالج کے انتظامات کرنے، طلبا،

کی شکایت سنتے، اساتذہ کی مشکلات دور کرتے اور دوسرے امور میں صرف ہوتا رہا۔

میں نے احمد امین سے پوچھا: آپ کو اپنی تصانیف میں کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے، میں نے سمجھا وہ اس کا وہی روایتی جواب دیں گے کہ میری تصانیف میرے جگر کے ٹکڑے ہیں، میں کسی ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دوں۔ لیکن وہ خاموش رہے اور پھر مسکرائے ان کی بے نور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور بولے: تم بتاؤ تمہیں میری کون سی کتاب زیادہ پسند آئی، ویسے میں نے سب سے زیادہ محنت فجر الاسلام والے سلسلۂ تصانیف پر کی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم۔ لیکن میں نے آپ کو بہ حیثیت انشاء پرداز کے زیادہ پڑھا ہے۔ اور پہچانا ہے، مجھے آپ کے مضامین، آپ کی خود نوشت سوانح زندگی، حیاتی اور وہ مکاتیب زیادہ پسند ہیں جو آپ نے اپنے صاحبزادے کے نام سپرد قلم کیے ہیں۔

کچھ اور باتوں کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے لکھنے پڑھنے کے اوقات کیا ہیں، بولے اب تو میری بصارت کمزور ہو گئی۔ لیکن وقت کی سختی سے پابندی کرنا میرے معمولات میں رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سارے کام اپنے وقت پر ہوں۔ میں یہی پابندی اپنے شاگردوں اور دفتر کے لوگوں سے چاہتا ہوں اور پھر مسکرا کر بولے اور یہیں سے ان کا مجھ سے اختلاف شروع ہوتا ہے لیکن خیر، تو معاملہ ہی کچھ اور ہے اور نیک و بد کی توفیق خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں صبح کی چائے کے بعد لنچ کے وقت تک تحریری کام کرتا ہوں، اور تالیف و تصنیف میں لگا رہتا ہوں کھانے کے بعد دن میں سو نا ضرور ہوں، پھر مسکرا کر بولے آپ جانتے ہوں گے ہم عرب قیلولہ کے لیے بہت بدنام ہیں، لیکن دن کو کچھ دیر سو لینے کے بعد شام کے لیے میرا جسم اور دماغ تازہ دم ہو جاتا ہے۔

اب دیر ہو رہی تھی، میں احمد امین کا جو بہت مصروف آدمی تھے، بہت وقت لے چکا تھا، میں نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی، بولے مصر کب چھوڑ رہے ہو! میں نے کہا چند دنوں بعد۔ پوچھا بحری راستے سے انگلستان جاؤ گے یا ہوائی سفر اختیار کرو گے، میں نے کہا راکیفلر فاؤنڈیشن نے ہوائی جہاز ہی سے سفر شروع کرایا ہے اور ہوائی جہاز ہی سے سفر پورا کرنا ہے، بولے: افسوس کہ تم سمندر کے لطف سے محروم رہے۔

سمندر کے سفر میں جو بات ہے وہ ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں ممکن نہیں۔ خیر تعلیم کی تکمیل کے بعد واپسی سمندر کے راستے سے کرنا اور اسکندریہ سے اُتر کر سیدھے قاہرہ آجانا اور اس درمیان جب موقع ملے تو سمندر کے عجائبات پر جو لٹریچر یورپی زبان میں ہے اس کا ضرور مطالعہ کرنا۔

فرمانے لگے: سمندر سے مجھے بچپن سے عشق ہے۔ جامعہ از ہر چھوڑنے کے بعد جب میں اسکندریہ کے ایک مدرسے میں مدرس ہو کر پہنچا تو میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہو گی۔ سمندر کے حسن سے پہلی بار مجھے اسکندریہ میں شادکام ہونے کا موقع حاصل ہوا۔ فرصت کے وقت میرا بہترین مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ ساحل سمندر پر چلا جاتا اور گھنٹوں موجوں کی طغیانی دیکھتا رہتا۔ وہ کہتے ہیں کہ موجوں کے زیروبم کے نظارے سے مجھے ایک خاص قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے، اس وقت تک میں سمندر کا نظارہ صرف ساحل سے کیا کرتا تھا، جب ۱۹۲۸ء میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا اور سمندر کے وسط میں ہمارا جہاز پہنچا، تب پہلی بار سمندر کی عظمت اور اس کی ہیبت و جبروت کا اندازہ ہوا، لیکن سمندر کا جوش و خروش سفر کے ابتدائی پہلے دو دن رہا، اس کے بعد سمندر پرسکون ہو گیا اور اس کی صحبت میں وہی سکون مجھے حاصل ہونے لگا جو اسکندریہ کے ساحل پر مجھے نوجوانی میں حاصل ہوتا تھا۔

میں نے استاد احمد امین کو بتایا کہ بیروت میں روکیفلر فاؤنڈیشن نے میرے قیام کا انتظام ایک ایسے ہوٹل میں کیا تھا جس کا تہائی حصہ عین سمندر کے اندر واقع تھا ہوٹل کیا تھا ایک بحری جہاز تھا جس کے دو حصے ساحل سمندر میں چھپی ہوئی چٹانوں پر واقع تھے، میرا کمرہ سمندر کے رخ پر واقع تھا، اس میں یا اس کی بالکونی میں بیٹھ کر سمندر کی موجوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کسی ہوٹل میں نہیں جہاز پر بیٹھا ہوا ہوں۔ اور جہاز سمندر میں رواں دواں ہے۔ احمد امین جواب کچھ تھک سے گئے تھے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، اچانک صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی وہ پُرشوق لہجے میں۔ بولے خدا کی قسم ٹھہرنے کی جگہ تو بس وہ ہی ہوٹل ہے۔ میرا بیروت جانا ہوا تو اسی ہوٹل میں ٹھہروں گا اور کچھ دن اور سمندر کا لطف اٹھاؤں گا۔

لیکن بیروت جانا اور اس سمندر سے لطف اٹھانا اب ان کے مقدر میں نہ تھا۔ میں ان سے رخصت ہوکر روم ہوتا ہوا انگلستان پہونچا اور چند ہی مہینوں کے بعد ایک دن اوکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں کام کر رہا تھا کہ پروفیسر گب آگئے، انھوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ احمد امین قاہرہ میں وفات پاگئے۔

احمد امین نے مجھے رخصت کرتے وقت، اپنی دو کتابیں مرحمت فرمائیں، اپنی سوانح زندگی حیاتی اور بیٹے کے نام خطوط الی ولدی، میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر ان دونوں کتابوں کا ترجمہ کروں گا اور ان پر ایک تعارفی مضمون شائع کروں گا تاکہ اردو کی دنیا ان سے واقف ہوسکے، ترجمہ ان دونوں کتابوں کا تقریباً مکمل ہے اور آج کی شب ان کے متعلق باتیں کر کے اس وعدے کی ایفا کر رہا ہوں جو احمد امین سے برسوں پہلے میں نے کیا تھا۔

(اردو سروس سے نشر)

ادب

اُردو کے زوال پذیر اصناف

مُسدّس اور مثنوی

پروفیسر گیان چند جین

جس طرح افراد، اقوام اور تہذیبوں کی قسمت میں کمال کے بعد زوال لکھا ہوتا ہے اسی طرح زبانیں، ادب اور ان کی اصناف بھی بڑھ کر گھٹتی ہیں۔ میر نے شاہوں کے کاسۂ سر کی خاک زدگی پر ماتم کیا تھا میں اُردو شاعری کی دو مشہور اصناف کا سوگوار ہوں۔ یہ ہیں مسدّس اور مثنوی۔ ان کے پاس ماضی ہے مستقبل نہیں، شاندار متمول ماضی۔ اس عظمتِ رفتہ کی مانند پڑتی ضو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اردو شعر میں تقسیم اصناف کسی ایک بنیاد پر نہیں جس کی وجہ سے یہ تقسیم منطقی حیثیت سے جامع ومانع نہیں رہتی یہ دو بنیادوں ہیئت و موضوع پر قائم ہے بعض اصناف محض ہیئت کی بنا پر متعین ہوتی ہیں بعض موضوع کی بنا پر اور تیسری قسم ہیئت و موضوع دونوں پر نظر رکھتی ہے پہلی نوع کی مثال مسدس، قطعہ رباعی، ترکیب بند، مثنوی وغیرہ ہیں جن کا کوئی بھی موضوع ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم کی مثال مرثیہ، واسوخت اور ہجو تک ہیں جن کا موضوع مقرر ہے اور ہیئت بھی کسی ہوئی ہے۔

اس بات چیت کا موضوع جو دو فلک زدہ اصناف ہیں وہ محض ہیئت کے سانچے فراہم کرتے ہیں وہ ایسا ظرف ہیں جن میں کسی بھی مظروف کو رکھا جا سکتا ہے ان کی دیواریں قوافی پر قائم ہیں ان دونوں اصناف میں جو خصوصیت مشترک ہے کہ ان کے ہر مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔

پہلے مسدس کو لیجئے۔ ایک خالص ہیئتی صنف مسمط قرار دی گئی جس میں کئی مصرعوں کے بند والی مسمط سے سروکار ہے۔ اسے مسدس کہتے ہیں اس کے بند میں پہلے چار

مصرعے باہم مقفیٰ ہوتے ہیں اور بعد کے دو مصرعوں میں کوئی دوسرا قافیہ آتا ہے مختلف بندوں میں آپس میں کوئی قافیہ نہیں ہوتا۔

مسدس کی ہیئت میں ایک پابندی یہ ہے کہ ہر مصرعہ میں قافیہ لانا پڑتا ہے۔ لیکن سہولت یہ ہے کہ چار قافیوں سے زیادہ کی تلاش نہیں کرنی پڑتی اور ہر بند کے ساتھ قافیہ بدلتا رہتا ہے۔ تبدیلی قوافی کی وجہ سے اس میں طویل نظمیں لکھنی ممکن ہیں۔ روایتی اصناف میں مثنوی اور مسدس یہ دو ہی طویل نظموں کے بروئے کار آسکیں۔ مسدس کو فروغ دینے میں سب سے بڑا ہاتھ مرثیے کا ہے سوداؔ نے کم از کم تین مرثیے مسدس کی شکل میں لکھے ہیں ان کے ہم عصروں میں میرؔ، حیدریؔ، گداؔ اور سکندرؔ سب کے یہاں مسدسی مرثیے ملتے ہیں لیکن اس صنف کی مقبولیت خلیقؔ و ضمیرؔ کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد مرثیے کے لیے صنفِ مسدس ٹکسال بند ہوگئی۔ انیسؔ و دبیرؔ سے لے کر جوشؔ تک نے اسی صنف کو آلۂ کار بنایا۔ مراثی کی متاعِ خطیر کے باعث مسدس اُردو نظم کی اہم اصناف میں ہے اس کے امکانات کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی میں رزم نامۂ انیسؔ اور رزم نامۂ دبیرؔ مرتب کیے گیے یعنی یہ صنف اپنے اندر طویل ایپک کی سمائی بھی رکھتی ہے۔

مرثیہ شاعری کے علاوہ اخلاقی عظمت کا امین بھی ہے۔ اسی کے دور میں ایک دوسری صنف واسوخت نے بھی مسدس کو پسند کیا۔ مرثیے کے برعکس یہ کسی اخلاقی برتری کی مدعی نہیں۔ اوّل اوّل واسوخت کے لیے کسی صنف کو مخصوص نہیں کیا گیا تھا لیکن امانتؔ کے بعد سے واسوخت کے لیے یہی پسندیدہ جامہ ٹھہرا چنانچہ امیر مینائیؔ اور نواب یوسف علی خاں ناظمؔ وغیرہ نے مسدس ہی میں واسوخت لکھا۔ امانتؔ کے دو واسوخت ملتے ہیں جن میں سے پہلا ۳۰ بندوں کا اور دوسرا ۱۱۰ بندوں کا ہے امانتؔ کے واسوخت کی ایک اہمیت اس کے تہذیبی پہلو یعنی ملبوسات و آرائش وغیرہ کے بیان میں ہے۔

غدر کے بعد دلّی کی تباہی کی نظموں کا جو مجموعہ فغانِ دہلی کے نام سے مرتب ہوا اس میں کئی نظمیں مسدس کی شکل میں ہیں مثلاً داغؔ کا مسدس۔

فلک، زمین و ملائک جناب تھی دلّی
بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے علی گڑھ میں اپنا صور بیداری پھونکا۔ حالی نے قوم کا مرثیہ پڑھا اور آئندہ کے لیے راہ مستقیم دکھائی۔ ان کے قول مد و جزر اسلام کے نام سے مسدس کے قالب میں رونما ہوئے۔ مقبولیت کے سبب اسے مسدس حالی ہی کہا گیا۔ وہ مسدس جو مرثیے کی منظر نگاری رزم و بین اور واسوخت کی خارجی شاعری کا حق ادا کرتا تھا وہی قومی و اصلاحی خیالات کا عمل طراز ہوا حالی نے بعض اور نظمیں بھی مسدس کی ہیئت میں لکھیں۔ پنجاب تحریک کے بعد جب نظم مسلسل غزل کے مقابل ایک مستقل صنف کی شکل میں قائم ہو گئی تو ترکیب بند کے ساتھ مسدس کو بھی اس میں اہم مقام ملا۔ درگا سہائے سرور اور چکبست نے اپنی بہت سی نظموں کے لیے مسدس کا انتخاب کیا چنانچہ چکبست کی قومی نظمیں اور راماین کا ایک سین اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اقبال بھی مسدس کو پسند کرتے تھے ان کے پہلے اردو مجموعے بانگ درا کی پہلی نظم ہمالہ اس کا ثبوت ہے۔ شاید بیسویں صدی کے سب سے اہم مسدس اقبال کے قلم سے نکلے میری مراد "شکوہ اور جواب شکوہ" سے ہے ان نظموں میں مسدس کا زور اور روانی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ جوش کے دو مرثیے "حسین اور انقلاب" اور "مفکر غالباً اس صنف کے آخری دو شاہکار ہیں۔ راہی معصوم رضا نے بھی ۱۸۵۷ء سے متعلق ایک طویل مسدس "اے قلم منزل دشوار کو آسان کر دے" یہ ان کے مجموعے ۱۸۵۷ء میں شامل ہے۔ نظم معریٰ اور آزاد نظم کے دور میں اہل اردو کو قافیوں کی پابندی بعید بے جا معلوم ہونے لگی جس کے نتیجے میں صنف مسدس کا رواج جاتا رہا۔ بہرحال مرثیوں کے بیش بہا سرمائے کی بدولت مسدس کو کسی دوسری صنف سے دبنے، شرمانے کی ضرورت نہیں۔

مثنوی میں ہر شعر کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں اور عموماً ہر شعر میں قافیہ بدلتا جاتا ہے چونکہ اس میں محض دو قافیوں کی تلاش کرنی پڑتی ہے اس لیے اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ اردو میں طویل ترین نظمیں مثنوی ہی لباس میں ظہور میں آئیں۔ مسدس کے مقابلے میں مثنوی کی داستان طویل تر ہے اردو شاعری کی جتنی عمر ہے مثنوی کی بھی اتنی ہی طویل تاریخ ہے دکن و شمال دونوں اس کی قلمرو میں ہیں ولی سے پہلے

کی دکنی شاعری بیشتر مثنوی ہی کی شاعری ہے وہاں کے مشاہیر شعرا محض مثنوی گو ہیں جنھوں نے گلشن عشق اور پھول بن جیسی شاہکار مثنویاں لکھیں۔ دکن میں اخلاقی، عارفانہ، تاریخی اور رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں لیکن شمالی ہند میں حالی و آزاد سے قبل مثنوی حسن و عشق تک محدود رہی۔

مثنوی ایک ہیئت کا نام ہے اس کے موضوع کی کوئی نقش و تحریر نہیں لیکن روایت نے طویل مثنوی کو منظوم داستان بنا دیا۔ شاہکار ہیں "سحرالبیان" "گلزار نسیم" طلسم الفت اور ترانہ شوق ان میں داخلی و خارجی دونوں قسم کی شاعری کے محاسن ہیں یعنی منظر نگاری اور تہذیبی رفیقوں کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری کے بھی اچھے نمونے ہیں۔ میر اور ان کے مقلدین نے نسبتاً مختصر مثنویاں لکھیں اور انھیں وارداتِ دلی کا مظہر بنا دیا۔ نواب مرزا شوق نے عشق کے جسمانی رخ پر توجہ کی۔ لکھنو اور دلی دونوں کے نواب مرزا کو ثر و تسنیم کی ستھری زبانیں لکھتے ہیں۔ شوق کی فریبِ عشق، بہارِ عشق زہرِ عشق اور داغ کی فریادِ داغ فصاحت و سلاست و روانی کا حرفِ آخر ہیں۔

جدید اصلاحی شاعری نے اپنے اجتہاد کے لیے مثنوی کی روایتی صنف ہی کو پسند کیا۔ آزاد و حالی کی لاہور کی نظمیں مثنویاں ہی ہیں اس قسم کی نظموں میں حالی کی 'مناجاتِ بیوہ' چوتی پر ہے حب وطن اور مناظرۂ تعصب و انصاف وغیرہ نئی سوچ اور نئے شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ شبلی کی مثنوی "صبح امید" اسی زمرے میں آتی ہے۔ اقبال نے اپنے بعد کے دور میں ایک اہم نظم "ساقی نامہ" مثنوی کی ہیئت میں لکھی۔ آزادی سے قبل کی ایک طویل مثنوی حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام ہے جو کئی جلدوں میں ہے۔

ترقی پسند شاعری نے آزاد نظم کو بطور خاص نوازا لیکن کیفی نے خانہ جنگی اور سردار جعفری نے جمہور جیسی اہم نظمیں مثنوی کے روپ میں لکھیں۔

مثنوی کا لکھنا سہل ہے لیکن چونکہ اس میں بندوں کی تقسیم نہیں ہوتی اس لیے پوری نظم ایک اٹوٹ سلسلہ ہوتی ہے اس میں خیال کے وقفے نہیں ہوتے مسلسل قافیے دار شعروں کی وجہ سے ایک بے کیف یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اسی وجہ سے مثنوی پر زوال آگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب طویل نظمیں لکھی ہی جاتی ہیں مختصر نظموں میں ہیئت کی اہمیت کم سے کم ہو گئی ہے۔

تابناک ماضی والی ان دونوں اصناف نے اُردو کو کیسے کیسے اور کتنے وافر اشعار دیئے۔ مسدس

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

(اقبالؔ کے شکوہ سے)

بام روشن تھا طور کی صورت
سر سے پا تک تھی نور کی صورت
گل سے رخسار گول گول بدن
گات جس طرح قمقمے روشن
لبِ نازک کہ جان دے دیجئے
دہن ایسا کہ چھپا لیجئے

"مثنوی بہارِ عشق سے"

افسوس ایسی جلال و جمال والی اصناف کو بھی زوال کا منہ دیکھنا پڑا۔

"ہر کمالے را زوال"

(آکاش وانی لکھنؤ سے نشر)

میرے بچپن کا محرّم

پنڈت برجموہن ناتھ

محرّم نام ہے اسلامی سنہ ہجری کے پہلے مہینے کا۔

لیکن برّصغیر ہندوستان میں اور خصوصاً اودھ اور لکھنؤ میں محرّم کا نام آتے ہی۔ عزاداری۔ رسول کے نواسے یعنی ان کی عزیز بیٹی جناب سیّدہ فاطمہ اور امیرالمومنین حضرت علی کے بیٹے سیّدالشہدا، حضرت امام حسین اور کربلا کے میدان میں ان کے گھر والوں اور رفقا کے سوگ، ماتم، تعزیوں مجلسوں کا تصوّر ہی ذہن پر چھا جاتا ہے۔

میرے بچپن کی سب سے پہلی یاد محرّم سے موسوم روشنی کی ہے۔ اگر میں اپنے گھر سے ہی شروع کروں تو روشنی نواب نیا محل کے امام باڑے سے شروع ہوتی تھی۔ اس کے بعد گھمّو جان امام باڑہ، رانی صاحب مرشدآباد کا امام باڑہ، پرانے نخاس میں نجا اور نور جہاں کے امام باڑے خاص طور پر آراستہ ہوتے تھے۔ درگاہ حضرت عبّاس بھی روشنی سے مزیّن ہوتی تھی۔

چوک میں دونوں طرف ڈیرے دار طوائفیں روشنی کرتی تھیں۔ دونوں طرف کوٹھے روشنی سے آراستہ ہوتے تھے۔ میں نے حیدری کے امام باڑے یا حیدر حسین خاں کے پھاٹک کی روشنی خود تو نہیں دیکھی لیکن میرے والد بیان کرتے تھے کہ وہاں بھی کبھی دیکھنے کے قابل روشنی ہوتی تھی۔ سوداگر کا امام باڑہ، آغا باقر کا امام باڑہ اور میاں داراب کا امام باڑہ یہ سبھی محرّم کی گہما گہمی کے مرکز تھے۔ سب سے زیادہ روشنی کا اہتمام اودھ کے شاہی اوقاف امام باڑہ حسین آباد آصف الدولہ اور شاہ نجف میں ہوتا تھا۔

یہ روشنیاں پہلی محرّم کو شروع ہو جاتی تھیں۔ محرّم کی آٹھ تاریخ کو ہم لوگ

ان شاہی امام باڑوں میں روشنی دیکھنے جاتے تھے اسی تاریخ کو ان امام باڑوں میں گورنر آتے تھے۔ ۸ محرّم کو شاہی خاندان وظیفہ داران پنشنداران لاٹ صاحب کے استقبال کے لیے موجود رہتے تھے کمشنر ڈپٹی کمشنر اور دیگر حکام تو رہتے ہی تھے۔ اس دن کا دعوت نامہ ملنا ہی ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بلیک آؤٹ کے دوران روشنی میں تخفیف ضرور ہوئی لیکن روشنی بند نہیں ہوئی۔

حسین آباد سے آصفی امام باڑے تک ایک عظیم میلے کی سی صورت رہتی تھی۔ بازار لگتے تھے۔ قندیلیں، کھلونے کا سامان ہلکے پھلکے پکوان سبھی ملتے تھے۔ سب سے زیادہ فروخت گوٹے کی ہوتی تھی۔ میرے کانوں میں "دل بہار گوٹا" "رنگ دار گوٹا" "خوشگوار گوٹا کی صدائیں" آج بھی گونجتی رہتی ہیں۔ دھنیا، الائچی، ناریل، پستہ، بادام، ڈلی، سپاری، چکنی ڈلی گوٹے کا جزو ہوتے تھے۔ گوٹے سوگواروں کے لیے پان کا بدل تھا۔ جب میں ذرا بڑا ہوا تو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی مہنگائی کے سبب گوٹا کمیاب ہوتا چلا گیا۔ اب کہیں دکھتا بھی نہیں۔

دوسرا بڑا ہنگامہ ان پوسٹروں اشتہاروں کا میرے ذہن میں ہے جو محرّم آتے ہی دیواروں پر چپک جاتے تھے۔ جو اردو میں ہوتے تھے اور جن کو میں پڑھنا چاہتا مگر ہجے اور تلفظ دونوں کے اعتبار سے وہ دشوار ہوتے تھے۔

میرے بچپنے تک عزاداری عام تھی اور محرّم ہر فرقے کے لوگوں میں منایا جاتا تھا۔ راجہ امام بخش کی روایات بھی باقی تھیں۔ کئی ہندو حضرات ٹھاکر گنج، مشک گنج، مصاحب گنج وغیرہ میں اچھے مرثیے نوحے لکھتے پڑھتے تھے۔

حسین آباد کی ضریح کا جلوس جسے لوگ موم تعزیے کے نام سے جانتے تھے ہمیشہ میرے گھر کے سامنے سے ہی گذرتا تھا اور اس زمانے میں اور اس سے بھی پہلے ہی شاید ہی کوئی کشمیری برہمن خاندان ہو جس نے اس گھر سے محرّم کا جلوس اور ضریح نہ دیکھی ہو۔ دسویں محرّم کا دن میرے گھر میں چہل پہل کا دن ہوتا تھا۔ گوٹا، پوریاں کچا کھانا افراط سے بنتا تھا تاکہ دور دور سے آئے مہمانوں کو تکلیف نہ ہو۔ شام تک آتے ہوئے لوگ جمع رہتے تھے۔

عشرہ کی شام کو یا دوپہر بعد سے مختلف برادریوں کے اور پیشہ ور گروہوں کے

تعزیے نکلنے شروع ہو جاتے تھے۔ کپڑے کے ہرے لال، تعزیے، جو کے تعزیے، چوٹہلوں کے تعزیے سہ پہر کو ہی نکلتے تھے۔ دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگ ڈھول دھف تاشے وغیرہ بجاتے تھے۔

حسین آباد کا موم کا تعزیہ اور آصف الدولہ کا کاغذ کا تعزیہ دونوں بہت بڑے ہوتے تھے۔ بیسوں آدمی انھیں اٹھاتے تھے۔ ہاتھی، اونٹ، نیزے، نشان، ماہی مراتب، مرثیہ خواں، سوز خواں سبھی جلوس میں شریک ہوتے تھے۔ پولیس اور فوج کا بینڈ چلتا تھا۔ موم کا اتنا بڑا تعزیہ بنانا ہی ایک مخصوص فن تھا۔ اتنی بڑی رنگ برنگی خوبصورت عمارت موم کی بنا دینا لکھنؤ کے لیے ایک مایۂ ناز فنکارانہ شاہکار کی حیثیت تھی۔

ضریح کے استقبال میں جگہ جگہ سبیلیں لگی ہوتی تھیں پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی۔

میرے بچپن میں محرّم خود ایک صنعت تھا۔ ہزاروں لوگ اس یادگار سے اس تیوہار سے پرورش پاتے تھے۔ تعزیے بنانے والے، شیرمال، خرمے، کباب، حلوے پراٹھے اور نذر نیاز کے لیے بننے والے کھانوں کے رکاب دار بنانے والے، خود شاہی اوقات کے کھانے ہی منوں میں بنتے تھے۔ دس دن تک ہزاروں گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ ہندوؤں کے یہاں عام طور سے لوگ بڑے بڑے تباخ حصے میں بھیجتے تھے۔

میرے بچپن میں سوز خوانی کا چلن تھا۔ نثر خوانی کا چلن تھا۔ سوز بلا ساز کے المیہ موسیقی ہے نثر میں مسجع اور مقفع عبارتوں کا استعمال ہوتا تھا۔ سوز خوانی میں مجھو صاحب مشہور تھے نثر نگاری میں نجم الحسن نثار صاحب کو میں نے سنا تھا۔

مہندی کے جلوس میں نے اپنے بچپن میں دیکھے نہیں۔ حسین آباد کے علاوہ گولا گنج سے بھی مہندی کے جلوس نکلتے تھے۔ مرثیہ گو حضرات میں مجھے یقین نہیں کہ میں نے دولہا صاحب عروج۔ جو میر انیس کے خاندان کے فرد تھے اور میرے پڑوسی تھے انھیں سنا ہو لیکن جناب پیارے صاحب رشید، حضرت شدید، حضرت مودّب کو خاندان دبیر کے نمائندہ جناب سرفراز حسین کو میں نے سنا تھا۔ اتنا تغیّر میرے بچپن میں آگیا تھا۔ بارہ دری رائے دل آرام صاحب کول جہاں میر انیس مجلسیں پڑھا کرتے تھے وہاں اب مجلسیں ہونا بند ہو گئیں ہیں۔ ماتمی انجمن بننا شروع ہو گئی تھیں۔ آگ کا ماتم کبھی کاظمین میں کبھی شاہی امام باڑوں میں ہوتے تھے۔ چھریوں اور برچھیوں سے ماتم کا رواج نیا چلا تھا ایسا میرے بزرگ کہتے تھے۔

(لکھنؤ سے نشر)

دُردانہ

جگر مرادآبادی

ایک تھے نواب فلک رفعت۔

جی نہیں ـــــ ایک تھا لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن۔ اس کے تھے ایک اسٹیشن ڈائرکٹر کے ایس ملک۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن ملک صاحب نے انصار ناصری، عشرت رحمانی اور شوکت تھانوی کو بلا کر طے کیا کہ ایک "اوپرا" (غنائیہ) براڈکاسٹ کیا جائے۔ بہت سے نام پیش کئے گئے مثنوی زہر عشق؟ جی نہیں ـــــ مثنوی میر حسن؟ ـ اوں ہنہ ـــ شوق کی مثنوی ـــ عالم خیال؟ پھر کبھی سہی ـــ اندر سبھا؟ بہت پامال ہے ـــ طے ہوا کہ نئی چیز لکھی یا لکھائی جائے۔ نام طے ہوا دُردانہ۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی نے کہانی لکھی۔

چار حصّوں میں اس کہانی کو تقسیم کر کے چار شعراء سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا اپنا حصہ نظم کریں۔ ن آرزو لکھنوی، نوح ناروی، آسی الدنی اور جگر مرادآبادی۔ باقی پیوند شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی نے لگائے انصار نے اوپرا پروڈیوس کیا[1]۔

---

[1] عشرت رحمانی صاحب نے اپنے ایک خط مطبوعہ ماہنامہ "شمع" نئی دہلی شمارہ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بھی اس مثنوی کا تذکرہ فرمایا ہے ..... چند ماہ بعد ہم نے حضرت جگر مرادآبادی (مرحوم) سے ایک نئی مثنوی "دردانہ" لکھوائی۔ اس کا پلاٹ خود ہم نے تجویز کیا تھا اور اس مثنوی پر مبنی ریڈیو اوپرا شوکت تھانوی اور میں نے ترتیب دیا۔ یہ اوپرا میرے ایک ساتھی سید انصار ناصری دہلوی کی زیر ہدایت نشر ہوا۔ اس کے ہیرو اور ہیروئن طلعت محمود اور جہاں آرا کجن تھے۔

جگر مرادآبادی سے مثنوی لکھوانا۔ آسان نہ تھا مگر میں خود ان کے پاس گونڈہ حاضر ہوا۔ یہ تو خیر مثنوی لکھوانے کا سوال تھا۔ میں تو اگر طلسم ہوشربا لکھنے کی بھی اُن سے درخواست کرتا تو سوچنے سمجھنے کا سوال ہی نہ تھا وہ قلم لے کر بیٹھ ضرور جاتے وہ احباب کو اسی طرح خرید اکرتے ہیں۔

بھلا غور کیجیے کہاں جگر؟ کہاں یہ پلاٹ کی پابندی مثنوی نظم کرنے کا سوال مگر جگر مرادآبادی نے مجھ کو ناکام واپس نہ آنے دیا۔ دعوتیں بھی کھلائیں اور اپنے حصے کے پلاٹ کو نظم بھی کر دیا۔ وہ اشعار میرے پاس محفوظ تھے۔ "نقوش" کے ذریعے محترمہ ہاجرہ مسرور اور برادرم احمد ندیم قاسمی کو میں اپنے نزدیک سب سے قیمتی تحفہ سمجھ کر یہ اشعار دے رہا ہوں۔

شوکت تھانوی

دردانہ

جگر مرادآبادی

بارے دُردانہ ہوش میں آئی
ہونٹ کانپے، نگاہ تھرّائی

ہائے وہ سوز و ساز کی تصویر
حُسن کا خواب، عشق کی تعبیر

آرزوئے طرب کا میخانہ
زندگی کا حسین افسانہ

تمتمائے ہوئے سے وہ رُخسار
جام خوش رنگ میں شفق کی بہار

تھی مجسّم وہ کھوئی کھوئی سی
جاگی جاگی سی سوئی سوئی سی

اد رنا آسر کا تھا یہ حال اُدھر
اک قیامت گذر گئی دل پر

بادۂ عشق نے کیا سرشار
کھوئے ہوش و حواس پہلی بار

موجِ ہستی سبک شعار ہوئی
غم کے طوفاں سے ہمکنار ہوئی

دردِ پہلو میں۔ یوں چمک اُٹھا
شعلۂ زندگی بھڑک اُٹھا

تھا مگر اس کو پاس عزّت کا
ننگ و ناموس کا شرافت کا

طبعِ غیرت پسند پائی تھی
فطرت اس نے بلند پائی تھی

حالتِ شوق عرض کر نہ سکا
رنگ تصویرِ غم میں بھر نہ سکا

مدتوں تک رہا یہی انداز
کوئی بھی پا سکا نہ عشق کا راز

درد لیکن نہ رہ سکا مستور
ایک جا ہو گئے تھے غیب وظہور

دل پہ جو نقش تھا مٹا نہ سکا
یادِ محبوب کی بھلا نہ سکا

آتشِ غم بڑھی بجھانے سے
راز افشا ہوا چھپانے سے

دل میں یارائے ضبط ہی نہ رہا
ہوش و تمکیں سے ربط ہی نہ رہا

دوستوں سے یہ بات چھپ نہ سکی
"ہائے وارفتگی محبت کی"

آہِ پنہاں اثر دکھا ہی گئی
راز کی بات لب تک آ ہی گئی

خاص لوگوں کو جب ہوا معلوم
یہ حقیقت یہ جذبۂ معصوم

ان کی دل سوزیوں نے ساتھ دیا
عشق کی بے کسی کا پاس کیا

صاحبانِ اثر ہوئے کوشاں
تاکہ ہو جائے عقد کا امکاں

لائے خود ہی پیام باوقعت
سن کے حیراں ہوئے "فلک رفعت"

نہ تو اقرار کا سہارا تھا
اور نہ انکار ہی کا یارا تھا

دل میں تھی کشمکش، زباں خموش
گفتگو کا رہا نہ باقی ہوش

ماہنامہ "نقوش" ۳ء لاہور

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

حیدرآباد کے اردوناولوں کی ادبی خدمات

مصنف: سید ممتاز مہدی

صفحات: 428

قیمت: -/92روپے

رہبراخبارنویسی

مصنف: سید اقبال قادری

صفحات: 752

قیمت: -/172روپے

منظرنامہ۔آندھی

مصنف: گلزار

صفحات: 122

قیمت: -/65روپے

منظرنامہ۔کوشش

مصنف: گلزار

صفحات: 84

قیمت: -/48روپے

منظرنامہ۔خوشبو

مصنف: گلزار

صفحات: 137

قیمت: -/69روپے

منظرنامہ۔ہیررانجھا

مصنف: گلزار

صفحات: 87

قیمت: -/53روپے

ISBN : 978-81-7587-568-5

₹ 152/-

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110025